خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

اپریل 2013

معراج رسول

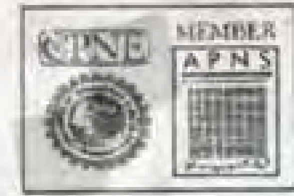

جلد43 • شمارہ04 اپریل 2013 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر215 کراچی74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

اندازہ

جون ایلیا

جو سماج افلاس اور جہالت کے دردناک عذاب میں مبتلا ہو وہ زندگی کا کوئی صحت مند خواب نہیں دیکھ سکتا اور نہ شاید اس کا حق ہی رکھتا ہے۔ ہم بار بار تعمیر و ترقی کا ذکر کرتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچتے کہ تعمیر و ترقی کی باتیں اسی قوم کو زیب دیتی ہیں جو معاشی استحکام اور تعلیمی ترقی کے ایک خاص نقطے تک پہنچ چکی ہو۔ اس سے پہلے تعمیر و ترقی کے امکانات پر غور کرنا دماغی عیاشی اور ذہنی بدکاری کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ ہم قومی حیثیت سے افلاس اور جہالت کے جس نقطے پر کھڑے ہیں۔ وہاں سے تعمیر و ترقی کی منزل اتنی دور ہے، اتنی دور ہے کہ اس کے بارے میں سوچنا بھی اپنے آپ کو ہمت شکنی اور زبوں ہمتی کے آزار میں مبتلا کرنا ہے۔
ہم اپنی اس پسماندگی و درماندگی کے سلسلے میں قابل ملامت بھی ہیں قابل رحم بھی اور ایک حد تک قابل معافی بھی کیونکہ ہماری موجودہ زندگی کے پس منظر میں صرف غلامی ہی کی ایک صدی نہیں، سماجی، اخلاقی، معاشی اور تعلیمی انحطاط کی بھی کئی صدیاں شامل ہیں اور ہمیں ماضی کے اس زبردست نقصان کی تلافی کے لیے جو مہلت ملی ہے وہ یقیناً بہت مختصر ہے اور اسی مختصر مہلت میں ہمیں صدیوں اور نسلوں کے قرضے چکانا ہیں لیکن اس معقول عذر کے باوجود ہم اپنی غیر ذمے داریوں کا کوئی جواز پیش نہیں کر سکتے۔ یہ عذر صرف اسی صورت میں قابل سماعت تھا جب ہم نے اپنے فرائض کو پوری طرح ادا کیا ہوتا، اصلاح حال کے لیے ہر وہ کوشش کی ہوتی جو ممکن تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ یہی نہیں بلکہ قوم کے بعض طبقوں نے تو اس نازک دور میں وہ طرز عمل اختیار کیا اور اختیار کیے ہوئے ہیں جس کو سہہ لینا ایک، پس ماندہ اور پریشاں حال قوم کے لیے کسی طرح بھی ممکن نہیں۔
اس موقع پر کس کس سے مواخذہ کیا جائے۔ کس کس کا نام لیا جائے کہ یہ سیاہ نامہ بہت طویل الذیل ہے مگر ایک خاص طبقے کا ذکر کیے بغیر چارہ بھی نہیں۔ ہمارا اشارہ قوم کے دولت مند طبقے کی طرف ہے ہمارے اس رعایت یافتہ اور برگزیدہ طبقے نے آزادی کے بعد جس مجنونانہ اور مجرمانہ ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے اس کی مثال نہیں مل سکتی، ان حضرات نے لکھ پتی سے کروڑ پتی بننے کی جو شان دار مہم تھوڑے ہی عرصے میں سر کر لی ہے اسے دوسرے شاید صدیوں میں بھی سر نہیں کر سکتے، پاکستان میں اگر کسی طبقے نے اپنی غیر معمولی اور قابل رشک صلاحیتوں سے دنیا کو مبہوت کر ڈالا ہے تو وہ یہی طبقہ ہے اس کی موجودگی میں جو لوگ علمی و ادبی تہذیبی اور سماجی میدانوں میں پاکستانی قوم کی صلاحیتوں کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں۔ ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ غلطی پر ہیں اور انہیں اس ہونہار قوم کا کوئی عرفان حاصل نہیں۔ اگر اس قوم کی استعداد اور کارکردگی کا اندازہ لگانا ہے تو اس کے لیے دولت کشی اور منفعت اندوزی کے شعبے کا انتخاب کرنا چاہیے کہ یہی تو ایک شعبہ ہے جس میں ہماری قوم نے حیران کن فتوحات انجام دی ہیں اور محیر العقول معجزے دکھائے ہیں۔ سماج کا یہی وہ ادارہ ہے جس کے حوصلہ مند نمائندوں نے ایک ایک رات میں بنجر زمینوں سے محل اگائے ہیں اور ایک ایک دن میں دولت و ثروت کی فصلیں کاٹی ہیں۔ یہ بات انہی لوگوں نے ثابت کی کہ آزادی ایک نعمت ہے اور غلامی ایک لعنت اگر یہ ارجمندان دولت نہ ہوتے تو پاکستان میں کوئی بھی آزادی کی نعمتوں اور برکتوں کا قائل نہ ہوتا۔ ہمیں اس موقع پر عبارت آرائی کا شکار نہیں ہونا چاہیے، ہمارا فرض ہے کہ اس ضمن میں پوری متانت اور سنجیدگی سے کام لیں، اس گروہ نے سماج کی صحت مند قدروں کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ یہ لوگ ”زرگری“ اور زر پرستی کے علاوہ کوئی قدر نہیں مانتے۔ ان کا صرف ایک نصب العین ہے یعنی دولت کھینچنا قوم جہنم میں جائے۔
انہیں تو اپنے کام سے کام ہے۔ زندگی میں ان کا سب سے بڑا ہتھیار دولت ہے اور سب سے مضبوط سپر جہالت۔ ان کے نزدیک تعمیر و ترقی کا مفہوم یہ ہے کہ کوٹھیوں کے نئے نئے ڈیزائنوں اور کاروں کے نئے نئے ماڈلوں کے ذریعے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی جائے۔
اب سوچنا یہ ہے کہ پاکستان کی فاقہ کش فلاکت زدہ اور درماندہ قوم ان مجنونانہ حرکات اور مجرمانہ رجحانات کی آخر کہاں تک متحمل ہو سکتی ہے۔ واقعی ہمیں اپنی قوت برداشت کا اندازہ لگانا چاہیے۔

آپ کے خط

محترم قارئین
تسلیمات!

اپریل 2013ء کا دلچسپ شمارہ آپ کے زیرِ نظر ہے۔ اگرچہ یہ مہینا اپنے دامن میں ہمیشہ مہکتے اور رنگ برنگے پھولوں کی سوغات لاتا ہے مگر بدقسمتی سے آج ہمارے دامن میں بے سکونی، انجانے خوف کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ پچھلے دنوں پہلے کوئٹہ اور پھر عباس ٹاؤن میں ہونے والے خون آشام دھماکوں نے عوام کی بے بسی اور اقتدارِ اعلیٰ کی بے حسی پر ہر آنکھ کو اشکبار کر دیا ہے مگر ستمگر ہاتھ ہیں کہ نہ تھکتے ہیں، نہ تھمتے ہیں۔ بارود کے اس دور میں یہ لمحۂ فکریہ ہے کہ ہماری نئی پود کے دل و دماغ پر اس کے کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ یہ وقت تو جیسے تیسے گزر جائے گا مگر...... جب اس نسل کے ہاتھوں میں ملکی نظم و نسق آئے گا تو کیا ان کے پاس کوئی راہ نما اصول ہوگا......؟ یہ بچے اپنے بچپن سے بہت دور محسوس ہوتے ہیں...... آنکھوں میں مسلسل الجھن اور خوف کی دبیز تہ صاف نظر آتی ہے...... اتنے بےزار ماحول میں کیسے تعلیمی سفر کو جاری رکھ سکیں گے۔ نفسیاتی ماہرین کی ریسرچ اور تشویش بھی اس حوالے سے منظرِ عام پر آچکی ہے کہ ایسی ابتر فضا میں پرورش پانے والے بچے زندگی کو کس رخ پر لے کر چلتے ہیں۔ ملکی معیشت کا جو حال ہوا سو ہوا مگر نئی نسل کی اس دولت کو تباہی سے بچانے کے لیے اہلِ فکر طبقے کو سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت ہے...... اور یہی وقت کا عین تقاضا بھی ہے۔

لفظوں کے ان موتیوں کے ساتھ اب چلتے ہیں اپنی محفل و گلزار محفل کی جانب...... جہاں اب بھی چاہتوں کی اقدار باقی ہیں۔

☩ **محمد عمار کشف**، کوٹلہ ارب علی خان سے خوب صورت تبصرہ کر رہے ہیں "کم ریٹ بالائشیں کی تفسیر سسپنس کی کرم فرمائی کے باعث ہم ابھی تک فراقِ یار، سوزِ انتظار میں پہلو بہ پہلو ہو رہے تھے کہ اطمینانِ قلب و جان موصوف ہمارے پہلو سے آن لگے۔ ناگاہ ہاتھوں سے لیکن درحقیقت پلکوں سے اٹھا کر نگاہوں میں سمیٹا تو ورق ورق پایا۔ یارکی ازکار رفتگی حسنِ یار کی ہر پہلو سے منفرد و دیدہ زیب ترتیب تھی۔ پری پیکر حسینۂ سرورق کی متورم کھوجتی نگاہیں بھانپ کر فوراً سے پیشتر اپنے صباحت و ملاحت میں یکتا چہرے کی دید کروائی اور حسینۂ سرورق کی دید کی پیاس بجھائی۔ ترش لیکن حق گو جون ایلیا نے ہمیشہ کی طرح چند حقائق تیغ کشید کیے اور افکار کے تار بنے۔ چشم کشن اداریہ علم بالقلم کی نصیحت سے حکام بالا کے صرف نظر پر سوختہ جگر رہا اور ایسا پایا اسبابِ معاشرے کی دیواروں کو مضبوط کرنے والوں کی اپنی ایمان کی عمارتیں منہدم ہونا ہے...... اپنے برسوں سے باتونی ہونے پر نازاں ہم سعدیہ بخاری کے تبصرے پہ ایک نگاہ تمسخر ڈالتے ہی نادم و نالاں رہ گئے۔ قیصر اقبال گچہ کے تبصرے کا حاصل اس امر کی وضاحت رہا کہ دوشیزۂ سرورق کے ہاتھوں میں چوڑیاں تھیں۔ طاہرہ یاسمین! اللہ رے اتنی معصومیت...... بچے کو نانی مل جائے یا موصوفہ کا خط چھپ جائے خوشی برابر۔ ہمایوں سعید راج دستانے دیکھ کر ہاتھ اور ماتھا دیکھ کر نام پھیلایا جائے تو بھی پیٹ کی نہیں کھانی پڑتی۔ محفل میں طاہرہ گلزار کی موجودگی بزمِ طرب کا سماں پیدا کیے رہی۔ حسن رقم بکھیرتے قلم کے جہاندیدہ مالک تفسیر عباس بابر کا بزم میں نہ ملنا نام و مقام ہمارے قلب کے لیے بے خلش کا سامان۔ مجلسِ سسپنس کی ایک اور شخصیت بارعب جو کیے رکھے ہمیں مرعوب اور لفظوں میں جائیں جس کے ڈوب ڈوب...... عزیز محترم محمد جاوید بلوچ کا تبصرہ اس بار بھی رہا خوب۔ ماہا کی غیر موجودگی سے پریشان سارہ آف کراچی وال کو سفید ہی سمجھتی رہیں۔ کہانیوں کی ابتدا غمگین روی و جاں سوز ابتلا اور دلگداز جذبوں کی ترجماں مسافر سے کی۔ حالات کی کٹھنائیوں سے نبرد آزما در پہ جانِ دشمناں سے بدست و گریباں شہر یار رفتہ رفتہ پرویز سوزشِ حسن کی حامل میڈم شکیلہ کی جانب بہ رفتہ مائل ہے لیکن حیثیت اور امارت کا تغیر حائل ہے۔ تشنگی کم کرنے کے لیے پڑھتے ہیں کمبخت اور بڑھ جاتی ہے۔ کشکول کا عروج بھی اپنے شباب پر رہا۔ اقبال پروازِ تخیل کے مالک احمد اقبال کا پایۂ اقبال ہے کہ ہماری سوچ مائل بہ زوال کو اقبال کیے جاتے ہیں، نئی طرز دیے جاتے ہیں۔ استوری آخری صفحات کی سوغات ٹھہری۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی جلالتِ علمی کا شاہکار، ماضی بعید کے پیوند خاک مگر اوراقِ تاریخ پر سانس لیتے کردار عادل شاہ کی زندگی کے پیچ و خم اور نشیب و فراز کی خوں رقم داستان، جس کی عدل کی فصیلوں سے جبر کی تمام تر رخنہ اندوزیاں ناکام گئیں۔ مینھا زہر، مرزا امجد بیگ کی کامیابیوں کے خزینے میں ایک اور نگینہ جس میں بیگ صاحب نہ صرف اپنے بے گناہ موکل کے درد کا درماں بنے بلکہ غیر معمولی فراست سے مجرم کی خون آلود گردن بھی ماپ لی۔ بے ساختہ جملہ ہائے تحسین بلند ہوئے۔ اردو ادب کے آسودہ دماغ قلم کاروں کی مختصر تصانیف مسحور کیے رہیں۔ ایم اے راحت کی تحریر، زخم زخم تو تیر کی آگ میں، سلگتی گل نور بالآخر اپنی عصمت کا چراغ گل کرنے والے کا قرار گل کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی اور خود بھی قیدِ غمِ حیات سے نجات پائی۔ بابر نسیم کی ٹرنک کی چوری میں ٹنگ ولیوٹ کے کردار نے فطانت تو دکھائی ہی، تبسم بکھیرنے کا اعجاز بھی بنا۔ کاشف زبیر کا شہر یار تحفہ، کم نصیب میں عناد و ذہنیت کی حامل روزیلا کی خفت اور سراسیمگی سے عجب بے نام سی تسکین ملی۔ مدفن سراسر دردسر رہی۔ طاہر جاوید مغل کی کاوش میں عفت و طینت کا مظہر یاسم کی حیات بہ انتہا کاوشوں سے اپنے محبوب کی جانب مائل ہو ہی گئی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی محنت ولی کامل میں سید نعمت اللہ شاہ ولی کی بہ ایمائے شریعت تابع اور اصولوں پر مدار زندگی ایمان کے لیے روشن مشعل ثابت ہوئی۔"

☩ **قیصر اقبال گچہ**، بکلول، بھکر سے محفل کی زینت بنے ہیں "کچھ مصروفیت کے باعث مارچ کا سسپنس ذرا تاخیر سے خریدا۔ جون ایلیا کے انشائیے سے مسلمانوں کو سبق سیکھنا چاہیے ورنہ تاریخ کے اوراق سے ہمارا نام و نشان ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔ سسپنس کے اسمبلی حال میں داخل ہوئے تو اجلاس کی کارروائی شروع ہو چکی تھی اور بخار میں لت پت سعدیہ بخاری اسپیکر کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ محترمہ کو مریم کے خان کی کہانی پڑھ کر جھرجھری آ گئی بلکہ چہرے پر جھریاں آ گئیں۔ لگتا ہے رمضان پاشا کا گلے پڑا ڈھول اب طاہرہ یاسمین کے گلے پڑ گیا ہے جو وہ ہمایوں سعید کے لیے بجانے والی ہیں۔ حافظ شاہد عمران اللہ تعالیٰ آپ کی مشکلات آسان فرمائے۔ حبیب احمد اور ارسل کا ظمی دعا ہے کہ کامیابی آپ کے قدم چومے۔ قیصر اعوان بھائی ہم نام کی حیثیت سے آپ کا مشورہ سر آنکھوں پر مگر پریشان مت ہوئیے گا، آپ کا یہ بھائی سب کو مناسب جواب دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ فیصل جاوید اور زین العابدین خوش آمدید۔ ظفر علی نے جتنے شارٹ وقت میں شمارہ ختم کیا، اتنا ہی شارٹ خط بھی لکھ ڈالا۔ تصویر العین شکر مناؤ کہ جنوں کے عدنان یوسف کو آپ کے دنیا میں آنے کا پتا نہیں چلا ورنہ معاملہ یک نہ شد دو شد والا ہو چکا ہوتا۔ رمضان پاشا انکل 1986ء میں چھپے آپ کے تبصرے سے لگتا ہے کہ آپ کوئی آثار قدیمہ کی شکل کی چیز...... نہیں ہیں بلکہ بہت پرانے تبصرہ

لگار ہیں۔ طاہرہ گلزار آنٹی، میں منظر امام کی کون سی تحریر سے کچھ سیکھوں۔ فروری میں تو ان کی کوئی تحریر شامل نہیں ہے۔ ہمایوں سعید یقیناً تمہارے ساتھ تمہارے جیسی ہی بیچ گی اور محاورہ بنے گا "پہلوئے لنگور میں لنگور" جاوید بھائی، اچھا کیا کہ ہمایوں سعید کے تبصرے پر آپ نے اینٹیں رکھیں۔ اگر یہی آٹھ دس مطلب اٹھارہ اینٹیں آپ ہمایوں سعید پر رکھنے کی بات کرتے تو اس کی تو بیچے چٹنی بن جاتی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے کشکول پڑھی، کنول کے اغوا کار کے روپ میں شیخ حامد منظر پر آچکا ہے اور اگلی قسط میں ضرور وڈی آئی جی کی منگنی کے حربے کو کرکرا کرے گا۔ مسافر میں اس بار کہانی اپنی سابقہ ڈگر سے ہٹ کر تھی۔ ہیرو ماہی اپنے انجام کو پہنچا، کھالے کی کہانی میں انٹری ہوئی ہے۔ شہر یار کی غزالہ سے ملاقات ہو گئی۔ آخر میں شہر یار پھر پھنس گیا ہے۔ احمد اقبال کی آخری کہانی زندگی نام ہے آخر میں جا کر کافی الجھ گئی۔ بہرحال شاہ جی نے ہر موقع پر عامر سے حق دوستی نبھایا۔ کاش کہ شاہ جی عامر کو یہ بھی بتا دیتا کہ عامر کی ہونے والی بیوی نرگس سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ میٹھا زہر میں بیگ صاحب نے اعجاز حسین کو صاف بچا لیا اور اصل مجرمان نگینہ بیگم اور رفیق شاہ کے قاتل مراد کو کیفرِ کردار تک پہنچایا۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی وارث میں عادل شاہی خاندان کے حالات پڑھے۔ طوخان کو اقتدار سے الگ کر کے ابراہیم عادل شاہ کے سپرد حکومت کی باگ دوڑ سونپ گئی اور حقیقت میں وہی اسمٰعیل عادل شاہ کا وارث ٹھہرا۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی ولی کامل میں میر عطاء اللہ صاحبزادے نعمت اللہ شاہ ولی کے حالات پڑھے واقعی یہ حیرت کی بات ہے کہ ان کے مزار کا کوئی پتا نہیں لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ایسے کامل اور عالم و فاضل صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔ ایم اے راحت کی قیدِ غمِ حیات میں کہانی کا اینڈ افسردہ کر گیا۔ جس طرح گل نور معصوم اور بے گناہ تھی اسی طرح عرشان اور شائل کا بھی تو کوئی قصور نہیں تھا۔ کاشف زبیر کی کم نصیب میں مارلن تو بدنصیب تھا ہی، مورس ڈین اور روزیلا بھی اس کے ساتھ ہی بدنصیبی کی چکی میں پس گئے۔ طاہر جاوید مغل کی نشانہ میں سرفراز غلط نشانہ لگا بیٹھا اور پھر اس کا کفارہ پانچ سال تک ادا کرنا پڑا۔ مختار آزاد کی چالباز میں دو چالبازوں سے ملاقات ہوئی جو اپنی کیٹیگری میں ایک دوسرے سے بڑھ کر تھے۔ تنویر ریاض کی مختصر تحریر شناسا اجنبی کسی قسم کا کوئی تاثر قائم نہ کر سکی۔ بابر نعیم ٹنگ ولیوٹ کے کارناموں پر مشتمل ٹرنک کی چوری لے کر آئے اور ٹنگ ولیوٹ نے وکٹر الیانوف کو قانون کے چنگل میں دے کر اور اینا الیانوف کو قانون کے چنگل سے نکال کر اپنے کارناموں میں ایک اور کارنامے کا اضافہ کیا۔ ڈاکٹر مقبول حسین کی مدفن میں تھامس اور نیہر اس کی لالچ کا شکار ہو کر اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ محفل شعر و سخن میں اس بار کراچی اور نور پور تھل کے ساتھی چھائے ہوئے نظر آئے۔ گزارش کروں گا قدرت اللہ نیازی سے کہ وہ اس نمبر پر 0302-3161904 صرف ایک ایس ایم ایس کر دیں تاکہ میں آپ کو بیٹے کی مبارک باد اپنی زبان سے بذریعہ سیل فون دے سکوں۔"

☩ **ادریس احمد خان**، ناظم آباد، کراچی سے محفل میں چلے آرہے ہیں "مارچ کا سسپنس 3 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل ہمیشہ کی طرح خوب صورت اور ٹائٹل گرل کسی گہری سوچ میں منہمک تھی۔ انشائیے میں علم و بصیرت کے موتی چنے، اس کے بعد اپنی محفل میں وارد ہوئے اور صنفِ نازک کو سرِفہرست پایا۔ سو سعدیہ بخاری کو بہت مبارک۔ دیگر دوست بھی باہم گفت و تکرار تھے۔ اپنی حاضری کا نامہ بھی نظر آیا بہت شکریہ۔ اس کے بعد مسافر کی سنگت میں گام سے گام ملاتے ہوئے ہم سفر ہوئے جہاں شہر یار مردِ میدان بنا ہوا دشمنوں کو للکار رہا ہے۔ اس کے بعد تاریخی واقعات سے مزین کہانی وارث پڑھی جو کہنہ مشق رائٹر ڈاکٹر ساجد امجد کی بہترین کہانی تھی۔ اس کے بعد مقبول عام کہانی کشکول تھی۔ شیخ حامد کی آمد ظاہر کی گئی اور کہانی دوبارہ شروع ہو گئی۔ منجھے ہوئے فنکارِ قلم کار ایم۔ اے راحت کی کہانی قیدِ غمِ حیات تھی۔ جس نے سوچ کے در وا کیے۔ سچ ہے انسان جو بوتا ہے اسی کی فصل کاٹتا ہے۔ اس کے بعد کاشف زبیر کی کم نصیب بھی کسی سے کم نہیں تھی۔ سچ ہے جس کی تقدیر میں مفلسی اور افلاس ہے، اس کو کوئی نہیں بدل سکتا۔ میٹھا زہر بس ٹھیک ہی تھی۔ ملک صاحب اور امجد بیگ صاحب کی کہانیوں پر پھر بھی لفظ بہ لفظ سطر بہ سطر تبصرہ ادھار۔ نشانہ نے بھی متاثر کیا۔ چالباز میں پال اور ایز گے تے مل کر جوئے میں سب کو چونا لگایا۔ محفل شعر و سخن میں اچھے اور معیاری شعر اچھے لگے۔ شناسا اجنبی بھی بہتر تھی، ٹنگ ولیوٹ کے کارنامے میں بھی مزہ آیا۔ ولیوں کے تذکرے میں روحانی روشنی سے منور بزرگ نعمت اللہ کے حالات و واقعات سے روشناس ہوئے۔ مدفن بھی اچھی لگی۔ ہمیشہ کی طرح آخری صفحات کی کہانی بہترین تھی جو احمد اقبال کی کہنہ مشقی کا ثبوت تھی۔"

☩ **رمضان پاشا**، گلشن اقبال، کراچی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں "سرورق حسبِ معمول جاذبِ نظر تھا۔ انشائیہ کا عنوان ہی دماغ کی چولیں ہلانے کے لیے...... کافی تھا۔ آپ کے خط میں ادارتی تحریر حسبِ حال اور حسبِ ضرورت تھی۔ محفل میں جن دوستوں نے مجھ پر تضحیک آموز جملے تحریر کیے وہ مجھے اچھے لگے، شکریہ۔ وارث، اس تاریخی کہانی پر تبصرہ نہیں کروں گا، وہ اچھی نہیں لگی۔ قیدِ غمِ حیات، راحت صاحب نے ایسی درد انگیز اور غم ناک کہانی پہلے کبھی نہیں لکھی، انہوں نے قاری کو خوب رلایا۔ کشکول کا اختتام اس بار بڑے خوشگوار انداز میں ہوا، کیا خوب۔ کم نصیب میں کافی تجسس بھرا ہوا تھا، وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ میٹھا زہر میں حسبِ معمول عدالتی کارروائی میں خوب لطف آیا۔ مغل صاحب کا نشانہ خوب تھا۔ اختتام چونکا دینے والا تھا۔ شناسا اجنبی کہانی کی اٹھان اچھی،

لیکن آخر میں تشنگی رہ گئی۔ چالباز پڑھ کر اندازہ ہوا کہ امریکا کے لوگ زمانہ قدیم سے ہی بڑے چالاک، بے ایمان اور دغاباز ہوتے چلے آرہے ہیں، کیا خوب کہانی تھی۔ ٹرنک کی چوری میں تنک ویلیوٹ کا کارنامہ حسب روایت قابل تعریف تھا۔ اس بار بھی مسافر کا اختتام دل کی دھڑکن کو اتھل پتھل کرنے والا تھا۔ چیخ یقیناً پروین کی تھی۔ ولی کامل ان بزرگ کا اسم گرامی تو سن رکھا تھا، حالات زندگی اب معلوم ہوئے، کافی معلومات ہوئیں۔ زندگی نام ہے، اقبال بھائی کمال کی کہانی لکھتے ہیں، یہ کہانی تو اس ماہ کی بہترین کہانی تھی، وری اسٹوری آف دی منتھ!"

✠ **محمد قدرت اللہ نیازی**، بھیم ٹاؤن، خانیوال سے تبصرہ کر رہے ہیں "مارچ کا شمارہ 17 تاریخ کو ہی مل گیا۔ سانولی سلونی حسینہ بہار کے موسم میں پیا ملن کی آس لگائے براجمان تھی۔ جون ایلیا اپنے نسخہ کیمیا کے ساتھ موجود تھے لیکن افسوس کہ علم و دانش سے ہمارا دور کا بھی واسطہ نہیں اور رہی جمہوریت تو اس کا تجربہ بھی ہمارے ملک اور عوام کے لیے خاصا خوفناک رہا ہے۔ اس بار سعدیہ بخاری محفل کی خاتون اول تھیں اور خاصی پھیل کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ سعدیہ بخاری اپنے طالب علمی کے واقعات بیان کر کے کیوں اپنے راز کھول رہی ہیں، آپ پڑھ نہیں سکیں تو اس میں اساتذہ کا کیا قصور۔ قیصر اقبال! ماما کا وہی حال ہے "اونچی دکان پھیکا پکوان" آپ بی پی ہائی نہ کریں۔ حافظ شاہد عمران! عمران حیدر بلوچ بیمار ہیں اس لیے محفل سے غائب ہیں اور خوش خبری یہ ہے کہ حسنین بلوچ رہا ہو گئے ہیں (مبارکاں بھئی) ملک قیصر اعوان! بھائی شادی والی قید میں تو ہر کوئی رہنا چاہتا ہے اس لیے یہ جیل والی قید سے بہت مختلف چیز ہے۔ سعدیہ بخاری، طاہرہ یاسمین، طاہرہ گلزار، محمد جاوید بلوچ اور دیگر سب کا شکریہ جو انہوں نے مجھے اپنے خطوط کے ذریعے بیٹے کی مبارک باد دی خیر مبارک۔ مقصود احسن طاہر! بھائی شادی کی ساتویں سالگرہ تھی۔ حافظ محمد عمران، اللہ ہم سب کو آزمائشوں سے بچائے اور آپ کی ذاتی زندگی میں جو مشکلات ہیں اللہ ان کو آسان فرمائے (آمین) جنوری میں سسپنس کے قاری اور محفل کے ساتھی نعمان پیارے سے ملاقات ہوئی جو شادی کی ایک تقریب میں خانیوال آئے ہوئے تھے یہ کسی بھی محفل کے ساتھی سے پہلی لائیو ملاقات تھی جو بہت اچھی رہی۔ سب سے پہلے کشکول پڑھی جس میں حسب توقع شیخ حامد زندہ پایا گیا۔ اورنگ زیب کا شک بھی درست ثابت ہوا۔ مسافر میں شہریار میڈم پر کچھ زیادہ ہی انحصار کرنے لگا ہے۔ یاران خان کی حویلی میں گھس کر اپنی شامت بلوالینا شہریار کی حماقت کی انتہا تھی۔ اگر ایسا کوئی کام کرنا ہی تھا تو منصوبہ بندی سے ٹیم بنا کر کیا جاتا۔ زندگی نام ہے، احمد اقبال کی "گپ کہانی" ثابت ہوئی۔ مردوں سے فون کروا دیے۔ بیوی کی شکل کہاں جا کر ملوائی۔ افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ احمد اقبال سے اس طرح کی کہانی کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔ کاشف زبیر کم نصیب لے کر آئے۔ ایلن ڈائل نے مارلن کو ناولوں کے مسودے بھیجے حالانکہ وہ جانتا تھا کہ وہ معمولی پڑھا لکھا ہے۔ جب مارلن نے بتایا کہ وہ بنڈل اس نے جلا دیے ہیں تو مورس اور روزیلا کی طرح میں بھی غمگین ہو گیا۔ طاہر جاوید مغل نشانہ لے کر آئے لیکن نشانہ غلط ہو گیا۔ سرفراز جس کو مارنا چاہتا تھا اسی کو نشانہ بنایا لیکن سارا ہیر پھیر عقل کا ہوا۔ چالباز میں پال اور ایز گے نے ڈارک نمبر والوں کو خوب بے وقوف بنایا دونوں کا پیش کردہ ڈراما سپر ہٹ رہا ہے اور مارتھا دولت کے ساتھ ساتھ جان سے بھی گئے۔ محمد امجد ریاض اور سارہ چودھری کے اشعار پسند آئے۔ ایک سوال آشوب وفا کے بارے میں کرنا چاہوں گا۔ پہلی قسط میں جب آیان جلالت کو مارنے آتا ہے تو جلالت کی بیوی کہتی ہے، بیٹا اس کو مار دو، یہ ہمارا دشمن ہے۔ تو ہم سمجھے شاید جلالت اسرائیلی یہودیوں سے ملا ہوا ہے لیکن بعد میں جلالت کے حالات سے ثابت ہوا کہ وہ پکا مسلمان تھا تو پھر اس کی بیوی نے اس کو دشمن کیوں کہا؟ نواب صاحب نے اس کی وضاحت نہیں کی۔"

✠ **ابرار وارث**، سندیلیانوالی سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "ماہ مارچ کا شمارہ 20 فروری کی صبح کو اپنی پوری جلوہ خیزی و رعنائی سمیت ایک خوش کن احساس سے ملا اور دل خوش ہو گیا۔ محفل میں سعدیہ باجی کو کرسی صدارت پر پا کر مبارکباد دینے کو دل چاہا۔ آپ نے آغا فرید کے متعلق پوچھا۔ آغا جی نے پڑھا ہوگا۔ میں بھی آغا فرید کو بہت مس کرتا ہوں لیکن پتا نہیں وہ کہاں گئے ہیں۔ سارہ جی آپ چوڑیوں کی بات پر خوش ہو گئیں تو ڈاکر انکل نے حسینہ کی کلائیاں پھر سونی کر دی ہیں۔ بہرحال باقی سب کے خطوط اچھے تھے۔ اسٹارٹ مسافر سے کیا لیکن پتا نہیں ملک صاحب کیوں اتنا آہستہ چل رہے ہیں سوائے غزالہ کے ادھورے دیدار کے اور کوئی بات جچ کی نہ تھی۔ آخری صفحات پر بھی کہانی پڑھی، پسند آئی لیکن پلیز رائٹرز سے گزارش ہے کہ اب برین ٹیومر والی اور کینسر والی کہانیاں بند کر دیں ہر جگہ پر یہی کہانی چل رہی ہے ڈراموں میں بھی اور ناولوں میں بھی۔ سب سے زیادہ جس کہانی نے متاثر کیا وہ تھی ایم اے راحت کی "قید غم حیات" نورگل نے کیا بھیانک انتقام لیا، کسی کے بارے میں بھی نہ سوچا، سچ کہتے ہیں کہ عورت کا انتقام اندھا ہوتا ہے۔ بہت خوب صورت اور اسٹوری آف دی منتھ کہانی تھی۔ طاہر جاوید مغل کی نشانہ اور کاشف زبیر کی کہانیاں بھی بے حد پسند آئیں۔"

✠ **ایم زاکم علی گورچانی**، داجل، ضلع راجن پور سے...... پچھلے شمارے پر تبصرے کے ساتھ حاضری دے رہے ہیں "بہت عرصے سے سسپنس کا قاری ہوں لیکن خط بھیجنے کی جسارت پہلی بار کر رہا ہوں (خوش آمدید) سب سے پہلے تو بات کرتے ہیں ناصر ملک صاحب کی کہانی مسافر کی۔ سچ پوچھیں تو اسے پڑھ کر دل پر قابو نہیں رہتا۔ ایک قسط پڑھ کر اگلی قسط کا انتظار بے کل کر دیتا ہے۔ بعض اوقات کہانی پڑھتے ہوئے میڈم شکیلہ کی اوٹ پٹانگ حرکتیں بے مزہ کر دیتی ہیں۔ سرورق پر حسینہ بے چاری کبوتروں کی جوڑی کو دیکھ کر کچھ حد سے زیادہ ہی شرما رہی تھیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی سودوزیاں بہت اچھی لگی۔ کشکول نے بھی صحیح رخ اختیار کر رکھا ہے۔ لگتا ہے یہ اب اختتام کے قریب ہے۔ لیکن خدارا مسافر کو ابھی سے ڈسچارج مت کیجیے گا۔ محفل شعر و سخن میں نور الایمان، قیصر اعوان سرگودھا، جلیل اور احسان اللہ بخشی کے اشعار زبردست لگے جبکہ باقی بھی اپنی مثال آپ تھے۔ آشوب وفا کا دوسرا اور آخری حصہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔ غیر ملکی کہانیاں اچھا تاثر نہیں دیتیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارے پیارے ساتھی عمران حیدر بلوچ کو شفائے کاملہ عطا فرمائے اور سسپنس کو مزید ترقی دے۔" (آمین)

✠ **توصیف احمد**، پٹھان کالونی، کراچی سے محفل کی زینت بنے ہیں "مارچ کا شمارہ 16 تاریخ کو ملا۔ ناقابل تبصرہ سرورق کو چھوڑ کر سیدھے محفل دوستاں میں پہنچ گئے۔ لیکن یہ کیا......؟ اپنے خط کا تو نام و نشان نہیں تھا۔ بہرحال...... بوجھل دل کے ساتھ خطوط کا مطالعہ شروع کیا۔ طاہرہ یاسمین کے خط پر پہنچ کر دل کے دروازے کا پٹ ایک فرحت بخش ہوا کے جھونکے کے ساتھ کھل گیا۔ کیونکہ 28 دوستوں کی محفل میں صرف طاہرہ یاسمین نے مجھے ویلکم کیا تھا۔ طاہرہ جی...... خوچہ ڈیرہ ڈیرہ مہربانی۔ صدر مجلس سعدیہ بخاری صاحبہ ماما ایمان کفن بھی پھاڑ کر بولے گی۔ یہ تو بہت مشکل ہو جائے گا منڈے لوگوں کے لیے کیوں حبیب میاں...... کہیں آپ کا ارادہ ماریہ فاروق کو ٹیوشن پڑھانے کا تو نہیں ہے۔ سارہ جی آپ نے چار، چھ نہیں پوری آٹھ چوڑیوں کا ذکر کیا تھا۔ لو جی...... اس بار کسر پوری کر دی ڈاکر انکل نے ایک بھی نہیں ہے۔ ہاہاہا...... رمضان پاشا صاحب جاوید بھائی کا اشارہ آپ کی ضعیف العمری کی طرف ہے۔ طاہرہ گلزار پشاوری صاحبہ

آپ نے اپنی سالگرہ کی تفصیلی تاریخ تو لکھی لیکن یہ نہیں لکھا کہ کون سی ویں سالگرہ ہے۔ کہیں آپ تصویر العین کی دادی تو نہیں ہیں جو کہ آل ریڈی 500 صدیاں گزار چکی ہیں۔ احمد خان توحیدی صاحب اللہ تعالیٰ آپ کے بھانجے کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے (آمین) حافظ محمد عرفان سرگودھا، کیا آپ حافظ محمد اجمل کو جانتے ہیں؟ ہمایوں سعید آپ نے اپنے نام کے ساتھ راج لکھنا کیوں چھوڑ دیا۔ حالانکہ آپ سچ کے راج ہیں کیونکہ محفل یاراں کے تقریباً ہر دوست کے تبصرے میں آپ کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اس بار تاریخ میں عادل شاہ کا سامنا ہوا۔ واقعی شعلہ بیانی اور عاجزی طبیعت میں اعتدال ہو تو بہت سی مشکلات شروع ہونے سے قبل ہی حل ہو جاتی ہیں۔ میٹھا زہر میں نگینہ بیگم اور مراد کی اچھی خاصی پلاننگ پر بیگ صاحب نے پانی پھیر دیا اور ملزم اعجاز حسین کو کسی ماہر شہری رضا کار کی طرح موت کی گہری کھائی سے نکال باہر کیا اور ثابت ہو گیا کہ سود یقیناً ایک ناسور ہے جس سے ہر مسلمان کو بچنا چاہیے۔ طاہر جاوید مغل کی نشانہ میں ڈی ایس پی سرفراز کی مہارت نے یاسم کے شوہر ناصر کی جان لے لی۔ کترنوں میں صفحہ 51 پر ماما ایمان نے کچھ چٹکلے چھانٹنے کی کوشش کی تھی جبکہ محفل شعر و سخن میں ادریس احمد خان اور طاہرہ یاسمین کا انتخاب زبردست تھا۔" (اب تو آپ خوش ہو ناں......!)

✠ **محمد ہمایوں سعید**، بنوں سے چلے آرہے ہیں "آج کل ہمارے دل کا موسم بے حد اداس ہے۔ انکل نے مارچ کے حوالے سے قرار داد پاکستان کا ذکر چھیڑا ہے تو انہیں بتاتا چلوں کہ آج کل ٹھیک اسی جگہ اسی مینار تلے پاکستان کی قدآور شخصیات بار بار آکر اپنے ہی جیسی پاکستانی شخصیات کے خلاف نازیبا الفاظ استعمال کرتے ہیں، کیا پاکستان میں کوئی ایسا بندہ بشر نہیں آسکتا جو دوسروں پر انگلی اٹھانے، ان کے لیے غلط الفاظ استعمال کرنے کے بجائے صرف اپنے منشور، اپنی پالیسیوں اور اپنے عوام دوست مشن پر بات کرے؟ سعدیہ صاحبہ! آپ پیچھے پڑنے سے منع کر رہی ہیں یا پیچھے پڑنے کی آفر کر رہی ہیں؟ بہرحال ہم پرانے برے دن ہرگز نہیں آنے دیں گے کہ آپ کے پیچھے پڑنے کا خیال تک ذہن میں گزرے۔ حبیب برادر! ایف ایس سی تو ہزاروں لاکھوں لوگ کر رہے ہیں، مگر ماریہ کے ایف ایس سی کا سن کر آپ کا پھولے نہ سمانا سمجھ سے بالاتر ہے۔ عمران بھائی بس کیا بتاؤں کہ کیوں پیچھے پڑے رہتے ہیں سب لوگ۔ اتنا تو آپ کو بھی پتا ہوگا کہ لوگ کسی ایکسٹرا اسپیشل چیز کے پیچھے ہی پڑتے ہیں۔ قیصر اعوان صاحب! محبت تو انسان کی تکمیل کرتی ہے۔ دھوپ میں چھاؤں اور اندھیرے میں نور کی علامت ہے۔ عادل برادر! آپ کو یہ دکھ کیوں کھائے جا رہا ہے کہ ہم آپ کو ضعیف العمر سمجھیں گے؟ طاہرہ جی! تفسیر بھائی اور بابر بھائی کا مشترک درد یہ ہے کہ دونوں بے تحاشا پرانے ہیں حالانکہ یہ کوئی بری بات تو نہیں مگر دونوں کو یہ درد کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتا۔ مقصود صاحب! آپ کے لیے اطلاعاً عرض ہے کہ طاہرہ یاسمین صاحبہ پہلے ہی کافی سے زیادہ بڑی ہو چکی ہے۔ اپنی معلومات اپ ڈیٹ رکھو یار تو بلاوجہ شرمندگی نہیں ہوگی۔ میرے ساتھ فون پہ بات کرنے کی افواہ پھیلا کر عالمگیر شہرت حاصل کرنے کے خواب دیکھنے والے جاوید صاحب اگر میرے تبصرے پر اینٹیں رکھنے سے آپ کی سوکنوں جیسی حاسدانہ فطرت کو ذرا بھر بھی سکون مل سکتا ہے تو ضرور رکھیے اور بار بار رکھیے۔ فہرست میں طاہر جاوید کا نام دیکھا تو بے اختیار ان کی جانب بڑھے۔ ان کی ہر مختصر کہانی ایک انوکھا اثر لازمی چھوڑتی ہے۔ مگر حالیہ کہانی قطعی غیر متاثر کن ثابت ہوئی۔ یوں لگا جیسے سنہرے فریم والے چشموں کے مالک شریف النفس انسان کو زبردستی ولن اور بھدے نقوش والے موٹے انسان کو ہیرو بنا لیا گیا ہو۔ ایم اے راحت کی قید غم حیات بلاشبہ لاجواب رہی۔ ایک معصوم لڑکی پر ظلم کی انتہا کر دی گئی مگر آخر میں اس کا انتقام کسی صورت بھی مستحسن عمل نہیں تھا۔ شیر زادے کے گناہوں کی سزا شمائل اور عرشان کو دینا کہاں کا انصاف تھا۔ کاشف زبیر کی کم نصیب بھی لاجواب اور دلچسپ رہی۔ بیگ صاحب میٹھے زہر سمیت حاضر تھے۔ حسب معمول ان کے چہرے پر پیشہ وارانہ مسکراہٹ تھی۔ نگینہ بیگم کے کمینے پن نے بہت غصہ دلایا۔ تنویر ریاض کی شناسا اجنبی بھی اچھی رہی۔ مغرب میں بھی تھا محسن جیسے سادہ دل اور ایماندار باضمیر لوگوں کی موجودگی پر خوشگوار حیرت ہوئی۔ جوئے کے ارد گرد گھومتی چالباز کچھ زیادہ پسند نہ آئی۔ محفل شعر و سخن میں ڈاکٹر لطیف اور سعدیہ بخاری کا انتخاب پسند آیا۔"

✠ **احسان سحر**، زادے خیلانوالہ، میانوالی سے تبصرہ کر رہے ہیں "سال کا تیسرا شمارہ 16 فروری کو نیازی نیوز ایجنسی سے مل گیا...... ٹائٹل کو دیکھ کر سارا مزہ ہوا ہو گیا...... بے رونق چہرے والی صنف نازک ٹائٹل پر جلوہ گر تھی۔ سعدیہ بخاری...... آخر انکل کو بے چاریوں پر رحم آ ہی گیا۔ مبارک ہو ایک صدی کے لیے...... خوشبو کی طرح نکھرا سا تبصرہ اچھا لگا۔ قیصر بھائی اونٹ کی انسلٹ مت کرو پلیز...... وہ ہمایوں سے تو خوبصورت ہے، خاص کر اس کے ہونٹ...... محمد جاوید بہت شکریہ...... پولیو کے قطرے ہمایوں سعید ہر کسی کی جان بچاتے اور مفت میں خوش ہوتے نظر آئے...... اندھیرے میں تو اپنا آپ بھی نظر نہیں آتا۔ قدرت اللہ نیازی اور ڈاکٹر صاحب کی کمی محسوس ہوئی۔ سب دوستوں کے تبصرے شاندار رہے اور جو بلیک آؤٹ ہوئے ان سے گزارش ہے کہ لگے رہو بھائی۔ کہانیوں کا آغاز ڈاکٹر صاحب کی وارث سے کیا...... عادل شاہ، بہت اچھا لگا تاریخ کی ایک اور یادگار پڑھ کر...... لیکن اب بوریت ہونے لگی ہے۔ سازشوں پر مشتمل قصے پڑھ کر، ڈاکٹر صاحب سے گزارش ہے کہ محبت کے حوالے سے بھی لکھیں۔ ایم اے راحت جب بھی آتے ہیں کمال کر جاتے ہیں بہت خوب، خاص کر آپ کے ابتدائی بول دل خوش کرتے ہیں، خوشبو میں ڈھلے ہوئے دل میں اتر جاتے ہیں۔ کشکول، اچھی اور صحیح جا رہی ہے پلیز اسی لائن پہ اسٹوری کو رکھیے گا بس یہ اچھا ہے...... کم نصیب میں کاشف زبیر اس دفعہ مختلف انداز میں حاضر ہوئے۔ مارلن نے واقعی بے وقوفی دکھا کر ایک اچھا موقع ہاتھ سے گنوا دیا...... مدفن...... وہی لالچ میں پڑ کئی دفعہ پڑھ چکے ہیں لیکن ہر دفعہ مختلف انداز میں لکھا گیا ہے۔ آخری صفحات پر احمد اقبال صاحب آئے اور چھا گئے عجیب و غریب موضوع اور عجیب و غریب کہانی شاہ جی کا کردار تو پراسرار رہا ساتھ اس کے پاس اتنی بڑی دولت حیران کن بات لگی۔ کافی کچھ پردے میں چلا گیا۔ نرگس کا پراسرار کردار کافی زیادہ حیرت

✠ **ڈاکٹر جعفر علی**، ملتان سے لکھتے ہیں "سسپنس پچھلے دس سال سے میرا پسندیدہ ماہنامہ ہے جبکہ اس کی عمر چالیس سے اوپر ہے۔ مرزا امجد بیگ کے قصے، کشکول اور مسافر جب تک نہ پڑھ لوں، چین نہیں آتا۔ محی الدین نواب، احمد اقبال، کاشف زبیر، ایچ اقبال اور طاہر جاوید مغل میرے پسندیدہ مصنف ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ سسپنس کی جوانی کے قصے بھی کہیں سے مل جائیں۔ چالیس بیالیس سال بہت ہوتے ہیں۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ پرانی قسط وار اور مکمل کہانیاں آپ دوبارہ چھاپنا شروع کریں تاکہ مجھ جیسے دس پندرہ سال پرانے قارئین بھی ان شاہکاروں سے لطف اندوز ہو سکیں" (آپ کا خط ہم نے اپنے قارئین کے سامنے پیش کر دیا۔ اس بارے میں گاہے بگاہے قارئین اصرار کرتے رہے ہیں جس کا تذکرہ حذف کیا جاتا رہا ہے۔ دیکھتے ہیں کہ وہ اس بارے میں اب کیا کہتے ہیں)

ہوئی کہانی پڑھ کر اور ابھی تک حیران بیٹھا ہوں کہ کیا حقیقی زندگی میں بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ ولی کامل ایمان افروز سلسلہ جسے پڑھتے ہی خوشگواریت اور سکون کا احساس ہوتا ہے۔ شعر سب اچھے لگے۔ مجموعی طور پر سسپنس اچھا لگا بلکہ بہت ہی اچھا۔"

✠ **ظفر علی**، حیدرآباد سے تبصرہ کررہے ہیں "مارچ کا شمارہ میرے ہاتھ میں ہے۔ سب سے پہلے تو میں نے مسافر پڑھی جس کا بڑا انتظار تھا پھر دوسری کہانیاں۔ ناصر ملک نے بڑا ہی شاندار کردار تخلیق کیا ہے۔ مجھے یہ بہت اچھا لگتا ہے۔ شیرے اور شکیلہ میڈم کا ساتھ بہت دلچسپ۔ کشکول بھی کافی دلچسپ ہے۔ تنک ولیٹ کی کہانی اس دفعہ بہت اچھی ہے۔ آخری کہانی بھی بہت اچھی ہے۔ امید ہے کہ آئندہ بھی اسی طرح سے اچھی کہانیوں کا مجموعہ شائع ہوتا رہے گا۔ مسافر میں ناصر ملک صاحب نے میڈم شکیلہ سے شیرے کو شوہر بنوا دیا اور ایک عورت کا اس انداز میں شوہر تسلیم کرنا بہت بڑا اہم ہے کوکہ وہ جس دنیا کی عورت ہے اس میں جھوٹ بولنا کوئی معیوب بات نہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ یہ اس کی دل کی آواز ہے اور لکھنے والے کا کمال۔"

✠ **ساجدہ راجا**، ہندواں، سرگودھا سے محفل میں شریک ہوئی ہیں "مسلسل دو تین ماہ خط بلیک لسٹ۔ آپ سے شکوہ کروں گی تو آپ ڈاک سسٹم کو الزام دیں گے، سو میں ایسا کچھ نہیں کہوں گی۔ اتنی دور اور مشکل سے خط ٹائم پر ہی پوسٹ کروایا جاتا ہے لیکن پھر بھی بلیک لسٹ میں ہو تو بندہ آئندہ خط نہ لکھنے کے بارے میں ہی سوچتا ہے (ارے ایسا غلطی سے بھی مت سوچیے گا) اب خط لکھنے کی دو وجہیں ہیں۔ اس لیے مارچ کا سسپنس آنے سے پہلے ہی میں خط پوسٹ کروا رہی ہوں۔ سب سے پہلے تو عمران حیدر بلوچ کی صحت کے بارے میں پوچھنا چاہوں گی کہ اب وہ کیسے ہیں؟ عمران حیدر صاحب جلدی سے صحت یاب ہو کر محفل کو رونق بخشیں۔ دوسرا میں نے کچھ عرصہ پہلے کچھ تحریریں بنام پراسراریت نیا رشتہ اور چالاک بھجوائی تھیں لیکن نہ وہ شائع ہوئیں نہ یہ پتا چلا کہ ان کے ساتھ کیا بیتی؟ (فی الحال ان کا نمبر نہیں آیا...... وقت آنے پر دیکھ لیا جائے گا) اگر وہ ناقابلِ اشاعت ہیں تو انہیں ضائع کرنے کے بجائے واپس ارسال کردیں۔ جواب ضرور دیجیے گا۔"

✠ **حسنین ہاشمی**، سینٹرل جیل گوجرانوالہ سے تبصرہ کررہے ہیں "میں تقریباً چار ماہ سے کوشش کررہا ہوں، خط لکھوں یا نہ لکھوں وہ شائع کریں یا نہ کریں۔ پھر میں نے دل سے پوچھا دل نے کہا حسنین ہاشمی خط لکھو انکل بہت اچھے ہیں ہمارے لیٹر کو تھوڑی سی جگہ ضرور دیں گے۔ پہلی دفعہ ہم نے سسپنس پڑھا پھر جب تک ہم پڑھ نہ لیں دل کو قرار نہیں آتا۔ ہم بتاتے چلیں گوجرانوالہ جیل میں دو سال بیت گئے ہیں۔ 302 کا کیس عدالت میں زیرِ سماعت ہے ہم بے گناہ ہیں۔ جج صاحب تقریباً 5 ماہ سے غائب ہیں۔ وکلا صاحبان آئے روز ہڑتال کرتے رہتے ہیں۔ اللہ کرے یہ کم از کم ایک ماہ بے گناہ اندر جیل میں آئیں انہیں پتا چل جائے کہ ہڑتال نہیں چاہیے۔ میرے کیس کا مدعی میرے ماموں کا بیٹا ہے اس کے بھائی قتل ہوئے ہیں۔ آپ فوج میں کیپٹن ہیں کچھ نیک لوگ صلح کروا رہے ہیں، دعا کرنا اللہ کرے جلدی صلح ہوجائے۔ جیل ایک زندہ قبرستان ہے، ہماری دعا ہے کہ کوئی انسان نہ آئے جیل میں انسان کی کوئی قدر نہیں۔ ماں باپ کا ایک ہی بیٹا ہوں۔ ماں اس دنیا میں نہیں ہے۔ دعا کرنا اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، والد صاحب بیمار ہیں۔ دعا کرنا وہ جلد صحت یاب ہوجائیں۔ جو مزہ سسپنس میں ہے اور کسی میں تو ہو ہی نہیں سکتا۔ آئی لو یو سسپنس۔ سب سے پہلے محفل شعر و سخن میں افتخار احمد تارڑ کا شعر بہت اچھا لگا۔ اس کے بعد سارہ صاحب کا شعر بھی کم نہیں تھا۔ سعدیہ بخاری کی بات ہی کچھ اور تھی۔ مسافر اور کشکول بہت ہی خوب صورت لگیں۔ چالباز مختار آزاد کی کوشش اچھی لگی۔ وارث ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔ محفلِ یاراں میں جب دیکھا سعدیہ بخاری کو صدارت کی کرسی پر تو مجھے یوسف رضا گیلانی صاحب یاد آگئے۔ ساتھ میں بیٹھے بابا صدر رفیق تارڑ صاحب بھی مسکرا رہے ہیں۔ بجی آپ کو بہت بہت مبارک۔ ماہا ایمان آپ کا تبصرہ بہت ہی اچھا ہوتا ہے۔ آپ کے تبصرے میں شیریں رحمان اور شیخ رشید کی جھلک نظر آتی ہے۔ آپ تبصرہ کم اور تنقید زیادہ کرتی ہو۔ اگر برا لگا ہو تو غصہ رائے قیصر پر نکالنا کیونکہ وہ شریف آدمی ہے۔ حافظ شاہد صاحب بہت اچھے قاری ہیں لیکن وہ کوشش کررہے ہیں مرزا غالب، ڈاکٹر طاہر القادری اسلام آباد دھرنا صاحب بن رہے ہیں۔ کچھ لوگ بہن بھائی کے رشتے سے کتراتے کیوں ہیں۔ بہن بنانا پسند نہیں کرتے۔ شاید بہن کی ڈولی اٹھانے سے ڈرتے ہوں یا ماموں بننے سے شرماتے ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حوصلہ، صبر، برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ سسپنس کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔"

✠ **حافظ شاہد عمران**، سینٹرل جیل گوجرانوالہ سے محفل میں شامل ہورہے ہیں "حسبِ معمول ڈائجسٹ 22 فروری کو چاند کی طرح چمکتا ہوا جیل کی کال کوٹھریوں میں آپہنچا تو خوشی کی انتہا ہی نہ رہی۔ ٹائٹل پر نظر پڑی تو حسینہ پریشان بیٹھی نظر آئی۔ جس کی پریشانی یہ بتا رہی تھی کہ ہمارے ملک کی صورت حال دن بہ دن بگڑتی جارہی ہے۔ الغرض ملک اس وقت اپنے نازک ترین دور سے گزر رہا ہے۔ اللہ اس کو ہمیشہ سلامت رکھے (آمین) انشائیہ میں جون ایلیا نے مسلمانوں کو ان کا گزرا ہوا سنہری دور یاد دلایا اور جھنجوڑنے کی کوشش کی۔ 23 مارچ 1940 قراردادِ پاکستان تاریخ کا ایک اہم دن ہے تمام پاکستانیوں کو یومِ قرارداد مبارک ہو۔ جب محفلِ یاراں میں پہنچے تو حیران رہ گئے کہ الیکشن سے پہلے ہی سعدیہ بخاری نے صدر کو گرا کر اس کی کرسیِ صدارت پر خود قبضہ جما لیا (ڈھیر ساری مبارکاں) اس دفعہ سعدیہ جی نے ماہا ایمان کو خوب لتاڑا۔ جس پر رائے قیصر بہت ہی خوش نظر آرہے ہوں گے۔ طاہرہ یاسمین شکریہ کہ خط شائع ہونے کی صورت میں آپ کی پریشانی ختم ہوگئی۔ سرگودھا جیل والو، سناؤ کیسے ہو آپ؟ حافظ عرفان صاحب اللہ آپ کی تمام پریشانیاں دور فرمائے۔ مقصود الحسن طاہر اس دفعہ رحمان ملک بنے بیٹھے نظر آئے (ہتھ ہولا رکھو جی) سب سے پہلے اپنی پسندیدہ کہانی مسافر پر پہنچے۔ کیا بات ہے مسافر کی۔ کہانی بہت ہی بلند جارہی ہے۔ اب تو میڈم شکیلہ نے شہریار کو اکیلے ہی اپنے مشن پر گاؤں بھیج دیا ہے۔ شہریار اب دشمنوں کے شکنجے میں پھنس چکا ہے۔ اس کے بعد کشکول پڑھی۔ کہانی بہت ہی بور جارہی ہے۔ اس میں سوائے دماغی ورزش کے کچھ بھی نہ تھا۔ ڈاکٹر ساجد امجد کے قلم سے نکلی ہوئی وارث، تاریخی کہانی بہت ہی پسند آئی۔ طاہر جاوید مغل کی نشانہ اچھی کہانی تھی۔ ممتاز ہراور ٹرنک کی چوری میں لوگوں کی چالبازیاں سامنے آئیں۔ ولی کامل نے ایمان تازہ کیا۔ محفل شعر و سخن میں طالب حسین اور تحفیل چٹھہ کے شعر بہت ہی پسند آئے۔ اس کے علاوہ باقی تمام اشعار بھی بہت اچھے تھے۔"

✠ **عاصم اقبال جسپال**، ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "اس ماہ کا سسپنس بڑی کوشش سے 22 تاریخ کو جیل میں آیا ہوا اور اسے دیکھ کے دل خوش ہوگیا۔ ٹائٹل پر دوشیزہ ہاتھ اپنے گالوں پر رکھ کر کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سعدیہ بخاری کو بہت بہت مبارک باد۔ اب کرسی زیادہ دیر تک نہیں رہی، خیال سے بیٹھیے۔ انوار صدیقی صاحب کی کشکول بہت ہی بیسٹ جارہی ہے اس میں ہم قیدیوں کو بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ ناصر ملک کی مسافر تو بس

مسافر ہی ہوتی جارہی ہے۔ ناصر صاحب اس میں کچھ رنگ ابھاریں۔ باقی کہانیوں میں چالباز، شناسا اجنبی کا مطالعہ کیا دونوں کہانیوں کا اپنا اپنا مزہ تھا بس ایسی کہانیاں سسپنس کی رونق ہیں اور ہمارا جیل میں وقت بھی اچھا گزر جاتا ہے۔ ہمارا دوست عمران حیدر بلوچ جو سزائے موت کا قیدی ہے ہمارے ساتھ سزا کاٹ رہا ہے، دعا کریں کہ اس موذی بیماری سے اللہ پاک اس کو نجات دیں۔ باقی بی بی طاہرہ، حبیب احمد اور ہمارا قیدی بھائی حافظ شاہد عمران جو گوجرانوالہ جیل میں ہے ان کے تبصرے بہت اچھے تھے۔ سارہ کراچی، شاہد عمران، ملک قیصر اعوان اور طاہرہ یاسمین کے اشعار دل کو لگے۔"

✠ **قیصر اعوان**، ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا سے تبصرہ کررہے ہیں "اس ماہ کا شمارہ 20 فروری کو ہی مل گیا۔ جون انکل کا انشائیہ سرسری دیکھا جو کوئی نسخہ کیمیا بتا رہے تھے۔ بہرحال ہمارے ملک کے حالات اللہ رب العزت جانے کب بہتر کرے گا۔ پتا نہیں ہمارے ملک کو کس کی نظر لگی اور ہمارے حکمران کب کوئی ایسا لائحہ عمل اختیار کریں گے کہ ایسا دردناک واقعہ پیش نہ آئے۔ اس دفعہ کرسیِ صدارت پر بہناں سعدیہ بخاری کو براجمان پایا چلیں لڑکیوں کی دلی خواہش بھی پوری ہوئی۔ بھائی قیصر اقبال گجر دعاؤں میں یاد رکھنے کا شکریہ۔ بھیا حبیب احمد (کرک) سالگرہ ایڈوانس میں مبارک، باقی غصہ نہ کریں صحت پر برا اثر ڈالتا ہے۔ بھائی حافظ شاہد عمران سینٹرل جیل گوجرانوالہ اللہ کے کرم سے میں بالکل ٹھیک ہوں اور آپ سب بھائیوں کے لیے بھی دعا گو ہوں اور بھیا عمران حیدر سخت بیمار ہے اس کے گردے خراب ہوگئے ہیں اس لیے کبھی وہ جیل کے اسپتال اور کبھی باہر کے اسپتال میں ہوتا ہے۔ باقی ماریہ فاروق نے ایک تیر سے دو شکار کیسے کرلیے؟ بھائی محمد خواجہ کورنگی کراچی کیا آپ نے سسپنس کی ایڈوانس بکنگ کروائی ہے جو ہر ماہ کی 15 تاریخ کو ہی آپ ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ بھیا رمضان پاشا آپ کی تلاش کہاں تک پہنچی؟ بہناں طاہرہ گلزار آپ نے پوچھا کہ کوئی لڑکی ہمایوں کو بھائی کیوں نہیں بناتی۔ میں بتا تو دوں پر ابھی نہیں ایسا نہ ہو برادر برا منا جائیں؟ اور ہاں سالگرہ ابھی سے ایڈوانس میں مبارک۔ برادر ہمایوں آپ کا تجزیہ دل کو لگتا ہے مگر یہ بھی تو سوچیں کہ بہن بھائی کا رشتہ کتنا عظیم ہوتا ہے۔ برادر حافظ محمد عرفان اللہ رب العزت آپ کے مسائل اور پریشانیوں کو دور فرمائے۔ ہمارے لائق کوئی حکم ہو تو ضرور بتائیں اگر آپ کے لیے کچھ کرسکا تو دلی خوشی ہوگی۔ احمد خان آحیدی صاحب آپ کے بھانجے کا پڑھ کر دلی دکھ ہوا، اللہ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ سید محی الدین اشفاق صاحب! درست فرمایا آپ نے اگر ہم ووٹ کا صحیح استعمال اور اس کے حق دار کا صحیح انتخاب کریں تو بہت کچھ بدل سکتا ہے۔ سب سے پہلے کشکول پڑھی، ڈی ایس پی لودھی کے بعد شیخ حامد کی کوٹھی پر دھماکے اور کنول کے اغوا کے بعد پھر سے شیخ حامد کے زندہ ہونے کا پتا چلتا ہے اسٹوری اچھی راہ پر جارہی ہے۔ مسافر اپنی رفتار سے مسافت طے کررہی ہے۔ میڈم اور شہریار کی مہم جوئیاں ابھی جاری ہیں۔ بہرحال ہیرو ماچھی اور شہریار کی ہینڈ ٹو ہینڈ فائٹ اچھی لگی۔ طاہر جاوید مغل کی نشانہ بھی ایک اچھی اسٹوری تھی، سرفراز سے غلط فہمی میں ہاشم کے شوہر کا قتل ہوا مگر اس کی محبت رنگ لائی۔ باقی کہانیوں میں ایم اے راحت کی قیدِ غمِ حیات اور آخری صفحات پر احمد اقبال کی زندگی نام ہے منفرد کہانیاں ہیں۔ بہناں تصویر العین اور ماہا ایمان کی کمی شدت سے محسوس ہوئی، پلیز جلدی اپنے ہونے کا احساس دلائیں۔"

✠ **ماہا ایمان**، حافظ آباد سے چلی آرہی ہیں "مارچ 2013ء کا سسپنس سرما کی آخری برستی بارش کے دوران 24 تاریخ کو موصول ہوا۔ سرورق کو دائیں بائیں ہر طرف سے جانچ لیا ہے لیکن کچھ بھی خاص نظر نہیں آیا۔ اگر ڈاکٹر انکل تھوڑے بہت گھاس، پودے اور پھول بوٹے سرورق پر بکھیر دیتے تو عدنان یوسف اور جاوید بلوچ کا کچھ بھلا ہو جاتا۔ خیر حلقۂ یاراں میں داخل ہوتے ہیں جہاں لفظوں کی تکرار، طعنوں کی یلغار، شوخیوں کی جھنکار، صنفِ نازک کی دودھاری تلوار اور سابق سرورق کی بیوٹی کوئین کی نگاہوں کا خمار کتنوں کو گھائل کیے ہوئے ہے۔ اداریے میں آپ کے قیمتی الفاظ سے مستفید ہونے کا موقع ملا جہاں بد کے ساتھ ساتھ خوش خبریاں بھی موجود تھیں۔ آج کل سیاسی درجۂ حرارت نقطۂ عروج پر ہے۔ سیاستدانوں کی باسی ہانڈیوں میں عوام کی نام نہاد ہمدردی کے ابال اٹھ رہے ہیں۔ سب سے پہلے سعدیہ بخاری کا شکریہ کہ آپ نے اول آکر حسیناؤں کو مزید شرمندہ ہونے سے بچالیا اور ڈیئر مت کروانتی بم باری کہ مخالفوں پہ چھا جائے لاچاری جس دن ہمایوں سعید کو شرم آگئی تو سمجھ لینا وہ دن اس دنیا میں شرم کا آخری دن ہوگا۔ رمضان پاشا بھائی میاں میں شادی کے لڈوؤں کی بات کررہی تھی۔ محمد جاوید بلوچ واللہ کیا شیطانی دماغ پایا ہے، مفت مشورہ ہے کہ دبی ہوئی چنگاریوں کو ہوا مت دو ورنہ شعلہ بنتے دیر نہیں لگتی مزید یہ کہ اپنی چھوٹی محدود سوچ کی عکاسی بھی ذرا کم کیا کرو۔ طاہرہ گلزار ڈیئر آپ کے لیے دعائے خیر کیا کلمائے خیر بھی ادا کیے جاسکتے ہیں۔ فرمایئے آپ سے رابطہ کیسے ہوسکتا ہے۔ ہمایوں سعید صاحب الحمدللہ میرا گھر محفوظ ترین ٹھکانا ہے میرا۔ میں جو ہوں میرے سب اپنے اور پیارے جانتے ہیں اور کسی کی مجھے پروا نہیں۔ محترم قیصر اقبال گجر آپ کو دماغ کے علاج کی اشد ضرورت ہے جو کہ صحیح بات سے بھی غلط مطلب نکالتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہماری قابلیت اور شبنم فشاں قلم کی چابک دستی نے قدرت اللہ صاحب کو ساڑ کر سواہ کردیا ہے سو وہ یہاں مقابلہ کرنے کے بجائے تحقیق و جستجو میں وقت ضائع کررہے ہیں۔ سارہ اور طاہرہ یاسمین کے بے لاگ تبصرے وقت کی ضرورت تھے۔ ویسے ہمایوں سعید بنوں کے شیر نہیں بنوں کا کھدر مشہور ہے وہ ٹرائی کرنا کبھی...... ظفر علی کیا خوب راز افشا کیا آپ نے بڑی اسپیڈ ہے آپ کی۔ تفسیر عباس تو شکل دکھانے سے بھی گئے۔ ارسل کاظمی فی الحال تو آپ عقل کی سیل سے استفادہ فرمایئے۔ ملک قیصر اعوان صاحب ہم نے تو اپنے حصے کی شمع جلا دی اب آپ کی باری ہے۔ محمد شفیق چغتائی مسافر کے بارے میں آپ کے خیالات سے میں متفق ہوں۔ مجبوں کی دنیا میں رہنے والے بڑے حسین و دلکش ہوا کرتے ہیں فہرست دیکھ کر اندازہ ہوا۔ سب سے پہلے اس ماہ مرزا صاحب سے وکالت کا سبق لیا، ممتاز ہر ایک اچھوتی تحریر تھی۔ عہدِ جدید ہو یا قدیم نیکی اور مفاد پرستی کی دوستی کبھی نہیں رہی کوئی انسانیت کے رشتے نبھاتا ہے اور کوئی دوسروں کی سادگی سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس ماہ مسافر میں کوئی خاص پیش رفت نہیں ہوئی سوائے شہریار کے گاؤں کی گلیوں میں گھومنے کے، اینڈ میں موصوف پھنس گئے۔ کشکول میں مصنف کا زورِ قلم عروج پر ہے کہانی پر گرفت خاصی مضبوط ہے۔ مختصر تحریروں میں مغل صاحب کی تحریر نشانہ کے مدوجزر بہت خوب صورت تھیں۔ مغل صاحب کا شمار صفِ اول کے قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ انسانی معاشرت کے مسائل اور ان کی پیچیدگیوں پر مغل صاحب کی خوب نظر ہے۔ میرے موسٹ فیورٹ کا درجہ پانے والے کاشف زبیر کا انتخاب کم نصیب کے عمدگی سے تانے بانے بنے گئے تھے۔ مسز ڈائل اور مسٹر پبلشر کے ارمانوں پر خوب اوس پڑی یہ جان کر کہ مارلن نے تمام مسودے سردی مٹانے کی سعی کرتے ہوئے جلا ڈالے۔ زندگی کی رعنائیوں سے لمحہ لمحہ کشید کرنے والے بے مقصد محوِ پرواز طائروں کی روداد حیات زندگی نام ہے از احمد اقبال لاجواب تحریر تھی۔ دولت چاہے وقت کی ہو یا زر کی زیادتی ایک خود پسند انسان کو احساسِ برتری کی بیماری میں مبتلا کرکے تنہائی کی اذیت میں دھکیل دیتی ہے۔ یہی اس تحریر کا حاصلِ مطالعہ ٹھہرا۔"

✠ **سعدیہ بخاری**، ضلع اٹک سے محفل میں چلی آرہی ہیں "پیاری یمنیٰ احمد آپ کی محبت اور حوصلہ افزائی کا بہت بہت شکریہ۔ بدلتے موسم کے ساتھ

ہی حکومت کی رخصتی بھی عمل میں آیا ہی چاہتی ہے۔ بہار کی آمد پر جب پھول، رنگ اور خوشبوئیں بھی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ سرورق کی قبول صورت دوشیزہ اداس صورت لیے ماحول کو بھی اداس بنا رہی ہے۔ انشائیہ میں جون ایلیا، علم و دانش میں مسلمانوں کے شاندار ماضی کا ذکر کرتے ہوئے اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ اگر آگے بڑھنا ہے تو علم کو ہتھیار بنانا ہے جہالت کو نہیں۔ ابتدائیہ 23 مارچ یوم پاکستان کے حوالے سے تھا ایک اہم ترین دن جب اس خواب کی بنیاد رکھی گئی۔ باقی الیکشن کی آمد اور ملک سنوارو مہم، سیاستدانوں کی چالاکیوں کو ہم خوب سمجھتے ہیں لیکن اس بار ہم دھوکا کھانے والے نہیں (ارے ہم عوام ہیں...... پھر کیسے دھوکا نہ کھائیں) واہ اس بار صدارت ہمارے حصے میں آئی بہت بہت شکریہ۔ نوید انجم دیکھ لیں خط لیٹ پوسٹ کیا تھا اور پہلے نمبر پر، اب آپ اپنی رائے بدل لیجیے۔ قیصر اقبال آپ کے منہ سے اوہ...... سوری میرا مطلب اونٹ کے منہ سے جھاڑی ہی کی خوشبو کیوں آئے گی اور یہ اپنے پنی بند بھائی قدرت اللہ کی رائے سے پورا پورا اتفاق......؟ طاہرہ یاسمین ڈیئر آپ کی طرح ہمیں بھی اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ سرورق کی حسینہ رو رہی ہے یا نہیں۔ جاوید بلوچ میں بھی آپ کو یہی سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ محض شک کی بنیاد پر آپ نے اتنا بڑا ہوا کھڑا کر دیا۔ طاہرہ گجر اراب تو خوش ہیں نا آپ کا پورا کا پورا خط شامل ہو گیا؟ ہمایوں سعید آپ کی مرادیں نہیں بر آئے گی آپ کے لیے ایک وظیفہ بتا رہی ہوں، صبح و شام اپنے گھر کی چھت پر اونچی آواز سے یہ دعا مانگا کریں۔ زندگی پروانے کی صورت ہو خدایا میری، علم دین کی شمع کو ہو مجھ سے محبت یارب۔ اس پر عمل کریں پھر اثر دیکھیں۔ رمضان پاشا تاریخ ایسے ہی لکھی جاتی ہے جیسے واقعات پیش آئے ہوتے ہیں۔ اب ساجد امجد آپ کی انٹرٹینمنٹ کے لیے تاریخی کہانی کو فلمی کہانی تو بنانے سے رہے۔ مقصود الحسن، قدرت اللہ بھائی کی شادی کی گولڈن جوبلی اینورسری تھی شادی کے بعد سال گرتے نہیں جمع ہو کے پہاڑ بن جاتے ہیں۔ آخر میں محبتوں کے سفیر تفسیر عباس بابر آپ کی غیر موجودگی میں محفل پھیکی پھیکی لگ رہی ہے۔ میٹھا زہر میں دلائل کے ایکسپرٹ مرزا امجد بیگ نے پر اسرار قتل کے کیس میں ایک نہایت باریک اور عام سے نقطے پر اپنی کامیابی کی بنیاد رکھی اور ہمیشہ کی طرح اپنے بے گناہ موکل کو پھانسی کے پھندے سے بچا لے گئے۔ آخری صفحات پر احمد اقبال کا جادو اثر قلم اس بار اپنا جادو نہ دکھا سکا "زندگی نام ہے" ایک تلخ لیکن عام معاشرتی موضوع پر لکھی گئی معمولی دلچسپی کی حامل کہانی تھی۔ کشکول میں سیٹھ حامد کی پُراسرار موت کا معما حل ہو چکا ہے سامنے کی بات ہے بجلی کا پنجرے سے چھلانگ لگانے والوں میں شیخ حامد تھا ہی نہیں۔ کشکول مسافر سے آگے نکلتی دکھائی دے رہی ہے۔ مسافر میں شہریار پر پے در پے پڑنے والی افتاد، اس کا بار بار زخمی ہونا اور بغیر میڈیکل ایڈ کے مسلسل ایکشن میں رہنا کچھ زیادہ ہی مبالغہ آمیزی شامل نہیں کر دی گئی؟ سب سے دلچسپ سین شہریار کا گیٹ اپ تبدیل کر کے شہر سے گاؤں تک کا سفر رہا۔ مغرب سے در آمد کہانیوں میں سب سے بہترین اور دلچسپ ترین رہی۔ "کم نصیب" ایلی ڈائل اور مارلن ڈائل دونوں بھائی ہی کم نصیب ثابت ہوئے۔ سیکنڈ پہ رہی ٹرنک کی چوری، مشہور چور نک ویلوٹ کی اصول پسندی اور واردات کے طریقہ کار کے تو ہم دل سے معترف ہیں۔ مدفن چوری ہی کی ایک اور کوشش پر مشتمل زبردست کہانی تھی۔ قید غم حیات ایم اے راحت کی بڑے نام کے ساتھ عام سی کہانی ثابت ہوئی۔ طاہر جاوید مغل کی نشانہ بھی نشانے پر نہ لگی۔ تاریخی کہانی زیرِ مطالعہ ہے۔ محفل اشعار میں چنیدہ چنیدہ اشعار بہت زبردست تھے۔"

✠ مسٹر ڈب کلاں کی محفل میں آمد ہوئی ہے، فرماتے ہیں "ایک مختصر وقفے کے بعد حاضر محفل ہوں۔ امید ہے کچھ نہیں کہا جائے گا (آپ کا خیال درست ہے) محفل میں شرکت نہ کر سکنے کی کئی وجوہات تھیں جنہیں مجبوریاں قرار دے دیا جائے تو وضاحت کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔ مارچ کا سسپنس ہڑتالوں، دھرنوں اور موسم کی خوش مزاجیوں کی وجہ سے معمول سے لیٹ دستیاب ہوا، تاہم جلدی ختم ہو گیا۔ سسپنس کی تیاری میں حصہ لینے والے قلم کاروں، مراسلہ نگاروں اور دیگر لوگوں کی حوصلہ افزائی کے لیے تبصرے کا قرض تو ادا کرنا ہی چاہیے۔ جھلمل کرتے 6 ستاروں کو دیکھ کر نشان حیدر کا گماں ہوا جو فہرست میں جھلک رہے تھے۔ جون ایلیا قبلہ کو حسب معمول اندھوں کے شہر میں آئینے بیچتے پایا۔ سعدیہ بخاری صاحبہ کو محفل میں دلہن بنے دیکھا، چشم بددور، تاہم ان کے قلم کی لڑکھڑاہٹ کا خوف ان کے حسن کو مزید جگمگا گیا۔ مسافر چونکہ میرے علاقے کی کہانی ہے اس لیے سب سے پہلے پڑھتا ہوں۔ جی کرتا ہے بائیک پر ان تمام جگہوں کا معائنہ کروں جن کا تذکرہ شہریار کرتا ہے لیکن فی الحال اتنی فرصت نہیں مل رہی۔ ہیرو ما بچھی کی جی داری قابل رشک اور موت حسب مزاج رہی اور آخر میں لگتا ہے ہمارا ہیرو اپنی بہن تک پہنچ چکا ہے۔ کشکول کی کہانی شکاری کے دلاور سیٹھ کی طرح لگتی ہے تاہم اس مرتبہ لیاقت حسین کا ایکشن دیکھنے میں نہیں آیا۔ زندگی نام ہے شاہ جی کی زندگی کے اتار چڑھاؤ اور ان کے مزاج کی تبدیلی کے بعد کفارے کے تمام حالات قابل رشک سہی، مگر ہر مجرم کی نہ تو ایسی کایا پلٹ ہوتی ہے اور نہ اتنا موقع مل سکتا ہے کہ اپنا نامہ سیاہ صاف کروا سکیں، پھر عامر کی شاہ جی سے سرراہ چند ملاقاتوں میں عامر نے اس سے تاش کی اتنی مہارتیں کیسے سیکھ لیں؟ جبکہ اس کے اور اس کے مزاج میں ہمیشہ تضاد ہی رہا؟ مدفن مس گیرائی مرتے مرتے بھی چوروں کو سوروالا معاملہ کر گئیں۔ ولی کامل سید نعمت اللہ ولی کے حالات زندگی پر مشتمل تحریر تھی۔ جہاں ان کے تقویٰ کا بیان ہوا وہیں ان کے استاد و مربی کا دنیادار ہونا اور انہیں سمجھ نہ سکنا افسوس ناک محسوس ہوا۔ ٹرنک کی چوری نک ویلوٹ کا حسب روایت دلچسپ کارنامہ رہا جس میں انہوں نے اپنے مزاج کے مطابق خدائی خدمت گاری بھی کر دکھائی۔ شناسا اجنبی الیویا کے ساتھ جارج کا رویہ ٹھیک سہی مگر اس کہانی میں ورق ورق چونکا دینے والی بل کھاتی کوئی بات بہرحال نہ تھی۔ محفل شعر و سخن میں فرحان احمد خان کا انتخاب پسند آیا۔ اول دوم اور سوم اشعار کا انتخاب غالباً قرعہ اندازی کے ذریعے ہوا ہے؟ چالباز واقعی ویڈیو لیری سے آنکھوں میں دھول جھونکنے والی کہانی رہی۔ ویسے ڈارک نمبر میں ہر شخص ہی باون گز کا لگ رہا تھا۔ نشانہ سراسر حالات، ذہن کی محدود رسائی اور قسمت کا شاخسانہ تحریر تھی۔ مرزا امجد بیگ کا میٹھا زہر خوب صورت روداد تھی۔ ایک دو باتیں قدرے مختلف تھیں ایک یہی کہ انہوں نے موکلہ (نفیسہ بیگم) کے حسن و خوب صورتی کا بیان ذرا لیٹ دیا اور دوسرے پوری اسٹوری میں روایتی لفظ رسان استعمال نہیں کیا اور نفیسہ بیگم کی یہ بات بھی بالکل سچ ثابت ہوئی کہ اعجاز صاحب انسان دوستی میں اکثر مشکلات میں پھنستے بھی ہیں اور پھر نکل بھی آتے ہیں۔ مراد نامراد تو بڑا ہی نامراد تھا۔ کم نصیب موریس اور ایلین ڈائل کی ڈریکولا بیوی دونوں کو نگلنے والے مجھلے نے واقعی دل خوش کر دیا۔ دونوں کو ڈائل سے محض اپنے مفادات کی حد تک دلچسپی تھی۔ قید غم حیات ابتدا سے انتہا تک حسرت، یاس، دکھ اور ملال کی کہانی تھی۔ اگر یہ کہوں کہ سسپنس مارچ 2013ء کی سب سے مکمل اور موثر کہانی یہی تھی تو بے جا نہ ہوگا۔ وارث، ہماری تاریخ میں ہماری شرمندگی کے لیے زیادہ اور فخر کے لیے غالباً کم صفحات ہیں۔"

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

مقصود الحسن طاہر پتوکی، قصور۔ ماریہ فاروق، چمن۔ چوہدری احمد خان، راولپنڈی۔ احمد خان توحیدی، الطوارق اسٹیل، کراچی۔ انجم ساحلی، لاہور۔ رانا فیصل جاوید، تحصیل علی پور۔ ارسل کاظمی، آزاد کشمیر۔ مرزا طاہر الدین بیگ، میر پور خاص۔ حبیب احمد، کرک۔

پسِ پردہ

ڈاکٹر ساجد امجد

تاریخ سے ثابت ہوا کہ عہد گزشتہ میں کچھ لوگوں کو حکمرانی کا شوق تھا اور کچھ کو اقتدار کا نشہ ... لہذا ان دونوں عوامل نے الگ الگ انداز میں صفحۂ قرطاس پران کے عہد کو اتارا... اور یہ بھی حقیقت ہے کہ چاہت اقتدار کی ہو یامحبوب کی... کشمکش ہمیشہ کسی نہ کسی شاخسانہ کو جنم دیتی ہے... یہ اور بات کہ حصولیابی کے درمیانی عرصے میں بے شمار واقعات تاریخ کو کئی رخ پر پھیلا دیتے ہیں۔ ماضی کے گوشوں میں ایسا ہی ایک مثلث خیزران... اور مامون وامین کا بھی پوشیدہ ہے... جس پر جب بھی روشنی ڈالی گئی تاریخ نے ایک اور ہی انداز میں اپنے پنکھ پھیلا دیے۔ خیزران کی امورِ سلطنت میں بے جا مداخلت نے مامون وامین کے درمیان ایک ایسی خلیج پیدا کردی جس کا انجام بھائی کے لہو پر ہوا... پس ثابت ہوا، حکمرانی کا شوق ہو یا اقتدار کا نشہ ایسی خونیں داستانیں توان کے تعاقب میں ہمیشہ سرگرداں رہتی ہیں۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

پہلے قصرِ طلائی کی دیواریں سوگ میں ڈوبیں پھر سارے بغداد میں صفِ ماتم بچھ گئی۔

خلیفہ منصور فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے جاتے ہوئے راستے میں انتقال کر گیا تھا۔ علما اور فقہا نے جو راستے میں شریکِ سفر تھے جنازہ اٹھایا اور اسے لے کر مکہ مکرمہ پہنچے۔ وہیں نماز پڑھائی گئی اور اسے سپردِ خاک کر دیا گیا۔

منصور کا وزیر ربیع بن یونس حاضر تھا۔ اس نے بہتر سمجھا کہ خبر کے بغداد پہنچنے سے پیشتر ہی محمد بن منصور، مہدی کے حق میں بیعت لے لی جائے تاکہ کسی ممکنہ بغاوت کا اندیشہ جاتا رہے۔

منصور کی وصیت کے مطابق پہلے مہدی کے حق میں بیعت خلافت لی گئی اور پھر یہ بیعت لی گئی کہ مہدی کے بعد منصور کا بھتیجا عیسیٰ بن موسیٰ تختِ خلافت پر براجمان ہوگا۔ منصور اپنی زندگی ہی میں یہ فیصلہ کر چکا تھا۔

بیعت لینے کے بعد ایک خبر رساں کو مہدی کے پاس روانہ کر دیا کہ وہ اس حادثے کی خبر پہنچا دے اور یہ اطلاع بھی دے دے کہ اسے خلیفہ بنایا گیا ہے اور عیسیٰ بن موسیٰ کو ولی عہدی کے منصب پر فائز کر دیا گیا ہے۔

اس قافلے کو تکمیلِ حج کے بعد عراق واپس آنا تھا۔

خبر رساں نے قصرِ طلائی میں قدم رکھا اور یہ خبر پہنچائی تو سب سے زیادہ دکھ ہارون رشید کو ہوا جس کی عمر اس وقت تیرہ سال تھی۔ منصور اسے بہت چاہتا تھا اور اس کے بارے میں ایسی باتیں کہتا تھا جو اس کی خلافت کی پیش گوئی کی حیثیت رکھتی تھیں۔

منصور کے انتقال کی خبر سن کر "خیزران" کے دل میں جذبۂ مسرت نے سر اٹھایا تھا۔ ان تمام عزائم اور سازشوں کی تکمیل کا وقت آ گیا تھا جو وہ اب تک اپنے ذہن و دل میں تیار کرتی رہی تھی۔

پہلی خوشی تو یہی تھی کہ اس کا شوہر اب خلیفۂ بغداد ہوگا۔ یہی وہ دروازہ تھا جس میں داخل ہو کر وہ اپنے تمام مقاصد پورے کر سکتی تھی۔

مہدی نے اپنی خلافت کی بیعت لینے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کی۔ رصافہ سے کرخ کی طرف فوراً روانہ ہوا جہاں "قصرِ خلد" واقع تھا۔ اس کے روانہ ہوتے ہی خیزران سوچنے بیٹھ گئی کہ پہلے کس منصوبے کو عملی جامہ پہنائے گی۔

مہدی، قصرِ خلد کے بڑے ہال میں داخل ہوا جو اس موقع کے لیے خاص طور پر سجایا گیا تھا۔ سپہ سالار، افسرانِ فوج اور اعیانِ حکومت صف بستہ موجود تھے۔

مہدی اس مجمع سے گزرتا ہوا باپ کے تخت پر جا بیٹھا۔

حاضرین نام بہ نام پکارے جانے لگے۔ جس کا نام پکارا جاتا وہ صف سے باہر نکلتا اور خلیفہ کی دست بوسی کرتا اور بیعت خلافت لیتا۔ ساتھ ہی ساتھ موسیٰ بن عیسیٰ کی ولی عہدی کی بیعت بھی لی جا رہی تھی۔

مہدی وہ خوش قسمت تھا کہ جب خلافت پر متمکن ہوا تو راستے میں کوئی پتھر نہ تھا۔ نہ کوئی شورش تھی نہ بغاوت۔ کسی وقت کے بغیر وہ یہاں تک پہنچ گیا تھا۔ ان آسانیوں نے اس کے مزاج میں نرمی اور شگفتگی پیدا کر دی تھی۔ اس کا نتیجہ تھا کہ اس نے اپنی خلافت کا آغاز جملہ علوی قیدیوں کو پروانہ رہائی عطا کر کے کیا۔

خیزران قصرِ طلائی میں پر سکون تھی اور آنے والے وقت کے لیے منصوبہ سازی کر رہی تھی۔ حکام، عمال اور افسران پر بے دریغ مال لٹا رہی تھی تاکہ آنے والے وقت میں اس کی ہمنوائی کر سکیں۔ منصور کا فولادی پنجہ خاندان سے ہٹ گیا تھا جو معاملات حکومت میں کسی طرح بھی عورتوں کا عمل دخل پسند نہیں کرتا تھا اور خاص طور پر مہدی کی اس کمزوری سے تو بہت نالاں تھا جو اپنی بیوی خیزران کی بات ہر معاملے میں اونچی رکھتا تھا اور جو نہایت کثرت سے شوہر کے اعمال و افعال میں مداخلت کرتی رہتی تھی۔

اب خیزران آزاد تھی۔

اس نے جب چاروں کھونٹ مضبوط کر لیے تو قصرِ طلائی سے قصرِ خلد میں منتقل ہو گئی۔ مہدی پہلے ہی زن مریدی کی زندگی گزار رہا تھا، خیزران نے خاتونِ اول ہوتے ہی اس پر اپنی گرفت مزید مضبوط کر لی۔ مجال نہیں تھی کہ مہدی اس کا حکم ٹال سکتا۔

خیزران کسی اعلیٰ خاندان سے تعلق نہیں رکھتی تھی۔ وہ ایک مملوکہ باندی تھی جسے منصور نے خرید کر مہدی کے حوالے کر دیا تھا۔ خیزران کے آنے سے پہلے مہدی کی شادی اس کی عم زاد ریطہ سے ہو چکی تھی لیکن خیزران کے آنے کے بعد ریطہ اس کی نظروں سے اتر گئی۔ ریطہ کو حسن و جمال سے بہرۂ وافر نہیں ملا تھا۔ اس کے برعکس وہ بھاری جسم والی تھی۔ اعلیٰ خاندان سے تھی اس لیے وہ چھل فریب بھی نہیں جانتی تھی جو عموماً باندیوں کے حصے میں آتے ہیں۔ ریطہ چاہتی تھی لوگ خود اس کی قدر و منزلت کریں۔ وہ ان عورتوں اور ان کے خاندان والوں کو منہ نہیں لگاتی تھی جو اس کے شوہر کی بارگاہ میں دخل رکھتی تھیں۔ اس کے برعکس خیزران کی پرورش جس ماحول میں ہوئی تھی اس کا تقاضا تھا کہ وہ

چھوٹے بڑے سب کی دلجوئی کرتی تھی۔ کسی پر اپنی فوقیت اور بزرگی نہیں جتاتی تھی۔ فیاض بھی تھی لہٰذا سب کی ضرورتیں بھی پوری کرتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے سب کی محبت جیت لی اور ہر زبان پر اس کی تعریف رہنے لگی۔ ریطہ یہ سب کچھ نہیں کر سکتی تھی لہٰذا راستے سے ہٹ گئی۔ خیزران کے لیے میدان خالی ہو گیا۔ اس فتح نے اس کے حوصلے بلند کر دیے۔ وہ شوہر پر حاوی ہو گئی۔ جو چاہتی اس سے منوا لیتی۔

اقتدار میں آتے ہی اسے اپنا خاندان یاد آیا۔ جس وقت منصور نے اسے خریدا تھا تو خیزران نے اسے یہ بتایا تھا کہ وہ دنیا میں اکیلی ہے اور اس کا کوئی نہیں جبکہ اس کے سب تھے۔ وہ بلادِ یمن کی رہنے والی تھی۔ اس کا خاندان ابھی تک وہاں آباد تھا۔ جب تک منصور زندہ تھا وہ یہ حوصلہ نہیں کر سکتی تھی کہ انہیں بلائے لیکن اب مہدی خلیفہ ہو گیا تھا اور وہ خیزران سے جتنا دبتا تھا خیزران کے لیے کچھ مشکل نہیں تھا کہ وہ اپنے خاندان والوں کو بغداد میں آباد کرا دے۔

مہدی تھکا ہارا دربار سے آ کر بیٹھا ہی تھا کہ خیزران نے ذکر چھیڑ دیا۔

"میں یہاں عیش کر رہی ہوں۔ تم خلیفہ بنے پھرتے ہو اور میرے ماں باپ، بھائی بہن یمن میں فاقے کر رہے ہیں۔ تف ہے تمہاری خلافت پر۔"

"تمہارے خاندان والے؟ کیا بات کر رہی ہو؟ تم تو یہ کہتی رہی ہو کہ تمہارا کوئی نہیں۔"

"میں جو بھی کہتی رہی ہوں مگر جواب کہہ رہی ہوں وہ سنو اور اس پر عمل کرو۔"

"بغداد صرف میرا نہیں، میں اپنے امرا سے مشورہ کروں گا۔"

"کیا ضرورت ہے مشورہ کرنے کی۔ تم میری خواہش کا احترام کرنا سیکھو۔"

"میں انکار تو نہیں کر رہا ہوں۔"

"میں تو جب سے تمہارے گھر میں آئی ہوں ایک لمحہ خوشی کا نہیں دیکھا۔ خاکروب کہیں کے۔" اس نے کہا اور روتے ہوئے اس کی قبا سے لٹک گئی۔

مہدی نے بڑے پیار سے اسے الگ کیا اور خواب گاہ سے نکل گیا۔ ظاہر ہے وہ اس وقت غصے میں تھا۔ وہ کہتا تو کس سے کہتا خود ہی سے کہنے لگا، بتاؤ تو مجھے خاکروب کہتی ہے۔ میں خاکروب ہوں اور یہ۔ اسے تو خود خریدا گیا تھا۔ نہ جانے اس کے ماں باپ کون ہوں، کیسے ہوں۔ کچھ دیر غلام گردش میں ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا۔ بغداد کی اتنی آبادی ہے اگر چند نفوس اور آ جائیں تو کیا حرج ہے۔ خیزران کا حسین چہرہ نظروں کے سامنے گھوم گیا۔

کمرے میں واپس آیا تو اس کا غصہ اتر چکا تھا۔ خیزران ابھی تک منہ پھلائے بیٹھی تھی۔

"کہاں ہیں تمہارے خاندان والے۔ میں بلاؤں بھی تو کہاں سے بلاؤں؟"

"چھوڑیں کیا کریں گے بلا کر۔ کیا خبر مر کھپ ہی گئے ہوں۔ میں نے تو ایک بات یوں ہی کہہ دی تھی۔"

"تم خفا مت ہوا کرو۔ میں تمہاری یہ خواہش بھی پوری کر دوں گا مگر کچھ بتاؤ تو سہی۔"

"یمن ہی میں تھے۔ اب کا مجھے کیا پتا۔ پتا ہوتا تو خود جا کر نہ بلا لاتی آپ سے کیوں کہتی۔"

"اچھا اچھا۔ میں ہی کچھ کرتا ہوں۔"

"ایک بات اور آپ کو بتانی تھی۔"

"وہ بھی بتا دو۔"

"کل ایک عورت میرے پاس آئی تھی۔ غربت کے لباس میں لپٹی ہوئی۔ پریشان حال۔ میں تو اسے پہچانتی بھی نہیں تھی میرے پاس جو ہاشمی خواتین بیٹھی تھیں۔ انہوں نے پہچان کر مجھے بتایا کہ یہ عورت مزنہ ہے آخری اموی خلیفہ مروان بن محمد کی بیوی۔ یہ خواتین اس کو برا بھلا کہنے لگیں اور اسے نکل جانے کو کہا۔ مجھ سے اس کا یہ حال دیکھا نہیں گیا۔ میں نے کنیزوں سے کہہ کر اس کے لیے ایک کمرا آراستہ کیا اور اسے وہاں ٹھہرا دیا۔ میں نے آپ کی اجازت کے بغیر یہ کام کیا ہے۔"

"خیزران، تمہاری انہی خوبیوں نے تو مجھے خرید لیا ہے۔ اگر تم اسے نہ ٹھہراتیں تو میں تم سے کبھی بات نہ کرتا۔"

"بات تو خیر پھر بھی تم کرتے۔" خیزران نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔

"خیال رکھنا وہ عورت ہمیشہ یہاں رہے۔ اموی ہمارے دشمن ہیں لیکن مروت کا تقاضا وہی تھا جو تم نے کیا۔"

مہدی نے وعدہ کر لیا تھا لہٰذا اس کی تکمیل کے لیے اس نے حاکمِ یمن کے نام خط لکھا کہ وہ خاندانِ خیزران کے افراد کو تلاش کر کے بغداد بھیج دے۔ حاکمِ یمن نے ان لوگوں کی تلاش شروع کر دی۔ ایک مقام پر ان کا سراغ لگا۔ یہ خاندان نہایت عسرت کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ خیزران کا بھائی انگور کے ایک باغ میں رکھوالی کا کام کر رہا تھا۔ یہ گھرانا اس کی معمولی آمدنی سے زندگی کے دن بسر کر رہا

تھا۔ حاکم یمن کے سپاہی سراغ لگاتے ہوئے اس کے پاس پہنچ گئے۔ اس رکھوالے کا نام عطریف تھا۔

''تم کسی خیزران نام کی لڑکی کو جانتے ہو؟'' سپاہیوں نے پوچھا۔

''آپ لوگ کس خیزران کی بات کررہے ہیں؟''

''جس کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ تمہاری بہن ہے۔''

''اگر اس نے ایسا ویسا کوئی کام کیا ہے تو ہم اسے نہیں جانتے۔''

''جانتے بھی ہو وہ خلیفۂ بغداد کی بیوی بن گئی ہے۔''

''اگر ایسا ہے تو وہ ہماری بہن ہے جسے غربت کے ہاتھوں مجبور ہوکر ہم نے بیچ ڈالا تھا۔ اب وہ یقیناً ہم سے بدلہ لینے کے لیے ہمیں ڈھونڈ رہی ہوگی۔''

''بدلہ لینے کے لیے نہیں تمہیں اپنے پاس ٹھہرانے کے لیے بغداد بلا رہی ہے۔''

''اگر یہ فریب نہیں ہے تو ہم لوگ بغداد جانے کے لیے تیار ہیں۔''

''تمہارے ساتھ اور کون کون ہے؟''

''میری ماں، نانی اور دو بہنیں ہیں سلسل اور اسماء''

''کل ہم پھر آئیں گے۔ تم سب کو تیار رکھنا۔''

اس کارواں کی روانگی کی اطلاع مہدی کو کردی گئی تھی۔ خیزران نے ان کے لیے ''مدینۃ السلام'' میں ایک شاندار محل ان لوگوں کے لیے مخصوص کردیا اور ان کے استقبال کے لیے تیاریاں کرنے لگی۔

یہ لوگ اس حویلی میں اترے تو خیزران نے اپنے دونوں بیٹوں موسیٰ اور ہارون کے ساتھ استقبال کیا۔ خیزران کی ماں کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ محل کی ایک ایک چیز کو ندیدوں کی طرح دیکھ رہی تھی۔ یہاں وہ چیزیں تھیں جن کا استعمال بھی اسے نہیں آتا تھا۔ اتنے دن بعد بیٹی کی شکل دیکھنے کو ملی تھی لیکن بیٹی سے ملنے کے بجائے پورے محل میں دوڑتی پھر رہی تھی۔ یہی حال دوسری خواتین کا بھی تھا۔

''خیزران، جیسی تیری قسمت کھلی ہے اپنی بہنوں کے لیے بھی ایسے ہی رشتے تلاش کر۔''

''دیکھتی جاؤ اماں، میں کرتی کیا ہوں۔''

ان لوگوں کے آجانے سے گھریلو سیاست میں خیزران کے ہاتھ اور بھی مضبوط ہوگئے۔ اس کے علاوہ خالد برمکی اور یحییٰ بن خالد کے خاندان سے اس کے جو مراسم تھے وہ اس کے ہر عزم کی تکمیل کے لیے کافی تھے۔

خیزران کو یہ گوارا نہیں تھا کہ مہدی کی وفات کے بعد اس کا چچازاد بھائی عیسیٰ بن موسیٰ تخت پر بیٹھے جبکہ اس کے اپنے دو بیٹے تھے موسیٰ اور ہارون۔ یہ ابھی چھوٹے تھے لیکن کبھی تو انہیں بڑا ہونا تھا۔ عیسیٰ بن موسیٰ کو ولی عہد مقرر کردیا گیا تھا۔ مہدی کی بیعت کے ساتھ ہی اس سے بھی بیعت لی گئی تھی۔ اب اسے کوئی ایسی چال چلنی تھی کہ عیسیٰ بن موسیٰ کا کانٹا درمیان سے ہٹ جائے۔ عیسیٰ بن موسیٰ کو ولی عہدی سے محروم کردیا جائے اور اس کے بجائے اپنے بیٹے کو یہ منصب دیا جائے۔

خیزران نہایت ذہین اور دور اندیش خاتون تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ جو مہرے چلتی تھی اپنے وقت پر اور نہایت احتیاط کے ساتھ چلتی تھی۔ رکاوٹ صرف یہ تھی کہ اس کے دونوں بیٹے ابھی بالغ نہیں ہوئے تھے لیکن وہ فیصلہ کرچکی تھی کہ جس طرح بھی ہو اس کشتی کو پار لگائے گی۔ سب سے پہلے تو مہدی کو آمادہ کرنا تھا۔ وہ اس کی مٹھی میں تھا لیکن پھر بھی بات تو کرنی تھی اور جب اس نے مہدی کے کان میں یہ بات ڈالی تو وہ یوں اچھل گیا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

''خیزران، تمہیں معلوم بھی ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ ابا حضور کے زمانے میں بھی عیسیٰ بن موسیٰ کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ خاموش ہوگیا تھا مگر اب حالات دوسرے ہیں۔ تمام امرا کے سامنے اسے ولی عہد مقرر کیا گیا ہے۔ اس کے گواہ موجود ہیں۔ سلطنت میں بدنظمی ہوجائے گی۔''

''خالد برمکی اور یحییٰ بن خالد جیسے جنگجو میرے ساتھ ہیں۔''

''ہمارے بچے ابھی سن رشد کو بھی نہیں پہنچے ہیں۔''

''آپ نیت تو کریں۔ آغاز تو کریں۔ کیا خبر اس میں کتنا وقت لگ جائے۔''

وہ کئی دن برابر مہدی کو رضامند کرنے کے جتن کرتی رہی۔ اس عورت کا اس پر اتنا اثر تھا کہ بالآخر وہ اسے شیشے میں اتارنے میں کامیاب ہوگئی۔

مہدی نے فیصلہ کرلیا کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوجائے ہر قیمت پر ولی عہدی کا مسئلہ خیزران کی مرضی کے مطابق طے کرے گا۔

ہاں میں ہاں ملانے والے رجال دولت بہت سے تھے۔ انہوں نے بھی مہدی کو باور کرادیا کہ اگر کہیں موسیٰ (مہدی کا بڑا بیٹا) کے سن رشد تک پہنچنے سے پہلے مہدی کا انتقال ہوگیا تو پھر خلافت اس گھرانے سے نکل جائے گی۔

اندر ہی اندر کھچڑی پکنے لگی۔ سرگوشیوں میں باتیں

ہونے لگیں۔ ایسی باتیں کہیں چھپتی ہیں۔ عیسیٰ بن موسیٰ کے کان میں بھی ان باتوں کی بھنک پڑ گئی۔ جو چیز اسے منصور کے ہاتھوں ملی تھی مہدی کے ہاتھوں چھن جائے۔ یہ اسے گوارا نہ ہوا۔ اس نے بھی ہاتھ پاؤں مارنا شروع کردیے۔ اس نے اپنے حمایتیوں اور مددگاروں کو جمع کرنا شروع کردیا۔

مہدی نے یہی بہتر سمجھا کہ عیسیٰ کی مکمل تیاری سے پہلے ہی اپنے ارادے کا کھلے بندوں اعلان کردے تاکہ ردعمل کا اندازہ ہوجائے۔ اس نے عیسیٰ کو خط لکھا کہ وہ اس کے بیٹے کے حق میں ولی عہدی سے دستبرداری کا اعلان کردے۔ ظاہر ہے وہ یہ بات کیوں ماننے لگا تھا۔ اس نے بھی وضاحت سے لکھ بھیجا۔

''جو چیز مجھے امیرالمومنین ابوجعفر منصور سے ملی تھی وہ آپ کو نہیں لوٹا سکتا۔ آپ سخت غلطی پر ہیں۔ آپ کے اس اقدام سے فتنہ وفساد پھیلے گا۔ آپ اس امر پر مجھے مجبور نہ کریں۔''

اس جواب نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ مہدی نے اس کو نہایت سخت جواب دیا۔ ''اگر تم نے میری بات نہ مانی اور ولی عہدی سے دستبردار نہ ہوئے کہ میں موسیٰ کی ولی عہدی پر بیعت لے سکوں تو یاد رکھو کہ تمہارے ساتھ وہی سلوک ہوگا جو مجرموں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے اور اگر تم نے میری بات مان لی تو پھر میں تمہیں بڑا اچھا معاوضہ دوں گا اور مالا مال کردوں گا۔''

اس نے اس دھمکی کی بھی پروا نہ کی۔ مہدی نے اسے بغداد حاضر ہونے کا حکم دیا۔

''تم بغداد آکر مجھ سے ملو۔ ممکن ہے درمیان کی کوئی راہ نکل آئے۔''

عیسیٰ بن موسیٰ کی عمر ساٹھ سال سے تجاوز کرچکی تھی۔ بہ ظاہر اس کا امکان نہیں تھا کہ مہدی کے مرنے تک وہ زندہ رہے گا۔ کوئی حادثہ پیش آجاتا تو الگ بات تھی۔ اس لیے اس نے یہی بہتر سمجھا کہ جنگ وجدل کی نوبت آنے سے پہلے وہ بغداد جاکر خلیفہ سے مل لے۔ وہ خراساں سے بغداد چلا آیا اور مہدی سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کی ولی عہدی کا معاملہ فقہا کے سامنے رکھیں۔ اگر وہ یہ فتویٰ دے دیتے ہیں کہ میں مسلمانوں کی یہ امانت تمہیں واپس دے سکتا ہوں تو میں دست بردار ہوجاؤں گا۔

خیزران کی شخصیت قصرِ خلافت کے تمام داخلی امور پر حاوی تھی اور ہر چیز پر غالب تھی۔ مہدی کے عزم وارادے پر بھی اسی کا تسلط تھا۔

وہ معاملے کو یہاں تک لے آئی تھی لیکن اب مہدی ڈر رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ مفتیانِ کرام کیا فیصلہ دیتے ہیں۔ اگر فیصلہ عیسیٰ کے حق میں ہوجاتا تو وہ اسے بدل نہیں سکتا تھا اور اگر فیصلہ اس کے خلاف جاتا تو عباسیوں کی مخالفت ضروری تھی جو عیسیٰ کو مہدی کے بیٹوں سے بہتر جانتے تھے۔ صغیر سنی کی وجہ سے ان کا کوئی کارنامہ دنیا کے سامنے نہیں آیا تھا۔ منصور نے بھی اپنے بیٹے مہدی کے حق میں بھی عیسیٰ کو دست بردار کرالیا تھا لیکن وہ منصور تھا۔ اٹھنے والی مخالفت کی آندھی کا رخ موڑ سکتا تھا۔ مہدی خود کو کمزور محسوس کررہا تھا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر خیزران سے بات کی۔

''خیزران، تم امور سلطنت سے واقف نہیں۔ مجھے ایسا قدم اٹھانے پر مجبور نہ کرو جو فساد کا سبب بنے۔''

''اب کون سی نئی بات ہوگئی جو تم پیچھے ہٹ رہے ہو۔''

''عیسیٰ نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ فقہا سے فتویٰ لے کر دیکھ لیا جائے۔ اگر فتویٰ اس کے حق میں گیا تو میں کچھ نہیں کرسکوں گا۔''

''امیرالمومنین! جہاں تلوار کام نہیں آتی وہاں دماغ کام کر دکھاتا ہے۔ میں وہ چال چلوں گی کہ فتویٰ آپ کے حق میں آئے گا۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''آپ دیکھتے جائیں۔''

خیزران نے ایک بہت بڑی دعوت کا اہتمام کیا۔ اس دعوت میں دوسرے اکابرین کے ساتھ ساتھ چند ایسے علما وفقہا کو بھی مدعو کیا جن کے بارے میں اس نے معلومات حاصل کرلی تھیں کہ وہ اس کی پیشکش کو قبول کرسکتے ہیں۔ مقصود صرف فقہا کو بلانا تھا۔ دوسرے لوگوں کو تو محض اس لیے بلایا تھا کہ یہ شک نہ ہو کہ صرف فقہا کو کیوں بلایا گیا ہے۔

عمال حکومت خیزران کی دریا دلی اور فیاضی کے معترف تھے۔ مہدی اور عمال حکومت کے درمیان وہ وسیلہ بنی ہوئی تھی۔ انہیں جو کام مہدی سے کروانا ہوتے تھے وہ خیزران کے ذریعے ہی نکل سکتے تھے لہٰذا اس کی دعوت کو کوئی بھی نہیں ٹھکرا سکتا تھا۔ ہر شخص اس کی نظروں میں اچھا بننا چاہتا تھا۔ اس کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے سب حاضر ہوگئے۔ فقہا میں سے کوئی نہیں تھا جو نہ آیا ہو۔

خیزران نے اس دعوت کا ایسا اہتمام کیا تھا کہ مدتوں لوگ اس کی مثال دیا کرتے تھے۔

جب دعوت اختتام کو پہنچی تو اس نے فقہا کو اپنے حضور

طلب کیا۔ پہلے ان سے ان کی ضروریات پوچھیں اور انہیں پورا کرنے کا وعدہ کیا اور پھر ولی عہدی کا مسئلہ ان کے سامنے رکھ دیا۔

ان میں سے بہت کم تھے جنہوں نے اس کے تخاطب کو ناپسند کیا۔ باقی سب نے خوف یا لالچ سے اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور وعدہ کرلیا کہ عیسیٰ کی دست برداری کے لیے کوشاں رہیں گے۔

خیزران اپنے عہد کی سب سے مالدار عورت تھی۔ جواہرات، زیورات، سیم وزر، جائداد، جاگیر کون سی چیز تھی جو اس کے پاس نہیں تھی۔ غربت کا زمانہ دیکھا تھا اس لیے دولت کی قدر کرنا جانتی تھی لیکن خاص مواقع پر وہ جس فیاضی کا مظاہرہ کرتی تھی وہ بھی دیدنی تھا۔

اس دعوت میں بھی اس نے مٹھیاں بھر بھر کر لٹایا۔

اس کی دولت اور تعلقات نے اثر دکھایا۔ بعض فقہا نے فتویٰ دے دیا کہ عیسیٰ بن موسیٰ ولی عہدی کی امانت مہدی کو واپس لوٹا سکتا ہے۔ اس میں شریعت مانع نہیں بلکہ اس سے تو فتنوں کا منہ بند ہوگا۔

یہ فتویٰ آتے ہی مدینتہ السلام کی مسجد میں مہدی نے بغداد کے اکابر وامرا کو طلب کیا تاکہ ان سے بیعت لی جائے۔ اس اجتماع میں مہدی کے بڑے بیٹے موسیٰ کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت لی گئی اور اس کا لقب ''ہادی'' قرار پایا۔

اس تقریب میں ہارون بھی شریک تھا اور اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

خیزران پر تو جیسے شادی مرگ طاری ہوگئی تھی۔ یہ خبر ہی ایسی تھی۔ ایک طرف اس کا بیٹا ولی عہد بن گیا تھا دوسری طرف اپنی سوکن، مہدی کی پہلی بیوی ریطہ سے اس نے بھرپور انتقام لے لیا تھا۔ بیٹا تو ریطہ کا بھی تھا جس کا نام علی بن ریطہ تھا۔ اپنی خاندانی بیوی کے بیٹے کو چھوڑ کر مہدی نے خیزران کے بیٹے موسیٰ کو ولی عہد مقرر کیا تھا اور ہادی کے لقب سے نوازا تھا۔ اس کے مرتبے میں اچانک ایسا اضافہ ہوگیا تھا کہ علی بن ریطہ اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔

ریطہ نے اس چوٹ کو محسوس تو کیا تھا لیکن یہ سوچ کر اس نے صبر کرلیا تھا کہ مہدی کے بعد موسیٰ کی بادشاہت میں بھی اسی کی ناموری ہے۔ اقتدار اس کے گھر ہی میں رہے گا۔ ایک شکست خوردہ عورت اور کیا سوچ سکتی ہے البتہ اس کا دکھ وہ کبھی فراموش نہ کرسکی کہ موسیٰ کی ماں ہونے کی حیثیت سے اقتدار کے ایوانوں میں جو مرتبہ خیزران کو حاصل رہے گا ریطہ اس سے محروم ہی رہے گی۔

مہدی کی نوازشوں کی اسے پروا نہیں تھی۔ وہ تو پہلے بھی اسے حاصل نہیں تھیں۔

جس طرح خوشی اور رنج کا موسم گھر میں ساتھ ساتھ چل رہا تھا اسی طرح بغداد کی گلیوں میں بھی یہ چرچے دھوپ چھاؤں کا منظر پیش کررہے تھے۔

یہ پہلا موقع تھا جب جبر سے کام لے کر ولی عہدی چھینی گئی تھی۔ ایک کا حق دوسرے کو دیا گیا تھا جبکہ موسیٰ کی عمر ابھی بہ مشکل سولہ سال ہوئی تھی۔ اس نے کوئی کارنامہ بھی سرانجام نہیں دیا تھا۔ عوام اس کی صلاحیتوں سے واقف نہیں تھے۔ پھر یہ سب کو معلوم تھا کہ موسیٰ کی ماں کو بازار سے خریدا گیا تھا۔ وہ ایک جاریہ (باندی) تھی اور موسیٰ کی پیدائش کے ایک سال بعد مہدی نے اس سے شادی کی تھی۔ ہارون رشید شادی کے بعد پیدا ہوا تھا اس لیے اس کا تو کوئی مقام تھا بھی لیکن موسیٰ! یہ باتیں ابھی ہو رہی تھیں کہ مہدی نے بیعت توڑنے کی ہم ڈال دی ہے جو ایک خطرناک اقدام ہے۔

یہ چرچے گلیوں، بازاروں تک محدود نہیں رہے۔ امرا کے محلات میں کچھ اور ہی باتیں ہو رہی تھیں۔ ان میں ناراضی نہیں بلکہ برہمی تھی۔ شاید وہ اندیشے درست ثابت ہو رہے تھے جس کا اظہار مہدی پہلے ہی کرچکا تھا اور خیزران کو باور کرایا تھا کہ اس اقدام سے فساد پھیلے گا۔ ان برہم ہونے والوں میں خاندان بنو ہاشم پیش پیش تھا۔ یہ لوگ اپنے آپ کو خود مہدی کے مقابلے میں خلافت کا زیادہ سزاوار سمجھتے تھے۔ پھر یہ کیسے برداشت کرلیتے کہ ولی عہدی کا منصب بھی اسی خاندان میں رہے اور وہ بھی ایک طفل صغیر کے حق میں۔

بنو ہاشم کے ایک گھر میں چند افراد جمع تھے اور موسیٰ کی بیعت موضوع بحث بنی ہوئی تھی۔ سب کے سب سخت غصے میں تھے۔ یہ سب کے سب ان شجاع افراد کے پوتے اور نواسے تھے جنہوں نے امویوں کا زور توڑ کر عباسی پرچم کو سربلند کیا تھا اور اس وقت انہی کارناموں اور حالات کے نشیب وفراز کا ذکر کرکے دل کا بخار اتار رہے تھے۔

''محمد بن علی بن عبداللہ اس لیے میدان میں نہیں آئے تھے کہ حکومت ان کے خاندان اور ان کے بیٹوں میں منتقل ہوتی رہے بلکہ ان کا مقصد تو یہ تھا کہ بنو عباس میں جو شخص سب سے زیادہ موزوں اور مناسب ہو اسے منصب پر فائز کردیا جائے۔ بنو عباس کو یہ اعزاز بھی صرف اسی لیے دیا گیا تھا کہ بنو امیہ کے خلاف یہ لوگ اسی جذبے کے تحت شریک ہوئے تھے۔ اس لیے نہیں کہ سلطنت ان کے خاندان میں تقسیم ہوتی رہے۔''

''ہمارے بڑوں کی بھی غلطی ہے کہ عباسی خلافت قائم کی اور عبداللہ بن محمد کو خلافت پر متمکن کیا جو اتنا ظالم تھا کہ اس کا لقب ہی (سفاح) پڑ گیا تھا۔'' وہاں بیٹھے ہوئے ایک دوسرے شخص نے کہا۔

''میرے بھائی اس وقت لوگ اس لیے خاموش ہوگئے تھے کہ حکومت کی جڑیں مضبوط نہیں ہوئی تھیں لیکن جب سفاح نے حکومت اپنے بھائی ابو جعفر منصور کی طرف منتقل کردی تو ہنگامہ ہوا تھا۔''

''آپ اسی ہنگامے کی بات کررہے ہیں جس میں بغاوت ہوئی تھی۔ عبداللہ بن عباسی جس کے بانی تھے۔ جن کے پوتے اس وقت بھی یہاں موجود ہیں۔''

''جی ہاں۔ منصور نے انہیں قتل کرادیا تھا۔''

''یہ بغاوت اس وقت بھی فرو نہیں ہوئی تھی، دب ضرور گئی تھی اور وہ بھی اس لیے کہ حکومت منصور کے فولادی پنجے میں تھی۔ کسی کو سر اٹھانے کی جرأت نہیں تھی۔ یہ آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ منصور نے بیس سال تک خلافت کی، مخالفت کی آگ تقریباً سرد پڑ گئی۔ ممکن ہے یہ چنگاریاں بھی سرد پڑ جاتیں لیکن اس نے خلافت اپنے بیٹے کے ہاتھ میں دے دی جبکہ عیسیٰ بن موسیٰ اس کے زیادہ مستحق تھے۔''

''اب تو موقع تھا۔ خلافت مہدی جیسے کمزور کے ہاتھ آگئی تھی لیکن عیسیٰ بن موسیٰ اس کا مقابلہ بھی نہ کرسکے مال و دولت لے کر کوفہ جاکر گوشہ نشین ہوگئے۔ بلکہ میں نے تو دو شعر بھی ان کے لیے کہہ رکھے ہیں۔

ابوموسیٰ نے موت کو ناگوار جانا حالانکہ اس کی موت باعث شرف وکرم تھی۔

اس نے جامۂ سلطنت اتار دیا جو ابھی پرانا نہیں ہوا تھا۔

اور اس نے پہنا کیا۔

جامۂ ملامت۔''

''سوال یہ ہے کہ ہمیں اب کیا کرنا چاہیے۔ اگر تلواریں مہدی کا علاج کرسکتی ہیں تو تلواریں سہی۔''

''میرے بچو، یہ نادانی مت کرو۔'' ایک بزرگ نے دخل دیا۔ ''پہلے ہم رائے عامہ کو ہموار کریں گے۔ میں کئی عباسی امیدواران خلافت کو جانتا ہوں جنہیں یہ امر ناگوار گزرا ہے۔ وہ خاموش ضرور ہوگئے ہیں لیکن چنگاریاں ان کے دلوں میں بھڑک رہی ہیں۔ انہیں بھڑکاتے رہو اور شعلہ بننے کا انتظار کرو۔''

''مجھے تو یہ تک معلوم ہے کہ فوج کے بعض افسران نے مہدی کے اقدام کی مخالفت کی تھی لیکن جب عیسیٰ بن موسیٰ خود ہی دست بردار ہوگیا تو انہوں نے بھی ہادی کی ولی عہدی پر بیعت کرلی۔''

''اس کا مطلب ہے کہ اگر ہم کوئی تحریک لے کر چلیں گے تو ان فوجی افسران کو شامل ہوتے دیر نہیں لگے گی۔''

سب نے عہد کیا کہ وہ آج سے اس مہم کا آغاز کردیں گے۔

دوسری طرف مہدی اور اس کے گھرانے کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ ان سازشوں سے بے خبر خوش تھے کہ نہایت سکون اور خاموشی سے خلافت کا قضیہ طے ہوگیا۔

مہدی نے بھی شکر خداوندی ادا کرنے کے لیے حج کا ارادہ کیا۔ بغداد سے مکہ مکرمہ تک نہریں اور تالاب کھودے جانے لگے تاکہ سفر میں گرمی کی شدت کو کم کیا جاسکے۔ اپنا نائب ہادی کو مقرر کرکے بغداد میں چھوڑا۔ ایک مجلس قائم کردی جس کا کام یہ تھا کہ حسب ضرورت حکومت کو چلائے اور ہادی کو مشورے دیتے رہیں۔

اس سفر میں ہارون رشید بھی اس کے ہمراہ تھا۔

مہدی اس سفر سے واپس آیا تو ابتری کے حالات دیکھے۔ باتدبیر مجلس مشاورت نے حالات کو بگڑنے نہیں دیا تھا لیکن کئی علاقوں میں بغاوت کے آثار تھے۔ مہدی نے حالات کی درستی کے لیے خالد برمکی اور اس کے بیٹے یحییٰ کو اپنے حضور طلب کرلیا، خالد برمکی اس وقت موصل کا والی تھا اور یحییٰ کے پاس آذربائیجان کی گورنری تھی۔

یحییٰ کا مہدی کے خاندان اور خصوصاً خیزران اور ہارون سے گہرا تعلق اس طرح تھا کہ ہارون کی پیدائش کے وقت خیزران کسی وجہ سے اپنا دودھ اسے نہیں پلا سکی تھی تو یحییٰ کی بیویوں میں سے دو نے اسے دودھ پلایا تھا۔ اب جو یہ خاندان بغداد میں آیا تو برمکی خواتین اور خیزران کے مابین دوستی اور خلوص کا رشتہ دوبارہ بحال ہوگیا۔

خیزران کی سفارش پر مہدی نے یحییٰ کو اپنے بیٹے ہارون کا وزیر اور پرچہ نویس اور اس کی جاگیر کا منتظم بنادیا۔ یحییٰ فہم وفراست اور تدبیر میں یکتا تھا۔ گفتگو کا ماہر اور تلوار کا دھنی تھا۔

کسی کو نہیں معلوم تھا کہ تاریخ آئندہ چل کر یحییٰ سے کیا کام لینے والی ہے۔

❁❁❁

ہارون کی تربیت یحییٰ برمکی کررہا تھا اور موسیٰ کے ساتھ مہدی نے وہی طرز اختیار کیا جو اس کے باپ منصور نے

اسے ولی عہد بنانے کے بعد روا رکھا تھا یعنی یہ کہ ولی عہد کو سلطنت کی ذمے داریاں سونپی جائیں تاکہ کامیابی اور ناکامی ہر دو صورتوں میں وہ تجربے کی راہ سے گزرے۔ رجال دولت کا قرب بھی اسے حاصل رہے۔

وہ نئے ولی عہد کو تربیت کی منزلوں سے گزار رہا تھا لیکن ایک خفیہ ہاتھ ایسا بھی تھا جو پس پردہ ایک نیا کھیل شروع کرنے والا تھا۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ یہ خبر سماعتوں کے دروازے کھٹ کھٹانے لگی کہ خلیفہ مہدی ملک روم پر چڑھائی کرنے والا ہے۔

یہ خبر افواہوں تک محدود رہتی لیکن جب خلیفہ نے خراسان، شام اور شمالی عراق میں فرامین بھیجے کہ جلد از جلد سپاہیوں اور افسروں کی جتنی تعداد مہیا ہو سکے مرکز خلافت میں روانہ کردی جائے اور ان فرامین کے جواب میں لشکر کے لشکر آنے اور بیرون بغداد پڑاؤ کرنے لگے تو ان افواہوں میں جان پڑ گئی۔ سب کو یقین آگیا کہ یہ خبر نہیں واقعہ ہے۔

اس خبر پر یقین آنے کے بعد یہ چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں کہ اس لشکر جرار کی قیادت کون کرے گا؟ یقیناً یہ عہدہ ولی عہد موسیٰ ہادی کو دیا جائے گا جس نے ابھی تک میدان جنگ میں قدم نہیں رکھا۔ ضروری ہے کہ یہ تجربہ بھی اسے حاصل ہو جائے۔

پالکی تیار تھی۔ دو کنیزیں خیزران کے ساتھ تھیں۔ یہ ایسی باوفا تھیں کہ سینے میں خنجر اتارو تو بھی خیزران کا راز کسی پر ظاہر نہ کریں۔ پالکی کے ساتھ چلنے والوں کے سوا کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ یحییٰ بن خالد کے دولت کدے کی طرف روانہ ہو رہی ہے۔ یحییٰ کے گھر جانا کوئی ایسی بات نہیں تھی جسے چھپایا جاتا لیکن اس وقت وہ جس مہم پر جا رہی تھی اس کا تقاضا یہی تھا کہ احتیاط سے کام لیا جائے یا اس کے دل کا چور تھا جو اسے ضرورت سے زیادہ محتاط رہنے پر مجبور کر رہا تھا۔

پالکی کا رخ باب الشام کی طرف ہوا تو پالکی میں سوار کنیزوں نے اپنے دوپٹے درست کیے اور سنبھل کر بیٹھ گئیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یحییٰ بن خالد کا محل بس قریب ہی ہے۔

یحییٰ کو شاید پہلے ہی خبر کر دی گئی تھی کہ مہمان آنے والے ہیں۔ انہیں ہرگز نہ روکا جائے۔ پہرے داروں میں سے کسی کو معلوم نہیں تھا کہ پالکی میں کون سوار ہے لیکن حکم یہی تھا کہ دروازے کھول دیے جائیں۔ کسی روک ٹوک کے بغیر پالکیاں اندر پہنچ گئیں۔ یحییٰ بذات خود اور اس کی تینوں بیویاں استقبال کے لیے موجود تھیں۔

کنیزوں کو مشرقی ایوان کی طرف بھیج دیا گیا۔ خیزران کو یحییٰ کی بیویاں مغربی ایوان کی طرف لے گئیں جہاں ایک کشادہ ہال تھا۔ جب تمام خواتین بیٹھ چکیں تو یحییٰ نے اپنا تجسس دور کرنے کے لیے گفتگو کا آغاز کیا۔

”ملکۂ عالیہ، میری عقل نے یہ تو مجھے باور کرا دیا ہے کہ آپ کا قدم رنجہ ہونا کسی خاص بات کی طرف دلالت کرتا ہے لیکن وہ بات کیا ہو سکتی ہے یہ جاننے کے لیے بے قرار ہوں۔“

”کیوں یحییٰ، کیا ہم یونہی تمہاری بیویوں سے ملنے اور خاص طور پر تمہاری بیوی زینب سے ملنے نہیں آسکتے؟ زینب تو ہمارے بیٹے ہارون کی رضاعی ماں ہیں۔ انہوں نے ہمارے بیٹے کو دودھ پلا کر تندرست و توانا کیا ہے۔“

”ملکۂ عالیہ، یہ ہمارا نہیں آپ ہی کا گھر ہے۔ ہمیں جو کچھ ملا ہے آپ ہی سے ملا ہے۔ میں تو صرف اس لیے فکرمند تھا کہ سلطنت کے ہزار بکھیڑے ہوتے ہیں۔ اس خادم کے لیے شاید کوئی کام نکل آیا ہو۔“

”شاید ایسا بھی ہو۔“ خیزران نے شگفتگی سے کہا۔

”حکم کیجیے، بندہ گوش بر آواز ہے۔“

”یحییٰ تمہیں معلوم ہے ہارون کو ہم کتنا چاہتے ہیں۔“

”یہ بات بتانے کی نہیں۔“ یحییٰ نے کہا۔ ”اور یہ بھی ہے کہ موسیٰ بھی آپ ہی کا بیٹا ہے۔“

”اس کی نافرمانی اور خودسری بھی آپ کے علم میں ہوگی۔“

”ملکۂ عالیہ ابھی بچپن ہے اور پھر اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے۔“

”ہم اس کی شکایت آپ سے نہیں کر رہے ہیں ہارون کی حمایت کے لیے آئے ہیں۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں۔“

”ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہارون کو ہادی کا ولی عہد مقرر کردیا جائے تاکہ ہادی کے بعد سلطنت ریطہ کے بیٹے کی طرف منتقل نہ ہو جائے۔“

”آپ کیا سمجھتی ہیں یہ اتنی آسان بات ہے۔ ایک سلطنت میں دو ولی عہد۔ لوگ اسے قبول کرلیں گے؟“

”کیا اس سے پہلے ایسا نہیں ہوا۔ مہدی اور عیسیٰ بن موسیٰ کے سلسلے میں بھی یہی ہوا تھا۔“

”وہ دوسرا معاملہ تھا۔ خلیفہ مہدی کو خلافت عطا ہوئی

تھی اور عیسیٰ بن موسیٰ کو ولی عہدی۔ یہاں تو ایک نیام میں دو تلواروں والا معاملہ ہوگا اور پھر ہارون ابھی پورے سولہ کا بھی نہیں ہوا۔“

”کیا میری طرح آپ کو یہ خوشی نہیں ہوگی کہ ہارون کو ولی عہد دوم بنا دیا جائے۔“

یحییٰ سے پہلے اس کی بیوی زینب بنت منیر بول اٹھی۔ ”ہارون کے ولی عہد بننے کی جتنی خوشی آپ کو ہوگی اتنی ہی مجھے ہوگی کیونکہ وہ میرا بھی بیٹا ہے۔ اب اس میں کیا رکاوٹیں ہیں یہ تو یحییٰ جانیں۔“

”جب تم بھی یہی چاہتی ہو تو اپنے میاں سے کیوں نہیں کہتیں۔ وہ تمہاری خوشی پوری کریں۔“

”یہ کب انکار کر رہے ہیں۔ ہم سب مل کر خلیفہ پر دباؤ ڈالیں گے۔“

”مجھے ایک بات کان میں ڈالنی تھی۔ کوئی ترکیب سوچو کہ ہمارے اور تمہارے خاندان میں یگانگت کا رشتہ مزید مضبوط ہو جائے۔“

خیزران نے ایک قسم کا لالچ دیا اور اٹھ گئی۔

خیزران جو چاہتی تھی یحییٰ نے اس پر غور کرنا شروع کیا کہ اگر ہارون کو ولی عہد بنا دیا جاتا ہے تو خود اسے کیا فائدے پہنچ سکتے ہیں۔ اپنے فائدے کا سوچتے ہوئے سب سے پہلے اسے ایان بن صدقہ کا خیال آیا۔

جس وقت مہدی نے موسیٰ ہادی کو ولی عہد مقرر کیا تھا تو ایان بن صدقہ کو ہادی کا وزیر مقرر کیا تھا اور ہارون کی وزارت یحییٰ بن خالد کو سونپی تھی۔ ان دونوں وزیروں میں بہت جلد چشمک شروع ہو گئی۔ دونوں میں بغض و عداوت کا دور شروع ہو گیا۔

ایان بن صدقہ چالیں چلنے میں نہایت ماہر تھا اور پھر ولی عہد کا وزیر تھا۔ یحییٰ کو دھڑکا لگا رہتا تھا کہ وہ کسی وقت بھی اسے نقصان پہنچا سکتا تھا۔ اب خیزران کی صورت میں اسے ایک ہتھیار ہاتھ آرہا تھا۔ اگر ہارون کو کسی طرح ولی عہد دوم بنا دیا جائے تو وہ ہمیشہ اس کی احسان مند رہے گی۔ اس کے ذریعے مہدی سے ہر کام نکلوایا جا سکتا ہے یہاں تک کہ ایان بن صدقہ کو بھی راستے سے ہٹایا جا سکتا ہے۔

اس نے یہ بھی سوچا کہ اگر موسیٰ ہادی کے بعد جانشینی کا مسئلہ آیا تو ممکن ہے بڑا ہونے کے سبب ریطہ کے بیٹے کو ولی عہد بنا دیا جائے۔ اگر ہارون کو اسی وقت ولی عہد بنا دیا جاتا ہے اور کل کلاں کو وہ خلیفہ بن جاتا ہے تو اس کی نوازشیں میرے خاندان پر رہیں گی اور اگر اس وقت تک میں زندہ رہا تو میں اسے انگلیوں پر نچا سکتا ہوں۔

یحییٰ جیسا ذہین اور بہادر شخص صرف ایک لڑکے (ہارون) کی خدمت پر قانع کیسے رہ سکتا تھا اور خاص طور پر اس صورت میں کہ ایان بن صدقہ مستقبل کے خلیفہ کا وزیر اور پورے مشرقی علاقہ سلطنت کا گورنر بنا رہے۔

اس کی بیویوں نے بھی یہی رائے دی کہ اس وقت خیزران کی مدد کی جائے اور اسے اعتماد میں لے کر آئندہ کے لیے راہ ہموار کی جائے۔ یحییٰ کے ہاتھ ایسا کارگر ہتھیار لگ گیا تھا جس کا کوئی توڑ نہیں تھا۔

یحییٰ نے ایک مرتبہ پھر ملکہ خیزران سے ملاقات کی اور اسے یقین دلایا کہ روم جانے والا لشکر کی کمان اس کا بیٹا ہارون ہی کرے گا۔ اس سے یہ گزارش بھی کی کہ وہ بھی مہدی کو ہموار کرتی رہے۔

یحییٰ نے بڑی ہوشیاری سے اس مہم کا آغاز کر دیا۔ خلافت کے حاشیہ نشینوں اور خلیفہ کے مقربین بارگاہ سے ملاقاتیں کر کے روم کی مہم کے لیے ہارون کا نام پیش کرتا رہا۔ ان میں سے ہر ایک کو صرف یہ اعتراض تھا کہ ہارون محض سولہ سالہ کا ہے۔ یحییٰ اس اعتراض کا جواب یہ دیتا رہا کہ ہارون کو میدان جنگ میں تو اترنا نہیں ہے۔ وہ تو محض ایک تمثیل ہوگا، خلیفہ کا نمائندہ ہوگا۔ آل برمک کے دلاور اس کے ساتھ ہوں گے۔ خالد برمک اور ربیع بن یونس جیسے جنگ جو ہمراہ ہوں گے۔ یہ جنگ تو ہارون کی تربیت کے لیے محض ایک تماشا ہوگی۔

”آپ لوگ جانتے ہیں ہارون نے میرے ہاتھوں پرورش پائی ہے۔ میں اس کی تربیت کرتا رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں اسے جنگ کا عملی تجربہ بھی ہو جائے۔“

یہ بات آگے بڑھی تو مہدی تک بھی پہنچی۔ یحییٰ نے اس سے بھی یہی کہا کہ یہ شرف اگر ہارون کو مل گیا تو آل برمک بڑے ذوق سے اس جنگ میں حصہ لیں گے۔ میری تین بیویاں ہیں۔ ان کے الگ الگ قبیلے ہیں اور وہ تینوں ہارون کو بیٹوں کی طرح چاہتی ہیں۔ ان کی رضاعی ماں ہیں۔ ان کے قبیلوں کے دلاور ہارون کا ساتھ دیں گے۔ ہارون کی تربیت کے لیے ایک اچھا موقع بھی ہے۔

”یحییٰ تو جانتا ہے کہ ہارون کم سن ہے، اپنی ماں کا لاڈلا ہے اور پھر اس کی شادی بھی ابھی نہیں ہوئی۔ جنگوں میں سب کچھ ہوتا ہے۔ اگر اس کی جان کو زیاں پہنچا تو اس کی ماں مجھے زندہ نہیں رہنے دے گی۔“

”آپ نے بجا فرمایا۔ اس کے لیے ملکۂ عالیہ سے

اجازت ضروری ہے۔ آپ ان سے بات کرلیں۔ اگر وہ اجازت نہیں دیتیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میں اپنی رائے واپس لے لوں گا۔"

یحییٰ نہ بھی کہتا تو مہدی، خیزران سے ضرور پوچھتا۔ اس کے مشورے کے بغیر وہ سلطنت کا کوئی کام کم ہی انجام دیتا تھا۔ اس نے خیزران سے مشورہ مانگا۔ خیزران نے بھی شدومد کے ساتھ اسی خواہش کا اظہار کیا۔

"مردوں کے لیے جنگ ایسا بازار ہوتی ہے جہاں عزت کی موت اور شہرت وناموری دونوں فروخت ہوتی ہیں۔ مجھے ہارون کی موت بھی قبول ہے اور شہرت وناموری بھی۔ وہ جو لے کر لوٹے گا میرے لیے تحفہ ہوگا۔"

"موسیٰ ولی عہد ہے وہ اسے اپنی حق تلفی سمجھے گا۔"

"وہ ولی عہد بن گیا ہے۔ کل کو خلیفہ بھی بنے گا۔ اس کے لیے ہزار مواقع ہیں۔" مہدی اس کی طرف سے بھی مطمئن ہوگیا۔

یحییٰ نے ایک مرتبہ پھر ملاقات کی۔ یہ ملاقات خیزران کے بلاوے پر ہوئی۔

"میں نے تم سے ہارون کی ولی عہدی طلب کی تھی۔ تم نے مہدی کے کان میں صرف لشکر کی سرداری کی بات ڈالی۔"

"ملکۂ عالیہ، میں جو کر رہا ہوں مجھے کرنے دیجیے۔ ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمتی۔ پودا ایک دن میں درخت نہیں بن جاتا۔ پاؤں اٹھاتے ہی منزل نہیں مل جاتی۔ میں تو ابھی صرف یہ چاہتا ہوں کہ ہارون دنیا کی نظروں میں فاتح بن جائے۔ اس کی شان وشوکت میں اضافہ ہو۔ اس کے کارنامے زبان زدعام ہوں۔ یہ پہلی منزل ہے اگلی منزل کا انتظار کیجیے۔"

مہدی نے اب پوری طرح ارادہ کرلیا تھا کہ وہ شرف سیادت ہارون کو بخشے۔

لشکر کی روانگی میں چند روز باقی رہ گئے تھے کہ مہدی نے چند سربرآوردہ لوگوں کو جمع کیا تاکہ وہ کسی ایسے شخص کا لشکر کی سیادت کے لیے انتخاب کرلیں جو اس اہم ذمے داری سے عہدہ برآ ہوسکے اور اپنی طرف سے ہارون کا نام پیش کیا۔

کس کی جرأت تھی کہ مطلق العنانی کے اس دور میں خلیفہ کو غلط کہتا۔ دبے لفظوں میں کچھ اعتراضات ہوئے بھی تو خلیفہ نے انہیں رد کردیا۔ اس نام پر اتفاق ہوجانے کے بعد خلیفہ نے یحییٰ کو اپنے قریب بلایا۔ جب وہ قریب آگیا تو خلیفہ اس سے مخاطب ہوا۔

"میں نے اپنے اہل دولت میں سے ہر ایک پر اس نیت سے نظر ڈالی کہ کسی ایسے معتمد شخص کو منتخب کروں جسے ہارون کے ساتھ بہ طور کاتب اور ناظم الامور .... بھیج سکوں۔ اے یحییٰ! تیرے سوا کوئی نظر نہ آیا۔ تجھے میں اس لیے ترجیح دیتا ہوں کہ تو نے اسے پالا اور اس کی تربیت میں حصہ لیا ہے لہٰذا یہ ذمے داریاں میں تجھے سونپتا ہوں۔ میں تجھے ایک لاکھ درہم دیتا ہوں جو زاد راہ کے طور پر تیرے کام آئیں گے۔ دیکھ میرے حسن ظن کو قائم رکھنا۔"

یحییٰ نے سر تسلیم خم کیا۔

یہ یقیناً خیزران کی کارگزاری تھی۔

مہدی بہ نفس نفیس اس لشکر کے ساتھ موصل تک گیا۔ یہاں ایک مرتبہ پھر اس نے سرداران لشکر کو جمع کیا۔

"ہارون کا خاص طور پر خیال رکھنا۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ خطرات سے کھیلنے میں بہت زیادہ بے پروا ہے۔"

ہارون سے مخاطب ہوا۔ "خبردار! خالد بن برمک اور ربیع بن یونس جیسے اصحاب رائے کے مشورے کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھانا۔" مہدی پایۂ تخت کی طرف لوٹ آیا اور لشکر نے ہارون کی نگرانی میں بلاد روم کی طرف کوچ کیا۔ یہ لشکر آگے بڑھتے ہوئے ایک رومی شہر کے قریب پہنچا جس کا نام سمالو تھا۔ ہارون کا لشکر عظیم دیکھ کر قلعے والوں کو مقابلے کی تاب نہ ہوئی اور قلعے کے پھاٹک بند کرلیے۔ ہارون نے قلعے کا محاصرہ کرلیا اور قلعہ سر کرنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ یہ محاصرہ چھوٹی چھوٹی جھڑپوں کے باوجود طول کھینچتا رہا۔ یہاں تک کہ اہل قلعہ عاجز آگئے۔ قلعے میں پانی کی کمی نے انہیں صلح پر مجبور کردیا اور چند شرائط پر ہتھیار ڈال دیے۔

ہارون نے یہ شرائط مان کر انہیں امان دے دی اور باشندگان کے ساتھ نہایت حسن سلوک کے ساتھ پیش آیا۔

یحییٰ اور چند دوسرے برمک سرداروں نے ہارون کو مشورہ دیا کہ بغداد واپس چلا جائے۔ مہدی نے اس سے کہہ دیا تھا کہ سرداروں کے مشورے پر عمل کرے۔ ہارون نے ان کی بات مان لی اور حسب ضرورت سپاہ وہاں چھوڑ کر بغداد کی طرف چل دیا۔

یحییٰ نے واپسی کا مشورہ کیوں دیا اور ایک ہی قلعے کی فتح پر اکتفا کیوں کرلیا؟ یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا لیکن جو محرم راز تھے وہ سمجھتے تھے۔

یحییٰ کا مقصد صرف ہارون کی شان وشوکت میں اضافہ کرنا تھا۔ ایک فتح سے یہ مقصد پورا ہوگیا تھا۔ اب اگلی

منزل کی طرف جایا جاسکتا تھا۔

اس فتح کو کس انداز میں پیش کرنا ہے اس کا انتظام بھی یحییٰ نے کر رکھا تھا۔ فتح کے پھریرے اڑاتا ہارون رشید بغداد کے نواح میں پہنچا تو باشندگان بغداد اپنے خلیفہ اور اس کے ندیموں اور منصب داروں اور امرا کے ساتھ مجاہدوں کے استقبال کے لیے شہر سے باہر نکل آئے۔

ہارون اس شان سے شہر میں داخل ہوا کہ اس کے ساتھ رومیوں کی ایک بہت بڑی تعداد تھی جو رضاکارانہ طور پر اس کے ساتھ چلے آئے تھے۔ جزیہ اور مال غنیمت کا ایک انبار تھا۔ فرزند امیرالمومنین کے نعرے بلند ہورہے تھے۔

شہر کے تمام دروازوں پر چراغاں کیا گیا۔ یہ رات جشن مسرت کے طور پر منائی جارہی تھی۔ قصر خلافت کی تو شان ہی دوسری تھی۔ خیزران مبارکبادوں کے ہجوم میں گھری ہوئی تھی۔

یحییٰ کی اسکیم کامیاب رہی تھی۔ بغداد سے واپس آتے ہی خلیفہ نے ایک فرمان صادر کرکے سلطنت کے پورے غربی علاقے کا اسے والی بنادیا۔ اس علاقے میں شمالی افریقا، مصر، شام، آرمینیا اور آذربائیجان شامل تھے اور یحییٰ اس کا وزیراعظم اور ناظم امور اور کاتب بن گیا۔

یحییٰ جیسے زیرک آدمی کو اتنے اختیارات کا مل جانا تمام مسائل کا حل تھا۔

اب ایک بھائی مشرق میں دوسرا مغرب میں تھا۔

❁❁❁

ہارون رشید کے ایام طفولیت میں اس کا چچا جعفر اکبر دو بچوں کو چھوڑ کر انتقال کرگیا تھا۔ بیٹے کا نام عیسیٰ جعفر تھا اور بیٹی کا نام امتہ العزیز تھا (یہی امتہ العزیز بعد میں زبیدہ کہلائی)

جعفر اکبر کی وفات کے بعد اس خاندان کی کفالت خلیفہ منصور نے اپنے ذمے لے لی۔ امتہ العزیز خوب صورت، نازک اندام اور لمبے بالوں والی لڑکی تھی۔ اس کی نزاکت اور رنگ روپ کو دیکھ کر منصور اسے "زبیدہ" کہنے لگا یعنی مکھن۔ بعد میں یہی اس کا نام پڑگیا۔

وہ دس سال کی ہوئی تو منصور بھی انتقال کرگیا۔ اب زبیدہ کی پرورش مہدی نے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ مہدی نے اس کی تعلیم وتربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ اس کی پرورش شہزادیوں کی طرح ہورہی تھی۔ وہ خود بھی ایسی ذہین ثابت ہوئی کہ جو پڑھا یاد رکھا۔ تاریخ وادب پر اس کی گہری نظر تھی۔

وہ ہارون سے چند مہینے چھوٹی تھی یعنی ہم عمر ہی تھی۔ بچپن میں ایک ساتھ کھیلے تھے۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی پسندیدگی کوئی اور رخ اختیار کرتی گئی۔ قربت نے محبت کا احساس پیدا کردیا۔ راز ونیاز کی منزلیں طے ہونے لگیں۔ پہلے اشعار کا تبادلہ ہوا پھر زبانی سلام وپیام ہونے لگے۔ زبیدہ میں فطری جھجک ضرور تھی لیکن بچپن سے ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے شرم وحیا نے پر سمیٹ لیے تھے۔ دونوں گھنٹوں باتیں کرتے رہتے تھے۔

یہ عشق آخر جنون میں تبدیل ہوگیا۔ ہارون کو اسے دیکھے بغیر چین نہ آتا تھا۔ زبیدہ بھی اس کے جذبے سے ناواقف نہیں تھی لیکن اسے ڈر تھا کہ خیزران ان دونوں کو ایک نہیں ہونے دے گی۔

"ہم نے فیصلہ کرلیا ہے کہ ہم تم سے شادی کریں گے۔"

"ہمارے فیصلہ کرلینے سے کیا ہوتا ہے ہارون۔"

"ہمارے بڑے بھی انکار کیوں کریں گے؟"

"وہ یقیناً یہ چاہیں گے کہ شہزادے کے لیے کسی شہزادی کا انتخاب کریں۔ میں ایک یتیم لڑکی انہیں کیا فائدہ پہنچا سکتی ہوں۔"

"تم میری عم زاد بھی تو ہو۔ یہ اعزاز کسی غیر شہزادی کو حاصل نہیں ہوگا۔"

"لوگ تو اپنا فائدہ دیکھتے ہیں۔"

"اسی لیے تو میں اپنا فائدہ دیکھ رہا ہوں۔" ہارون نے اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھنساتے ہوئے کہا۔

"آپ کا بھلا کیا فائدہ؟"

"زبیدہ کیا تم میرے لیے مجسم فائدہ نہیں؟ تم کہو تو میں یحییٰ چچا سے بات کروں۔ وہ امی حضور سے بات کرلیں گے۔"

"خبردار! ایسا ہرگز نہ کرنا۔ اگر بات کرنی ہے تو امی حضور سے خود بات کیجیے۔ یحییٰ بن خالد آپ کی بات سن ضرور لیں گے لیکن اپنی بیویوں سے بھی ضرور کہیں گے اور پھر بات بہت دور تک جائے گی۔ دنیا پر یہ ظاہر نہیں ہونا چاہیے کہ ہماری شادی پسند کی شادی ہے۔"

"اگر امی حضور نے انکار کردیا؟"

"وہ انکار نہیں کریں گی۔"

"تمہیں اتنا یقین کیوں ہے۔"

"باتوں باتوں میں وہ آپ کا ذکر چھیڑ دیتی ہیں اور پھر میرے چہرے کا رنگ دیکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ انہیں اندازہ ہوگیا ہے۔ اگر وہ مجھے ناپسند کرتیں تو مجھے یہاں سے

کہیں اور بھیج دیتیں یا پابندیاں عائد کرتیں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے وہ میری حوصلہ افزائی کر رہی ہوں۔ ان کی مادرانہ نوازشات روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں۔"

"بس تو پھر کیا ہے، میں امی حضور سے بات کر لیتا ہوں۔"

ہارون یہ باتیں کر ہی رہا تھا کہ زبیدہ کی نسوانی حس نے اچانک شور مچایا۔

"ہارون، تم نے کچھ محسوس کیا؟"

"کیا؟"

"ابھی ہمارے بہت قریب کوئی تھا۔ میں نے قدموں کی آواز خود سنی ہے جیسے کوئی تیزی سے واپس پلٹا ہو۔"

"تمہارا وہم ہوگا۔ محل کے جس حصے میں ہم بیٹھے ہیں وہاں کون آ سکتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے کوئی ہماری نگرانی کر رہا ہو۔"

"ہم کوئی مجرم نہیں ہیں جو ہماری کوئی نگرانی کر رہا ہوگا۔"

"اب ہمیں چلنا چاہیے۔"

ان کی واقعی نگرانی ہو رہی تھی۔ ایک کنیز تھی جو چھپ کر ان کی باتیں سن رہی تھی اور اب خیزران کے سامنے کھڑی تھی۔ خیزران تک یہ تمام باتیں پہنچ گئیں۔

خیزران کو اندازہ تھا کہ ہارون زبیدہ سے محبت کرتا ہے۔ وہ بہت دن سے غور کر رہی تھی کہ زبیدہ کو بہو بنا کر گھر لانے میں کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ اس میں ایک فائدے کا پہلو یہ تھا کہ بنو ہاشم کی تائید و اعانت اسے حاصل ہو سکتی تھی کیونکہ زبیدہ نجیب الطرفین ہاشمیہ تھی۔ آل برمک کی تائید و اعانت حاصل کرنے کا موقع بھی مل سکتا تھا۔ آل برمک پہلے ہی ہارون کے قریب تھے۔ زبیدہ سے شادی کی صورت میں یہ معاونت اور بھی بڑھ سکتی تھی اور ہارون کو آگے بڑھانے میں مدد مل سکتی تھی۔

اس سے پہلے کہ ہارون کوئی ذکر چھیڑتا خیزران نے خود اسے ٹٹولا۔

"زبیدہ تمہیں کیسی لگتی ہے؟"

"ابا حضور نے اس کی پرورش شہزادیوں کی طرح کی ہے۔ وہ تمام ہنر اسے سکھائے ہیں جو شہزادیوں کے حسبِ حال ہوتے ہیں۔"

"ہم اس کی شکل صورت کی بات کر رہے ہیں۔"

"دادا حضور نے اسے زبیدہ کا لقب دیا تھا۔"

"کیا تم اس سے محبت کرتے ہو؟"

"کیسے کہہ دوں کہ نہیں؟"

"اور زبیدہ؟"

"یہ آپ خود اس سے دریافت کر لیجیے گا۔"

"اگر اس سے تمہاری شادی کر دی جائے؟"

"یہ آپ پر منحصر ہے۔"

"اگر ہم انکار کر دیں؟"

"پھر میں یہ جسارت کروں گا کہ کہیں شادی نہ کروں۔"

"تو پھر خوش ہو جاؤ۔ ہم تمہاری شادی زبیدہ سے ضرور کریں گے۔"

"ہارون آپ کا احسان مند رہے گا۔"

"زبیدہ ہمیں بھی بہت اچھی لگتی ہے۔"

شادی سے مہینوں پہلے بغداد کی گلیوں کو دلہن کی طرح سجا دیا گیا۔ اس جشن مسرت کے لیے خیزران نے اپنی آمدنی کا ایک بڑا حصہ الگ کر دیا۔ یہ اس رقم کے علاوہ تھا جو مہدی کے خزانہ عامرہ سے اس موقع پر خرچ کیا جاتا تھا۔

مہدی نے سرپرست کی حیثیت سے ساز و سامان، جواہرات، زیورات، تاج و کلاہ زریں، سونے چاندی کے برتن، نادر خوشبویات اور بیش بہا ملبوسات اس کثرت سے دیے کہ اب تک کسی عورت کو نہ ملے ہوں گے۔

اس تقریب میں شرکت کے لیے آفاق و اطراف سے لوگ آئے تھے۔ مہدی نے دل کھول کر ان سب کو تحائف دیے۔ دینار چاندی کے ڈبے میں، درہم سونے کے ڈبے میں، عنبر، مشک اور عطریات شیشے کے ڈبے میں رکھ کر لوگوں میں تقسیم کیے۔ قیمتی خلعت اور پارچہ جات عطا کیے۔

ہر خاتون کو دینار سے بھری ایک تھیلی اور درہم سے بھری ایک ہمیانی اور خوشبویات سے بھرا ہوا ایک چاندی کا ڈبہ عطا کیا اور نہایت قیمتی جوڑا دیا۔

اس شان کی مثال تاریخ میں اس سے پہلے نہیں ملتی۔

محمد بن سلیمان عباسی (خلیفہ مہدی کا داماد) نے اپنے محل پر ایسا چراغاں کیا کہ زمین پر سوئی پڑی نظر آتی تھی۔ یہی وہ محل تھا جسے دلہا دلہن کے رات گزارنے کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔

کہا جاتا ہے اس رات خیزران نے زبیدہ کو ایک ایسا جوڑا عطا کیا جس پر جواہر اور موتی ٹکے ہوئے تھے۔ یہ اتنا بھاری تھا کہ اسے پہن کر نازک اندام زبیدہ کے لیے چلنا مشکل تھا۔ آخر اسے بدل کر دوسرا جوڑا پہنایا گیا۔

سب سے زیادہ خوشی کا مظاہرہ آل برمک کر رہے تھے۔ انہوں نے دل کھول کر خوشی منائی اور جود و سخا کا غیر معمولی مظاہرہ کیا۔ اس شادی کے بعد وہ حسبِ موقع

سیاسی فائدہ اٹھا سکتے تھے۔

ابھی ہارون اس ثمر خوشگوار کا حظ اٹھانے میں مشغول تھا کہ سیاست نے ایک اور مہرہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ قصر خلافت کی پسِ پردہ سازشوں نے ایک مرتبہ پھر اسے آگے کر دیا۔

ابھی بغداد جشن مسرت میں ڈوبا ہوا تھا۔ بلاد روم کی سرحد سے خبر آئی کہ ایک فوجی سردار عبدالکبیر از خود اپنا چھوٹا سا لشکر لے کر دشمن سے جنگ کرنے پہنچ گئے۔ لشکر کی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ روم کے بطریق نے انہیں بہ آسانی شکست دے دی اور تمام مسلمانوں کو قتل کر دیا۔

ان میں سے چند زندہ بچ کر بغداد آ گئے تھے اور وہی یہ خبر لے کر آئے تھے۔ مہدی کو عبدالکبیر کی خودسری پر غصہ آیا اور اسے فوراً گرفتار کر کے بغداد بلا لیا اور قید کر دیا۔

عبدالکبیر کی اس حرکت سے مسلمانوں کی سخت توہین ہوئی تھی۔ مہدی شکست کے اس داغ کو دھو ڈالنا چاہتا تھا چنانچہ اس نے ایک لشکر گراں تیار کرنے کا حکم دیا۔

ایک مرتبہ پھر یہ سوال اٹھا کہ اس لشکر کی سیادت کسے سونپی جائے۔ ہارون کا سوال اس موقع پر خارج از بحث تھا۔ اس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ پھر یہ کہ اس مرتبہ مہدی نے اعلان کر دیا تھا کہ اسلامی لشکر بلاد روم میں جہاں تک بڑھتا ہے بڑھتا جائے۔ یہ ایسا عظیم الشان معرکہ تھا کہ 19 سال کے ہارون رشید کو مہدی کسی خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا لیکن قصر خلافت کی سیاست کی کارفرمائیوں کا تقاضا یہی تھا کہ اس مرتبہ بھی ہارون کو یہ فخر عطا کیا جائے۔

یہ سیاست بھی کامیاب ہوئی۔ خیزران کا داؤ اس مرتبہ بھی چل گیا۔ یحییٰ منزل کے قریب پہنچنے کے لیے بے تاب تھا۔

ہارون اپنا لشکر لے کر حدود سلطنت سے باہر نکلا۔

ایک مرتبہ پھر سیاسی داؤ پیچ نے موسیٰ بن مہدی کو پیچھے دھکیل کر ہارون کو آگے کر دیا تھا۔

یہ معلوم ہوتا تھا جیسے ہارون کو فتح یاب ہو کر جلد سے جلد زبیدہ کے پاس لوٹنے کی جلدی ہو۔ جو شہر جو علاقہ سامنے آیا اسے کچلتا ہوا دشمن کے اصل لشکر کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

طرفین میں گھمسان کا رن پڑا۔ یہ لڑائی کئی دن جاری رہی اور بالآخر رومیوں کا سپہ سالار مارا گیا۔ رومی بھاگ کھڑے ہوئے۔

ہارون اب قسطنطنیہ کی طرف بڑھا۔ اس نے قسم کھائی کہ یا تو قسطنطنیہ فتح کرے گا ورنہ اسی جدوجہد میں جان دیدے گا۔

اس زمانے میں روم کے تختِ حکومت پر ایک خاتون ایرینی متصرف تھی جو نوعمر وارث تخت کی جگہ حکومت کر رہی تھی۔ اس نے مسلمانوں کی طاقت دیکھ کر پرچم صلح بلند کیا اور گفت و شنید کا آغاز کر دیا۔ فدیہ دینے اور ہر سال جزیہ دینے پر آمادہ ہو گئی۔

ہارون نے ان شرائط پر صلح کر لی۔

ان فتوحات کی خبریں تواتر اور تسلسل کے ساتھ پہنچ رہی تھیں۔ ہارون کے پسِ پردہ ہمنوا ان خبروں کو نمک مرچ لگا کر پھیلا رہے تھے۔

ان میں یہ خبر تو شد و مد کے ساتھ پھیلائی جا رہی تھی کہ شہزادہ ہارون نے اس جنگ میں صرف نگراں کا کردار ادا نہیں کیا ہے بلکہ قتال و پیکار میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ دشمن اس کی بہادری کا لوہا مانے بغیر نہ رہ سکا۔

اس میں صداقت ہو نہ ہو اس میں ضرور صداقت تھی کہ اس نے کامل آٹھ مہینے اپنی محبوب بیوی کے ہجر میں بسر کر دیے۔ اہل بغداد کو متاثر کرنے کے لیے یہ واقعہ ہی بہت تھا۔ اس کے بعد قدرتاً یہ ہونا چاہیے تھا کہ لوگ اس کی بڑائی اور عظمت کے سامنے سرنگوں ہو جائیں۔

اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا کہ ہارون کا لشکر جب بغداد کے دروازوں پر پہنچا تو عوام بے قابو ہو کر سڑکوں پر نکل آئے۔ پھول نچھاور کیے اور مجاہدوں کا بے مثال

بیٹی

اسلام میں بیٹی کی اہمیت
حضرت محمد ﷺ نے فرمایا۔

☆ عورت کے لیے یہ بہت ہی مبارک ہے کہ اس کی پہلی اولاد لڑکی ہو۔

☆ جس شخص کے بیٹیاں ہوں اس کو برا مت سمجھو اس لیے کہ میں بھی بیٹی کا باپ ہوں۔

☆ بیٹیاں ماں باپ کا سکون ہوتی ہیں۔

☆ بیٹیوں کو پھولوں کی مانند رکھو کیونکہ یہ پرائی ہیں۔

☆ جب اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے تو زمین پر بیٹی پیدا کرتا ہے۔

مرسلہ: طیب شاہین، منڈی بہاؤالدین

استقبال کیا۔

خیزران محل کی کھڑکیوں سے ہارون کی پذیرائی کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اب ہارون کو ولی عہد دوم بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ میرے دونوں بیٹے خلافت کے مستحق ہوں گے۔ بس اب یہ اعلان باقی رہ گیا تھا کہ یحییٰ بن خالد آگے بڑھے اور ہارون کو ولی عہد دوم بنانے کی تجویز پیش کرے۔

دوسرے روز خلیفہ مہدی نے قصر خلد میں جلوس کیا اور دربار عام منعقد کیا۔ اسی دربار میں اس نے ہارون کو خلعت فاخرہ پہنایا اور ہارون کو ''رشید'' کا لقب دے کر ہارون رشید بنا دیا۔ اس دن کے بعد سے وہ اسی نام سے پکارا جانے لگا۔

خیزران کو اب کہاں صبر ہونے والا تھا۔ ہارون کی شان وشوکت اور یحییٰ کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو دیکھ کر اس نے ہارون کی ولی عہد دوم ہونے کی تجویز مہدی کے سامنے رکھ دی۔

یہ ایک پرخطر تجویز تھی، مہدی اس پر کبھی تیار نہ ہوتا لیکن تجویز پیش کرنے والی خیزران تھی۔ خیزران کی ضد کے سامنے سرِتسلیم خم کرنا کوئی پہلی بات نہیں تھی۔ خیزران کے بہکاوے میں آکر کئی بڑی بڑی غلطیاں کر چکا تھا لیکن شاید اس سے بڑی غلطی اب تک اس نے کی نہیں تھی جو وہ اب کرنے جا رہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس غلطی سے آئندہ کیا پیش آسکتا ہے۔

اس نے خیزران سے وعدہ کر لیا تھا لیکن وہ رات بھر نہ سوسکا۔ وہ اس اعلان کے بعد کے نتائج پر غور کرتا رہا۔ وہ امکانات بار بار اس کے ذہن میں آرہے تھے جو دو بھائیوں کو بیک وقت ولی عہد بنانے کے بعد آئندہ پیش آسکتے تھے۔

صبح قریب تھی کہ اس کی آنکھ لگ گئی۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں درخت کی دو شاخیں ہیں۔ ایک اس نے موسیٰ (ہادی) کے سامنے ڈال دی دوسری ہارون کے سامنے۔ موسیٰ کی شاخ پر چند پتیاں نکل آئیں جبکہ ہارون کی شاخ مکمل طور پر سرسبز ہوگئی۔

آنکھ کھلتے ہی اس نے تعبیر دینے والوں کو بلایا۔ انہوں نے اسے بتایا کہ موسیٰ کی مدت خلافت مختصر ہوگی جبکہ ہارون لمبی مدت تک بادشاہت کرے گا۔

اس سے آگے وہ کچھ نہ بتا سکے کہ موسیٰ کی مدت خلافت کم کیوں ہوگی۔ اسے کیا حادثہ پیش آئے گا کہ خلافت ہارون کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔ کیا دونوں بھائیوں میں جنگ ہوگی؟ یہ سوچ کر ہی وہ کانپ گیا۔ ایک مرتبہ پھر اس کا ارادہ متزلزل ہوگیا، اس نے خیزران کو اپنے خواب سے آگاہ کیا اور نتائج بتائے لیکن خیزران کچھ سننے کو تیار نہیں تھی۔ وہ بڑے بیٹے موسیٰ کی نافرمانی سے خوش نہیں تھی۔ ہارون کو بہت عزیز رکھتی تھی۔ وہ تو اب یہ بھی سوچنے لگی تھی کہ صرف ولی عہدی نہیں ممکن ہوا تو موسیٰ سے پہلے ہارون کو خلیفہ بننے میں مدد دے گی۔ یحییٰ بن خالد کی پوری مدد اسے حاصل تھی۔ وہ دراصل اپنی خیرخواہی جتا کر اور اپنی خواتین کا اثر ڈال کر خیزران کے ذریعے اپنے اقتدار اور سطوت کا راستہ صاف کر رہا تھا۔

باپ کے اس ارادے کی بھنک ہادی کے کانوں میں بھی پڑ گئی تھی۔ کسی نے اسے مہدی کے خواب سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔ اکسانے اور بھڑکانے والے ندیم اور مصاحبین یہاں بھی کم نہیں تھے۔ وہ باپ کے غضب کا سامنا کرتے ہوئے تو ڈرتا تھا لیکن ماں سے تو الجھ سکتا تھا۔ اس نے خیزران پر پابندیاں لگانے کی کوشش کی کہ وہ یحییٰ اور اس کے گھر کی خواتین سے نہ ملا کرے لیکن وہ یہ بھول گیا تھا کہ خیزران کتنی بااثر ہے۔ یہ راز تو اس وقت کھلا جب اس کے اپنے مقرب لوگ بھی خیزران کے گن گاتے نظر آئے۔

ماں کے دل میں اس کی طرف سے مزید میل آگیا۔

موسیٰ کو فی الحال چپ ہونا پڑا لیکن ہارون کو وہ اپنے لیے مستقل خطرہ سمجھنے لگا تھا۔ اب دونوں بھائیوں کے دل میں ایک دوسرے کے لیے شکوک وشبہات کے سوا کچھ نہ تھا۔

مہدی سب کچھ جانتے ہوئے بھی خیزران کی بتائی ہوئی راہ پر چل پڑا۔ آخر ایک تقریب میں امرائے بنوہاشم اور امرائے دولت کی موجودگی میں مہدی نے اعلان کر دیا کہ دوسرا ولی عہد ہارون ہوگا۔

ہارون کی شہرت عوام میں اتنی ہوچکی تھی کہ اس بیعت پر خوشی کا اظہار کیا گیا لیکن قوم کا فہمیدہ طبقہ فکرمند تھا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بیعت دونوں بھائیوں میں نفرت وعداوت کا سبب بنے گی اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ مملکت کی وحدت پارہ پارہ ہوجائے گی۔ ایک مملکت میں دو بادشاہ لڑے بغیر کبھی نہیں رہ سکتے۔

اس کا مظاہرہ ابھی سے ہونے لگا تھا۔ موسیٰ نے اپنے مستقبل کی حفاظت کے لیے امرائے بنوعباس کی ایک بڑی تعداد اپنے گرد جمع کر لی۔ عبدالملک بن صالح، عیسیٰ بن موسیٰ، عباس بن محمد وغیرہ جو بھی مہدی سے پرخاش

رکھتے تھے یا جنہیں اس کے ہاتھوں گزند پہنچی تھی ہادی کے حلقے میں آ گئے۔ کئی سرداران فوج بھی اس کی ٹولی میں آ گئے۔ وہ لوگ بھی اس کے پاس چلے آئے جو یحییٰ برمکی کے خلاف تھے۔

یہی حال مہدی کے محل کا بھی تھا۔ یہاں بھی دو پارٹیاں کام کر رہی تھیں۔ ایک پارٹی موسیٰ ہادی کی پشت پناہ تھی دوسری ہارون کے حق میں تھی۔ ہارون کا پلڑا اس لیے بھاری تھا کہ اس کے ساتھ خیزران تھی اور اب زبیدہ بھی آ گئی تھی۔ زبیدہ کو ابھی سیاست کی سمجھ نہیں تھی لیکن اتنا شعور تو تھا کہ معاملہ اس کے شوہر کا ہے۔ وہ ہادی کو نقصان پہنچانے میں شریک نہیں ہوسکتی تھی لیکن اپنے شوہر کے دفاع میں تو جوش وخروش دکھا سکتی تھی۔

خیزران کا تیر نشانے پر لگا تھا۔ زبیدہ کی وجہ سے امرائے بیت ہاشمی بھی خیزران اور ہارون کی حمایت کر رہے تھے۔ ان مخالفتوں کو ابھارنے اور رنگ دینے کے لیے یحییٰ موجود تھا۔ اسے اس سیاست میں خفیہ ہاتھ کہا جاسکتا تھا۔ اس خفیہ ہاتھ کو فوراً حرکت میں آنے کا موقع مل گیا۔

جرجان سے خلیفہ کے پاس خبریں پہنچنے لگیں کہ کوہستانی علاقے میں زبردست بغاوت ہوئی ہے۔ پھر یہ خبر آئی کہ یہ بغاوت طبرستان تک پہنچ گئی ہے۔

مہدی نے بغاوت فرو کرنے کے لیے لشکر تیار کرنا شروع کر دیا۔ ایک مرتبہ پھر سیادت کا مسئلہ سامنے آیا۔ سازشیں کام کر رہی تھیں۔ مہدی کو مشورہ دیا گیا کہ سیادت کا شرف ہادی کو دیا جائے نا کہ ہارون کو۔ مہدی کے سامنے یہ دلیل پیش کی گئی۔

''وہ چونکہ شرقی حصے کا گورنر ہے اس لیے یہ ذمّے داری اسی کو سونپی جائے۔''

کوہستانی علاقہ دشوار گزار راستوں پر مشتمل تھا۔ باغیوں کو کچل دینا اتنا آسان بھی نہیں تھا۔ ایک سال سے کچھ اوپر کی مدت گزر گئی اور جنگ ختم نہیں ہوئی۔ محاذ جنگ گرم تھا۔ بغداد موسیٰ ہادی اور اس کے اعوان وانصار سے تقریباً خالی ہوچکا تھا کہ سازشوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

سازشوں کا مقصد یہ تھا کہ ہادی کو ولی عہدی سے معزول کر دیا جائے اور پہلا ولی عہد ہارون کو بنایا جائے۔ جب پہلے پہلے مہدی کے سامنے یہ تجویز پیش کی گئی تو وہ بھونچکا رہ گیا۔ اسے حیرت اس لیے ہوئی تھی کہ اس مرتبہ یہ تجویز امرائے بنوعباس کی طرف سے آئی تھی۔ یحییٰ ان سازشیوں کا رہنما تھا اور کہہ چکا تھا۔ ''حصول مقصد کے لیے سب کچھ کر گزرنا چاہیے۔''

ایک باپ کی حیثیت سے وہ موسیٰ ہادی اور ہارون رشید کو مساوی سمجھتا تھا۔ وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ ہادی کو خوامخواہ اس کے حق سے کیوں محروم کر دیا جائے جبکہ وہ بہادر بھی تھا اور سخی بھی۔ تیغ زن بھی تھا اور صف شکن بھی۔

سیاسی اعتبار سے بھی یہ اچھا فیصلہ نہ ہوتا۔ اسے خود اپنا ایک واقعہ یاد آگیا۔ کسی زمانے میں اسے یہ غلط خبر ملی تھی کہ اس کا باپ منصور اسے ولی عہدی سے معزول کر کے یہ منصب اس کے چھوٹے بھائی جعفر اصغر کو دینا چاہتا ہے تو اس نے باپ کا لحاظ نہیں کیا تھا اور باپ سے کہہ دیا تھا۔

''خدا کی قسم! اگر آپ نے ایسا کیا تو میں اسے قتل کر کے رہوں گا۔''

منصور نے جواب دیا تھا۔ ''تمہیں غلط خبر ملی ہے۔ ہم جعفر سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ اسے تمہارا نشانہ نہیں بننے دیں گے۔'' اگر یہ خبر غلط نہ ہوتی تو میں واقعی اپنے بھائی کو قتل کر چکا ہوتا۔ کیا یہ تاریخ پھر تو نہیں دہرائی جارہی ہے اور پھر یہ بھی معلوم نہیں کہ لوگ اسے کس نظر سے دیکھیں گے۔

وہ درست سمت میں سوچ رہا تھا لیکن خیزران اور امرائے بنوعباس کا ایسا دباؤ تھا کہ اس کی قوت مزاحمت جواب دے گئی۔

اس نے اس سازش کے سرکردہ لوگوں کو بلایا اور ان سے کہا۔

''مسلمانوں سے موسیٰ ہادی کی بیعت لی جاچکی ہے۔ اس کا انتزاع اسی صورت ممکن ہے کہ وہ خود اس سے دست بردار ہو۔''

''اگر آپ فرمائیں گے تو ولی عہد ہرگز سرتابی نہیں کریں گے۔'' لوگوں نے کہا۔

''آپ لوگ پہلے اس کے پاس جائیں اور اسے قائل کریں۔ اگر وہ مان گیا تو پھر میں فرمان جاری کردوں گا۔''

ان لوگوں میں سے بعض جرجان پہنچے اور ہادی کے سامنے پوری بات رکھ دی۔ وہ ولی عہدی کیسے چھوڑ دیتا۔ لاکھ سمجھانے کے باوجود وہ تیار نہیں ہوا اور برہم ہوگیا، عالم طیش میں مہدی کو بھی سخت سست کہہ دیا۔

یہ لوگ واپس چلے آئے۔ بہ ظاہر ناکام لوٹے تھے لیکن اتنا ضرور کر آئے تھے کہ ہادی کے دل میں باپ کے لیے نفرت پیدا ہوگئی۔ مہدی سے ملاقات کر کے آخری کیل بھی ٹھونک دی۔ اس کی برہمی کے بارے میں

کچھ نہیں بتایا بلکہ اسے مشورہ دیا کہ آپ اسے خط لکھ کر بغداد بلالیں۔ اس کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ انکار نہیں کرے گا۔ بس وہ یہ چاہتا ہے کہ یہ بات آپ اس سے کہیں شاید اسے ہم پر اعتبار نہ ہو۔

مہدی نے یہ انتظار بھی نہیں کیا کہ جنگ ختم ہونے کا انتظار کرے۔ اس نے ہادی کو خط لکھ کر بغداد طلب کیا۔ ہادی نے نہ صرف انکار کردیا بلکہ نامہ بر کے سامنے باپ کا خط پھاڑ کر پھینک دیا اور نامہ بر کو مار پیٹ کر باہر نکال دیا اور بغداد میں اپنے ہواخواہوں کو لکھ بھیجا کہ حالات پر نظر رکھیں اور مجھے برابر اطلاع دیتے رہیں۔

مہدی کو جب معلوم ہوا کہ ہادی نے یہ حرکت کی ہے تو غصہ تو بہت آیا لیکن بیٹے کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے باز رہا کیونکہ اسے احساس تھا کہ ہادی کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ ابھی غصے میں ہے غصہ اترتے ہی ٹھیک ہوجائے گا۔

سازشی عناصر خوش ہورہے تھے کہ انہوں نے باپ بیٹے کو ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ مہدی ضرور ہادی کے خلاف لشکر کشی کرے گا۔

جب انہوں نے دیکھا کہ مہدی کسی کارروائی کا ارادہ نہیں کررہا ہے تو انہوں نے خیزران کو اکسایا۔

''اگر امیرالمومنین نے کوئی کارروائی نہیں کی تو ہادی کی ہمت دراز ہوجائے گی۔ اگر امیرالمومنین اپنی ذلت پی گئے ہیں تو آپ ہی کچھ کیجیے۔''

''آپ مجھے بتائیں کہ میں کیا کروں؟''

''آپ ہادی کے خلاف علم مخالفت بلند کریں اور اپنے شوہر کی تذلیل کا بدلہ لینے کے لیے اٹھ کھڑی ہوں ورنہ ہارون ہمیشہ کے لیے خلافت سے محروم کردیا جائے گا۔''

ہارون کی محبت نے اسے اتنا اندھا کردیا تھا کہ وہ ہادی سے بدلہ لینے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مہدی نے جب بگڑتا ہوا رنگ دیکھا تو اسے اپنے باپ منصور کا کہا یاد آیا۔

''خبردار! اپنے معاملات میں عورتوں کو دخل انداز مت ہونے دینا لیکن مجھے اندیشہ ہے تم ایسا ضرور کروگے۔'' اب وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

سازشیوں کا اصرار تھا کہ مہدی خود جرجان جائے جہاں ہادی قیام پذیر تھا۔ مہدی اتنا مغلوب ہوچکا تھا کہ اس نے یہ رائے بھی مان لی۔ مہدی نے اپنے خاص خاص آدمیوں کو ساتھ لیا اور جرجان کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس کی اطلاع ہادی کو فوراً مل گئی۔ اسے یقین ہوگیا کہ اب وہ اپنے حق سے محروم ہوکر رہے گا۔

جب مہدی نہروان کے قریب ایک مقام ماسبذان پر پہنچا تو یہاں پڑاؤ کرنے کا حکم دیا۔ صحت بہت اچھی تھی، بیماری قریب ہوکر بھی نہیں گزری تھی کہ ناگہانی موت کا شکار ہوگیا۔

سازشوں نے اپنا رنگ دکھادیا۔

تاریخ نے یہاں عجیب رنگ دکھایا ہے۔ اس کی موت ایک معما بن گئی۔ کہیں لکھا گیا ہرن کے شکار کے دوران گھوڑے سے گر کر مرگیا۔ کہیں لکھا گیا زہر آلود امرود کھانے سے مرا۔ کسی نے یہ سبب بتایا کہ زہر آلود حلوا کھایا تھا۔ اس کے اردگرد اتنے حاشیہ نشین موجود تھے کہ کسی کو بھی صحیح سبب معلوم نہ ہوسکا۔

شاید اصل بات یہ تھی کہ لوگوں نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی یہ بات اس لیے پوشیدہ رکھی کہ مجرم کوئی معمولی شخص نہیں بلکہ ولی عہد مملکت موسیٰ ہادی تھا۔ ایک مورخ نے بہرحال اس راز سے پردہ اٹھانے کی جسارت کی۔

''خلیفہ مہدی نے جب یہ فیصلہ کیا کہ ولی عہد اول موسیٰ ہادی کے بجائے ہارون رشید کو بنا دیا جائے تو ہادی اسے برداشت نہ کرسکا۔ اس نے بعض باندیوں کو اپنے باپ کے خلاف آمادۂ عمل کیا جنہوں نے چوری چھپے اسے زہر دے کر ہلاک کرڈالا۔''

ہارون رشید کو ولی عہد اول بنانے کی سازش یا کوشش اس وقت ناکام ہوگئی جب منزل بالکل قریب آگئی تھی۔

یحییٰ بن خالد اور اس کے ساتھی اس حادثۂ جانکاہ سے کانپ اٹھے اور انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ اب کوئی مزاحمت نہ کی جائے۔ حالات جو رخ اختیار کررہے ہیں اختیار کرنے دو۔ کوئی مزاحمت کی تو کسی کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔

مہدی کی وفات کے بعد ہارون رشید جو مہدی کے ساتھ نہروان آیا تھا۔ یحییٰ بن خالد کے پاس آیا۔

''اگر امیرالمومنین کی وفات کا علم فوج کو ہوگیا تو کوئی نیا ہنگامہ نہ اٹھ کھڑا ہو۔ میرا خیال ہے فوج کو واپس جانے کا حکم دیا جائے اور ہم بعد میں نعش لے کر بغداد جائیں، آپ کی کیا رائے ہے؟''

''میری تو یہ رائے نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ خلیفہ کو یہیں دفن کردیا جائے۔ پوشیدہ طور پر انگشتری اور عصا ہادی کو بھیج دیجیے۔ اس کے بعد فوج کو واپس جانے کا حکم دیجیے۔ پھر کوئی چوں چرا نہیں کرے گا۔''

ہارون یحییٰ کی کوئی بات نہیں ٹالتا تھا۔ اس نے اسی رائے پر عمل کیا اور مہدی کو ایک قریبی قریے میں دفن کردیا۔ تدفین کے بعد ان تمام لوگوں کو جو ساتھ آئے تھے جمع کیا اور ان سے موسیٰ ہادی کی خلافت پر بیعت لی۔ اس کے بعد لشکر کو روانہ کیا اور پیچھے پیچھے خود بغداد کی طرف روانہ ہوگیا۔

خیزران دو صدموں سے ایک ساتھ گزر رہی تھی۔ ایک تو اس کا شوہر دنیا سے رخصت ہوگیا تھا دوسرے یہ کہ بازی اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ اس نے تمام چالیں اس لیے چلی تھیں کہ موسیٰ ہادی ولی عہدی سے دست بردار ہوجائے نہ کہ یہ وہ خلیفہ بن گیا تھا۔ اسے یقیناً یہ فکر بھی ستا رہی ہوگی کہ کہیں سازشوں کا پردہ چاک نہ ہوجائے۔ اس نے گھبرا کر یحییٰ کو طلب کیا۔

ہوا کا رخ تبدیل ہوگیا تھا۔ اب سیاہ سفید کا مالک موسیٰ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ موسیٰ کارپردازانِ حکومت کا خیزران سے میل جول پسند نہیں کرتا۔ اس وقت اس کی خفگی مول لینا دانش مندی نہیں۔ وہ خیزران سے ملاقات میں لیت ولعل سے کام لیتا رہا۔

مہدی کی وفات کے اٹھارہ دن بعد خلیفہ موسیٰ ہادی پایۂ تخت بغداد میں وارد ہوگیا۔ امرائے شہر، سردارانِ قوم اور عمائدین حکومت نے شہر سے باہر نکل کر اس کا استقبال کیا۔

ان لوگوں میں سب سے پیش پیش یحییٰ بن خالد برمکی تھا۔ اس نے ہادی کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور ایسی نیازمندی اور اطاعت کا مظاہرہ کیا جیسے اس سے پہلے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

''بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے''

یحییٰ کی حکمت عملی رنگ لائی۔ ہادی نے جب اس کا یہ عالم دیکھا اور اسے بعد میں یہ بھی معلوم ہوا کہ خیزران کی طلبی کے باوجود یہ وہاں نہیں گیا تو اس کا دل صاف ہوگیا۔ اس نے بھی مصلحت سے کام لیا۔ کوئی باز پرس نہیں کی اور اسے سابقہ عہدے پر بحال رکھا۔

یحییٰ بہ دستور ہارون کے معاملات وانتظامات سرانجام دیتا رہا۔

ہادی کو معلوم تھا کہ اب تک جو نشیب وفراز آتے رہے اس میں خیزران کا اہم کردار رہا ہے لیکن اب وہ اس کے لیے قابل رحم بھی تھی کہ اس کا شوہر اس سے جدا ہوگیا تھا۔ یہ توقع بھی تھی کہ اب وہ سبق سیکھ جائے گی۔ امور مملکت میں دخل اندازی کے بجائے خاموشی سے شوہر کا سوگ منائے گی۔

اس نے کوششیں شروع کردیں کہ کسی طرح ماں سے صلح ہوجائے۔ اس نے اپنی طرف سے کوئی ایسا موقع نہیں آنے دیا جو خیزران کی برہمی اور عتاب کا سبب بنتا۔ اس کی خدمت میں تحائف بھی بھیجتا رہا لیکن کچھ دن کے وقفے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ خیزران پرانی روش پر لوٹ آئی ہے۔ معاملات حکومت میں دخل اندازی کررہی ہے۔ سفارش اور زور سے حاجت مندوں کی مدد کررہی ہے۔ اس کی حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے وزرا اس کی غلط سفارشوں پر بھی عمل کرنے پر مجبور ہورہے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ ان لوگوں سے میل جول بڑھا رہی ہے جنہیں ہادی اپنے لیے خطرہ سمجھتا تھا خصوصاً خاندان برمک سے اس کا تعلق اور زیادہ مضبوط ہوگیا ہے۔

جب وہ بہت مجبور ہوگیا تو ایک روز اس نے خیزران سے ملاقات کی اور اس کے طور طریقوں پر اسے ٹوکا۔

''میں چاہتا ہوں آپ حرم تک محدود رہیں۔ حرم کے باہر جو امور ہیں ان میں دخل اندازی نہ فرمائیں۔ عورتوں کو زیبا نہیں کہ معاملات حکومت میں دخل دیں۔ میں آپ کی اطاعت کروں گا لیکن اس حالت میں نہیں جو طریقہ اب آپ نے اپنایا ہوا ہے۔''

''تو خلیفہ بنتے ہی مجھ پر حکم جاری کرنے لگا۔''

''میں تو صرف گزارش کررہا ہوں اور وہ بھی صرف اس لیے کہ آپ کی دخل اندازی سے مملکت کے کام بگڑتے ہیں۔''

''میں اسی لیے ہارون کو عزیز رکھتی ہوں کہ وہ میرے کاموں میں دخیل نہیں ہوتا۔''

''میں بھی دخل اندازی نہیں کررہا ہوں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ میرے لیے آسانیاں فراہم کریں۔''

''میں نے تمہیں برداشت کرلیا ہے بس یہی بہت ہے۔'' خیزران نے کہا اور عالم طیش میں دامن جھٹک کر کھڑی ہوگئی۔ ہادی واپس چلا گیا۔

ہادی اپنی ماں پر مکمل نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس کی دانش نے یہ فیصلہ دے دیا تھا کہ تمام سازشوں کا منبع اس کی ماں کی ذات ہے ورنہ کس کی اتنی ہمت ہو۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ خیزران کی حوصلہ شکنی کرتا رہے گا۔

دوسری طرف خیزران پر ہادی کی نصیحت کا مطلق اثر نہیں ہوا تھا بلکہ اور زیادہ شدت کے ساتھ حکومت کے معاملات میں دخیل ہونے لگی۔ اس جیسی ذہین عورت اس وقت مصلحت سے کام نہ لے سکی۔ اس کے غصے نے کھیل بگاڑ

دیا۔ اس کی مداخلت سے سرکاری کام چوپٹ ہو کر رہ گئے۔
تمام سازشی لوگ وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اس سے الگ ہو گئے تھے۔ خیزران جھنجلاہٹ سے بے حواس ہو رہی تھی۔
ایک دن خلیفہ کی محافظ جماعت کا سردار عبداللہ بن مالک اپنا کوئی کام لے کر خیزران کے پاس آیا۔ کام یقیناً ایسا ہوگا جو وہ خلیفہ کے سامنے نہیں رکھ سکتا تھا۔ خیزران نے اس سے وعدہ کر لیا کہ وہ اس کا یہ کام کرا دے گی اور اس کے باوجود کہ ہادی نے اسے دخل اندازی کے لیے منع کر دیا تھا وہ اس کے پاس پہنچ گئی اور اصرار کیا کہ وہ یہ کام کرے۔ ہادی نے انکار کر دیا۔
''میں انکار نہیں سن سکتی۔ یہ کام تمہیں کرنا پڑے گا۔''
''میں یہ کام ہرگز نہیں کروں گا۔''
''میرے کہنے سے بھی نہیں؟''
''ہرگز نہیں۔''
''میری لاج رکھ لو۔ میں عبداللہ بن مالک سے وعدہ کر چکی ہوں۔''
''آپ نے وعدہ کیوں کیا۔ سلطنت کے کام میرے ہیں آپ کے نہیں۔''
''خدا کی قسم! اب میں تجھ سے کسی کام کے لیے نہیں کہوں گی۔''
''مجھے اس کی پروا نہیں بلکہ یہی میں چاہتا بھی ہوں۔''
خیزران کے غصے کا یہ عالم تھا کہ اس کا پورا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔
ہادی نے اسے پھر مخاطب کیا۔
''اگر آئندہ مجھے معلوم ہوا کہ میرا کوئی سردار فوج یا حاکم یا مصاحب آپ کے دروازے پر پہنچا ہے تو میں اس کا سر قلم کر دوں گا۔ آخر آپ کے دروازے پر ان لوگوں کی بھیڑ کیوں جمع رہتی ہے۔ کیا آپ کے پاس کرنے کو کچھ نہیں۔ اگر کچھ کرنے کو نہیں ہے تو قرآن کی تلاوت ہی کر لیا کریں۔ گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر چپ چاپ وقت گزاریں۔''
یہ اتنی سخت باتیں تھیں کہ وہ اس کے پاس اور زیادہ نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ اٹھ کر کھڑی ہو گئی لیکن حال یہ تھا کہ پاؤں رکھتی کہیں تھی پڑتا کہیں تھا۔ اسے شدت سے اپنی بے عزتی کا احساس ہو رہا تھا۔
خیزران کے چلے جانے کے بعد ہادی نے سرداران فوج کو طلب کیا اور ان سے پوچھا۔
''کون زیادہ بہتر ہے میں یا تم؟''
''امیر المومنین۔'' سب نے جواب دیا۔
''کیا تم میں سے کوئی گوارا کرے گا کہ لوگ اس کی ماں کے بارے میں چہ چا کریں۔''
''نہیں امیر المومنین۔ کون اس بات کو گوارا کرے گا۔'' سب لوگوں نے کہا۔
''پھر کیا بات ہے کہ لوگ میری ماں کے دروازے پر پہنچتے ہیں اور پھر اس کی باتوں اور کاموں کے بارے میں کہتے پھرتے ہیں۔''
بس وہ یہاں تک پہنچا تھا کہ سب سمجھ گئے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے اور کیوں کہہ رہا ہے۔ سب نے عہد کیا کہ وہ اپنے کاموں کے لیے خیزران کے دروازے پر دستک نہیں دیا کریں گے۔
خیزران کو اس کی اس کارگزاری کا علم ہوا تو سخت صدمے سے دوچار ہوئی۔ اس نے بھی قسم کھالی کہ وہ اب ہادی سے کسی کام کے لیے نہیں کہے گی۔
لوگوں نے بھی ہادی کے خوف سے اس سے کنارہ کشی کر لی۔
خیزران کا دبدبہ لوگوں پر سے ختم ہو گیا تھا اور اس کا ذمے دار وہ ہادی کو سمجھتی تھی اور اسے اس کی نافرمانی تصور کرتی تھی۔
وہ بے بس ہو کر خاموش ہو گئی تھی لیکن بیٹے کی طرف سے عداوت کے جذبات برابر ترقی کر رہے تھے۔ ہادی کا حال بھی مختلف نہیں تھا۔ اس نے بھی ماں کی طرف سے بالکل منہ موڑ لیا تھا۔ کبھی کبھی کسی آدمی کو بھیج کر اس کی خیریت دریافت کر لیتا تھا لیکن ویسے بالکل ترک تعلق تھا۔
ہارون رشید بھی بھائی کے عتاب اور خفگی کا شکار تھا۔ اس نے ہارون رشید کو معطل نہیں کیا۔ غربی حصے کی گورنری اب بھی اس کے پاس تھی لیکن عملاً وہ معطل ہو گیا تھا۔ اس کی نقل و حرکت اور سرگرمیوں کی سخت نگرانی کی جا رہی تھی۔ وہ کسی طرح بھی آزاد اور خود مختار نہیں رہا تھا۔ یحییٰ کا بھی اس نے قافیہ تنگ کر رکھا تھا۔
ہادی کے دل میں خیزران اور ہارون کے لیے نفرت کے سوا کچھ نہ تھا اور ہارون خوف میں مبتلا تھا کہ ابتدائی مہینوں میں یہ حال ہے تو آگے چل کر زندگی کیا رخ اختیار کرے گی۔
خیزران کی چالاکی نے اپنی طاقت کے زعم میں

آ کر مہدی کے ہاتھوں نفرتوں کا جو بیج بو دیا تھا وہ پودا اب جڑ پکڑنے لگا تھا۔ بدگمانیاں کیا رنگ دکھا رہی تھیں اس کا اندازہ ہارون اور موسیٰ کے درمیان ایک ملاقات سے ہوسکتا ہے۔

ہارون، بھائی سے ملاقات کے لیے آیا تو رسم کے مطابق اس کے ہاتھ کو بوسہ دے کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

”ہارون، وہ خواب کیا تھا۔ وہی شاخ سرسبز والا خواب۔“ ہادی نے اسے وہ خواب یاد دلایا جو کبھی مہدی نے دیکھا تھا۔ ”تم خوابوں کی دنیا میں رہتے ہو۔ اس چیز کے آرزو مند ہو جس سے تم بہت دور ہو۔ تمہاری یہ خواہش پوری ہونے والی نہیں۔ خواب میں تو یہ تھا کہ تمہاری مدت خلافت عرصہ دراز تک رہے گی۔ کہاں گئی وہ خلافت۔ کیا اب بھی تمہیں امید ہے کہ تم خلیفہ بنو گے؟“

”اے موسیٰ! اگر آپ نے جبر کیا تو خوار ہوں گے۔ اگر تواضع کا برتاؤ کیا سربلند ہو جائیں گے۔ اگر ظلم کیا تو خود بھی ہدف بنیں گے۔ اگر امر خلافت میرے ہاتھ آیا تو آپ کی اولاد کو اپنی اولاد سے برتر سمجھوں گا اور ان کی بیویوں کو اپنی لڑکیاں سمجھوں گا۔“

موسیٰ اس کے جذبے سے خوش ہو گیا اور اسے اپنے قریب آنے کو کہا۔ ہارون اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔

”ابھی میرے بھائی کے ساتھ ایک لاکھ دینار کر دو اور اسے خزانہ عامرہ تک لے جاؤ۔ وہاں جو کچھ یہ پسند کرے اسے لینے دو۔“ موسیٰ نے اپنے وزیر سے کہا۔

اس واقعے کے بعد دونوں کی بدگمانیاں کچھ دور ہو گئیں۔ ممکن ہے دونوں کے دل صاف ہو جاتے لیکن وقفہ قلیل نے سازشوں کو پھر دراز کر دیا۔ ہارون کو یہ باور کرایا گیا کہ ہادی کی تم پر نوازشیں صرف اس لیے ہیں کہ تم خاموش ہو کر بیٹھے رہو۔ تمہارا وہی حال ہونے والا ہے جو عیسیٰ بن موسیٰ کا ہوا۔ آل برمک کی خواتین خیزران کے کان ہادی کی طرف سے بھر رہی تھیں تاکہ ماں بیٹوں کے درمیان عداوت کی دیوار بلند ہوتی رہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مایوس ہو کر ہارون رشید کی طرف سے بالکل ہی غافل ہو جائے۔ اگر ہارون کو اقتدار نہیں ملا تو انہیں عیش کیسے ملے گا۔

کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو پچھلی سازشوں میں شریک رہے تھے اور اب ہوا کا رخ دیکھ کر ہادی کے بہی خواہوں میں شامل ہو گئے تھے اور اب اسے ماضی قریب کی تلخیاں یاد دلا کر یحییٰ کے خلاف اکسا رہے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ یحییٰ کو ہدف تنقید بنایا جائے تاکہ وہ مبتلائے مصیبت ہو۔ یہ باور کرایا جا رہا تھا کہ یہی وہ شخص تھا جو ہارون کو ولی عہد بنانے کی مہم چلا رہا تھا۔

ہادی مخالفتوں کی جن آندھیوں میں گھرا ہوا تھا اس کا تقاضا یہ تھا کہ ان نشانیوں کو ایک ایک کر کے ختم کر دے جو اس کی تباہی کا باعث بنی تھیں یا بن سکتی تھیں۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ ہارون سے ولی عہدی چھین لے گا تاکہ سازشوں کا خاتمہ ہو۔

اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہادی نے سرداران فوج، حکام، وزرا اور عمائد کو جمع کیا اور دل کی بات زبان پر لے آیا۔

”میں ہمیشہ مملکت کی بہتری کے لیے سوچتا رہا ہوں اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہارون رشید کو ولی عہدی سے محروم کر کے اپنے بیٹے جعفر کو ولی عہد مقرر کر دوں کیونکہ اگر میرے بعد خلافت کی باگ ڈور ہارون کے پاس چلی گئی تو ہارون کے پردے میں یحییٰ بن خالد اور میری والدہ حکمرانی کریں گی اور سلطنت کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے گا۔“

ہادی کی زبان سے یہ تجویز ادا ہوئی تھی کہ خوشامدیوں نے واہ واہ کا شور بلند کر دیا۔ اس کے فیصلے کی توثیق و تعریف کی جانے لگی۔

توثیق کرنے والے معمولی لوگ نہیں تھے۔ ان میں بڑی بڑی شخصیتیں شامل تھیں۔ ان میں یزید بن زید شیبانی بھی تھا جس نے دو مرتبہ روم پر چڑھائی کرنے والی فوج کی سپہ سالاری کی تھی۔

مخالفت میں بھی آوازیں بلند ہوئیں۔ یہ لوگ بھی معمولی نہیں تھے۔ سب سے بلند شخصیت تو فضل بن ربیع ہی کی تھی جو ہادی کا حاجب تھا۔

مخالفوں کے اعتراضات وہی تھے جو اس سے پہلے اس وقت سامنے آئے تھے جب ہادی سے ولی عہدی چھینی جا رہی تھی۔

”امیر المومنین! آپ تاریخ کو پھر الٹی طرف لے جا رہے ہیں۔ آپ کے صاحبزادے کی عمر صرف آٹھ سال ہے۔“

”ہارون اپنی ولی عہدی سے کبھی دست بردار نہیں ہوگا۔“

”فتنہ و فساد برپا ہوگا جو سلطنت کے لیے کسی طرح مناسب نہیں۔“

اعتراضات ہوتے رہے لیکن ہادی فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے حمایت کرنے والوں کی رائے کا احترام کیا اور

اعلان کر دیا کہ وہ اپنے بیٹے جعفر کی ولی عہدی پر عنقریب بیعت لے گا۔

ہادی کے اس فیصلے نے اس کی فوج اور حکام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ جن لوگوں کی بات نہیں مانی گئی تھی وہ اس وقت تو خاموش ہو گئے لیکن انہوں نے آپس میں مل کر فیصلہ کر لیا کہ وہ ایسا نہیں ہونے دیں گے۔

اندر اندر کھچڑی پھر پکنے لگی۔

ہارون رشید سے خاموشی سے کہہ دیا گیا کہ وہ ہرگز دست برداری پر تیار نہ ہو۔

ہادی نے پوری تیاری کر لی۔ وہ اب تک قصر خلد میں والدہ خیزران کے ساتھ ہی مقیم تھا لیکن اب اس نے یہ سکونت ترک کر کے ”قصر ابیض“ کو قصر خلافت کا درجہ دے دیا۔

اس کی منتقلی کے بعد قصر خلد کے دروازے یحییٰ پر کھل گئے۔ اس کے دونوں بیٹے فضل اور جعفر بھی آزادانہ گھومتے تھے۔

قصر خلد کا سازشی گروہ ایک لمحے کے لیے بھی ہارون رشید کو تنہا نہیں چھوڑ رہا تھا کہ کہیں وہ ہادی سے اتفاق کر کے ولی عہدی سے دست برداری پر اتفاق نہ کر لے۔

ہارون ان دونوں طرف کی پابندیوں سے اکتا گیا۔ ایک طرف ہادی تھا جس نے اس پر طرح طرح کی پابندیاں لگا رکھی تھیں دوسری طرف یہ سازشی گروہ اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ ایک دن اس نے تنگ آ کر یحییٰ سے صاف صاف کہہ دیا۔

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنے حق سے دست بردار ہو جاؤں تاکہ اس مصیبت سے چھٹکارا ملے۔“

”خبردار! ایسا ہرگز مت کرنا۔“ یحییٰ نے اسے سرزنش کی۔

یحییٰ نے اسے قائل کرنے کی بھرپور کوشش کی اور امید دلائی کہ وہ کچھ دن صبر کر لے خلافت کا پھل اس کی جھولی میں گرنے ہی والا ہے۔ ہارون رشید پھر مطمئن ہو گیا۔

ہادی چاہتا تھا کہ ہارون پابندیوں سے تنگ آ کر ولی عہدی سے دست بردار ہو جائے لیکن اسے یہ بھی اطلاعات مسلسل مل رہی تھیں کہ یحییٰ ہر بار اس کے ارادے کو تبدیل کر دیتا ہے اور اسے امیدیں دلاتا رہتا ہے۔ ہارون رشید اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا ہے۔

اس نے یحییٰ کو اپنے حضور طلب کیا۔ قربت کا شرف بخشا۔ انعام و اکرام سے نوازا۔ طرح طرح سے اسے رام کرنے کی کوشش کی لیکن یحییٰ کی روش میں کوئی فرق نہیں آیا۔

ایک دن یحییٰ قصر خلد آیا ہوا تھا۔ وہ ہارون رشید سے ملاقات کے بعد واپس جا رہا تھا کہ ہادی کے حمایتی سرداران فوج نے اسے گھیر لیا۔

یہ سب ہادی کے حکم سے ہو رہا تھا۔ اسے گرفتار کر کے ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں مقید کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہادی نے حکم دیا کہ ہارون کی سواری کے ساتھ جلوس اور خدم حشم نہ ہوا کریں حالانکہ اب تک ہر ولی عہد کے ساتھ یہ ہوتا آیا تھا۔

اب حال یہ ہو گیا تھا کہ خلیفہ کے خوف سے لوگوں نے ہارون کو سلام تک کرنا چھوڑ دیا۔ ہارون اپنی بے عزتی کی شکایت خیزران سے کر سکتا تھا اور وہ اس وقت بے بس تھی۔ یحییٰ قید کر دیا گیا تھا۔ دوسرے سازشی بھی ہادی کے خوف سے خاموش ہو گئے تھے۔

کچھ عرصہ اسی طرح گزر گیا تو کسی نے ہادی کو مشورہ دیا کہ یحییٰ کو رہا کر کے اس پر دباؤ ڈالا جائے۔ ہادی اس سفارش پر غور کرتا رہا پھر اس نے اپنے کچھ آدمیوں کو یحییٰ کے پاس قید خانے میں بھیجا۔ شاید وہ راہ راست پر آ گیا ہو۔

ان لوگوں نے یحییٰ سے ملاقات کی۔ یحییٰ نے ان سے بات کرنے سے انکار کر دیا اور اصرار کیا کہ وہ جو کچھ کہے گا تنہائی میں صرف ہادی سے کہے گا۔

اس کا یہ پیغام ہادی تک پہنچا دیا گیا۔ ہادی اس ملاقات پر تیار ہو گیا۔

”وہ کیا بات ہے جو تو مجھ سے کہنا چاہتا ہے۔“

”آپ مجھے قصوروار سمجھتے ہیں لیکن میں تو جو کچھ کر رہا ہوں مملکت کی بھلائی کے لیے کر رہا ہوں۔“

”تو مجھ سے میرے بھائی کو لڑانے کے بعد بھی کہتا ہے کہ اس میں مملکت کی بھلائی ہے۔“

”میں تو صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ لوگ راضی خوشی جعفر بن ہادی کی ولی عہدی تسلیم نہیں کریں گے جبکہ وہ صرف آٹھ سال کا بچہ ہے۔ کیا لوگ اسے اپنی نماز کا امام اور حج کا امیر بنا لیں گے؟“

”شاید نہیں۔“ سچی بات ہادی کی زبان پر آ گئی۔

”کیا آپ اس سے بھی انکار کریں گے کہ آپ کے خاندان کے اور دوسرے لوگ بھی اس عہدے کے

آرزومند ہیں۔ اس حالت میں آپ اپنے باپ کے بیٹے کو محروم کیسے دے رہے ہیں۔ اگر آپ نے ایک مرتبہ لوگوں کو عہد شکنی پر آمادہ کر دیا تو پھر یہ کام آئندہ بھی ہوگا۔

میری رائے یہ ہے کہ اپنے بھائی کو فی الحال اس کے منصب پر باقی رہنے دیجیے۔ جب ابوجعفر بڑا ہو جائے گا میں خود اسے لے کر رشید کے پاس جاؤں گا۔ وہ یقیناً ازخود دست بردار ہو جائے گا اور اس کے ہاتھ پر بیعت کر لے گا۔"

یحییٰ کے جوشِ خطابت نے ہادی کو مسحور کر دیا تھا۔ وہ سر جھکائے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

"یحییٰ! تو نے سچ کہا۔ خدا کی قسم! تو نے میرے سامنے وہ باتیں رکھی ہیں جن کی طرف ابھی تک میرا ذہن منتقل ہی نہیں ہوا تھا۔ اب میں ہارون سے ولی عہدی کی دست برداری کی بات نہیں کروں گا۔"

ہادی نے یحییٰ کو رہا کرنے کا حکم دے دیا۔

ہادی کے وہ حاشیہ نشیں جو یحییٰ کے خلاف تھے اس خوشگوار فضا کو کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ انہوں نے ہادی کو اکسانا شروع کر دیا۔ انہوں نے ایسی باتیں کیں جو رشید اور یحییٰ کے خلاف جاتی تھیں۔ ان کی دلیل یہ تھی۔

"ہم ایسے شخص کو اپنا خلیفہ بنانے پر کس طرح آمادہ ہو سکتے ہیں جو دوسرے شخص کے ہاتھ کا کھلونا بنا ہوا ہے۔"

دوسرے شخص سے ان کی مراد یحییٰ بن خالد برمکی تھا۔

"یحییٰ کی نیت یہ ہے کہ وہ آپ کو راستے سے ہٹا کر رشید کو خلافت پر متمکن کر دے اور خود وزارت پر قابض ہو جائے۔ یہ کام اس کے لیے یوں آسان ہو گیا ہے کہ آپ کی والدہ یحییٰ کا پورا پورا ساتھ دے رہی ہیں۔"

ہادی یہ باتیں سن کر پریشان ہو گیا۔

"آپ لوگ مجھے مشورہ دیں کہ میں کیا کروں۔"

"اس وقت ہارون آپ کے قبضۂ اقتدار میں ہے۔ اس پر جبر کریں اور یہ عہدہ اس سے چھین لیں۔ اگر اس کے حامیوں نے مزاحمت کی تو ہماری تلواریں آپ کے اقتدار کے لیے حاضر ہیں۔"

ہادی کا ذہن ایک مرتبہ پھر دوسرے پہلو پر سوچنے لگا۔ اس نے کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہارون سے ملاقات کی اور اس پر زور ڈالا کہ وہ ولی عہدی سے دست بردار ہونے کا اعلان کر دے لیکن رشید نے یہ بات نہیں مانی۔

ہادی نے اپنے خواص کے سامنے اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ جبراً ہارون رشید کو ولی عہدی سے محروم کر دے گا اور جعفر کی ولی عہدی پر لوگوں سے بیعت لے گا۔

یہ خبر جیسے ہی خیزران تک پہنچی اسے ہارون کی جان کی فکر ہو گئی۔ ہارون کسی طرح اپنے حق سے محروم ہونے کے لیے تیار نہیں تھا اور ہادی اپنی ضد پر اڑا ہوا تھا۔ وہ تو اب اس نتیجے پر پہنچنے لگی تھی کہ ہارون اپنے بھائی کی بات مان لے اور اپنی جان بچا لے۔ اس نے اپنی ایک کنیز کو یحییٰ کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا۔

"میرے بچے ہارون پر رحم کرو۔ کہیں تمہاری ضد اس کی جان نہ لے لے۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو کہ وہ اپنے بھائی ہادی کا مطالبہ پورا کر دے کیونکہ ہارون کی زندگی مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔"

یحییٰ نے اس پیغام کو سنا اور کنیز سے کہا۔

"واپس جا اور ان سے کہہ دے کہ آپ کو کیا ہو گیا ہے کہ ایسی باتیں کر رہی ہیں۔ میں میرے اہل و عیال اس واقعے سے پہلے قتل ہو جائیں۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں ہارون اور آپ کی بہتری کے لیے کر رہا ہوں۔ آپ خاموشی سے دیکھتی جائیں کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ ہارون کا دست بردار نہ ہونا ہی اس کے حق میں ہے۔"

خیزران کو برابر ایسی خبریں مل رہی تھیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ ہارون کی جان کو خطرہ ہے لیکن یحییٰ کی تسلیاں بھی اس کے سامنے تھیں۔ وہ فکرمند سہی لیکن خاموش بیٹھی رہی۔

اس پیغام کے بعد یحییٰ یہ سمجھنے لگا تھا کہ خیزران کے اعصاب جواب دینے لگے ہیں۔ ہادی بھی آخر اس کا بیٹا ہی تو ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی محبت بھی کبھی اس پر غالب آ جاتی ہو۔ اگر وہ ہاتھ اٹھا لیتی تو یحییٰ کا کامیاب ہونا مشکل تھا۔ خیزران کی غیر موجودگی میں اس کی حیثیت کیا رہ جاتی۔ اس نے سوچا کوئی ایسی ترکیب کی جائے کہ خیزران کے دل میں اگر ہادی کے لیے تھوڑی سی بھی جگہ ہے تو وہ بھی ختم ہو جائے۔ نفرت عداوت میں تبدیل ہو جائے۔ خیزران خود کہے کہ یحییٰ! میرے بچے کو اور مجھے ہادی سے بچاؤ۔ اس کے بعد میں ہادی کے خلاف جو بھی قدم اٹھاؤں گا خیزران نہ صرف خاموش رہے گی بلکہ میری حوصلہ افزائی بھی کرے گی۔ خیزران کا مزاج ایسا ہے کہ اگر ایک مرتبہ بگڑ جائے تو وہ بڑے سے بڑا اقدام کر سکتی ہے حتیٰ کہ اپنے لختِ جگر کو موت کے سپرد کرنے میں بھی تکلف سے کام نہیں لے گی۔ اس نے سوچا، اگر میں کسی طرح خیزران کو یہ باور کرا دوں کہ مہدی کو زہر دینے والا ہادی ہی تھا تو پھر خیزران کے دل میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہے گی لیکن اس سے پہلے مجھے کچھ اور بھی کرنا ہوگا۔

اس نے اپنی اسکیم پر عمل کرنے کے لیے محل کی دو باندیوں کو ورغلایا اور انہیں بھاری انعام کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ ان میں سے ایک باندی ایک خوان چاولوں سے بھرا ہوا خیزران کے پاس لائی۔ یہ دراصل یحییٰ نے اس کے حوالے کیا تھا لیکن اس باندی نے خیزران سے یہ کہا کہ امیر المومنین نے پلاؤ بھیجا ہے۔ یہ بھی کہلوا بھیجا ہے کہ اگر آپ اس میں سے تھوڑا سا چکھ لیں گی تو میں سمجھوں گا کہ آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے۔

خیزران خوش ہو گئی کہ ہادی کے دل سے اس کی ناراضی جاتی رہی ہے۔ اس نے خوان پوش اٹھایا اور چکھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

اب دوسری باندی کو اپنا کردار ادا کرنا تھا۔ اس نے فوراً ہاتھ پکڑ لیا۔

"ملکۂ عالیہ! ذرا ٹھہریے۔ میری ایک بات سن لیجیے۔ اتنے دن بعد جو یہ نوازش ہوئی ہے تو ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس میں کوئی ایسی چیز ہے جو آپ کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔"

"کیا بکتی ہے۔ میرے بیٹے نے کیا مجھے مارنے کے لیے اس میں زہر ملا دیا ہوگا؟"

"احتیاط میں کیا حرج ہے۔"

اس باندی نے ایک کتا منگوایا اور تھوڑے سے چاول اس کے آگے ڈال دیے۔ کتے نے جیسے ہی چاولوں پر منہ مارا اور چاول اس کے معدے میں اترے وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا اور تھوڑی دیر میں ٹھنڈا ہو گیا۔

"دیکھا آپ نے؟"

"میں دیکھ بھی رہی ہوں اور سمجھ بھی گئی ہوں۔ تخت و تاج کی حرص کسی کو اتنا گرا سکتی ہے یہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔" خیزران نے کہا اور خواب گاہ میں چلی گئی۔

اس کے سینے میں ایک طوفان تھا۔ ہادی میری اولاد ہے اور اس نے یہ حرکت کی۔ اسے دنیا کا کیا خدا کا خوف بھی نہیں ہوا۔ جب وہ مجھے مارنے کی کوشش کر سکتا ہے تو ہارون کس شمار میں ہے۔ وہ تڑپ کر بستر سے اٹھ گئی۔ وہ اس وقت غصے میں نہیں صدمے میں تھی اس لیے اس کا ذہن پوری طرح کام کر رہا تھا۔ اس نے دونوں باندیوں کو اپنے حضور طلب کیا۔

"یہ راز کسی پر ظاہر نہ ہو کہ ہادی نے میرے ساتھ کیا حرکت کی ہے۔"

"ملکۂ عالیہ، اس راز کو تو افشا ہونا چاہیے ورنہ امیر المومنین کی ہمت اور بڑھ جائے گی۔"

"یہ مجھے معلوم ہے اس راز کو کس وقت ظاہر ہونا چاہیے۔"

چند روز کے وقفے کے بعد یحییٰ بن خالد نے خیزران سے ملاقات کی اور چاولوں کا ذکر خود ہی اس نے چھیڑ دیا۔

"ملکۂ عالیہ! مجھے یہ سن کر سخت افسوس ہوا ہے کہ ہادی نے آپ کی بھی جان لینے کی کوشش کی۔ ایک مرتبہ وہ کامیاب ہو گیا تھا۔ اس مرتبہ آپ کی قسمت اچھی تھی۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ پہلی مرتبہ اس نے کس کی جان لی تھی؟"

"میں یہ بات کبھی آپ کے گوش گزار نہ کرتا لیکن اب ضروری ہو گیا ہے کہ میں آپ کو خبردار کر دوں۔ کیا آپ نے کبھی امیر المومنین مہدی کی ناگہانی موت پر غور کیا ہے؟"

"موت تو سب کو آتی ہے۔"

"معاملہ اتنا سیدھا نہیں۔ امیر المومنین بیمار نہیں تھے کہ بیماری موت کا بہانہ بن جاتی۔ انہیں زہر دیا گیا تھا اور زہر دینے والا آپ کا بیٹا ہادی تھا۔ جو اپنے باپ کو مار سکتا ہے وہ آپ کو کیوں نہیں۔ میں اس لیے خاموش رہا تھا کہ مرنے والا تو مر گیا اب مزید خون بہے گا۔ میں تو آپ کو بھی مشورہ دوں گا کہ یہ راز کسی پر ظاہر نہ ہو۔"

"یحییٰ، اب اس لڑکے کا زندہ رہنا ہم سب کے لیے خطرہ ہے۔"

"ابھی اس اقدام پر نہ سوچیں۔ میں کوئی درمیان کا راستہ نکالوں گا۔"

"میں ہارون کو خلیفہ دیکھنا چاہتی ہوں اور بس۔"

"یہی ہوگا۔ بس آپ دیکھتی جائیں۔"

یحییٰ نے بڑی ترکیب سے خیزران کے دل میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ اس کا بیٹا اسے زہر دے کر ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ اب اگر ہادی کو بھی زہر دے دیا جاتا تو خیزران کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔

غالباً ہادی کو بھی زہر خورانی کے اس واقعے کی اطلاع مل چکی تھی۔ اس نے اس کی وضاحت کے لیے یحییٰ کو طلب کیا۔

"میں چاہتا ہوں کہ میرے اور میرے بھائی کے مابین نفرت پھیلانے کا عمل بند کر دو۔ کیا تم میرے خلاف فساد انگیزی نہیں کرتے رہے ہو؟"

"میں تو صرف وہ کام کر رہا ہوں جو خلیفہ مہدی نے میرے سپرد کیا تھا۔ آپ نے بھی اس کی تجدید کی تھی۔ میں

نے تو آپ کے حکم کی تعمیل کی تھی۔"

"میری والدہ کو زہر شدہ کھانا بھیجنے کا حکم بھی میں نے نہیں دیا تھا۔"

"مجھ تک بھی اس واقعے کی اطلاع پہنچی ہے لیکن مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ یہ کھانا آپ کی طرف سے آیا تھا۔"

"وہ تو خیر میں تحقیق کرلوں گا۔"

اسی دن دونوں کنیزیں مردہ پائی گئیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ انہیں کس نے قتل کرادیا۔

ان کی موت کی تصدیق ضرور ہوتی لیکن اسی دوران ہادی علویوں کی شورش اور بغاوت کے استحصال میں لگ گیا جو حجاز میں برپا ہوئی تھی اور بالآخر اس بغاوت کے سرغنہ کے قتل پر ختم ہوئی۔

اس بغاوت کے فرو ہونے کے بعد ہادی نے پھر ہارون کو مجبور کرنا شروع کیا کہ از خود ولی عہدی سے دستبردار ہوجائے۔

رشید اتنا مجبور ہوگیا کہ ایک مرتبہ پھر وہ یحییٰ کے پاس آیا۔

"اب معاملہ میری برداشت سے باہر ہوچکا ہے۔ اب آپ درمیان سے ہٹ جائیں۔ میں بھائی کی بات مان کر ولی عہدی سے دست بردار ہوئے جاتا ہوں۔"

"ایسا نہ کرنا۔"

"اب میری یہاں کیا عزت رہ گئی ہے۔"

"تم ہادی سے اجازت لے کر شکار پر چلے جاؤ۔ جب یہاں سے ہٹ جاؤ گے تو بہت سے معاملات خود بخود رفع ہوجائیں گے۔"

یحییٰ کچھ اور بھی سوچ چکا تھا لہٰذا اس نے یہ بھی کہا۔

"یاد رکھو ہادی کا زمانہ بہت تھوڑا رہ گیا ہے۔"

رشید نے اس کی بات مان تو لی لیکن اس نے ہادی سے اجازت لینا مناسب نہ سمجھا۔ وہ اجازت لیے بغیر شکار پر روانہ ہوگیا۔

ہادی کو جب معلوم ہوا کہ وہ شکار کے لیے روانہ ہوا ہے تو اسے تشویش ہوئی۔ پس پردہ کوئی سازش نظر آئی۔ چالیس دن گزر گئے اور ہارون رشید واپس نہ آیا۔ ہادی نے اسے خط لکھا کہ فوراً واپس آجائے لیکن ہارون پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔

یحییٰ اسے برابر خبردار کر رہا تھا کہ وہ ٹال مٹول سے کام لیتا رہے۔

ہادی کا پیمانۂ صبر لبریز ہو رہا تھا۔ اس نے یحییٰ کو طلب کیا۔ آج اس کا انداز ہی دوسرا تھا۔

"میں سمجھ رہا ہوں کہ تم نے اسے شکار پر کیوں بھیجا ہے۔ اس لیے کہ میں اسے مجبور نہ کرسکوں۔ تم چاہتے ہو کہ ہارون خلیفہ بن جائے اور تم وزارت کے پردے میں حکومت کرو۔ میں تمہاری یہ آرزو کبھی پوری نہ ہونے دوں گا اس سے پہلے ہی میں تمہیں قبر کے کنارے پہنچادوں گا۔"

یحییٰ کو ایک ایسی تنگ کوٹھری میں قید کردیا گیا جہاں پاؤں پھیلانا ممکن نہیں تھا۔ بس وہ پاؤں سمیٹے بیٹھا رہ سکتا تھا۔ اس حالت میں اگر زیادہ دن گزر جاتے تو اس کا مرجانا لازمی تھا۔ آخر ہادی کا ایک وزیر یحییٰ کے کام آیا اور اس نے سفارش کرکے اسے دوسرے قید خانے میں بھجوادیا۔

یحییٰ کو قید کرنے کے بعد ہادی نے عمائدواعیان کو طلب کیا اور ان سے ہارون کی سبکدوشی کے بارے میں مشورہ کیا۔

رفقا نے مشورہ دیا۔ "جعفر اس وقت تک ولی عہد نہیں بنائے جاسکتے جب تک ہارون رشید اپنے حق سے دستبردار ہونے کا اعلان نہ کردیں۔"

"یہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔ اس کے علاوہ کوئی راستہ بتاؤ۔"

"ایک راستہ یہ ہے کہ جو لوگ ہارون کے حق میں بیعت کرچکے ہیں وہ اپنی بیعت توڑ دیں۔"

بعض نے یہ بھی کہا۔

"ہارون کو معزول کیا جاسکتا ہے اور جعفر کے لیے بیعت لی جاسکتی ہے۔"

ہادی نے پہلی رائے کو اہمیت دی کہ محفوظ راستہ یہی تھا۔ ایک لشکر روانہ کیا کہ جزیرہ، مصر اور مغرب میں اگر کوئی بیعت سے انکار کرے تو اس کی سرکوبی کرنے میں تامل نہ کرے۔ اگر علاج تلوار سے ہو تو تلوار چلائے۔ سالار فوج محمد بن فروخ نے سامان سفر تیار کیا اور لشکر کے ساتھ شام کی طرف روانہ ہوگیا۔

یحییٰ بن خالد قید ہوچکا تھا۔ ہارون کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ بغداد میں کیا ہو رہا ہے۔ اسے یہ تشویش ضرور تھی کہ یحییٰ کا کوئی پیغام کیوں نہیں پہنچا۔ اسی لیے وہ شکار سے واپس آگیا۔

وہ خیزران سے ملا تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اسی کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ یحییٰ گرفتار کرلیا گیا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ایک لشکر شام کی طرف گیا ہے جو فسخ بیعت کے لیے جبر و زور سے کام لے گا۔

ہارون نے ضروری سمجھا کہ وہ ہادی سے ملے۔ وہ رصافہ کی طرف چل دیا جہاں ہادی اپنے محل "قصر ابیض" میں مقیم تھا۔

راستے میں اس نے دیکھا کہ لوگ کچھ بدل گئے ہیں۔ جو اسے دیکھتا ہے منہ دوسری طرف پھیر لیتا ہے۔ لوگ خوفزدہ ہیں یا مجھ سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ وہ یہی سوچتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ اس کا گزر ایک پل پر سے ہوا۔ اسی وقت جعفر بن موسیٰ کی سواری اس طرف سے گزری۔ اس سواری کے ساتھ فوج کا ایک افسر بھی تھا۔

جب اس فوجی افسر نے ہارون کو دیکھا تو چیخ کر کہا۔

"وہیں ٹھہرے رہو۔ دیکھتے نہیں ولی عہد کی سواری گزر رہی ہے۔"

وہ چپ چاپ کھڑا ہوگیا۔ جب جعفر کی سواری گزر گئی تو ہارون نے پل پار کیا۔

ہارون کی اس سے پہلے ایسی توہین نہیں ہوئی تھی۔

وہ جب بھائی کے پاس پہنچا تو سخت غصے میں تھا۔ ممکن ہے مصالحت کے لیے آیا ہو لیکن اب معاملہ دوسرا تھا۔

"ولی عہد میں ہوں اور ولی عہدی کے نعرے دوسروں کے لیے بلند ہو رہے ہیں۔" ہارون نے کہا اور پل سے گزرتے ہوئے اس وقت کا پورا واقعہ سنایا۔

"اسی لیے تو کہتا ہوں ہوا کا رخ پہچان لو۔ شکار کے بہانے کب تک مجھ سے بھاگتے رہو گے۔"

"ولی عہد میں ہوں تاوقتیکہ میں خود اس سے دست بردار نہ ہوجاؤں۔"

"تو ہوجاؤ دستبردار۔ میں تمہیں اتنا مال و زر دوں گا کہ زندگی بھر عیش کرو گے۔ میرا بھائی ہونے کی عزت پھر بھی تمہیں حاصل رہے گی۔"

"جو حق میرے باپ نے مجھے دیا ہے، میں اسے نہیں لوٹا سکتا۔"

"اس کا نتیجہ جانتے ہو؟"

"نتیجہ کچھ بھی ہو۔"

"میں تمہیں قید کرسکتا ہوں۔"

"اس کے بعد بھی میں اپنے قول پر قائم رہوں گا۔"

ہادی نے اسے قید کردیا۔ اسے ایک گھر میں رکھا گیا اور اس کی نگرانی پر ایرش نامی ایک شخص کو مامور کردیا۔ اسے کسی سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔

ہارون کا باہر کی دنیا سے کوئی رابطہ نہیں رہ گیا تھا۔ قید کیسی بھی ہو قید ہوتی ہے لہٰذا ہادی یہی سمجھ رہا تھا کہ چند دن اکیلے گھر میں رہ کر وہ میری بات مان لے گا۔ ہادی کبھی کبھی اس سے ملنے چلا بھی جاتا تھا اور ہر مرتبہ اپنا مطالبہ دہراتا تھا لیکن رشید اپنی جگہ اٹل تھا۔

اس طرف سے مایوس ہونے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ یحییٰ جب تک ہے ہارون کسی طرح دست برداری پر تیار نہیں ہوگا اسے قتل کرادیا جائے۔ جب ہارون کو یہ معلوم ہوگا کہ اس کا حمایتی اس دنیا میں نہیں رہا تو وہ ہار مان لے گا۔ دیگر سازش کرنے والے بھی دبک کر بیٹھ جائیں گے۔

اس نے چند بھروسے کے آدمیوں کو اپنے پاس بلایا تاکہ یحییٰ بن خالد کو قتل کردینے کے بارے میں مشورہ کرے۔ یہ لوگ اپنی اپنی رائے دیتے رہے۔ کئی گھنٹوں بعد بھی مجلس کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی کہ اچانک ہادی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور کسی کام کا عذر کرکے محل کی طرف روانہ ہوا۔

"آپ لوگ صلاح مشورہ جاری رکھیں۔"

ہادی واپس نہیں آیا بلکہ یہ اطلاع آئی کہ وہ علیل ہوگیا ہے اور بستر پر ہے لہٰذا مجلس برخاست کی جائے۔ ان لوگوں میں ابراہیم حرکانی بھی تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس کی سفارش پر ہادی نے یحییٰ کو تنگ قید خانے سے دوسری جیل میں منتقل کیا تھا۔ اس پر ہادی بہت بھروسا کرتا تھا لیکن ہادی کی بدقسمتی کہ یہ یحییٰ کے ساتھ سازش میں شریک تھا۔ ہادی کو گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ مجلس میں بیٹھا ہوا ابراہیم حرکانی اس کے خلاف کسی سازش میں شریک ہوگا۔

ابراہیم حرکانی مجلس سے نکل کر سیدھا اس قید خانے کی طرف گیا جہاں یحییٰ قید تھا۔

"میں ہادی کا ایک پیغام لے کر آیا ہوں۔ مجھے یحییٰ سے ملنے دو۔"

پہرے داروں نے اسے جانے دیا۔

یحییٰ نے بھاری قفل کھلنے کی آواز سنی۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا کہ دیکھو کون آیا ہے اور کیا پیغام لایا ہے۔ ابراہیم تہ خانے کی بھاری سیڑھیاں اتر کر وہاں پہنچ گیا جہاں یحییٰ بیٹھا ہوا تھا۔

"ابراہیم تم! تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اگر ہادی کو معلوم ہوگیا کہ تم مجھ سے ملنے آئے تھے تو تمہاری جان خطرے میں پڑجائے گی۔"

"اب بات خطروں کی حدود سے نکل گئی ہے یحییٰ۔ میں تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ ہادی نے تمہارے قتل کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے ایک مجلس بھی طلب کی

تھی۔ میں بھی وہاں شریک تھا۔ وہیں سے چلا آرہا ہوں۔"

"کیا فیصلہ ہوا؟"

"تمہاری قسمت اچھی تھی کہ ہادی مجلس سے اٹھ کر چلا گیا۔ بعد میں خبر آئی کہ وہ علیل ہے۔ کسی فیصلے پر پہنچے بغیر مجلس کا خاتمہ ہوگیا۔"

"تم اگر میرے قتل کے فیصلے کو کچھ دنوں کے لیے ملتوی کرادو تو پھر ہادی تم سے یا کسی سے یہ نہیں کہے گا کہ یحییٰ کے قتل کی تدبیر سوچو۔"

"یہ فیصلہ فی الحال تو ملتوی ہی سمجھو۔ میں تو تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ سوچ سکتے ہو تو کچھ سوچو۔"

"باہر کھڑے پہرے داروں میں ایک فضیل ہے۔ جاتے وقت اس سے مل لینا۔ تمہیں پیغام رسانی میں آسانی ہوگی ورنہ بار بار تمہارا یہاں آنا ٹھیک نہیں۔ ہوسکتا ہے ہادی کے جاسوس بھی یہاں ہوں۔"

ابراہیم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا۔ قید خانے سے باہر نکلا تو ایک شخص اس کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔

"میرا نام فضیل ہے۔ میں آپ سے کہاں مل سکتا ہوں۔"

ابراہیم کو تعجب ہوا کہ اس شخص کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں اس سے ملنے کا خواہاں ہوں لیکن یہ وقت تعجب کا نہیں تھا۔ ابراہیم شہر سے باہر ایک محل تعمیر کرا رہا تھا جس کا جائزہ لینے وہ روز وہاں جایا کرتا تھا۔ اس نے فضیل کو بتادیا کہ وہ شام کے وقت وہاں آسکتا ہے۔

"اگر میں وہاں نہ بھی ہوا تو میرا کوئی آدمی مجھے بلا لے گا۔ اگر مجھے تمہاری ضرورت پڑی تو میں اپنا کوئی آدمی تمہارے پاس بھیج دوں گا۔"

دوسرے دن وہ سارے لوگ پھر جمع ہوئے جو یحییٰ کے قتل کے سلسلے میں مشورے کے لیے بلائے گئے تھے۔ مشورے پھر جاری ہوگئے۔ وہ تمام لوگ جو ہارون کی معزولی کے بارے میں خلیفہ کے ہم رائے تھے بضد تھے کہ یحییٰ کو قتل کرادیا جائے۔

"دیکھو بھائیو! ہارون ابھی تک قانونی طور پر ولی عہد ہے۔ خلیفہ علیل ہیں۔ اگر اس علالت میں ان کا انتقال ہوگیا تو وزیر یحییٰ بنے گا اور ہمیں ایک ایک کرکے قتل کرڈالے گا لہٰذا ہمیں یحییٰ کو قتل کرنے میں جلدی کرنی چاہیے۔"

ابراہیم حرکانی کو یحییٰ کا پیغام مل چکا تھا کہ قتل کا فیصلہ جب تک ہوسکتا ہو ٹال مٹول کا شکار رکھو۔ اس نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"یہ ضروری تو نہیں کہ خلیفہ کا انتقال ہی ہوجائے۔ ہمیں تو اس کی تندرستی کی دعا کرنی چاہیے۔ اگر وہ تندرست ہوگیا اور یحییٰ کے قتل کے بارے میں اس کی رائے بدل گئی تو وہ یہ سوال ضرور کرے گا کہ اس سے پوچھے بغیر ہم نے یحییٰ کو قتل کیوں کیا۔ سوچو اس وقت ہم کیا جواب دیں گے۔ کیا خلیفہ کے عتاب کا شکار نہیں بنیں گے۔"

دیگر کئی لوگوں نے بھی ابراہیم کی رائے سے اتفاق کیا۔ ان میں وہ لوگ یقیناً شامل تھے جو یحییٰ کے لیے جاسوسی اور مخبری کرتے رہے تھے۔

یحییٰ نے یہ اہتمام کیا تھا کہ ایک جاسوس کو دوسرے کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ یہ اہتمام اس لیے کیا گیا تھا کہ راز کھل نہ جائے۔

جب مخالفت کی آوازیں بھی بلند ہوئیں تو طے پایا کہ جب تک صورت حال واضح نہ ہوجائے قتل یحییٰ کو معرض التوا میں رکھا جائے۔

اسی شام فضیل نے ابراہیم سے نوتعمیر محل میں ملاقات کی اور یحییٰ کا پیغام پہنچایا۔

"قصر خلد میں خالصہ نام کی ایک جاریہ (باندی) ہے۔ آپ ملکہ عالیہ خیزران سے ملیں اور اس جاریہ کو پیغام پہنچا دیں کہ وہ اپنی بہن کو جو قصر ابیض میں خلیفہ کی تیمارداری کے لیے موجود ہے پیغام پہنچادے کہ اب وقت آگیا ہے۔"

"کس چیز کا وقت آگیا ہے۔"

"مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا۔"

ابراہیم قصر خلد گیا اور یحییٰ کا پیغام خیزران تک پہنچادیا۔

اگلے دن خیزران نے جیل میں یحییٰ کو پیغام پہنچادیا۔

"وہ شخص اپنے انجام کو پہنچنے والا ہے۔ وہ قطعاً ہلاک ہوجائے گا۔ تم ضروری اقدامات کے لیے تیار ہوجاؤ۔"

یحییٰ نے خیزران کے دل میں اتنی بدگمانیاں پیدا کردی تھیں کہ وہ بیٹے کی ہلاکت کے لیے بھی خوشی خوشی تیار ہوگئی۔ پہلے تو اسے اپنی جان کی فکر تھی اب رشید کی جان بھی خطرے میں تھی۔ اس نے دو جانیں بچانے کے لیے ایک جان قربان کردی۔

پیغام ملتے ہی یحییٰ نے اپنے بیٹے فضل کو پیغام بھیجا کہ برمکی کاتبوں کو جمع کرو اور رشید کی طرف سے تمام عمال کو فرمان جاری کریں کہ وہ فوراً لوگوں سے اس کے لیے بیعت کریں اور اپنی ذمے داریاں بہ دستور سرانجام دیتے رہیں۔

فضل نے باپ کے حکم کی تعمیل کی اور کاتبوں سے

فرمان لکھوالیا۔

سازشیں اپنا کام کررہی تھیں۔ خالصہ نے اپنی بہن کو پیغام پہنچادیا تھا۔ وہ خلیفہ ہادی کی تیمارداری پر متعین تھی۔ پیغام ملتے ہی وہ موقع کی تاک میں لگ گئی۔ یہ موقع اسے جلد ہی مل گیا جب ہادی گہری نیند سوگیا۔ اس باندی نے جو ہاتھ پیروں کی نہایت مضبوط تھی۔ اس کے بازو پہلوانوں کی طرح سخت تھے۔ نہایت فربہ اندام اور باوزن تھی، خلوت سے فائدہ اٹھالیا۔ ایک تکیہ ہادی کے منہ پر رکھا اور اس پر بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھوں سے پلنگ کو پکڑلیا۔ ہادی مرد تھا۔ جری بھی تھا اور طاقتور بھی۔ اس نے ہاتھ پاؤں چلائے لیکن اس باندی کو اپنے اوپر سے ہٹا نہ سکا۔ کچھ دیر تڑپا اور پھر ٹھنڈا ہوگیا۔ وہ اس کے اوپر سے اٹھی اور اچھی طرح سے اطمینان کرلینے کے بعد کہ وہ مرچکا ہے اس کے بستر کی شکنیں درست کیں اور شور مچادیا کہ خلیفہ کا انتقال ہوگیا ہے۔

موسیٰ ہادی کی وفات کا اعلان کردیا گیا۔

خیزران نے ایک پیام کے ذریعے یحییٰ کو اس واقعے کی اطلاع دی۔ اطلاع پہنچانے والے نے اسے جیل سے رہا کیا اور وفات کی خبر سنادی۔

یحییٰ قید خانے سے نکلا اور سیدھا قصر ابیض پہنچا جہاں ہادی کی لاش رکھی ہوئی تھی۔ ابھی تک کوئی حکومتی کارندہ وہاں نہیں پہنچا تھا۔ کچھ دیر بعد بعض سالاران فوج اور ابراہیم حرکانی پہنچ گئے۔ یحییٰ انہیں لے کر اس مکان پر پہنچا جہاں ہارون کو نظر بند کیا گیا تھا۔

ہارون اس وقت سو رہا تھا۔ نصف شب گزر چکی تھی۔ ہارون گہری نیند میں تھا۔ یحییٰ نے اسے بیدار کیا۔

"امیرالمومنین! خواب راحت سے بیدار ہوجایئے۔"

ہارون ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور امیرالمومنین کہنے پر یحییٰ کی سرزنش کی۔

"آپ نے مجھے امیرالمومنین کہہ کر پکارا۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ اگر یہ بات ہادی تک پہنچ گئی تو آپ کا اور میرا کیا حشر ہوگا۔"

"ہادی کا انتقال ہوگیا ہے۔"

"کیا!" اس کی نیند اڑ گئی۔ "یہ مذاق ہے یا آپ کسی سازش کا شکار ہوئے ہیں؟"

"نہ یہ مذاق ہے نہ میں سازش کا شکار ہوا ہوں۔ میں خود اس کی لاش دیکھ کر آرہا ہوں۔ میں آزاد ہوں یہ پہلا ثبوت ہے اور ہادی کی انگشتری میرے پاس ہے یہ دوسرا ثبوت ہے۔ تخت آپ کا انتظار کررہا ہے۔ دروازے پر ابراہیم حرکانی آپ کا منتظر ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ خبر بعض فسادیوں کو فساد پر آمادہ کرے آپ تشریف لے چلیے اور انتظامات سنبھالیے۔"

ہارون نے جلدی جلدی اپنا لباس درست کیا اور ابراہیم حرکانی کی معیت میں قصر ابیض پہنچ گیا۔ طے یہ ہوا کہ سپیدیٔ سحر نمودار ہونے سے پہلے ہادی کا جسد خاکی پیوند خاک کردیا جائے۔

ہارون نے میت کے غسل کا حکم دیا۔ نماز جنازہ پڑھائی اور اس کے بعد ہادی کو قصر ابیض میں دفن کردیا گیا۔

یہ رات ایک تاریخی رات تھی۔ مختصر سی رات میں کئی واقعات ایک ساتھ روبہ عمل ہوئے۔ اسی رات ہادی اپنے خالق حقیقی سے جاملا۔ اسی رات ہارون رشید قید سے رہا ہوا۔ اسی رات ایک جاریہ کے بطن سے اس کا ایک بچہ تولد ہوا۔ اس بیٹے کا نام اس نے عبداللہ رکھا جو بعد میں مامون کے نام سے شہرۂ آفاق ہوا۔

ایک خلیفہ دنیا سے رخصت ہوا۔ ایک خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کی گئی اور ایک خلیفہ پیدا ہوا۔

اس رات کی صبح ہوئی تو ہارون نے اپنے بھتیجے، ہادی کے بیٹے جعفر بن ہادی کو طلب کیا۔ اسے ایک اونچی جگہ پر کھڑا کیا اور حکم دیا کہ عمائد و اعیان کے سامنے حق ولی عہدی سے دست برداری کا اعلان کرے۔

اس نے فوراً عمل کیا۔

"جس کی گردن میں میری بیعت کا حلقہ ہو اسے میں اس عہد سے آزاد کرتا ہوں۔ خلافت میرے چچا ہارون رشید کا حق ہے۔ میرا اس میں نہ کوئی حق ہے نہ مطالبہ۔"

یہ سب تقریبات قصر ابیض میں ہورہی تھیں۔ یہیں خلافت پر بیعت ہوئی۔ خطیب نے آواز دی۔

"اٹھو اور خلیفۂ وقت کی بیعت کے لیے ہاتھ بڑھادو۔ عہد پر قائم رہو۔ اللہ تم سے راضی رہے اور تمہاری حفاظت کرے۔"

بیعت کے لیے لوگ ٹوٹ پڑے۔

جب بیعت ہوچکی تو ہارون رشید نے یحییٰ سے پوچھا۔

"اب کیا کیا جائے؟"

"میری رائے یہ ہے کہ کچھ روز یہیں قیام کیجیے البتہ ہم میں سے کچھ لوگ بغداد چلے جائیں تاکہ وہاں فضا ہموار ہو۔ اس کے بعد ایک بڑے جلوس کے ساتھ بغداد جایا جائے۔"

"میں بغداد روانہ ہونے سے قبل کچھ اور بھی چاہتا

ہوں۔ میں ان اذیتوں کو بھولا نہیں ہوں جو اب تک مجھ پر گزری ہیں۔ پل پر سے گزرتے ہوئے ابوعصمہ نے جس حقارت سے مجھے ڈانٹا تھا اور سلامہ ابرش نے قید کے زمانے میں جو تکلیفیں مجھے پہنچائی ہیں انہیں میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ ابراہیم حرکانی کی وہ بدکلامی بھی مجھے یاد ہے جو اس نے ہادی کے سامنے مجھ سے کی تھی۔ میں ان سب کے سر قلم کراؤں گا۔"

یحییٰ بن خالد کے لیے یہ تو ممکن نہیں تھا کہ وہ ہارون کو اس اقدام سے باز رکھتا لیکن اسے یہ خوف ہوا کہ کہیں یہ لوگ مرتے وقت اس سازش کا بھانڈا نہ پھوڑ دیں جو اس نے "رشید" کو برسرِ اقتدار لانے کے لیے کی تھی۔ اس سازش سے رشید بے خبر تھا۔ خاص طور پر ابراہیم حرکانی کا قتل وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا۔

اس نے سفارش کی۔ "ابوعصمہ تو بے شک ناقابلِ معافی مجرم ہے لیکن سلامہ مجبور تھا۔ وہ حکم کی اطاعت کر رہا تھا۔ ابراہیم حرکانی کی طرف سے آپ دل صاف کرلیں۔ وہ ہمارا مخالف بھی نہ تھا۔ اس نے کسی مصلحت کے تحت کچھ کہا ہوگا۔"

اس سے زیادہ وہ سفارش نہیں کرسکتا تھا۔

ہارون نے ابوعصمہ کا سرقلم کرادیا۔ سلامہ اور ابراہیم کو جیل میں ڈال دیا (یہ دونوں بعد میں یحییٰ کی سفارش سے رہا کردیے گئے تھے)

◆◆◆

سابق خلیفہ ہادی کی وفات کی خبر بغداد پہنچی تو گویا اتنی اچانک تھی کہ لوگوں کو صدمے سے زیادہ حیرت ہوئی۔ اس انتقال میں کوئی سازش چھپی صاف نظر آرہی تھی۔ لوگ اتنے خوفزدہ تھے کہ کھل کر بات کرتے ہوئے ڈر رہے تھے۔ ایک دوسرے سے سرگوشی میں سوال جواب کرتے پھر رہے تھے۔ فضا مسموم ہوگئی تھی لیکن ہارون رشید کی سواری کی خبر پہنچی تو سب استقبال کو نکل آئے۔ سڑکوں پر ہجوم ہوگیا۔ عورتیں چھتوں اور کھڑکیوں پر نئے خلیفہ کو دیکھنے کے لیے آگئیں۔

جب ہارون کی سواری پل کے قریب پہنچی تو منظر دیدنی تھا۔ ہارون بنوعباس کی معزز شخصیتوں کے درمیان گھرا ہوا نظر آیا۔ وہ سیاہ لباس زیب تن کیے جواہر دار دستے کی تلوار لٹکائے مبارک بادوں کا جواب زیرِ لب تبسم سے دیتا چلا آرہا تھا۔ پشت پر افسرانِ فوج، فقہا، علما اور منصب داروں کی قطاریں تھیں۔

اس کی سواری قصرِ خلد پہنچی۔

نمازِ جمعہ کا وقت آیا رشید قصرِ خلد سے جامع مسجد میں پہنچا۔ ہارون نے خود امامت کی اور اس کے بعد صحنِ مسجد میں بیٹھ گیا۔ یہاں وہ لوگ بیعت کے لیے پیش ہوئے جو قصر اسیفی میں حاضر نہ ہوسکے تھے۔

دوسرے دن ہارون رشید نے محل میں دربارِ عام منعقد کیا۔ یحییٰ بن خالد کو منصبِ وزارت سونپا اور مہرِ وزارت عطا کی۔

"اپنی ذمے داری کا حلقہ آپ کی گردن میں ڈالتا ہوں آپ جو حکم چاہے نافذ کیجیے۔ میں آپ کے کسی معاملے میں مداخلت نہیں کروں گا۔"

شعرا نے قصائد پیش کیے۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ سورج اندھا ہوا تھا
لیکن جب ہارون نے حکومت ہاتھ میں لی تو اس کا نور ہر طرف
پھیل گیا
ہارون کے رخِ روشن سے دنیا نے جمال حاصل کیا
ہارون والی ہے اور یحییٰ اس کا وزیر۔

◆◆◆

یحییٰ نے وزارت حاصل ہوتے ہی گرد و پیش پر نظر ڈالی تو میدان صاف تھا۔ تمام سیاسی حریف منظرنامے سے غائب ہوچکے تھے۔ کچھ مر گئے تھے، کچھ مار دیے گئے، کچھ جیل میں تھے۔ کوئی نہیں تھا جو اس کے اثر و نفوذ میں مزاحم ہوسکے۔ ایک خیزران تھی جس سے بچنے کا کوئی طریقہ اس کے پاس نہیں تھا۔

خیزران اب بھی قدیم روش پر قائم تھی۔ امورِ مملکت میں اسی طرح دخل انداز ہورہی تھی۔ یحییٰ نے غور کیا تو سپر انداز ہونے کے سوا اس کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ اسے خیزران کی ابھی ضرورت بھی تھی تاکہ قصرِ خلافت سے اٹھنے والی لہروں سے مقابلہ کرنے کے لیے خیزران کی پشت پناہی اسے حاصل رہے۔

خیزران کو خوش کرنے کے لیے وہ ہر اہم کام میں اس سے مشورہ کرنے لگا۔ خیزران کو مزید رام کرنے کے لیے اس نے تحائف کا سلسلہ دراز کردیا۔ کبھی کوئی گاؤں نذر کر دیتا کبھی کوئی باغ پیش کرتا۔ اتنی عنایات کے بعد خیزران اس سے کیوں پوچھتی کہ وہ خود کتنا کما رہا ہے۔

دونوں ایک دوسرے کے خاموش مددگار بنے ہوئے تھے۔

یہی حال خود رشید کا تھا۔ اس نے سارا بار یحییٰ کے کندھوں پر ڈال دیا تھا۔ خیزران موجود تھی جو اسے خطرات سے بچاسکتی تھی۔ اس نے لگام اماں کے ہاتھوں میں دے دی تھی اور خود اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

رشید کا سارا وقت شاعروں کی مجالس اور نغمہ و سرور کی محافل میں بسر ہو رہا تھا۔

یحییٰ کو اور کیا چاہیے تھا۔ وہ کیوں چاہتا کہ رشید امورِ مملکت کی طرف متوجہ ہو بلکہ اس نے تو اپنے بیٹوں فضل اور جعفر کو اس کا ندیمِ خاص بنادیا کہ اگر کبھی وہ راہِ راست پر آنا بھی چاہے تو نہ آسکے۔ یہ دونوں قصرِ خلد کے مستقل مکین بن گئے۔ ہارون رشید کے پیچھے سائے کی طرح لگے رہتے۔ اپنے بھائی محمد بن خالد کو حاجب بنادیا تاکہ وہ مجلس کا انتظام کرے اور لوگ ہارون کی خدمت میں حاضر ہوں تو وہ وہاں موجود رہے۔

اب ہارون پوری طرح یحییٰ کے شکنجے میں تھا۔ اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ ہر طرف یحییٰ کے آدمی موجود ہیں اور کیوں ہیں؟

یحییٰ کو پورا موقع مل رہا تھا کہ وہ اپنی من مانی کرتا رہے۔ اس نے آہستہ آہستہ حکومت کے تمام شعبوں پر قبضہ کرلیا۔ البتہ مہر بردار کا منصب ایسا تھا جس پر ایک ایسا شخص فائز تھا جو منصور کے زمانے سے چلا آرہا تھا اور یحییٰ کی طرف سے بھیجے گئے ہر کاغذ پر مہر نہیں لگاتا تھا بلکہ کسی فرمان پر ذرا بھی شک ہوتا تو ٹال مٹول سے کام لیتا تھا۔ بالآخر کوئی ایسی چال چلی کہ یہ عہدہ بھی اس سے لے لیا۔ اب وہ خود مختار تھا۔ رشید اور خیزران کے علم میں لائے بغیر فرمان جاری کرنے لگا۔

یحییٰ نے اب ان لوگوں کو ٹھکانے لگانے کی سوچی جو اس کے مخالف تھے، جنہوں نے ہادی کا ساتھ دیا تھا یا بیعت کرنے میں تامل سے کام لیا تھا۔ یہ لوگ نہ صرف تعداد میں بہت زیادہ تھے بلکہ بااثر بھی تھے۔ سب سے اہم شخص فضل بن ربیع تھا۔ یہ شخص یحییٰ کا جانی دشمن تھا اور ہادی کو اس کے خلاف بھڑکاتا رہتا تھا۔ خیزران بھی اس سے پرخاش رکھتی تھی لیکن زبیدہ اس کے حق میں تھی۔

اب حکومت کی تکون میں زبیدہ کا بھی حصہ تھا۔ وہ امورِ مملکت میں دخل نہیں دیتی تھی لیکن ہارون کی چہیتی بیوی تھی۔ اب اس کی پسند ناپسند کا خیال رکھنا بھی ضروری ہوگیا تھا لہٰذا زبیدہ کے کہنے سے رشید نے اسے مقربِ بارگاہ بنانے کا ارادہ کیا۔ زبیدہ بھی اس کے حق میں تھی لیکن

خیزران آڑے آگئی۔

زبیدہ کی حمایت سے فضل کو بہرحال اتنا فائدہ پہنچ گیا کہ اس کی جان بچ گئی اور عرصہ دراز تک حکومت کے ایوانوں سے دور رہنے پر مجبور ہو گیا۔

ان سیاسی اور انتظامی امور کے ساتھ ساتھ دوسری اصلاحات بھی کی جا رہی تھیں۔ نئے نئے قلعے بنائے گئے۔ چھاؤنیاں تعمیر ہوئیں۔

اسی طرح ہارون رشید نے اچھی خلافت کے چار سال گزار دیے کہ 789ء میں اس کے اطمینان کی کشتی ڈانوا ڈول ہوئی۔

خیزران کا انتقال ہو گیا۔

سوگ تو ہارون منا رہا تھا کہ خیزران اس کی ماں تھی لیکن فکرمند یحییٰ تھا۔ اس کے لیے اس سے مشکل وقت کون سا ہو سکتا تھا۔ خیزران کے اٹھ جانے سے مخالفین کے دروازے کھل گئے تھے۔ ان لوگوں کو روکنے والا کوئی نہیں تھا جو یحییٰ کے حریف تھے۔ وہ بڑی آسانی سے داخل ہو سکتے تھے اور رشید کے کان بھر سکتے تھے۔

جب خیزران کی تدفین عمل میں آئی تو تدفین کے بعد رشید ایک قریبی حویلی میں چلا گیا جو اس کی استراحت کے لیے تیار کی گئی تھی۔

لوگ ایک ایک کر کے آرہے تھے اور تعزیت پیش کر رہے تھے۔ ان تعزیت کرنے والوں میں فضل بن ربیع بھی تھا۔ جب وہ تعزیت کر چکا تو ہارون نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

”اے فضیل! جس روز سے مجھے منصب خلافت ملا ہے میں تجھے مقرب بنانے اور مرتبۂ خاص تک پہنچانے پر غور کر رہا ہوں۔ خدا میری والدہ پر رحم کرے وہ مجھے روکتی رہیں۔ میرے پاس اطاعت کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اب میں آزاد ہوں۔ تم جعفر بن یحییٰ برمکی سے انگشتری لے لو۔“

اس غیر متوقع اعلان پر یحییٰ برمکی ششدر رہ گیا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ رشید اس کے مشورے کے بغیر کوئی کام کر سکتا ہے اور وہ بھی اس کے بیٹے کو معزول کر کے اس کے دشمن کو اعزاز دینے کا اقدام۔

یہ واقعہ ستر سال کے اس تجربہ کار بوڑھے کی آنکھیں کھول دینے کے لیے بہت تھا۔

رشید پر بھی پہلی مرتبہ یہ انکشاف ہوا تھا کہ وہ خلیفہ ہے۔ قصر خلد پر اب زبیدہ قابض تھی۔ وہ نہ تو مال ومتاع جمع کرنے کی شوقین تھی اور نہ سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کی ماہر......

یحییٰ اس سے وہ کام نہیں لے سکتا تھا جو خیزران سے لیتا رہا تھا۔ اب اسے جو کچھ کرنا تھا اپنے بل بوتے پر کرنا تھا۔ سب سے پہلے تو اسے یہ دیکھنا تھا کہ اب اس کی حیثیت میں کوئی فرق آیا ہے یا نہیں۔ یہ جانچنے کے لیے وہ اذن باریابی کے بغیر جیسا کہ اس کا قاعدہ تھا رشید کی مجلس میں پہنچ گیا اور سلام کیا۔ رشید نے سلام کا جواب دے تو دیا لیکن سرد مہری صاف ظاہر تھی، جب یحییٰ بیٹھ چکا تو ہارون رشید ایک شخص کی طرف متوجہ ہوا۔

”اگر تم اپنی مجلس میں بیٹھے ہو تو کیا کوئی شخص اجازت لیے بغیر اندر آسکتا ہے؟“

”نہیں امیرالمومنین! ایسا تو نہیں ہو سکتا۔“ اس شخص نے جواب دیا۔

”تو گویا ہم اتنے گئے گزرے ہیں کہ لوگ اجازت لیے بغیر جب چاہیں ہماری مجلس میں آجائیں۔“ اتنے واضح اشارے کے بعد یحییٰ کیسے نہ سمجھتا کہ بات اسی کی، کی جا رہی ہے۔ اس نے وضاحت کی۔

”یا امیرالمومنین! اگر یہ غلطی ہے تو مجھ سے پہلی مرتبہ سرزد نہیں ہوئی ہے۔ امیرالمومنین نے مجھے ہمیشہ دوسروں سے بلند و ممتاز رکھا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اب تک امیرالمومنین جس بات کو پسند کرتے اور خوشی سے گوارا کرتے چلے آئے تھے اب اسے ناپسند فرمانے لگے ہیں۔ مجھے اس میں کیا عذر ہو سکتا ہے کہ میں اس طبقۂ ثالث میں شامل ہو جاؤں جو اہل اذن میں شمار ہوتے ہیں۔“

ایک مرتبہ یحییٰ رشید کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دور سے دیکھا کسی سوچ میں گم بیٹھا ہے۔ یہ مناسب نہ معلوم ہوا کہ اس کے غور و فکر میں دخل انداز ہو۔ الٹے پاؤں واپس آگیا۔ رشید کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ اس نے خادم کو حکم دیا۔

”جاؤ یحییٰ کے پاس جاؤ اور اسے کہنا کیا تو مجھے مہتمم گردانتا ہے جو دبے پاؤں آیا اور واپس چلا گیا۔“

یحییٰ نے اس خادم سے کہا۔

”امیرالمومنین سے کہنا جب وقت آجاتا ہے تو موت بہانے پیدا کر لیتی ہے ورنہ خدا جانتا ہے کہ میں تو صرف اس لیے واپس آگیا تھا کہ حکومت میں مخل ہونا نہیں چاہتا تھا۔“

ان پے در پے واقعات نے یحییٰ کو ہوشیار کر دیا۔ اب وہ سمجھنے لگا تھا کہ رشید اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔ اب اسے اپنا سیاسی رخ تبدیل کرنے کی ضرورت تھی۔

وہ خاموش ہو گیا تھا لیکن اپنے بیٹوں کو نہیں سمجھا سکتا تھا۔ فضل بن یحییٰ اور جعفر اب ایسی سازشوں میں شریک ہو گئے تھے جن کا رخ رشید کے خلاف تھا۔ رشید کے بیٹوں امین اور مامون کی ولی عہدی کے مسئلے پر انہوں نے زبیدہ سے مل کر رشید کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ رشید مامون کو ولی عہد بنانا چاہتا تھا جبکہ فضل بن یحییٰ نے خراسان میں امین کے حق میں بیعت لینا شروع کر دی۔

یحییٰ اپنے بیٹوں کو سمجھاتا رہتا تھا اور بالآخر اس نے ایک دن جعفر سے کہہ ہی دیا۔

”خدا کی قسم خاندان برامکہ اگر برباد ہوگا تو صرف تیری غلط کاریوں اور برائیوں کے باعث۔“

ایک مرتبہ اس نے جعفر کو لکھا۔

”میں نے تجھے تیرے حال پر چھوڑ دیا ہے تاکہ زمانہ خود تجھ سے بھگت لے۔ اگرچہ مجھے اندیشہ ہے کہ تو اپنے خاندان کے لیے پیام موت ثابت ہوگا۔“

یحییٰ کے بڑھاپے نے اسے کم حوصلہ کر دیا تھا۔ اب اس کے بس میں کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ خود اپنے لڑکوں تک پر اس کا زور نہیں تھا۔ اس بات سے بھی واقف نہیں تھا کہ رشید ان لڑکوں کی سازشوں اور کارروائیوں سے کتنا چوکنا ہو چکا ہے لیکن حالات کا رخ دیکھ کر اندازہ کر سکتا تھا کہ نتائج اچھے نہیں نکلیں گے۔

زمانہ اسی طرح گزرتا رہا اور رشید منتظر رہا کہ موقع ملے اور وار کر گزرے۔ بالآخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ برامکہ کا خاتمہ کر دے گا۔

ایک اندرونی کشمکش تھی جو رشید اور آل برمک کے درمیان جاری تھی اور روز بروز خطرناک صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ اس کے چرچے اب عوام کی زبان پر بھی آگئے تھے حالانکہ وہ آل برمک کے افراد کے ساتھ ظاہری طور پر تعلقات قائم رکھے ہوئے تھا۔

جعفر برمکی سے اس کے تعلقات روز بروز کشیدہ ہوتے جا رہے تھے۔

رشید اپنے منصوبے کو تیزی کے ساتھ کامیاب بنانے میں منہمک تھا۔

⚬⚬⚬

رشید نے سارا دن جعفر اور دوسرے مصاحبوں کے ساتھ شکار کھیلا۔ کسی کو گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ وہ جعفر سے کتنا خفا ہے۔

شکار سے واپس آکر تھکن اتارنے کے لیے لیٹ گیا۔ جب آدھی رات گزری تو اپنے معتمد خاص کو طلب کیا۔

”جو حکم میں تجھے دوں گا کیا تو اس کی تعمیل کرے گا؟“

”امیرالمومنین! اگر آپ حکم دیں کہ اپنی تلوار اپنے پیٹ میں اتار لوں تو میں دیر نہیں لگاؤں گا۔“

”تو ابھی جا اور جعفر بن یحییٰ کا کٹا ہوا سر میرے پاس لے کر واپس آ۔“

مسرور یہ حکم سن کر کانپ اٹھا لیکن حکم تو بجا لانا تھا۔ اس نے ایک دستہ سپاہ ساتھ لی اور جعفر کے خیمے میں پہنچ گیا۔ محفل ناؤ نوش گرم تھی۔ دف بج رہا تھا۔ مغنی نغمہ سرا تھے۔

”تم بلا اجازت اندر کیسے آئے؟“ جعفر چیخا۔

”آپ ذرا میرے ساتھ تنہائی میں چلیے۔“

جعفر خاموشی سے اٹھ گیا۔ مسرور اسے ایک جگہ لے گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھے اور قتل کی تیاری کرنے لگا۔

”مسرور یہ تم کیا کر رہے ہو؟“ جعفر نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اپنے آقا کے حکم کی تعمیل۔“

”مسرور، کیا تم نہیں جانتے امیرالمومنین مجھ سے طرح طرح کے مذاق کرتے ہیں۔ یہ حکم بھی انہوں نے مذاق میں دیا ہوگا۔“

”وہ تم سے مذاق کرتے ہوں گے، مجھ سے نہیں کرتے۔“

”اچھا تو تم امیرالمومنین کے پاس واپس جاؤ اور کہو تم نے مجھے قتل کر دیا ہے۔ اگر وہ اظہار ندامت کریں تو مجھے معاف کر دینا۔ سمجھ لینا کہ یہ مذاق تھا۔“

مسرور نے اس کو اچھی طرح رسیوں سے جکڑ دیا اور رشید کے پاس واپس آیا۔

”یا امیرالمومنین! آپ نے جو حکم دیا تھا اس کی تعمیل ہو گئی ہے۔“

”جلدی کر اور اس کا کٹا ہوا سر لا۔“

مسرور جعفر کے پاس پہنچا اور اس کا سر کاٹ لیا۔

اس کے بعد برامکہ کے ملازموں، خادموں، غلاموں اور جتنے لوگ اعوان و انصار میں سے تھے، سب کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔

یحییٰ برمکی کے لیے حکم ہوا کہ اسے گھر میں قید کر دیا جائے لیکن اس کے ساتھ کوئی رعایت نہ برتی جائے۔ سلالہ ابرش کو اس کی نگرانی پر مامور کیا۔

سلالہ ابرش اسی وقت یحییٰ کے پاس آیا اور اسے حکم دیا کہ وہ نظر بند ہے۔ یہاں سے قدم باہر نہ نکالے۔

یحییٰ نے پوچھا۔ ”جعفر پر کیا گزری!“

ابرش نے جواب دیا۔ ”وہ قتل کردیا گیا۔“

”اور جعفر کے دوسرے بھائیوں کا کیا حال ہے!“

”وہ جیل میں ہیں۔“

یحییٰ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ”زمانہ اسی طرح گردش کرتا ہے۔ مجھے معلوم تھا یہی ہونا ہے لیکن میرے بیٹوں نے میری ایک نہ سنی۔ ہائے میرا خاندان۔“

بغداد کے چوراہے پر جعفر بن یحییٰ برمکی کی لاش لٹک رہی تھی۔ جب برامکہ کے تمام مرد قتل ہوچکے یا گرفتار ہوئے اور انتظامات سے فراغت ہوئی تو رشید نے یحییٰ کے پاس پیغام بھیجا۔

”میں تم سے کوئی بدسلوکی روا رکھنا نہیں چاہتا۔ تمہاری رضا پر چھوڑتا ہوں کہ تم جہاں جانا چاہو رہو۔“

”اگر آپ مجھ سے راضی ہیں تو مجھے مکہ مکرمہ بھیج دیں اور اگر راضی نہیں تو جہاں ہوں وہیں ٹھیک ہوں۔“ یحییٰ نے جواب دیا۔

یحییٰ نے یہ سفارش بھی کی کہ جو برمکی جیل میں ہیں انہیں رہا کردیا جائے لیکن رشید جانتا تھا کہ انہیں جیل سے رہا کردینا خطرناک ہے۔

رشید نے پیغام بھیجا۔

”تم اکیلے جہاں چاہو جا کر رہ سکتے ہو۔“

”اس صورت میں میرے لیے پسندیدہ یہ ہے کہ میں اپنے بیٹوں فضل اور اور موسیٰ کے ساتھ رہوں۔“

رشید نے اس کی بات مان لی اور اسے بیٹوں کے پاس ایک مقام پر منتقل کردیا۔

رشید کے سامنے فضل اور جعفر کی ماں اور اپنی رضاعی ماں زینت بیگم کا مقدمہ بھی پیش ہوا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے۔

اس کے لیے حکم صادر ہوا کہ وہ جب چاہے اور جتنے دن چاہے ان قیدیوں کے ساتھ بود و باش رکھ سکتی ہے۔ ایک لاکھ درہم اسے ضروریات پوری کرنے کے لیے بھیجے اور بہت سے بیش قیمت کپڑوں کے تھان ارسال کیے۔

رشید اب تک یحییٰ کے سحر کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا لیکن ایک ہی جھٹکے میں یہ زنجیریں اس نے توڑ دیں۔ اس کی شخصیت پہلی مرتبہ بالکل ٹھیک طور پر اپنے آب و رنگ کے ساتھ نمایاں ہوئی تھی۔ اب وہ سب کچھ کرنے میں آزاد تھا کسی میں دم مارنے کی مجال نہیں تھی۔

⬭⬭⬭

جب کچھ عرصہ گزر گیا تو آل برمک کی خواتین ملکہ زبیدہ کے پاس آئیں اور رو رو کر اپنی خدمات کا ذکر کیا اور یحییٰ اور فضل بن یحییٰ کی دہائی دی۔ زبیدہ کا دل نرم پڑ گیا اور اس نے وعدہ کرلیا کہ وہ رشید سے ان کے لیے سفارش کرے گی۔ وہ رشید کے پاس گئی بھی لیکن رشید نے صاف انکار کردیا۔

اب زبیدہ نے ایک اور چال چلی۔ یحییٰ کی جانب سے اثر انگیز رقعہ لکھا جس میں رحم و کرم کی اپیل کی گئی تھی اور کچھ خواتین کو لے کر رشید کے پاس ایک مرتبہ پھر گئی۔ اپنے ساتھ کچھ باندیاں بھی لے کر گئی جنہوں نے رشید کے سامنے گیت گائے۔ ایسے گیت جن میں رشید کی فیاضی اور رحم دلی کے قصیدے تھے۔ رشید کے چہرے سے یہ ظاہر ہورہا تھا جیسے اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ اسی وقت زبیدہ آگے بڑھی اور اس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی اور یحییٰ کی طرف سے لکھا ہوا رقعہ اس کے سامنے ڈال دیا۔

رشید نے وہ رقعہ اٹھایا۔ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا اور پھر اس پر اپنا جواب لکھا اور زبیدہ کی طرف پھینک دیا۔

”تمہارا گناہ اتنا بڑا ہے کہ رحم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

اس دن کے بعد سے زبیدہ نے خاموشی اختیار کرلی۔

یحییٰ کے بہی خواہوں اور دوستوں کی کمی نہیں تھی لیکن اس واقعے کے بعد کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ ان میں سے کوئی رشید کے حضور یحییٰ کی سفارش کرتا۔

وقت گزرتا گیا۔ یہاں تک کہ یحییٰ جیل میں بیمار پڑا اور بالآخر وفات پا گیا۔

بغداد میں اٹھنے والی سازشوں کا یہ آخری مہرہ بھی منظرنامے سے دور ہوگیا۔ قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ یحییٰ کی وفات کے صرف تین سال بعد ہی ہارون رشید بھی راہی ملکِ عدم ہوا۔

ماخذات

تاریخ طبری، ابن جریر طبری۔ تاریخ ابن کثیر، علامہ ابوالحسن۔ ہارون الرشید، مترجم رئیس احمد جعفری۔ تاریخ اسلام، شاہ معین الدین ندوی

بعض ذمہ داریوں کا قرض کسی پر یوں عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے عوض اسے اتارنا چاہے تو بھی ادا نہ ہو پائے۔ وہ بھی سانسوں کے نذرانے دے رہا تھا مگر مسلسل اس دلدل میں دھنستا جارہا تھا جس کی نہ گہرائی کا پتا تھا نہ گیرائی کا مگر... ایک روز اس ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا اور وہ جو ناممکن تھا، ممکن ہوگیا۔

مغرب سے درآمدہ جرائم کی دنیا کا مختلف انداز

قرض

کاشف زبیر

رینا نے رائفل شانے سے لگائی اور سانس روک کر فائر کیا۔ سو گز دور رکھی بیئر کی خالی بوتل دھماکے سے بکھر گئی۔ یہ آج کے دن اس کا پچاس میں سے چالیسواں کامیاب شاٹ تھا۔ رینا کی عمر تیس سے زیادہ نہیں تھی مگر دیکھنے میں وہ پچیس برس کی لگتی تھی۔ اس کے سیاہ بال اور سیاہ آنکھیں ماں کی طرف سے تھی جو نسلاً اسپینش تھی۔ جبکہ اس کا گلابی رنگ، کھڑے نقوش اور سڈول بدن اس کے باپ کی طرف سے تھا جو انگریز نسل سے تھا۔ کلارک ہاردی کا باپ لندن سے آکر ٹیکساس میں آباد ہوا تھا۔ وہ سپاہی تھا اس لیے اس نے یہاں بھی یہی پیشہ برقرار رکھا مگر فوج کے بجائے پولیس فورس کو ترجیح دی اور شیرف بن گیا۔ البتہ کلارک نے کسی قدر مختلف پیشہ اختیار کیا تھا۔ اس نے کوریئر کمپنی کھول لی اور

لوگوں کا قیمتی سامان ان کی بھیجی جگہوں پر پہنچانے لگا۔ اس کا کام چل نکلا اور اس نے اچھی خاصی دولت کمالی۔ ایریزونا اور نیو میکسیکو کی کانوں سے نکلنے والا سونا مغربی شہروں تک پہنچانے کا کام پُرخطر لیکن نفع بخش تھا۔

بیس سال کی عمر میں رینا باپ کے بزنس میں شامل ہوگئی تھی۔ اس نے بہ طور گارڈ کام کا آغاز کیا۔ اگرچہ کلارک نے مخالفت کی تھی۔ وہ جانتا تھا اس کام میں کتنا خطرہ ہے۔ پندرہ سال میں کلارک کے ایک درجن سے زیادہ گارڈ ڈاکوؤں کا نشانہ بن چکے تھے لیکن انہوں نے ایک بار بھی ڈاکوؤں کو اپنے مقصد میں کامیاب ہونے نہیں دیا تھا۔ کلارک اپنے گارڈز کی تربیت خود کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سب سے زیادہ ڈاکے گارڈز خود پڑواتے ہیں۔ اس معاملے میں اس نے ایک ہی بار غلطی کی تھی اور وہ اس کی آخری غلطی ثابت ہوئی تھی جب اس نے واٹسن نامی ایک نوجوان کو گارڈ کے طور پر جاب دی اور وہ ٹیکساس کے صحرا کے بخار کے نام سے مشہور ڈاکو جارج کا ساتھی نکلا تھا۔ جارج کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا اور کوئی اسے صورت سے بھی نہیں پہچانتا تھا کیونکہ جن لوگوں نے اس کا سامنا کیا تھا وہ اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ جارج عینی گواہ چھوڑنے کا قائل نہیں تھا۔ اس کی سفاکی کے قصے مشہور تھے۔ اس سفر میں کلارک بھی گیا تھا کیونکہ سونے کی بہت بڑی کھیپ تھی جو نیو میکسیکو سے کیلیفورنیا بھیجی جارہی تھی اور بعد میں کلارک سمیت اس کے ایک درجن محافظوں کی لاشیں ایریزونا کے ویران صحرا میں پائی گئی تھیں سوائے واٹسن کے جو غائب تھا۔ پولیس کے مطابق یہ جارج کی کارروائی تھی۔

رینا ان دنوں بیمار تھی اور اسی وجہ سے اس سفر پر ساتھ نہیں جاسکی تھی۔ البتہ اس نے واٹسن کو دیکھا تھا۔ وہ پچیس چھبیس برس کا سخت نقوش والا نوجوان تھا۔ کلارک نے کھیپ جانے سے صرف ایک ہفتہ پہلے اسے ملازم رکھا تھا۔ رینا کے لیے باپ کی موت بہت بڑا سانحہ تھی۔ کیونکہ ماں اس وقت ہیضے کی وبا کا شکار ہوگئی تھی جب رینا صرف دس سال کی تھی پھر اس کی پرورش کلارک نے کی تھی اور اسی وجہ سے وہ باپ سے بہت زیادہ قریب تھی۔ وہ اس سے متاثر تھی اور رینا نے باپ کا پیشہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ کلارک راضی نہیں تھا مگر جب اس نے دیکھا کہ رینا کسی صورت پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہے تو مجبوراً وہ راضی ہوگیا اور پھر اس نے خود رینا کی تربیت کی۔ اس کی خواہش تھی کہ رینا شادی کرے اور اسے کئی نواسے نواسیوں کا نانا بنادے۔ مگر رینا نے جلد شادی سے انکار کردیا تھا۔ وہ جن افراد سے ملی تھی ان میں سے کوئی اسے شریکِ حیات کی حیثیت سے متاثر نہیں کرسکا تھا۔

پھر کلارک مارا گیا اور اس ناکامی نے کمپنی کی ساکھ کو بھی شدید متاثر کیا۔ ڈاکو تقریباً ایک کروڑ ڈالرز مالیت کا سونا لے اڑے تھے۔ 1835ء میں ایک کروڑ ڈالرز بہت بڑی رقم تھی اور آنے والے کئی سالوں تک اس واردات کا چرچا ہوتا رہا تھا، جو کہیں بھی فروخت کے لیے مارکیٹ میں نہیں آیا تھا۔ کیونکہ مارکیٹ میں موجود سونے کی مقدار میں اضافہ دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔ سونا ایوی گولڈ نامی فرم کا تھا جو ایریزونا اور نیو میکسیکو میں سونے کی سب سے بڑی خریدار تھی اور یہ سونا خرید کر زیادہ تر وفاقی حکومت کو فروخت کرتی تھی۔ بعد میں ایوی گولڈ کی جانب سے کلارک کی فرم پر حرجانے کا دعویٰ کیا گیا تھا مگر عدالت نے یہ دعویٰ خارج کردیا۔ رینا نے کمپنی ختم کردی۔ کلارک نے اس کے لیے اس فارم ہاؤس کے علاوہ بھی بہت کچھ چھوڑا تھا۔ وہ مزے سے رہ رہی تھی۔ باپ کے بعد بھی اس نے شادی کا نہیں سوچا تھا۔

وہ رائفل لے کر پاس رکھی میز تک آئی، رائفل رکھ کر اس نے چائے دانی سے اپنے لیے چائے نکالی۔ تقریباً دو ہیکٹر رقبے پر پھیلے فارم ہاؤس میں سنگترے اور سیب کے درخت لگے تھے۔ سامنے والے حصے میں بڑا خوب صورت لان تھا اور لان کے پار دو منزلہ لکڑی اور پتھر سے بنا ہوا سفید مکان تھا۔ عقبی حصے میں اصطبل اور ایک چھوٹا سا مویشی گھر تھا۔ فارم ہاؤس اور گھر کے کاموں کے لیے کلارک کے زمانے سے دو ملازم تھے۔ جیف گھر کی دیکھ بھال کرتا تھا باورچی بھی وہی تھا جبکہ نوجوان مارس اصطبل اور فارم ہاؤس دیکھتا تھا۔ مارس صرف چھ برس کا تھا جب کلارک نے اسے گود لیا تھا۔ اس کا باپ کلارک کا گارڈ تھا اور ایک ڈاکے میں مارا گیا۔ مارس کا اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ مارس کی پرورش اور تربیت کلارک نے کی تھی مگر اس سے پہلے کہ مارس اپنے باپ کی جگہ لیتا کلارک مارا گیا اور کمپنی ختم ہوگئی۔ اب مارس رینا کے ساتھ تھا۔ وہ چاہتا تو اسے کہیں بھی ملازمت مل سکتی تھی مگر وہ رینا کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔

رینا چائے پی رہی تھی کہ اس نے دور سے ایک بگھی کو فارم کی طرف آتے دیکھا۔ وہ انتظار کرتی رہی۔ اس جگہ اور بھی لوگوں کے فارم ہاؤس تھے، ممکن ہے آنے والا کسی اور سے ملنے آیا ہو لیکن چند منٹ بعد بگھی اسی کے فارم کے سامنے رکی۔ جیف مکان سے نکل کر گیا اور فوراً ہی واپس آگیا۔ اس نے رینا کے سامنے ایک کارڈ رکھا۔ ”کوئی مسٹر والکر کرٹ ہے۔“

رینا ایوی گولڈ کا نام اور مونوگرام دیکھ کر چونکی۔ مگر یہ واضح نہیں تھا کہ والکر کرٹ کی فرم میں کیا حیثیت تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ پانچ سال بعد انہیں پھر کوئی خیال آیا ہے؟ اس نے جیف سے کہا۔ ”مسٹر کرٹ کو اندر بلالو لیکن صرف مسٹر کرٹ کو۔“

والکر کرٹ تقریباً چالیس برس کا مضبوط جسامت کا خوش شکل مرد تھا۔ اس کے بال اور مونچھیں سنہری مائل بھورے رنگ کی مگر نفاست سے ترشی ہوئی تھیں۔ اس نے موسم کی مناسبت سے اوورکوٹ پہن رکھا تھا مگر کمر سے بندھا ہولسٹر اور اس میں رکھا اعشاریہ چالیس کا ریوالور صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس پر گولڈ اور چاندی کی پالش کی گئی تھی اور یہ خاصا قیمتی ریوالور تھا۔ والکر کا لباس اعلیٰ درجے کا اور سرخ چمڑے سے بنے جوتے شاندار تھے۔ اس نے اپنا ہیٹ اتارا اور اپنا تعارف کرایا۔ ”والکر کرٹ، مس ہاروی۔“

”کس لیے آئے ہو؟“ رینا نے سرد لہجے میں پوچھا، اس نے اسے بیٹھنے کی پیشکش نہیں کی تھی۔

”میں ایک جاب لے کر آیا ہوں۔“

”میں کام چھوڑ چکی ہوں۔ کمپنی بہت پہلے فروخت کر دی تھی۔“

والکر نے سر ہلایا۔ ”میں جانتا ہوں... میں ایوی گولڈ میں سیکیورٹی چیف ہوں۔ ہم اس سونے کی بازیابی چاہتے ہیں جو ہاروی کوریئر کھو چکی ہے۔“

”ہاروی کوریئر ختم ہوچکی ہے۔“ رینا کا لہجہ مزید سرد ہوگیا، اس کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔

”میں جانتا ہوں۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”کیا میں بیٹھ سکتا ہوں۔ میں کچھ وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔“

رینا نے سوچا اور پھر اس کے خدوخال نرم پڑ گئے۔ ”ٹھیک ہے مگر جو کہنا ہے جلدی کہو۔“

والکر سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”میں نے اس سونے کی بازیابی کے لیے ایک منصوبہ بنایا ہے کیونکہ ایوی گولڈ نے اس کی بازیابی پر نصف سونا انعام میں دینے کا فیصلہ کیا ہے اور اب اس سونے کی مالیت تیرہ ملین ڈالرز ہوچکی ہے۔“

رینا حیران ہوئی تھی۔ ”ساڑھے چھ ملین ڈالرز کا انعام۔“

”بالکل۔“ والکر اس کی دلچسپی محسوس کرکے بولا۔ ”وہ سونا کہیں موجود ہے اور ہم اسے حاصل کرسکتے ہیں۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟ پانچ سال ایک بڑی مدت ہے اور ممکن ہے اس دوران میں تھوڑا تھوڑا کرکے اس سونے کو فروخت کردیا گیا ہو۔ سونا یورپ بھی بھیجا جاسکتا ہے جہاں اس کی زیادہ قیمت مل سکتی ہے۔“

”نہیں، وہ سونا یہیں ہے۔“ والکر نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”ہمارے پاس یقینی معلومات ہیں۔ اس سونے کے پیچھے جارج کا گروہ دو افراد میں بٹ گیا اور لڑائی میں جارج شدید زخمی ہوا جبکہ اس کے بیشتر ساتھی مارے گئے تھے۔ جارج جان بچا کر میکسیکو بھاگ گیا۔ اس کی غیر موجودگی میں دوسرا گروہ اس کے نام سے کام جاری رکھے ہوئے ہے۔ سونا جہاں چھپایا گیا تھا اس جگہ سے صرف جارج واقف تھا یا اس کے مارے جانے والے ساتھی واقف تھے۔ جارج نے میکسیکو میں اپنی طاقت دوبارہ جمع کی اور سنا ہے وہ واپس آچکا ہے۔ لازمی بات ہے وہ اس سونے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا۔“

رینا سوچ میں پڑ گئی۔ والکر کرٹ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ کلارک کے مارے جانے کے بعد رینا نے بھی کچھ جاسوس ہائر کرکے جارج کے پیچھے لگائے تھے اور اس کے پاس بھی کچھ ایسی ہی معلومات آئی تھیں مگر اس نے زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ مجرموں کے بارے میں آنے والی اکثر معلومات افواہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ہیں۔ ”ممکن ہے جارج سونا نکال چکا ہو؟“

”نہیں، اس کا مخالف گروہ زیادہ طاقتور ہے اور جب تک وہ اس پر حاوی نہیں آجاتا سونا نکالنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ مخالف گروہ اتنا ضرور جانتا ہے کہ سونا کس علاقے میں ہے اور وہ اس علاقے کی نگرانی کررہا ہے۔“

”سونا کس علاقے میں ہے؟“

والکر نے اپنے اوورکوٹ سے ایک نقشہ نکال کر میز پر پھیلایا اور ایریزونا کے پہاڑی علاقے گرینڈ کینین (عظیم کھائی) پر انگلی رکھی۔ ”یہ فلیگ اسٹاف کہلاتا ہے، کسی زمانے میں یہاں فوجی کیمپ ہوا کرتا تھا جب ریڈ انڈین قبائل طاقتور تھے؟ مگر اب یہاں کچھ نہیں ہے۔“

رینا نے نقشہ غور سے دیکھا۔ ”یہ نہایت دشوار گزار علاقہ ہے۔ یہاں پوری فوج چھپائی جاسکتی ہے۔ بعض جگہیں تو ایسی ہیں جہاں کسی کی رسائی کبھی نہیں ہوئی ہے۔“

”تم نے ٹھیک کہا۔“ والکر نے سر ہلایا اور نقشہ واپس رکھ لیا۔ ”یہ بات یقینی ہے کہ سونا اسی علاقے میں ہے۔ یہاں میلوں دور تک کوئی آبادی نہیں ہے اور نہ ہی یہ عام گزرگاہ ہے۔“

”مگر کیلیفورنیا جانے والا روٹ یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔“

”یہ ڈاکے کے لیے مناسب ترین مقام تھا۔ جارج

کے گروہ نے سونا لوٹا اور فوراً ہی اسے چھپا بھی دیا۔ ایک بات جو منظر عام پر نہیں آئی وہ جارج کے گروہ کا جانی نقصان تھا۔ اس کے ایک درجن سے زیادہ ساتھی مارے گئے تھے حالانکہ انہوں نے اچانک حملہ کیا تھا۔ مارے جانے والوں میں جارج کے اعتماد کے اور پرانے ساتھی تھے۔ بغاوت نئے آنے والوں نے کی تھی اسی وجہ سے جارج کو پسپا ہونا پڑا مگر اس سے پہلے وہ سونا چھپا چکا تھا۔ بغاوت پر آمادہ گروہ نے جان بوجھ کر ڈاکے میں حصہ نہیں لیا اور جارج کو کامیابی کے باوجود بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ غالباً اسی سے اس نے اپنے ساتھیوں کی نیت بھانپ لی اور اس سے پہلے کہ وہ اس پر قابو پاتے وہ سونا لے کر فرار ہو گیا اور اسے چھپا دیا۔ اس کے بعد اس نے باغی گروہ کے خلاف کارروائی کی مگر خود اسے نقصان ہوا، اس کے رہے سہے ساتھی بھی مارے گئے اور وہ خود زخمی حالت میں میکسیکو فرار پر مجبور ہو گیا۔''

''ٹھیک ہے، میں سمجھ گئی۔'' رینا نے کہا۔ ''لیکن تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''میں چاہتا ہوں تم میرا ساتھ دو، ہمیں نہ صرف سونا واپس حاصل کرنا ہے بلکہ جارج اور اس کے ساتھیوں کو سزا بھی دینی ہے۔''

''یہ بہت مشکل بلکہ ناممکن کام ہے۔'' رینا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''جس کام میں مقامی حکومتیں ناکام ہو گئی ہوں وہ ہم کیسے کر سکتے ہیں۔ جارج کا باغی گروہ ہی کم طاقتور نہیں ہے جبکہ خود جارج بھی واپس آ گیا ہے۔''

''جارج کی واپسی ہمارے لیے نہیں بلکہ باغی گروہ کے لیے خطرہ ہے۔ ہم انتظار کریں گے کہ کب دونوں گروہوں میں ٹکراؤ ہوتا ہے اور جب وہ آپس میں لڑ کر کمزور ہو جائیں گے تو ہم ان پر قابو پا سکتے ہیں۔''

''اچھا خیالی پلاؤ ہے۔'' رینا نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''گویا تم مفروضات کے سہارے سونا واپس لینے کا ارادہ رکھتے ہو۔''

''یہ مفروضہ نہیں ہے۔'' والکر کے لہجے میں ہلکا سا طیش آ گیا۔ ''مجھے یقین ہے میں کامیاب رہوں گا لیکن اس مقصد کے لیے میں ایک اچھی ٹیم جمع کر رہا ہوں۔ دیکھو انعام بہت بڑا ہے۔ تمہارے حصے میں جو آئے گا اس سے تم یہ ساری وادی خرید سکتی ہو۔''

''مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔'' رینا بے نیازی سے بولی۔ ''میں اپنی زندگی سے خوش ہوں۔''

والکر کرٹ مایوس نظر آنے لگا۔ پھر وہ کھڑا ہو گیا اور گیٹ کی طرف جانے کے لیے مڑا لیکن پھر رک کر بولا۔ ''کیا تم جانتی ہو کہ باغی گروہ کا سربراہ واٹسن نامی نوجوان ہے۔''

رینا چونک گئی تھی۔ ''کیا... کیا کہا تم نے؟''

مگر والکر رکے بغیر گیٹ کی طرف بڑھتا رہا مجبوراً رینا اس کے پیچھے آئی اور سامنے آ کر اسے روک لیا۔ ''تمہارا مطلب ہے وہی واٹسن اب باغی گروہ کا سرغنہ ہے جس نے پاپا کو دھوکا دیا تھا۔''

''بالکل وہی اس باغی گروہ کا سرغنہ ہے۔ اس نے صرف تمہارے پاپا کو نہیں جارج کو بھی دھوکا دیا تھا۔''

☆☆☆

رینا نے کھڑکی سے پردہ ہٹا کر دیکھا، ونسلو نامی یہ قصبہ چھوٹا سا تھا لیکن مشرق اور مغرب کو ملانے والی اہم ترین شاہراہ پر واقع تھا، اس لیے یہاں گہما گہمی رہتی تھی۔ یہاں کئی ہوٹلز اور بارز تھے جہاں مسافروں کا ہجوم رہتا تھا۔ وہ دو دن پہلے مارس کے ہمراہ یہاں آئی تھی۔ مارس اصطبل کے پاس ایک چھوٹے ہوٹل میں مقیم تھا۔ رینا کے ہوٹل کے سامنے ایک بڑا ہوٹل تھا اور والکر اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ وہاں رکا ہوا تھا جبکہ اس کے کچھ ساتھی دوسرے ہوٹلوں میں تھے۔ رینا صرف واٹسن کا سن کر اس مہم کے لیے تیار ہوئی تھی۔ اس کے اندر برسوں سے دبی چنگاری اس نام کو سن کر شعلہ بن گئی تھی۔ والکر اس کی رضامندی سے بہت خوش ہوا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس نے ایوی گولڈ کے سابق سیکیورٹی چیف شائن مور کو بھی اس مہم کے لیے راضی کر لیا تھا۔ شائن مور اس وقت ایوی گولڈ کے لیے کام کرتا تھا۔ جب کلارک کے قافلے پر ڈاکا پڑا تھا تو اس نے اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے استعفیٰ دے دیا تھا۔ شاید وہ اسی ناکامی کا ازالہ کرنے کے لیے والکر کرٹ کے ساتھ شامل ہوا تھا۔ ان دونوں کے علاوہ والکر نے کوئی درجن بھر اعلیٰ درجے کے لڑاکے بھاری معاوضے پر حاصل کیے تھے۔ اب وہ سب ون سلو میں مقیم تھے۔

ون سلو کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ کسی زمانے میں یہی قصبہ ایریزونا میں جارج کے آدمیوں کا گڑھ تھا۔ خود جارج زیادہ تر شمالی ٹیکساس میں نیو میکسیکو کی سرحد کے ساتھ پھیلے صحرا میں رہتا تھا۔ یہ نہایت دشوار گزار پتھریلا صحرا تھا۔ ون سلو یہاں سے کوئی چار سو میل دور تھا۔ سونے اور دوسری قیمتی چیزوں کی ترسیل ان ہی راستوں سے ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے جارج اور اس جیسے ڈکیت گروہ یہاں سرگرم عمل تھے۔ یہاں کئی بارز اور جوئے خانے تھے جو جرائم پیشہ افراد کا اڈا تھے۔ یہاں سے معلومات ملتی تھیں اور اپنے مطلب کے آدمی بھی ملتے تھے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ ون سلو اس فلیگ اسٹاف سے زیادہ دور نہیں تھا اور سونا اسی علاقے میں پوشیدہ تھا۔

رینا نسوانی لباس میں تھی وہ کاؤ گرل بن کر دوسروں کو متوجہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے اپنا انداز ایسا رکھا تھا جیسے کوئی حسین خاتون کسی اونچی آسامی کی تلاش میں ہے۔ انداز سے قطع نظر وہ پوری تیاری کے ساتھ آئی تھی۔ شام کے وقت وہ باہر نکلی اور ایک اعلیٰ درجے کے بار میں آئی۔ یہاں اسے شائن مور نظر آیا۔ وہ کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا وہسکی سے شغل کر رہا تھا۔ جن دنوں وہ باپ کے ساتھ کام کرتی تھی تو اس کی کئی بار شائن مور سے ملاقات ہوئی تھی۔ شائن مور تقریباً بیالیس سال کا متوسط قد و قامت کا آدمی تھا۔ چہرے کے تاثرات نرم تھے اور وہ کہیں سے سیکیورٹی چیف نظر نہیں آتا تھا مگر کلارک اس کی تعریف کرتا تھا اور کلارک آسانی سے کسی کی تعریف نہیں کرتا تھا۔ رینا نے سر سے اشارہ کیا تو شائن یوں اس کی طرف آیا جیسے اس سے متاثر ہوا ہو۔ ویسے وہ سچ اس سے متاثر تھا کیونکہ اس بار وہ ملا تو اس کا انداز ماضی سے مختلف تھا۔ اس نے جھک کر خوش اخلاقی سے کہا۔

''مادام کیا میں تمہاری میزبانی کا شرف حاصل کر سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں۔'' وہ مسکرائی۔ شائن اس کے سامنے بیٹھ گیا اس نے ویٹر کو شیری اور شمپین لانے کو کہا پھر آہستہ سے بولا۔

''یہاں جارج کے دو آدمی نظر آئے ہیں مگر وہ بس دکھائی دیے اور اس کے بعد غائب ہو گئے۔''

''کیسے پتا چلا کہ وہ جارج کے آدمی ہیں؟''

''والکر کے ساتھ ایک آدمی ہے وہ کسی زمانے میں ان لوگوں کو اسلحہ سپلائی کرتا رہا ہے وہ تقریباً سب کو پہچانتا ہے۔''

''جارج اور اس کے آدمیوں کو جہنم میں ڈالو، مجھے واٹسن اور اس کے آدمیوں کا بتاؤ۔''

''فی الحال ان میں سے کوئی نظر نہیں آیا۔ والکر کا خیال ہے وہ سب محتاط ہیں اور ایسی جگہوں پر جانے سے گریز کر رہے ہیں جہاں ایک دوسرے سے سامنا ہونے کا خطرہ ہو۔''

''تب جارج، واٹسن گروپ کا صفایا کیسے کرے گا؟'' رینا نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔ ''اور جب وہ واٹسن گروپ کا صفایا نہیں کرے گا تو سونا کب نکالے گا؟''

''والکر کا خیال ہے دونوں گروپ پہاڑوں میں ہیں اور وہیں شاید ایک دوسرے کو گھیرنے کے چکر میں بھی ہیں۔''

''تب ہم یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' رینا نے پوچھا۔

''ہم انتظار کر رہے ہیں تصادم کا۔'' شائن نے کہا اور اسی دوران میں ویٹر جام لے آیا۔ اس کے جانے کے بعد رینا بولی۔

''تمہیں یقین ہے کہ یہ تصادم ہوگا اور اگر ہوگا تو ہمیں اس کی خبر ہوگی؟''

''کیا مطلب؟'' شائن نے اپنا گلاس اٹھا لیا۔

''مطلب یہ کہ مجھے یقین نہیں ہے کہ واٹسن اور جارج میں تصادم کی نوبت آئے گی۔ اگر طاقت واٹسن کے پاس ہے تو جارج اس کا کیا بگاڑ لے گا؟''

شائن مور نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

رینا نے شانے اچکائے۔ ''ٹھیک ہے بیٹھے رہو ون سلو میں اور بالآخر ہم یہیں سے واپس چلے جائیں گے۔''

شائن کی آنکھوں میں تشویش نظر آنے لگی پھر اس نے رینا سے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''ہمیں یہاں سے نکل کر فلیگ اسٹاف جانا چاہیے۔'' رینا نے تجویز پیش کی۔ ''تب ہی ہم کچھ کر سکیں گے۔''

والکر کرٹ کے منصوبے کے مطابق انہیں ونسلو میں رک کر جارج اور واٹسن کے تصادم کا انتظار کرنا تھا اور اس کے بعد وہ حرکت میں آتے۔ مگر رینا کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ فلیگ اسٹاف سے تقریباً پچاس کلومیٹرز دور رہ کر وہ بھلا کیسے پتا چلائیں گے کہ دونوں گروہوں میں تصادم ہو گیا ہے اور اب ان کے حرکت کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ والکر نے اس بارے میں کوئی وضاحت نہیں کی تھی۔ شائن بھی اس کے منصوبے سے مطمئن نہیں تھا مگر باس وہی تھا اور وہ اسی شرط پر انہیں ساتھ لایا تھا کہ وہ اس کے کہے پر عمل کریں گے۔ شائن نے انکار کیا۔ ''والکر نہیں مانے گا۔''

رینا نے بے دلی سے سر ہلایا۔ اصل میں اسے اپنا کردار کھل رہا تھا۔ وہ گھر میں بھی اس طرح کے نسوانی لباس کم پہنتی تھی۔ خاص طور سے ایسے بھاری بھرکم لباس سے اسے بہت الجھن ہوتی تھی۔ اس نے کہا۔ ''والکر نے کچھ اور افراد بھی رکھے ہوئے ہیں جن کا ہمیں علم نہیں ہے؟''

شائن نے سوچا اور پھر سر ہلایا۔ ''میرا بھی یہی خیال ہے، اس نے ہمیں پوری بات نہیں بتائی ہے۔''

''یعنی ہم اس کے اشاروں پر ناچنے والے پیٹ ہیں۔'' رینا تلخ لہجے میں بولی۔ ''کیا میرے لیے اس قسم کا کاسٹیوم تجویز کرنا ضروری تھا؟''

''بہت ضروری تھا۔'' شائن نے مسکرا کر کہا۔ ''یہاں

مقامی عورتیں ہوتی ہیں یا پھر شکاری عورتیں۔ اس کے علاوہ تمہیں کوئی تیسری عورت دکھائی نہیں دے گی۔ اگر تم پتلون قمیص اور جیکٹ میں پستول اور رائفل کے ساتھ دکھائی دیتیں تو یہاں موجود ہر فرد تم میں دلچسپی لیتا لیکن اب وہی تمہاری طرف آئیں گے جن کی جیب اس کی اجازت دیتی ہوگی اور انہیں تم نہایت آرام سے ٹال سکتی ہو۔''

''بعض لوگ اتنی آسانی سے ٹلنے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ ان کے لیے مجھے دوسرا حربہ استعمال کرنا پڑے گا۔'' رینا نے کہا اور گلاس بیج کر کھڑی ہوگئی۔ وہ دو دن سے اپنے ہوٹل کے کمرے میں قید تھی اور آج بور ہو کر باہر نکلی تھی۔ مگر اب اسے دوبارہ کمرے میں قید ہونا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد میدانِ عمل میں آجائیں۔ دوسرے دن ونسلو میں ایک معمولی سا ہنگامہ ہوا۔ ایک جوئے خانے میں پتے لگانے پر جھگڑا ہوا اور آپس میں فائرنگ میں تین جواری مارے گئے تھے۔ مارے جانے والوں کی لاشیں مقامی انتظامیہ لے گئی تھی مگر اگلی صبح والکر نے رینا اور شائن سے ملاقات کی، وہ پریشان لگ رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''کل جوئے خانے میں جو تین لوگ مارے گئے تھے ان میں ایک میرا آدمی بھی تھا اور اس وقت اسے فلیگ اسٹاف کے پہاڑوں میں ہونا چاہیے تھا۔ مگر وہ یہاں جوئے خانے میں موجود تھا۔''

رینا نے طنز کیا۔ ''ان لوگوں پر بھروسا کر کے تم سونے کے حصول کا ارادہ رکھتے ہو؟''

''اب مجھے خود جا کر دیکھنا ہوگا۔'' والکر نے کہا۔

''اور ہم؟''

''تم لوگ یہیں ٹھہرو گے، میں واپس آؤں گا۔'' والکر نے کہا۔

''تمہاری عدم موجودگی میں تمہارے آدمیوں کو کون کنٹرول کرے گا؟''

''شائن۔'' والکر نے کہا۔ ''یہ ان کے بارے میں جانتا ہے۔''

والکر ایک آدمی کو لے کر فلیگ اسٹاف کی طرف روانہ ہو گیا تھا اور پھر اگلے دن بھی اس کی واپسی نہیں ہوئی تھی جبکہ وہ کہہ گیا تھا کہ وہ چوبیس گھنٹے سے پہلے واپس آجائے گا۔ شائن اور رینا دونوں اس کے بارے میں فکر مند تھے۔ حالات بتا رہے تھے کہ والکر بھی کسی مشکل میں گھر گیا تھا۔ رینا نے شائن سے کہا۔ ''مجھے خطرہ ہے وہ کہیں واٹسن یا جارج کے ہتھے نہ چڑھ گیا ہو، اس صورت میں ہم سب خطرے میں ہیں۔''

''وہ کیسے؟'' شائن نے پوچھا۔

''وہ اس سے ہمارے بارے میں اگلوا سکتے ہیں۔'' رینا نے کہا۔ ''اس کے بعد وہ یہیں کا رخ کریں گے۔''

شائن فکر مند ہو گیا تھا۔ والکر کی عدم موجودگی میں باس وہی تھا۔ رینا نے خدشے کا اظہار کر دیا تھا لیکن فیصلہ اسے ہی کرنا تھا۔ شائن نے کہا۔ ''ہم صبح تک دیکھتے ہیں اگر والکر واپس نہیں آیا تو ہم فلیگ اسٹاف کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔''

''لیکن شاہراہ والے راستے سے نہیں...''

''پھر کون سے راستے سے جائیں گے؟''

''ایک راستہ مشرق کی طرف سے نکلتا ہے ہمیں پہلے ٹیکساس کی طرف جانا ہوگا پھر ہم پلٹ کر اس راستے سے فلیگ اسٹاف کی طرف بڑھیں گے۔''

شائن راضی ہو گیا۔ اگلی صبح تک والکر واپس نہیں آیا تھا اس لیے وہ ونسلو سے روانہ ہو گئے۔ رینا نے اپنا لباس بدل لیا تھا، اب وہ پتلون قمیص میں تھی اسلحہ چھپانے کے لیے اس نے اوپر سے اونی شال لے لی تھی۔ رینا، شائن اور مارس کے علاوہ نو افراد تھے۔ انہیں لے کر وہ مشرق کی طرف روانہ ہو گئے۔ رینا نوجوانی میں اس علاقے میں کلارک کے ساتھ سفر کرتی رہی تھی اور کلارک نے ہی اسے اس راستے کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ نہایت دشوار گزار تھا اور صرف گھوڑوں کی مدد سے سفر کیا جا سکتا تھا۔ یہ راستہ فلیگ اسٹاف کے شمال میں گرینڈ کینین کے پاس جا کر نکلتا تھا، در حقیقت یہ ایک نالہ تھا جو بارش کے پانی نے کاٹ کر بنایا تھا اور پہاڑوں میں گھومتا ہوا گرینڈ کینین میں جا کر نکلتا تھا۔ بارش کے دنوں میں اس میں سفر کرنا خودکشی کے مترادف ہوتا۔ اس لیے جو اس راستے سے واقف تھے وہ بھی اس میں سفر سے گریز کرتے تھے۔ مگر ان دنوں بارش کا موسم نہیں تھا اس لیے نالے میں سفر ممکن تھا۔ چند میل بعد وہ گھوم کر اس طرف آ گئے۔ شائن نالے کی گہرائی دیکھ کر حیران ہوا تھا، اس کے دونوں طرف بہت بلند پہاڑ تھے اور یہ سیدھے کھڑے تھے اس میں کہیں اوپر چڑھنے کا راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شائن مضطرب ہو گیا۔

''اس میں ہم پھنس سکتے ہیں۔ اگر کہیں کسی نے گھیرا تو اس سے نکلنے کا راستہ بھی نہیں ملے گا۔''

''میرے پاپا نے یہ راستہ دریافت کیا تھا اور ان کا کہنا ہے اس میں اوپر سے حملہ کرنا بہت مشکل ہے کیونکہ نیچے بے شمار چھپے ہوئے راستے ہیں۔''

''اس صورت میں دشمن باہر نکلنے کے راستے پر انتظار کرے گا اور ہم ساری عمر تو اس میں نہیں رہ سکتے۔''

''لیکن دشمن کو پتا کیسے چلے گا جبکہ اس پلان کا صرف مجھے اور تمہیں پتا ہے۔'' رینا نے کہا۔ ''مجھ پر اعتماد کرو اگر والکر دشمنوں کے ہاتھ لگ گیا ہے تو شاہراہ والا راستہ ہمارے لیے پھندا ثابت ہوتا، اس پر گھیرنا بہت آسان ہے۔''

شائن اور اس کے ساتھی اتنے آمادہ نہیں تھے، مجبوراً اس نالے میں داخل ہوئے تھے۔ یہاں کہیں کہیں پانی کے تالاب کھڑے تھے اور سبزہ اکثر جگہوں پر تھا۔ اس کا مطلب تھا کئی مہینوں سے اس نالے میں زیادہ پانی نہیں آیا ورنہ نقشے کے مطابق یہ نالا تقریباً ساٹھ کلومیٹرز کے بعد جا کر فلیگ اسٹاف پر نکلتا۔ یہ شاہراہ سے زیادہ طویل تھا مگر محفوظ بھی تھا۔ وہ گھوڑوں پر تھے اور معتدل رفتار سے سفر کر رہے تھے۔ دوپہر تک وہ فلیگ اسٹاف کے پاس آ چکے تھے۔ شائن کے ساتھی اسی وقت باہر نکلنا چاہتے تھے لیکن شائن اور رینا نے انہیں روک دیا۔ ان کا خیال تھا کہ واٹسن اور جارج کے گروہ اسی علاقے میں تھے اور دن میں وہ آسانی سے ان کی نظروں میں آجاتے اس لیے سورج غروب ہونے کے بعد نکلنا مناسب ہوگا۔ اب شائن کو ایک فکر اور ستا رہی تھی، اس نے رینا سے کہا۔

''فرض کرو والکر کو کسی وجہ سے دیر ہوئی ہو اور اب وہ واپس پہنچے گا تو ہمیں غائب پائے گا۔''

''یہ اس کا قصور ہے اور اس قسم کے معاملات میں مفروضات پر نہیں حالات پر فیصلے کیے جاتے ہیں۔'' رینا نے جواب دیا۔ وہ اپنی رائفل چیک کر رہی تھی۔ ''ویسے مجھے یقین ہے والکر کسی مشکل میں پڑ گیا ہے۔ اس کا آدمی جسے اس نے جاسوسی کے لیے فلیگ اسٹاف بھیجا تھا ونسلو میں جوئے خانے میں جوا کھیلتے ہوئے جھگڑے میں مارا گیا۔ اس کا مطلب ہے اس کے باقی آدمیوں کے ساتھ بھی کوئی مسئلہ تھا۔ میرے خیال میں اسے اکیلے جانے کے بجائے سب کو ساتھ لے کر جانا چاہیے تھا۔''

''یہی خیال اب مجھے بھی آرہا ہے۔''

''واٹسن اور جارج دونوں بہت ہوشیار مجرم ہیں اور ان سے نمٹنا آسان نہیں ہے۔'' رینا بولی۔ ''تم سے کم ایسے ہلکے منصوبوں سے وہ قابو میں نہیں آسکتے۔''

شائن کو شاید اچھا نہیں لگا تھا کہ ایک عورت یوں مردوں پر تنقید کر رہی تھی، اس نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''تب تم کیوں ساتھ آئیں؟''

''مجھے واٹسن سے اپنے باپ کا انتقام لینا ہے ورنہ مجھے سونے والے چکر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور مجھے اس کا یقین بھی نہیں ہے کہ سونا اب یہاں موجود ہے۔'' رینا نے جواب دیا۔

''صرف ایک آدمی کے ساتھ تم واٹسن سے انتقام لے سکو گی؟'' شائن نے مارس کی طرف دیکھا جو اپنے اور رینا کے گھوڑے کی دیکھ بھال میں لگا ہوا تھا۔ ''تمہارا یہ ملازم لڑنے بھڑنے کا ماہر نہیں ہے؟''

''رائفل چلا لیتا ہے۔''

شائن طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ ''رائفل چلا لیتا ہے اور اس کے بل پر تم واٹسن جیسے سفاک ڈاکو سے ٹکرانے چلی ہو۔''

''تم لوگ بھی تو ساتھ ہو۔''

''ہم یہاں صرف سونے کے لیے آئے ہیں۔'' شائن نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ ''ہمارا واٹسن یا جارج سے ٹکرانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''لیکن میرا خیال ہے یہ ٹکراؤ لازمی ہوگا۔'' رینا بولی۔ ''سب سونے کے پیچھے پاگل ہو رہے ہیں اور کوئی دوسرے کو آسانی سے کامیاب ہونے نہیں دے گا۔''

رات ہونے پر وہ نالے سے باہر آئے تھے۔ باہر آنے کا راستہ آسان نہیں تھا خاص طور سے تاریکی میں لیکن وہ کسی نہ کسی طرح باہر نکل آئے۔ احتیاطاً انہوں نے گھوڑوں کے سموں پر کھال باندھ دی تھی تاکہ ٹاپوں کی آواز دور تک نہ جائے۔ یہ سارا علاقہ سخت پتھر سے بنا ہوا تھا اور اس پر گھوڑوں کی ٹاپیں دور تک سنائی دے سکتی تھیں۔ شائن نے ایک بلند چوٹی کی طرف اشارہ کیا۔ ''ہمیں وہاں جانا ہوگا، وہاں سے یہ سارا علاقہ صاف دکھائی دیتا ہے۔''

''مجھے معلوم ہے لیکن اس چوٹی تک آنے جانے کا ایک ہی راستہ ہے۔ اگر دشمن نے ہمیں دیکھ لیا تو نہایت آسانی سے گھیر لے گا، ہمارے پاس نیچے آنے کا اور کوئی راستہ بھی نہیں ہوگا۔''

''وہاں ہم محفوظ ہوں گے۔'' شائن نے اصرار کیا۔ ''ہمیں اس وقت تک چھپ کر رہنا ہوگا جب تک واٹسن اور جارج میں تصادم نہیں ہو جاتا۔''

''ہم لامحدود مدت تک یہاں نہیں رہ سکتے کیونکہ ہمارے پاس پانی نہیں ہوگا۔'' رینا نے توجہ دلائی تو شائن پریشان ہو گیا۔

''ہاں یہ تو سوچا نہیں تھا۔''

”بہتر ہوگا کہ ہم نالے کے ساتھ رہیں۔ ایک تو گھیرے جانے پر ہم اس سے فرار ہوسکتے ہیں دوسرے یہاں سے ہمیں پانی مل سکتا ہے۔“

پارٹی نالے کے ساتھ ایک بلند ٹیلے پر سمت آئی تھی۔ یہاں سے آس پاس کا منظر صاف دکھائی دیتا تھا۔ وہ نالے سے دائیں طرف نکلے تھے۔ ونسلو سے آنے والا راستہ بھی اسی طرف سے گزرتا تھا۔ مغرب سے آنے والی شاہراہیں فلیگ اسٹاف کے راستے اس کھائی کو عبور کرتی تھیں۔ اس کے لیے پہلے کھائی میں اترنا پڑتا تھا اور بارش کے دنوں میں اسے عبور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کھائی کا ایک حصہ بلند زمین کے دائیں طرف بھی تھا گویا ان کے دو طرف کھائی تھی اور وہ بلند ٹیلا جس پر وہ لوگ موجود تھے، ان کے درمیان میں تھا۔ یہ جگہ محفوظ تھی کیونکہ کوئی حملہ آور بہت لمبا چکر لگا کر ہی ان تک آسکتا تھا اور وہ بھی بہت دور سے ان کی نظروں میں آجاتا کیونکہ تین طرف کھائی تھی اور نیچے اترنے کا راستہ وہی تھا جہاں سے وہ آئے تھے۔ مگر رینا کے خیال میں یہ جگہ اتنی محفوظ نہیں تھی خاص طور سے جب یہاں سے باہر نکلنا ہوتا۔ راستہ ایک ہی تھا اور چند آدمی آرام سے ان کا راستہ روک سکتے تھے۔ رینا نے شائن سے بات کی لیکن فی الحال وہ یہاں سے کہیں اور جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

رینا گھوڑوں کے پاس آئی۔ مارس وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ جب رینا اس مہم پر جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی تو جیف نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ اس کا کہنا تھا کہ والکر کرٹ بے شک ایوی گولڈ سے متعلق سہی لیکن اس کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ رینا کو اس پر آنکھ بند کر کے بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ جب رینا اپنے ارادے پر قائم رہی پھر جیف نے التجا کی کہ وہ مارس کو ساتھ لے جائے۔ اس نے کہا۔ ”مادام، اب میں بوڑھا ہوگیا ہوں اور آپ کے ساتھ جانے کے قابل نہیں ہوں لیکن مارس بہت اچھا محافظ ثابت ہوگا۔“

اس لیے وہ مارس کو ساتھ لے آئی۔ اس نے رینا کو دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ ”مادام مجھے ان لوگوں کا انداز پسند نہیں ہے۔“

”تم اس کی فکر مت کرو۔“

”مادام مجھے خطرہ بھی محسوس ہو رہا ہے۔ ہم بہت محدود جگہ پر ہیں۔ اگر دشمن نے ہماری موجودگی بھانپ لی تو وہ ہمیں یہاں سے نکلنے نہیں دے گا۔ صرف دو آدمی ہمیں یہاں قید رکھنے کے لیے کافی ہوں گے۔“

رینا نے سر ہلایا۔ ”یہی بات میں بھی محسوس کر رہی ہوں مگر شائن اور اس کے ساتھی یہاں سے جانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔“

”تب ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ یہ لوگ اس جگہ اتنے سکون سے بیٹھے ہیں۔ جبکہ یہاں آدمی زیادہ دیر چھپ نہیں سکتا۔ مجھے یقین ہے اب تک واٹسن اور جارج کو ہماری یہاں موجودگی کی اطلاع مل گئی ہوگی، اس سے پہلے کہ وہ ہمیں یہاں گھیریں ہم دونوں کو نکل جانا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے، تم آدھی رات کو گھوڑے تیار رکھنا۔“ رینا نے سر ہلایا۔ کم عمری سے قطع نظر مارس ایک پختہ کار اور بہت ذہین نوجوان تھا۔ کیونکہ اس کی پرورش ان کے گھر میں ہوئی تھی اس لیے رینا اسے چھوٹا بھائی سمجھتی تھی۔ رینا خود سوچ رہی تھی اتنے سارے لوگوں کے ساتھ ایک جگہ رکے رہنا ٹھیک نہیں تھا۔ وہ زیادہ دیر نہیں چھپ سکتے تھے۔ نصف رات سے پہلے مارس اپنے اور رینا کے گھوڑے کو پانی پلانے کے بہانے روانہ ہوگیا۔ پانی نیچے نالے میں تھا مگر وہ نالے میں نہیں گیا بلکہ ٹیلے کے ایک طرف رینا کا انتظار کر رہا تھا جیسے ہی رینا آئی وہ شمال مشرق کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایک طویل چکر کاٹ کر وہ واپس جنوب مغرب کی طرف آئے۔

اب وہ گرینڈ کینین کے عین اوپر تھے۔ ان کے اور شائن کے آدمیوں کے درمیان میں کھائی آگئی تھی۔ مارس نے صبح سے پہلے کچھ چٹانوں کے درمیان ایک محفوظ جگہ تلاش کر لی تھی۔ یہاں وہ سب کی نظروں سے چھپ کر رہ سکتے تھے اور سب سے بلند چٹان پر چڑھ کر آس پاس نظر بھی رکھ سکتے تھے۔ رینا نے اپنی ڈارک ریڈ جیکٹ اتار دی۔ یہ دور سے نظر آتی۔ اب وہ خاکی پتلون اور اسی رنگ کی شرٹ میں تھی اور یہ چٹانوں میں زیادہ نمایاں نہیں تھی۔ رینا اوپر چڑھی اور اس نے سب سے پہلے دوربین سے شائن اور اس کے آدمیوں کا ٹھکانا دیکھا۔ وہ اس جگہ سے تین کلومیٹرز دور تھا مگر طاقتور دوربین سے دکھائی دے رہا تھا۔ آدمیوں کے چہرے صاف نہیں تھے مگر وہ شائن اور اس کے ساتھی تھے۔ مارس اس کے ساتھ ہی اوپر آگیا تھا اور وہ بھی دوربین سے آس پاس کا معائنہ کر رہا تھا۔ پھر اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ”مادام اس طرف دیکھو۔“

رینا نے دوربین گھمائی تو فوراً ہی اسے وہ چار گھوڑے سوار دکھائی دیے جو چٹانوں کی آڑ میں شائن کے کیمپ کی طرف بڑھ رہے تھے، وہ سب مسلح تھے اور ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کوئی کارروائی کرنے جا رہے ہیں۔

صرف چار افراد کا دس افراد پر دھاوا بولنا سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ گھات لگا کر بے خبری میں انہیں نقصان پہنچا سکتے تھے لیکن اس طرح براہ راست حملہ ممکن نہیں تھا۔ شائن کے آدمی انہیں دور سے دیکھ لیتے۔ پھر وہ کچھ چٹانوں کے پاس پہنچ کر رک گئے، انہوں نے اپنے گھوڑے ایک طرف باندھ دیے۔ وہ پھیل کر چٹانوں پر چڑھ رہے تھے۔ باہر آنے کا راستہ یہی تھا۔ شائن اور اس کے آدمی جب اس جگہ سے نکلنے کی کوشش کرتے تو ان کی زد میں آجاتے اور وہ انہیں نہایت آسانی سے اپنا شکار بنا سکتے تھے۔ مارس نے رینا کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ میں نے کہا تھا نا مادام۔ رینا دوربین سے شائن اور اس کے ساتھیوں کا معائنہ کر رہی تھی اور اس نے محسوس کیا کہ وہ وہاں سے نکلنے کی تیاری کر رہے تھے، گھوڑے تیار کیے جا رہے تھے اور ان پر سامان باندھا جا رہا تھا۔ رینا عجلت میں نیچے اترنے لگی۔ اس نے مارس سے کہا۔ ”جلدی کرو، وہ نکل رہے ہیں اگر چٹانوں تک آگئے تو سب مارے جائیں گے۔“

رینا اور مارس نے سامان وہیں چھوڑا اور عجلت میں گھوڑوں پر سوار ہوکر روانہ ہوگئے۔ انہوں نے صرف اسلحہ ساتھ لیا تھا۔ چٹانوں سے کچھ پہلے انہوں نے گھوڑے بھی چھوڑ دیے اور پیدل آگے بڑھے۔ قریب پہنچ کر مارس نے ایک چٹان کی طرف اشارہ کیا۔ اس سے وہ چاروں آسانی سے نشانے پر آجاتے۔ وہ دونوں چٹان پر چڑھ گئے۔ واقعی یہاں سے وہ چاروں صاف دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے رائفلیں سنبھال لیں اور انتظار کرنے لگے۔ پھر شائن اور اس کے ساتھی گھوڑوں پر سوار آتے نظر آئے، ان کو دیکھتے ہی چاروں نے رائفلیں نکال لیں مگر اس سے پہلے کہ وہ انہیں استعمال کرتے رینا اور مارس کی رائفلوں نے شعلے اگلے اور ایک منٹ سے بھی پہلے وہ چاروں ڈھیر ہوگئے تھے۔ تین تو مارے گئے تھے صرف ایک زخمی ہونے کے بعد چٹان سے نیچے اتر گیا تھا۔ رینا نے نیچے آنے سے پہلے مخصوص انداز میں سیٹی بجائی تو شائن اور اس کے آدمی جو فائرنگ کی آواز سن کر رک گئے تھے، آگے آئے۔ شائن خود گھوڑا دوڑاتا اس کے پاس آگیا۔

”تم یہاں... ہم تمہاری تلاش میں نکلے تھے۔“

”مجھے معلوم تھا یہاں حملہ ہوگا اس لیے میں پہلے نکل آئی ورنہ ابھی ان کی جگہ تم سب کی لاشیں پڑی ہوتیں۔“

شائن کے ساتھی جلد ہی زخمی کو تلاش کر کے لے آئے۔ گولی نے اس کے شانے کی ہڈی توڑ دی تھی اور وہ تکلیف سے نڈھال تھا مگر شائن نے ذرا رحم کھائے بغیر اس کے زخمی شانے پر جوتے کی نوک رکھ دی اور غرا کر پوچھا۔ ”کس نے بھیجا ہے تمہیں؟“

”اس سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ رینا نے کہا اور زخمی کے جوتے کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ دیکھو اس پر ڈبلیو کا حرف بنا ہے۔ یہ یقیناً واٹسن کا آدمی ہے، اس سے واٹسن کا پتا پوچھو۔“

”واٹسن کہاں ہے؟“

زخمی نے رونا کراہنا جاری رکھا لیکن اس نے منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ مر جائے گا مگر منہ سے کچھ نہیں کہے گا۔ شائن نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ساتھ کر لیں۔ رینا شائن کو ایک طرف لائی۔ ”واٹسن تک پہنچنے کا ایک طریقہ ہوسکتا ہے۔ ان گھوڑوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور پھر ان کا تعاقب کیا جائے امید ہے یہ اپنے ٹھکانے پر جائیں گے۔“

شائن کو یہ آئیڈیا پسند آیا بلکہ اس نے یہ کیا کہ مارے جانے والوں کی لاشیں اور زخمی کو بھی گھوڑے پر بندھوا دیا اور پھر انہیں ہنکایا تو گھوڑے ایک طرف روانہ ہوگئے اور وہ سب فاصلے سے ان کا تعاقب کرنے لگے۔ شائن نے رینا سے پوچھا۔ ”تمہیں یقین ہے یہ واٹسن کے ٹھکانے پر جائیں گے؟“

”بالکل۔“

”فرض کرو ایسا ہی ہوا تب ہم کیا کریں گے؟“

”واٹسن اور اس گروپ کا صفایا۔“ رینا نے کہا۔

”لیکن ہمارا مشن یہ نہیں ہے۔“

”تمہارا مشن...؟“ رینا نے طنز کیا۔ ”اگر میں سمجھداری سے کام نہ لیتی تو تمہارا مشن اب تک ختم ہوچکا ہوتا۔ واٹسن اور اس کے گروپ کا خاتمہ کیے بغیر ہم سونے تک نہیں پہنچ سکتے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن کیا جارج کا یہی مقصد نہیں ہوسکتا؟“

رینا چونکی۔ ”کیا مطلب؟“

”جارج چاہتا ہے کہ واٹسن کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اس کے بعد وہ آرام سے سونا وہاں سے نکال لے گا جہاں اس نے چھپا رکھا ہے۔“

”فرض کرو ایسا ہی ہے تب بھی ہم کیا کر سکتے ہیں۔ واٹسن بہرصورت ہمارے راستے میں آئے گا۔ اب یہ بات ثابت ہوچکی ہے واٹسن سے نمٹے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔“

گھوڑے گرینڈ کینین کے مرکزی حصے کی طرف جا رہے

تھے۔ یہ نہایت دشوار گزار علاقہ تھا اور بعض جگہوں پر تو پہاڑوں کے ساتھ بس ایک پتلی سی پٹی ہوتی تھی گزرنے کے لیے۔ یہاں ذرا سا پاؤں پھسلتا تو آدمی سیکڑوں فٹ کی گہرائی میں جا گرتا۔ بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ایسے مقامات پر وہ گھوڑے سے اتر کر اس کی لگام تھام کر چلتے تھے۔ لاشوں والے گھوڑے یہاں سے پتا نہیں کیسے گزرے تھے۔ شاید وہ اس کے عادی تھے۔ شام کے قریب وہ گرینڈ کینین کے مرکزی حصے میں تھے۔ گھوڑے اب بھی سست رفتاری سے چل رہے تھے، ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کی منزل قریب آ گئی ہو۔ رینا نے کہا۔ ”میرے خیال ہے اب پیدل ان کا تعاقب کیا جائے۔“

”بہتر ہو گا انہیں روک لیا جائے اور ہم صبح آگے بڑھیں تاریکی میں یہ کام مناسب نہیں ہو گا۔ اگر واٹسن کا ٹھکانا آس پاس ہوا تو وہ اس علاقے سے بہتر واقف ہوں گے اور اس کا فائدہ اٹھائیں گے۔“

رینا کو اس کی بات درست لگی اس نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے لیکن رات کو ہمیں بہت ہوشیار رہنا پڑے گا۔“

لاشوں والے گھوڑے واپس بلا لیے گئے۔ چوتھا زخمی اس طرح سفر کرنے سے قریب المرگ ہو گیا تھا۔ شائن کے ایک آدمی سے اس کی حالت دیکھی نہیں گئی اور اس نے اس کا گلا دبا کر اسے مار دیا۔ رینا کو یہ اچھا نہیں لگا تھا مگر وہ کیا کرتی، وہ بھی دشمن تھا اور انہیں نہایت بے دردی سے قتل کرنے آیا۔ انہوں نے باری باری ساری رات جاگتے اور چوکنا رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ شائن کے تین آدمی ایسی جگہوں سے پہرہ دے رہے تھے جہاں سے وہ دور تک نظر رکھ سکتے تھے۔ خود شائن بھی جاگ رہا تھا۔ انہوں نے کھانے اور کافی کے لیے آگ ایسی جگہ جلائی تھی جہاں وہ دور سے نظر نہیں آ سکتی تھی۔ شائن کھانے کے بعد اپنی کافی لے کر رینا کے پاس آ گیا۔ ”اگر کل ہم واٹسن سے نمٹ لیتے ہیں تو کیا تم واپس چلی جاؤ گی؟“

رینا نے محسوس کیا کہ اس واقعے کے بعد وہ اس سے مرعوب ہو چلا تھا اور ہر معاملے میں اس کی رائے جاننے کی کوشش کرتا تھا۔ رینا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں سونے کے حصول میں تمہارا ساتھ دوں گی۔ والکر نے انعام میں سے مجھے چوتھا حصہ دینے کو کہا تھا۔“

”مجھے بھی چوتھا حصہ کہا ہے۔“ شائن بولا۔

”یعنی نصف وہ خود رکھ رہا ہے۔“ رینا نے غور کیا۔ ”سوال یہ نہیں ہے کہ وہ نصف خود کیوں رکھ رہا ہے؟ سوال یہ ہے کہ وہ نصف ہمیں کیوں دے رہا ہے؟“

”یہ آدمی میں نے ہائر کیے ہیں۔“ شائن نے اپنے آدمیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ سب قابلِ اعتماد اور ماہر لڑاکے ہیں میرے علاوہ کوئی اسے ایسے آدمی مہیا نہیں کر سکتا تھا۔“

”ٹھیک ہے تمہاری شمولیت سمجھ میں آتی ہے لیکن میں کیوں...؟“

شائن نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”میرا خیال ہے تم نے ثابت کر دیا ہے کہ اس مہم کے لیے تم میرے ایک درجن آدمیوں سے زیادہ کارآمد ہو کیونکہ تم اس علاقے اور واٹسن جیسے مجرموں کی فطرت اچھی طرح جانتی ہو۔“

رینا سوچ رہی تھی کہ وہ واٹسن سے نمٹ لیتے ہیں تب سونے کی تلاش کیسے کی جائے گی کیونکہ مکمل پلان والکر کے پاس تھا اور وہ غائب تھا۔ یہ بات واٹسن سے معلوم کی جا سکتی تھی کہ والکر کہاں تھا۔ اگر وہ واٹسن کے ہاتھ نہیں آیا تھا تو لازمی بات تھی وہ جارج کے ہتھے چڑھ گیا تھا اور دونوں صورتوں میں اس کا انجام ایک ہی ہوتا تھا۔ اگر والکر مارا جا چکا تھا تو سونے کے حصول کا منصوبہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ رینا کے خیال میں وہ پھر بھی خسارے میں نہیں رہے گی۔ واٹسن کی موت اس کے لیے سب سے بڑا انعام ثابت ہو سکتی تھی مگر شائن کا کیا ہو گا؟ وہ تو سونے کی امید میں یہاں آیا تھا اور درجن بھر آدمی بھی ساتھ لایا تھا۔ رینا نے ان کی طرف دیکھا۔

”انہیں کیا دیا جائے گا؟“

”دس ہزار ڈالرز فی کس۔“ شائن بولا۔ ”ایک ہزار پیشگی دیے ہیں اور نو ہزار کام ہونے کے بعد۔“

”تم نے دیے ہیں؟“

”نہیں والکر نے... اس مہم کے تمام اخراجات وہی برداشت کر رہا ہے۔“

”یہ مان گئے؟“ رینا نے حیرت سے کہا۔ یہ مہم آسان نہیں تھی اور یہاں زندگی اور موت کا امکان آدھا آدھا تھا اور وہ صرف دس ہزار ڈالرز کی خاطر یہ خطرہ مول لینے چلے آئے تھے۔ شائن اس کی سوچ بھانپ گیا، اس نے کہا۔

”یہ پیشہ ور لڑاکے ہیں اور ان کا کام ہی رقم کے بدلے موت کا سامنا کرنا ہے۔“

رینا دیکھ رہی تھی کہ ان میں نظم و ضبط تھا اور وہ احکامات کی پوری طرح تعمیل کرتے تھے۔ صبح ہوتے ہی وہ سب تیار ہو گئے۔ رات سب نے ہی کسی قدر آرام کیا تھا۔ اس لیے اب حالات کا سامنا کرنے کے لیے تر و تازہ تھے۔ لاشوں سے بُو آنا شروع ہو گئی تھی۔ دوپہر تک وہ یقیناً بہت زیادہ بو دینے لگتیں اس لیے انہوں نے روشنی ہونے

سے پہلے روانہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ گھوڑے آزاد کیے گئے تو وہ پہلے سے زیادہ بے تابی سے چلنے لگے۔ انہیں کھانے پینے کو نہیں دیا تھا۔ شائن کا خیال تھا کہ اس صورت میں وہ سیدھے اپنے ٹھکانے پر جائیں گے۔ سورج نکلنے کے کچھ دیر بعد گھوڑے ایک چھوٹی سی وادی میں داخل ہوئے جس کی تہ میں کوئی چشمہ تھا کیونکہ وہاں درخت اور ہریالی دکھائی دے رہی تھی، اس کے آس پاس لکڑی کے بنے کئی کیبن تھے۔ وہ اوپر ہی رک گئے۔ گھوڑے کیبنوں کے سامنے پہنچ گئے تھے۔ اب وہ ہنہنا رہے تھے اور اندر موجود افراد کو متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ دیر میں کیبنوں سے لوگ برآمد ہونے لگے اور جب انہوں نے اپنے آدمیوں کی لاشیں دیکھیں تو چوکنا ہو گئے۔ وہ ہتھیار لینے دوڑے تھے مگر اس سے پہلے شائن اور اس کے آدمیوں نے اوپر سے فائر کھول دیا۔ تین تو راستے میں مارے گئے تھے اور دو زخمی ہو کر کیبنوں میں گھسے تھے جبکہ تین افراد بچ نکلے تھے۔ فوراً ہی کیبنوں کی طرف سے جوابی فائرنگ شروع ہو گئی۔

رینا نے حملے میں حصہ نہیں لیا تھا اس کے بجائے وہ بھاگنے والوں اور کیبنوں میں موجود افراد کی تعداد کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پانچ افراد بچ گئے تھے اور اندر بھی کچھ لوگ موجود تھے۔ رینا نے ہتھیاروں کی تعداد سے اندازہ لگایا کہ وہ اب بھی ایک درجن سے زیادہ تھے۔ کیبنوں کی طرف بے تحاشا فائرنگ سے دھواں پھیلا ہوا تھا اور اس کے پار کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ شائن اور اس کے آدمی محفوظ تھے۔ اب وہ نیچے جا کر واٹسن اور اس کے آدمیوں کے خاتمے کی بات کر رہے تھے۔ رینا نے مارس کو اشارہ کیا اور وہ پیچھے ہٹ آئے۔ رینا نے مارس سے کہا۔ ”میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ واٹسن دفاعی لحاظ سے اتنی کمزور جگہ کو اپنا ٹھکانا بنا سکتا ہے۔“

”مادام، تمہارا مطلب ہے وہ یہاں موجود نہیں ہے۔“

”ہو سکتا ہے وہ موجود ہو لیکن یہ اس کا مستقل ٹھکانا نہیں ہو سکتا۔ ہمیں محتاط رہنا ہو گا۔“

دونوں طرف سے گولیاں چل رہی تھیں، مورچہ زن ہونے کے بعد مخالف پارٹی کا مزید کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ رینا کی ہدایت پر مارس ایک بلند چٹان پر چڑھ گیا جہاں سے وہ آس پاس نظر رکھ سکتا تھا۔ شائن نے اس سے پوچھا۔ ”تم نے اپنے آدمی کو کہاں بھیجا ہے؟“

”میرا اندازہ ہے یہ جگہ واٹسن کا اصل ٹھکانا نہیں ہو سکتی اس کا اصل ٹھکانا کہیں اور ہے اور اگر وہ پاس ہی ہوا تو جلد یا بدیر اس کی طرف سے ردعمل سامنے آئے گا۔ ہمیں اپنے اطراف سے بھی ہوشیار رہنا چاہیے۔“

شائن کے آدمیوں کے پاس مٹی کا تیل تھا۔ ایک لڑکا ایک ایسی جگہ گیا جہاں سے کیبن زیادہ دور نہیں تھے اور اس نے مٹی کے تیل سے بھری بوتل کے منہ پر کپڑا ٹھونس کر اسے آگ دکھائی اور پھر ایک کیبن پر پھینک دیا۔ بوتل ٹوٹی اور کیبن کی چھت پر آگ لگ گئی۔ اس دوران میں شائن کے آدمی وادی کے اوپری حصے میں چاروں طرف پھیل رہے تھے تاکہ کوئی بچ کر جانے نہ پائے۔ چند اور بوتلیں پھینکنے سے تینوں کیبن آگ کی زد میں آ گئے تھے۔ ان میں دبکے لوگ جلد یا بدیر وہاں سے نکلنے پر مجبور ہو جاتے۔ رینا ایسی جگہ موجود تھی جہاں سے وہ وادی اور مارس دونوں پر نظر رکھ سکتی تھی اچانک مارس نے ہاتھ سے اشارہ کرنا شروع کیا۔ رینا نے شائن سے کہا۔ ”خطرہ! کچھ لوگ اس طرف آ رہے ہیں۔“

وہ بھاگ کر مارس کے پاس پہنچی تو اس نے چلا کر کہا۔ ”شمال سے ایک درجن گھڑسوار آ رہے ہیں۔“

یہ سنتے ہی شائن کے آدمیوں میں افراتفری مچ گئی تھی۔ وہ آنے والوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک جگہ جمع ہونے لگے۔ مارس بلندی پر تھا اس لیے وہ دور سے نظر آ گئے ورنہ وہ اچانک ان کے سر پر آ جاتے تو انہیں سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملتا۔ دو آدمیوں کو وادی پر چھوڑ کر باقی سب آنے والوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ مگر آنے والے چالاک تھے وہ زیادہ نزدیک نہیں آئے اور ایک جگہ گھوڑوں سے اتر کر پیدل چٹانوں اور پتھروں کی آڑ میں آگے آنے لگے۔ رینا نے اپنی رائفل سے سب سے آگے آنے والے کو اس وقت نشانہ بنایا، جب وہ ایک پتھر کی اوٹ سے نکلا۔ گولی نشانے پر لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ شائن نے داد دی۔ ”زبردست نشانہ۔“

”وہ ہوشیار ہیں۔“ رینا نے رائفل لوڈ کرتے ہوئے کہا۔ ”اپنے آدمیوں سے کہو وادی والوں کی طرف سے ہوشیار رہیں اگر وہ اوپر آ گئے تو ہم دو طرف سے گھر جائیں گے۔“

”فکر مت کرو اس طرف میرے دو بہترین آدمی لگے ہیں وہ کسی کو اوپر آنے نہیں دیں گے۔“

کیبن اب پوری طرح آگ کی لپیٹ میں آ گئے تھے اور ان میں موجود افراد نکل بھاگے تھے اور اب درختوں اور پتھروں کی آڑ میں اوپر فائرنگ کر رہے تھے۔ آنے والوں نے بھی پھیل کر فائرنگ شروع کر دی تھی۔ ہر طرف گولیاں برس رہی تھیں۔ فاصلہ ہونے کی وجہ

سے دونوں فریق خاص نقصان سے بچے ہوئے تھے پھر بھی آدھے گھنٹے میں آنے والوں کے دو آدمی مارے جا چکے تھے اور شائن کا بھی ایک آدمی زخمی ہوا تھا گولی اس کے پیٹ کے پہلو سے گزر گئی تھی۔ خون بہا تھا مگر زخم جان لیوا نہیں تھا۔ وادی میں موجود افراد زیادہ نقصان میں رہے تھے کیونکہ ان کی پناہ گاہیں تباہ ہو چکی تھیں اور وہ نشانے پر تھے۔ شائن کے دو آدمیوں نے ایک گھنٹے میں مزید چار افراد کو مار گرایا تھا۔ اب تک دونوں طرف سے اندھا دھند فائرنگ ہو رہی تھی کہ اچانک رینا کو خیال آیا، اس نے شائن سے کہا۔

''اپنے آدمیوں سے کہو اس طرح بے تحاشا فائرنگ نہ کریں ایمونیشن کم پڑ گیا تو وہ ہم پر حاوی آجائیں گے۔''

شائن نے اپنے آدمیوں کو اب ہاتھ روک کر فائر کرنے کا حکم دیا۔ ''کیا خیال ہے یہ اس طرح ہمارا اسلحہ ضائع کرا رہے ہیں؟''

''ہوسکتا ہے۔ نیچے والوں کے پاس خاصا ایمونیشن موجود ہوگا اور آنے والے بھی پوری طرح مسلح ہوں گے۔ میرا اندازہ ہے اب بھی ہمارے مقابلے پر ڈیڑھ درجن افراد ہیں۔ آنے والے رسد کے معاملے میں آزاد ہیں اور ہم اس جگہ قید ہوگئے ہیں جب تک دشمنوں کا صفایا نہیں کریں گے اس جگہ سے نہیں نکل سکتے۔''

''تب ہم کیا کریں؟''

رینا نے سوچ لیا تھا کہ انہیں کھلے مقابلے کے بجائے حکمت عملی سے کام لینا ہوگا۔ اس نے تین جگہوں کی نشان دہی کی اور شائن سے کہا۔ ''اپنے تین آدمیوں سے کہو خاموشی سے ان جگہوں تک پہنچ جائیں اور اپنی موجودگی ظاہر نہ کریں بلکہ میرے اشارے کے منتظر رہیں جب میں کہوں تب وہ حرکت میں آئیں۔''

شائن نے اپنے تین آدمیوں کو ان جگہوں پر جانے کا حکم دیا اور رینا سے کہا۔ ''تمہارے ذہن میں کیا ہے؟''

''ہم رفتہ رفتہ پسپائی اختیار کریں گے اور سمٹ کر ان چٹانوں کی طرف جائیں گے۔'' رینا نے پیچھے موجود چٹانوں کی طرف اشارہ کیا جہاں ان کے گھوڑے موجود تھے۔ ''لازمی بات ہے وہ آگے آئیں گے اور جب ہمارے آدمیوں کے نشانے پر آجائیں گے تو وہ اچانک ان پر حملہ کریں گے اور اسی وقت ہم بھی گھوڑے پر سوار ہو کر حملہ کریں گے۔''

''یہ خطرناک نہیں ہوگا؟'' شائن نے تشویش سے کہا۔

''کامیابی کے لیے خطرہ تو مول لینا پڑے گا۔ اب مجھے یقین ہے کہ یہ واٹسن کا گروہ ہے، وہ خود آگیا ہے۔''

سورج بلند ہو رہا تھا اور چٹانیں تپنا شروع ہوگئی تھیں لیکن اس سے زیادہ تپش وہاں موجود افراد کی رگوں میں تھی۔ خونریز معرکے کے احساس سے وہ سب مضطرب تھے۔ آنے والے ایک گھنٹے میں انہوں نے اپنی حکمت عملی پر کام کیا اور بتدریج کمزوری ظاہر کرتے ہوئے وہ پسپا ہونے لگے۔ وادی پر موجود شائن کے دونوں آدمی بھی ان کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہے تھے لیکن ساتھ ہی وہ وادی والوں کو اپنی زد میں بھی رکھے ہوئے تھے۔ کیبنوں کی آگ درختوں تک پھیل رہی تھی اور خشک جھاڑیاں اور گھاس بھی آگ پکڑ رہی تھی۔ شائن کے تین آدمی اپنے مورچوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ رینا، شائن اور اس کے بقیہ آدمیوں نے سمٹ کر چٹانوں میں جگہ بنالی تھی۔ یہاں ان کے گھوڑے تھے۔ رینا نے اشارہ کیا تو سب گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی رینا نے مورچوں میں چھپے تینوں افراد کو اشارہ کیا کیونکہ واٹسن کے آدمی خاصے آگے آچکے تھے اور اب وہ ان کی زد پر تھے۔ اس لیے جب شائن کے آدمیوں نے اچانک ہی اپنے مورچوں سے ان پر فائرنگ کی تو وہ سنبھل نہیں سکے۔ کئی تو فوراً مارے گئے اور جب ان کی توجہ مورچوں کی طرف تھی تو رینا، شائن اینڈ کمپنی نے مل کر ان پر حملہ کردیا۔ آنے والے ایک گھنٹے تک شدید تصادم ہوا۔ واٹسن اور اس کے ساتھی بری طرح پسپا ہوئے تھے۔ ان کی نصف نفری تو مورچہ بند افراد کا شکار ہوئی تھی۔ پھر رینا اور شائن کا حملہ فیصلہ کن ثابت ہوا۔ بچے ہوئے آدمی ایک چھوٹی سی چٹان کے ساتھ مورچہ بند ہوگئے تھے۔ ان کی تعداد تین سے زیادہ نہیں تھی، باقی مارے جا چکے تھے۔ دوسری طرف وادی میں موجود افراد میں سے بھی کوئی زندہ نہیں بچا تھا، جھاڑیوں اور درختوں میں آگ لگنے کے بعد ان کے پاس چھپنے کو جگہیں بھی باقی نہیں رہی تھیں۔ اس معرکے میں شائن کے چار ساتھی بھی مارے گئے تھے اور دو زخمی تھے۔ مارس کو بھی ران پر زخم آیا تھا مگر اس کا کہنا تھا کہ زخم معمولی ہے اور وہ پوری طرح مستعد ہے۔ انہوں نے چھوٹی چٹان کو اس طرح سے گھیر لیا تھا کہ وہاں چھپے افراد کہیں نہیں جاسکتے تھے۔ رینا نے شائن سے کہا۔

''میرا خیال ہے واٹسن ان میں ہے کیونکہ اس کی لاش نظر نہیں آئی ہے، تم اسے مخاطب کرو۔ میرا ذکر مت کرنا ورنہ وہ آخر دم تک مقابلہ کرے گا۔''

''میں سمجھ رہا ہوں۔'' شائن نے آہستہ سے کہا۔ پھر

اس نے بلند آواز سے کہا۔ ''واٹسن تم میری بات سن رہے ہو؟''

''ہاں سن رہا ہوں۔'' واٹسن کی غراتی آواز آئی۔ ''تم لوگ کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو؟''

شائن نے قہقہہ لگایا۔ ''اگر تم سمجھ رہے ہو کہ ہم جارج کے ساتھی ہیں تو تم غلط فہمی کا شکار ہو۔ اصل میں ہم جارج کے پیچھے آئے ہیں اور اس سے وہ سونا حاصل کرنا چاہتے ہیں جو اس نے پانچ سال پہلے لوٹا تھا۔''

''اگر تم جارج کے پیچھے آئے ہو تو یہاں کیا کر رہے تھے؟'' واٹسن نے پوچھا۔

''تمہارے آدمیوں نے بلاوجہ ہمارے کیمپ پر حملہ کیا جس کے جواب میں ہمیں یہ سب کرنا پڑا۔ اب تمہاری عافیت اسی میں ہے کہ ہتھیار ڈال کر سامنے آجاؤ۔''

''ہم ہتھیار نہیں ڈالیں گے۔'' واٹسن نے پرعزم لہجے میں کہا۔ ''ہم مرتے دم تک مقابلہ کریں گے۔''

''تب مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' شائن نے کہا۔ ''ویسے میں ضمانت دیتا ہوں اگر تم ہتھیار ڈال دو تو تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا بلکہ قانون کے حوالے کر دیا جائے گا۔ تم اس سونے کو لوٹنے والوں میں شامل تھے۔''

واٹسن نے قہقہہ لگایا۔ ''تم نے مجھے پاگل سمجھا ہے جو میں جارج کے کیے کی سزا کاٹوں، عدالت تبھی مجھے پھانسی دے گی۔ نہیں، میں ہتھیار نہیں ڈالوں گا۔ مجھے معلوم ہے تمہارے پاس بھی اب زیادہ لوگ نہیں ہیں۔ اگر تم نے ہمیں مارنے کی کوشش کی تو تم بھی نہیں بچو گے۔''

رینا کچھ سوچ رہی تھی، اس نے مارس کو اشارہ کیا اور وہ دونوں اس جگہ سے دور جانے لگے۔ رینا نے مارس کو دور لے جا کر کہا۔ ''اگر تم وہاں اس چٹان تک جا سکو تو وہاں سے یہ جگہ نشانے پر آسکتی ہے۔ اس طرح ان لوگوں کو باہر آنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔''

مارس نے دور وہ چٹان دیکھی، وہاں تک جانے کے لیے اسے کھائی میں اتر کر بہت لمبا چکر کاٹنا پڑتا۔ مارس نے سر ہلایا۔ ''میں کر لوں گا۔''

''تمہارا زخم...''

''وہ ٹھیک ہے اب دیکھو خون بھی رک گیا ہے۔''

مارس نے اپنے زخم کی طرف اشارہ کیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں سے چلا گیا۔ ذرا دیر میں وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ شائن نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے چٹان کے بارے میں بتایا۔

''وہ بہت دور ہے۔''

''مارس کا کہنا ہے کہ وہ وہاں تک پہنچ سکتا ہے۔'' رینا نے کہا۔ ''اگر وہ وہاں پہنچ گیا تو ان لوگوں کو نشانہ بنا سکتا ہے اور یہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائیں گے۔''

''واٹسن کے لیے تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

''میں اسے قانون کے حوالے کروں گی تاکہ یہ اپنے کیے کی سزا پائے۔'' رینا نے کہا لیکن ابھی اس کا جملہ مکمل نہیں ہوا تھا کہ یکے بعد دیگرے کئی فائر ہوئے اور ان کے چاروں ساتھی زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ وہ بوکھلا گئے تھے کیونکہ فائرز مخالف سمت سے ہوئے تھے۔ شائن کے زخمی آدمیوں نے اٹھنے کی کوشش کی تھی لیکن دوبارہ فائر ہوئے اور اس بار وہ نشانہ بن گئے۔ رینا کا ہاتھ اپنی رائفل کی طرف بڑھا تھا کہ ایک بڑا سا جال آکر بیک وقت اس پر اور شائن پر گرا اور وہ اس میں الجھ کر گر پڑے۔ فوراً ہی دو افراد نمودار ہوئے اور انہوں نے رینا اور شائن کا اسلحہ چھین کر انہیں غیر مسلح کر دیا۔ یہ چھلاوے جیسے لوگ تھے۔ جب تک واٹسن اور اس کے آدمی ہوشیار ہوتے انہوں نے انہیں بھی نشانہ بنا لیا۔ فائرز کے ساتھ چٹان کے پیچھے سے چیخیں سنائی دی تھیں۔

''یہ... یہ کون ہیں؟'' شائن نے بوکھلا کر کہا۔ جال میں وہ اور رینا ہلکان ہو رہے تھے۔ اسی لمحے ایک آدمی سامنے آیا اور رینا کے منہ سے نکلا تھا۔

''والکر۔''

وہ والکر ہی تھا جو اپنے آدمیوں کو کہہ رہا تھا کہ ان تین کے سوا کوئی زندہ نہیں بچنا چاہیے۔ تیسرے سے کیا مراد تھی اس کا پتا اس وقت چلا جب والکر کے آدمی واٹسن کو گھسیٹتے ہوئے چٹان سے باہر لائے اور والکر کے سامنے ڈال دیا۔ وہ زندہ لیکن زخمی تھا۔

''یہ... والکر ہے۔'' شائن دم بہ خود تھا۔ زمین پر پڑے واٹسن نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور پھر ہذیانی انداز میں قہقہہ لگایا۔

''مجھے پہلے ہی پتا تھا، تم لوگ بے وقوف بن رہے ہو۔''

''کیا مطلب؟''

''یہ والکر نہیں ہے... یہ جارج ہے، صحرا کا بنجارہ۔''

والکر یا جارج اس کی طرف آیا اور اچانک اسے گھونسا مارا۔ واٹسن کا بازو جو پہلے ہی زخمی تھا اس ضرب نے اسے بے ہوش کر دیا۔ پھر اس نے رینا کی طرف دیکھا۔ وہ کانپتی آواز میں بولی۔ ''تم سچ مچ جارج ہو؟''

والکر اس کی طرف آیا اور ہیٹ اتار کر بولا۔ ''یہ درست کہہ رہا ہے۔''

''میں نے اپنی زندگی میں اتنا بڑا دھوکا نہیں کھایا۔'' رینا بولی۔ ''اب تم کیا کرو گے ہم سب کو مار دو گے؟''

''ہاں...... لیکن اس سے پہلے تم سے کام لوں گا۔'' جارج نے کہا۔ ''میرے پاس زیادہ آدمی نہیں ہیں بس یہی چار میکسیکن ہیں۔''

جارج کے ساتھ چاروں میکسیکن عجیب سے حلیے میں تھے۔ انہوں نے پاجامہ نما پتلونیں پہن رکھی تھیں اور اوپر واسکٹ نما شرٹس اور سب سے اوپر مخصوص گول میکسیکن ہیٹ تھے۔ وہ صورت سے وحشی اور خونخوار لگ رہے تھے۔ ان کے پاس لمبی نال والے ریوالور تھے اور وہ ان کے استعمال کے ماہر تھے۔ مشکل سے دو منٹ میں انہوں نے آٹھ افراد کو مار ڈالا تھا۔ شائن کراہا۔ ''یہ تم نے اچھا نہیں کیا... ان کے بارے میں مجھ سے پوچھا جائے گا۔''

''فکر مت کرو۔'' جارج نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم زندہ رہو گے تو کوئی تم سے جواب طلب کرے گا۔'' پھر اسے مارس کا خیال آیا اور اس نے رینا سے پوچھا۔ ''تمہارا ملازم مارس کہاں ہے؟''

''پتا نہیں شاید کسی چٹان کے پیچھے بے ہوش پڑا ہو۔'' رینا نے غلط بیانی سے کام لیا۔ ''وہ بے چارہ جنگ سے ڈرتا ہے۔''

جارج نے اسپینی زبان میں اپنے آدمیوں سے کہا اور وہ شاید مارس کو تلاش کرنے لگے، مگر مارس وہاں ہوتا تو انہیں ملتا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ سب گھوڑوں پر سوار وہاں سے جا رہے تھے۔ رینا اور شائن کے ہاتھ پشت سے باندھ دیے گئے تھے اور ان کے گھوڑوں کی لگامیں جارج کے آدمیوں کے ہاتھوں میں تھیں۔ واٹسن ایک گھوڑے پر بندھی حالت میں بے ہوش پڑا تھا۔ جارج سب سے آگے تھا اور رینا اس کے پیچھے۔ اس نے چلا کر پوچھا۔ ''تم ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟''

''وہاں جہاں میں نے سونا چھپایا تھا۔'' جارج مڑے بغیر بولا۔ ''وہ جگہ زیادہ دور نہیں ہے، ہم شام سے پہلے وہاں پہنچ جائیں گے۔''

وہ گرینڈ کینین کے شمالی حصے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہاں پہاڑ تہ در تہ تھے۔ جیسے جیسے وہ ان تہوں کو عبور کر رہے تھے گرینڈ کینین سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ اب پہاڑوں کا رنگ سرخ اور سرمئی تھا۔ یہاں ہوا بہت تیز تھی اور جہاں جہاں مٹی جمع ہوئی تھی اس میں کیکٹس اگ آئے تھے۔ یہ بہت بڑے کیکٹس تھے، کہیں کہیں تو تیس چالیس فٹ اونچے کیکٹس بھی تھے۔ پھر وہ چٹانوں کے بھول بھلیوں جیسے کھنڈرات میں داخل ہوئے۔ لاکھوں سال سے ہواؤں نے ان چٹانوں کو کاٹ کر یہ شکل دی تھی۔ چٹانوں کے درمیان سفر کرتے ہوئے کچھ دیر بعد وہ ایک مشروم نما چٹان کے نیچے رکے۔ یہاں موجود سامان بتا رہا تھا کہ جارج کا ٹھکانا یہیں تھا۔ انہیں ایک ہی جگہ بٹھا دیا گیا تھا مگر کھولا نہیں تھا۔ واٹسن ہوش میں آگیا تھا۔ جارج کے آدمیوں نے مشعلیں جلائیں اور پھر رات کے کھانے کی تیاری میں لگ گئے۔ ان میں سے ایک گھوڑوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا اور ایک ان سے کچھ فاصلے پر مستعد موجود تھا۔ شائن نے آہستہ سے کہا۔

''یہ بہت بڑا اداکار ہے مجھے ذرہ برابر شبہ نہیں ہوا کہ اس کا تعلق ایوی گولڈ سے نہیں ہے، یہ اندر کی بہت ساری باتیں جانتا ہے۔''

''اس سے زیادہ کون جانے گا۔'' رینا نے کہا۔ ''اسی لیے تو اس نے کامیابی سے واٹسن کو ہماری کمپنی میں ملازمت دلوائی تھی۔''

''یہ ہمیں یہاں کیوں لایا ہے؟''

''یہ ہمیں سزا دینے لایا ہے۔'' واٹسن نے کہا۔

''سزا کیوں؟''

''میری اور اس کی دشمنی تو ظاہر ہے۔'' واٹسن نے کہا اور پشت دیوار سے لگا کر بیٹھ گیا۔ ''شائن وہ شخص ہے جس نے جارج کی بہت بڑی رقم کی آفر ٹھکرا دی تھی۔ وہ اس سے حفاظتی انتظامات کے بارے میں جاننا چاہتا تھا، وہی کام اس کے نائب نے خاصی کم قیمت میں کر دیا تھا۔''

''برون۔'' شائن نے دانت پیسے۔ ''غدار۔''

''مجھے اس چکر میں کیوں ڈالا؟'' رینا نے واٹسن کی طرف دیکھا۔

''یہ جس گولی سے زخمی ہوا تھا وہ کلارک نے چلائی تھی۔ آج تک کسی کی چلائی گولی جارج کو نہیں چھو سکی تھی۔ اس وقت اس نے یہ زخم چھپا لیا تھا، اسے خوف تھا کہ اس کے زخمی ہونے کا پتا چل گیا تو ہم بغاوت کر دیں گے اور اسی وجہ سے اس نے پہلے سونا چھپایا تھا۔ جب تک ہم اسے گھیرتے یہ سونا چھپا چکا تھا۔ مقابلے میں اس کے ساتھی مارے گئے اور یہ فرار ہو گیا۔ یہ بھولا نہیں ہو گا کہ اسے کلارک نے گولی ماری تھی، وہ اب زندہ نہیں ہے اس لیے یہ انتقاماً تمہیں لایا ہے۔''

جارج ان کے سامنے آگیا، اس نے کہا۔ ''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ کچھ دیر میں تم لوگ زمین سے سونا نکالو گے۔''

وائسن نے زمین پر تھوکا۔ ”تم مجھ سے ایک انچ زمین نہیں کھدوا سکتے۔“

”اس صورت میں تمہیں اپنے ہاتھ سے مارنے کے بجائے تمہیں اندھا کر کے حکومت کے حوالے کر دوں گا اور تم جانتے ہو وہ تمہارے ساتھ کیا کرے گی۔“

یہ سزا اتنی خوفناک تھی کہ وائسن کے ساتھ رینا بھی کانپ اٹھی تھی، اسے یقین آ گیا کہ جارج نہایت سفاک انسان ہے، کسی اور کے ذہن میں ایسی سزا نہیں آ سکتی تھی۔ وائسن نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ ”دوسری صورت میں......؟“

”میں تمہیں ایک گولی مار کر اسی جگہ دفن کر دوں گا جہاں ابھی سونا دفن ہے۔“

”مجھے منظور ہے۔“ وائسن نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

”بس تو تیار ہو جاؤ۔“ جارج نے کہا اور اس کے اشارے پر نگران میکسیکن نے ان کی رسیاں کھول دی تھیں۔ وہ جارج اور دو مسلح نگرانوں کے ساتھ ایک جگہ آئے۔ یہاں چٹانوں کے درمیان ایک گول پیالہ نما گڑھے میں ڈھیر ساری ریت تھی۔ چٹانوں کے رخنوں میں مشعلیں لگا دی گئی تھیں، اس لیے روشنی تھی۔ جارج نے ان کی طرف دیکھا۔ ”یہ ریت ہٹاؤ، سونا اسی کے نیچے ہے۔“

انہیں بیلچے مہیا کر دیے گئے تھے۔ ریت کھودنا نہیں تھی کیونکہ اس کا ایک ایک ذرہ الگ تھا، یہ صحرائی ریت کی طرح تھی البتہ اسے ہٹانا نہایت مشکل تھا۔ کیونکہ یہ پیالے نما جگہ تھی اور ریت ہٹانے پر واپس اس پیالے میں گرتی تھی۔ اسے ہٹانے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ اسے اس جگہ سے دور پھینک دیا جائے اور یہ نہایت مشقت والا کام تھا۔ مگر انہیں کرنا ہی تھا۔ جارج کسی رعایت کے موڈ میں نہیں تھا، اس نے رینا کے عورت ہونے اور وائسن کے زخمی ہونے کی پروا بھی نہیں کی تھی۔ وہ ریت اٹھا اٹھا کر اس جگہ سے دور پھینک رہے تھے۔ یہی سب سے مشقت والا کام تھا شائن نے جارج سے کہا۔ ”کوئی چیز دے دو جس میں ریت جمع کر کے دور پھینکیں۔ اس طرح تو بہت مشکل ہے کہ ایک ایک بیلچہ لے جا کر پھینکیں۔“

جارج نے شانے اچکائے۔ ”تمہاری مرضی، کام جلدی ہوگا اور تمہارا کام بھی جلدی ہو جائے گا۔“

انہیں ایک بوری مہیا کر دی گئی اور وہ اس میں ریت بھر کر پھینکنے لگے۔ رفتہ رفتہ گڑھے سے ریت کم ہونے لگی اور پھر آخر میں ایک سوراخ نمودار ہوا۔ اس میں بھی ریت بھری ہوئی تھی۔ سونا یقیناً اس کے اندر تھا۔ وہ اب اس میں سے ریت نکالنے لگے۔ اب وہ آخر والے حصے سے ریت نکال رہے تھے۔ واقعی یہ ایسی جگہ تھی جس طرف کسی کا دھیان بھی نہ جاتا کہ اس میں کوئی چیز چھپائی گئی ہے۔ صبح چار بجے تک وہ تھکن سے چور ہو چکے تھے تب وہ سونے تک پہنچے۔ یہ لکڑی کی چھوٹی چھوٹی پیٹیاں تھیں۔ ایوی گولڈ کی مہر اب تک ان پر لگی تھی۔ ہر پیٹی میں تقریباً دس کلوگرام سونا تھا اور وہاں ایسی پچاس کے قریب پیٹیاں تھیں۔ ریت کے بعد وہ پیٹیاں نکالنے لگے۔ رینا عورت ہونے کے باوجود ہمت سے کام لے رہی تھی۔ وائسن کی حالت سب سے بری تھی۔ اگر جارج نے اسے خوفناک دھمکی نہ دی ہوتی تو وہ اس مشقت پر موت کو ترجیح دیتا۔ صبح تک ساری پیٹیاں نکل آئی تھیں۔ یہ پیٹیاں گھوڑوں پر لادی جا رہی تھیں۔ جارج ان کے لیے خاص طور سے مضبوط چمڑے کے بکس بنوا کر لایا تھا۔ ہر بکس میں پانچ پیٹیاں رکھی جا رہی تھیں اور ہر گھوڑے پر دونوں طرف ایک ایک بکس لادا جا رہا تھا۔ جارج کے پاس پانچ مضبوط گھوڑے اسی مقصد کے لیے تھے۔ اس نے آخری پیٹی نکلنے پر پر مسرت لہجے میں کہا۔

”میں تم کو اسی جگہ دفن کر کے ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا۔ اس سونے سے میں میکسیکو میں بادشاہ جیسی زندگی گزاروں گا۔“

کام مکمل ہو گیا تھا اس لیے ان کا بھی آخری وقت آ گیا تھا۔ جارج نے اپنے آدمیوں کو پکارا۔ دو وہیں موجود تھے وہ باقی دو کو بلا رہا تھا مگر جب بلانے پر بھی وہ نہیں آئے تو اس کے چہرے پر تشویش نظر آنے لگی، اس نے اپنا پستول نکال لیا اور ایک میکسیکن سے کچھ کہا تو وہ اپنے ساتھیوں کو دیکھنے چلا گیا اور جب خاصی دیر تک اس کی واپسی نہیں ہوئی تو جارج غضب ناک ہو گیا۔ اس نے دہاڑ کر ان تینوں سے کہا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے... کیا تمہارے اور ساتھی بھی ہیں؟“

”ہمارا اب کوئی ساتھی نہیں ہے۔“ شائن نے بدمزگی سے کہا۔ ”جو تھے تم انہیں مار چکے ہو۔“

”کوئی گڑبڑ ہے۔“ جارج نے کہا اور اپنے آخری آدمی کو بھی بھیج دیا اور پھر ان سے بولا۔ ”اگر یہ واپس نہیں آیا تو میں تمہیں مار دوں گا۔“

”تم نے ویسے بھی ہمیں مارنا ہے۔“ رینا بولی۔ ”بہانے کیوں کر رہے ہو۔“

”تمہارا کوئی ہمدرد یہاں آ گیا ہے اور وہی میرے آدمیوں کو شکار کر رہا ہے۔“ جارج کہتے ہوئے دیوار سے

تک گیا اور بلند آواز سے بولا۔ ”تم جو کوئی بھی ہو سامنے آ جاؤ ورنہ میں تین تک گن کر ان تینوں کو مار دوں گا۔“

کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا تو جارج بلند آواز سے گننے لگا مگر ابھی اس نے دو تک ہی گنا تھا کہ اوپر سے وہی جال اس پر گرا جو اس کے آدمیوں نے رینا اور شائن کو پکڑنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ جارج اس میں الجھا اور زمیں بوس ہو گیا۔ رینا کے منہ سے خوشی سے چیخ نکلی تھی۔ ”مارس۔“

پھر وہ تینوں وہاں سے بھاگے کیونکہ جارج نے جال میں سے ہی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ وہ دیوانہ وار فائر کر رہا تھا اور وہ اسی وجہ سے بچ گئے ورنہ ایک آدھ ضرور مارا جاتا۔ جارج پاگل ہو گیا تھا اور جب اس کا پستول خالی ہو گیا تو وہ چیخ چیخ کر گالیاں دینے لگا۔ آخر اوپر سے ایک پتھر اس کے سر پر گرا اور اس کی مزاحمت جواب دے گئی۔ چند منٹ بعد وہ بندھا ہوا پڑا تھا۔ مارس، رینا کو بتا رہا تھا کہ اس نے کس طرح ان کا تعاقب کیا تھا اور پھر ایک ایک کر کے میکسیکن پر قابو پایا۔ ان میں سے دو مر چکے تھے اور دو زخمی تھے۔ رینا فخر سے اسے دیکھ رہی تھی اور شائن بار بار اس کا شانہ تھپک رہا تھا۔ وائسن کو پھر باندھ دیا گیا تھا اور اب وہ اپنے سابق باس جارج کے ساتھ پڑا ہوا تھا۔ وائسن نے کہا۔ ”سنو، اصل قصوروار جارج ہے۔“

”بکومت۔“ رینا غرائی۔ ”میرے باپ کو کس نے دھوکا دیا تھا؟“

شائن بولا۔ ”اب تم دونوں قانون کا سامنا کرو گے۔“

جارج نے اپنی خفیہ شخصیت کا فائدہ اٹھایا تھا۔ اس نے میکسیکو میں رہ کر چند آدمی حاصل کیے اور پانچ سال بعد سونا لینے واپس آ گیا لیکن جہاں سونا چھپایا تھا وہیں وائسن موجود تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے سونا نکالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ وہ اب تک جارج کا نام استعمال کر رہا تھا اس لیے جارج مقامی جرائم پیشہ افراد کی مدد بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ بھلا صحرا کے بخار کا مقابلہ کون کرتا اس لیے جارج نے یہ منصوبہ بنایا۔ اس نے والکر کرٹ کے جعلی نام سے کارڈ چھپوائے اور خود کو ایوی گولڈ کا نمائندہ ظاہر کیا پھر اس نے شائن کی خدمات حاصل کیں، اسی کی مدد سے اسے قابل اعتماد لڑاکے مل سکتے تھے۔ رینا کو شامل کرنے کا مقصد اس کے اور شائن کے ہاتھوں وائسن کے گروہ کا خاتمہ کرنا تھا۔ اسی لیے وہ ونسلو سے بہانہ کر کے غائب ہو گیا۔ مارے جانے والے جواریوں میں اس کا کوئی آدمی نہیں تھا، اس نے جھوٹ بولا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رینا، شائن کو مجبور کر دے گی کہ وہ وائسن کی تلاش میں چلے اور ایسا ہی ہوا۔ جارج اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا اس لیے وہ خاموشی سے شائن اینڈ کمپنی اور وائسن پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ بالآخر وائسن کے گروہ نے پہل کی اور جنگ چھڑ گئی۔ جب دونوں پارٹیاں لڑ کر تباہ حال ہو گئیں تو جارج حرکت میں آیا اور بچے کھچے لوگوں کا صفایا کر کے انہیں قید کر کے لے آیا۔ مگر بدقسمتی سے وہ مارس کو نظر انداز کر گیا تھا اور یہاں بھی رینا کی دور اندیشی کام آئی اگر وہ مارس کو روانہ نہ کرتی تو وہ بھی مارا جاتا اور پھر کون ان کی مدد کرتا۔

کچھ دیر آرام کے بعد انہوں نے کھایا پیا اور سفر کے لیے تیار ہو گئے۔ جارج اور وائسن کو ایک ہی گھوڑے پر اس طرح باندھ کر بٹھایا گیا تھا کہ وہ خود کو ایک دوسرے سے بھی الگ نہیں کر سکتے تھے۔ شام سے پہلے وہ سونے اور ان دونوں کے ساتھ ونسلو کے شیرف کے دفتر پہنچے تو پورے قصبے میں سنسنی پھیل گئی تھی۔ لوگوں کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ صحرا کا بخار جارج اور اس کا نائب پکڑے گئے تھے اور ان کے گروہ کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ اس سے زیادہ سنسنی ایوی گولڈ کے سونے کی بازیابی سے پھیلی تھی۔ شیرف نے اپنی ساری نفری بلا لی تھی اس سونے کی حفاظت کے لیے اور فوری طور پر اس کی اطلاع فونکس بھیج دی گئی تھی۔ دوسرے دن ایک فوجی دستے کی حفاظت میں اس سونے کو روانہ کیا گیا۔ مقامی انتظامیہ نے لاشیں اٹھوالی تھیں اور شائن اپنے ساتھیوں کی لاشیں لے کر روانہ ہو رہا تھا، وہ افسردہ تھا۔ رینا کو خیال آیا۔

”وہ والکر نے سونے کی بازیابی کے انعام کے بارے میں کہا تھا؟“

”وہ بھی جھوٹ تھا۔ ایوی گولڈ نے ایسے کسی انعام کا اعلان نہیں کیا اور اگر اس کی طرف سے کوئی انعام ملا تو اس کے حق داران درجن افراد کے اہل خانہ ہوں گے جنہوں نے اپنی جانیں قربان کیں۔“

رینا نے سوچا اور ٹھنڈی سانس لی۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو میرے لیے یہ بھی بہت ہے کہ میرے باپ کے قاتل پکڑے گئے ہیں۔“

”یہ کام نمٹ جائے پھر میں تم سے ملنے آؤں گا۔“

رینا سمجھ رہی تھی کہ وہ اس سے کیوں ملنے آئے گا مگر اس نے انجان بن کر پوچھا۔ ”کیوں؟“

”یہ جب میں آؤں گا تب ہی بتاؤں گا۔“ شائن نے کہا اور اچھل کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

کشکول

انوار صدیقی

قسط 21

زندگی کی داستان بھی کتنی عجیب ہے... جو کہیں احساسات کا آئینہ ہے تو کہیں حادثات کا مجموعہ... کسی کو سنوارنا کسی کو بکھیرنا اس زندگی کا مشغلہ... یوں کہیں گلشن کہیں ویرانہ اس کا مزاج ٹھہرا... زندگی کو برتنے والا یہ انسان... زندگی سے کہیں زیادہ عجیب فطرت کا مالک نکلا جو کہیں ہوش ربا حسن کے طلسم کدوں میں قید ہے تو کہیں بیابانوں کی سرگوشیوں میں گم... انہی تجربات، احساسات اور حادثات کے زیراثر اس کی شخصیت تعمیر، تخریب کے مراحل سے گزرتے ہوئے سنورتی یا بکھرتی رہتی ہے۔ کبھی محبت کی شبنمی پھوار اس کے دل میں گل و گلزار کھلاتی ہے تو کبھی نفرت کی زہریلی آگ میں وہ خود بھسم ہو کے بھی پشیمان نہیں ہوتا ایسے میں مخالف ہوائیں انسان کو بے وزن پتوں کی طرح اپنی مرضی کی سمت میں اڑا لے جاتی ہیں۔ جہاں جرائم کے بے تاج بادشاہ بے بسی کو پیروں تلے روندکر خوش ہوتے ہیں، جہاں روپ بہروپ کی اس دنیا میں بھکاری بھی ہیں اور کھلاڑی بھی... محیر العقول واقعات اور ذہنی کرشمہ سازیوں سے مزین... ایک منفرد اور جداگانہ اسلوب کی صورت سسپنس کے صفحات پر... صرف آپ کے لیے۔

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

کشکول کی داستان لیاقت حسین کے گرد گھومتی ہے جس کا تعلق نوشہرہ کے شہر جہانگیرہ سے تھا، اس کے باپ سردار سرفراز خان نے اپنی بگ کبھی جھکنے نہیں دی تھی، شادی کے معاملے میں بھی اس نے لیاقت حسین کا رشتہ اس لڑکی سے کرنا چاہا جہاں اس نے زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین نے جو مذہبی تعلیم کے زیور سے آراستہ تھا۔ باپ کے سامنے زبان نہیں کھولی۔ اس نے فرحین نامی لڑکی کو زبان دے رکھی تھی۔ لیاقت حسین کی ماں کو بھی فرحین کا رکھ رکھاؤ پسند تھا چنانچہ لیاقت حسین نے ماں کی دعائیں لیں، فرحین سے شادی کے بعد شہر آ گیا جہاں اس نے اپنے دوست گل خان کی کچی بستی میں رہنا پسند کیا جو قدیم قبرستان سے متصل تھی۔ فرحین نے ایک رات قبرستان میں ایک سیاہ فام دراز قد شخص پر تاب بھوجن کو برہنہ حالت میں کوئی پُراسرار عمل کرتے دیکھا تو وہ خوفزدہ ہو گئی۔ دوسرے دن لیاقت حسین کو فرحین کی نشاندہی والی قبر سے ایک نیبو ملا جس میں سفلی کے گندے عمل والی جان لیوا سوئیاں پیوست تھیں۔ لیاقت حسین نے گل خان کے منع کرنے کے باوجود خدا کا نام لے کر نیبو سے سوئیاں نکال کر پھینک دیں۔ گل خان لیاقت حسین کو ایک بزرگ کے پاس لے جاتا ہے لیکن وہاں تک ان کی رسائی نہیں ہوتی۔ گل خان واپسی کے لیے رکشا لینے جاتا ہے تو تب ایک نابینا شخص سے لیاقت حسین کی ملاقات ہوتی ہے۔ نابینا کے اصرار پر لیاقت حسین جب دوبارہ بزرگ کی چھولداری کی سمت جاتا ہے تو نہ کوئی ان دونوں کو دیکھتا ہے نہ روکتا ہے۔ نابینا خود چھولداری کے باہر رک کر لیاقت حسین کو اندر جانے کو کہتا ہے جہاں ایک بزرگ ہستی آنکھیں بند کیے استغراق میں محو تھی۔ بزرگ ہاتھ کے اشارے سے لیاقت حسین کو بلاتا ہے۔ ایک چٹکی خاک اٹھا کر لیاقت حسین کے منہ میں ڈال دیتا ہے۔ بعد میں نابینا لیاقت حسین کو سخت تاکید کرتا ہے کہ وہ خاک کی اس چٹکی کا ذکر کبھی زبان پر نہ لائے یہ ہدایت دے کر نابینا نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ خاک کی وہ چٹکی خداوند کریم کا کرشمہ ثابت ہوتی ہے۔ لیاقت حسین کو ہر آنے والے خطرے کا احساس لاشعوری طور پر ہو جاتا ہے۔ اسی کیفیت میں وہ اس کا توڑ بھی تلاش کر لیتا ہے لیکن شعوری طور پر وہ بات اسے یاد نہیں رہتی۔ لیاقت حسین جس بستی میں رہتا تھا وہاں ایک دو منزلہ مکان میں آگ کے شعلے بھڑک اٹھتے ہیں تو کوئی اندر جانے کی ہمت نہیں کرتا جہاں ایک ضعیف عورت موجود تھی۔ اس کے قریبی عزیز دار بھی مایوسی کے عالم سے دوچار تھے جب لیاقت حسین اس موقع پر اللہ کا نام لے کر اندر جاتا ہے اور بوڑھی عورت کو زندہ و سلامت نکال لاتا ہے۔ اسی عورت کے بیٹے کے ذریعے لیاقت حسین کی رسائی سیٹھ عثمان تک ہوتی ہے جہاں اسے بطور ڈرائیور ملازمت پر رکھ لیا جاتا ہے۔ سیٹھ عثمان اور ان کی اہلیہ راحیلہ بیگم سلجھے

ہوئے ہمدرد لوگ تھے۔ سیٹھ عثمان کاروباری شخص تھا۔ کاروباری میدان میں شیخ حامد بہ ظاہر سب کا دوست تھا لیکن وہ اندرونی طور پر مافیا کا مقامی سرغنہ اور انڈر ورلڈ کا ایک خطرناک فرد تھا جو پولیس کو مطلوب خطرناک مجرموں کی پشت پناہی کر کے ان کو اپنے اشاروں پر چلاتا تھا۔ شیخ حامد کا خاص آدمی "بلیک ٹائیگر" تھا۔ وہ بھی اسی پاس ورڈ پر ہر حکم کی تعمیل کرتا تھا لیکن براہِ راست وہ بھی شیخ حامد کی اصلیت سے ناواقف تھا۔ شیخ حامد کے مخالفین میں سرِفہرست میڈم روبی تھی جو اس سے اپنے شوہر خالد ریاض کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لیے میڈم روبی نے بھی انڈر ورلڈ کی تنظیم سے تین خطرناک افراد ڈوما، لوچن اور سیاہ فام ہاشم کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں۔ ان افراد کو سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے احکامات دیے جاتے تھے۔ افضل خان شیخ حامد کا ملازم اور خاص آدمی تھا جو ہر کام میں آگے آگے رہتا تھا۔ وہ اپنے دفتر کی ایک ساتھی شبنم کو پسند کرتا ہے لیکن یہ نہیں جانتا کہ شبنم بھی اندرونی طور پر میڈم روبی سے گٹھ جوڑ کر چکی ہے۔ وہ بھی شیخ حامد سے اپنی مرحوم ماں کا قرض چکانے کی خاطر موقع کی تلاش میں تھی۔ شیخ حامد اپنے کارندوں کے ذریعہ میڈم روبی کو اغوا کرا کے اس کی مخربِ اخلاق تصویریں حاصل کرنے کی پلاننگ کرتا ہے۔ لیاقت حسین کی بیوی فرحین کو بھی اغوا کراتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوتیں ہر موقع پر اس کے آڑے آجاتی ہیں۔ ان ہی ریشہ دوانیوں میں افضل خان بھی زیرِ عتاب آجاتا ہے۔ شبنم اسے شیخ حامد کے اشارے پر اپنے فلیٹ پر لے آتی ہے۔ بعد میں وہ شبنم کے کہنے پر ایک اور بڑے تاجر رستم علی آغا خانی اور اس کی بیوی کی قابلِ اعتراض تصاویر ریوالور کی نوک پر حاصل کر لیتا ہے۔ ایماندار آئی جی علیم احمد کے ریٹائر ہونے کے بعد اس کی جگہ آغا منظور احمد نیا آئی جی مقرر ہوتا ہے۔ وہ بھی شیخ حامد کے اوپر تک تعلقات ہونے کے سبب اس کا راستہ کاٹنے کی حماقت نہیں کرتا۔ ایک ڈی ایس پی سراج سے جو شیخ حامد کو خوش فہمی کا شکار ہونے کا موقع دینے کی خاطر کچھ رقم اس کے اصرار پر لے لیتا ہے لیکن اسے فوراً ہی آئی جی علیم احمد کے حوالے کر دیتا ہے۔ سراج ایماندار اور فرض شناس آفیسر ہے۔ ایک نئے ایس پی اورنگ زیب کے آجانے کے بعد اس کے ہاتھ اور مضبوط ہوجاتے ہیں۔ چونکہ اورنگ زیب کے بھی کچھ تعلقات مرکز سے تھے اس لیے وہ کسی کے دباؤ میں نہیں آتا۔ اسی بنا پر اس کی اور شیخ حامد کی ٹھن جاتی ہے۔ اسی دوران شیخ حامد کی بیوی صبا بیگم جو شوہر کی عیاشیوں سے تنگ آچکی تھی خودکشی کر لیتی ہے۔ وہ شیخ حامد کے بارے میں بہت ساری اہم باتوں کو تحریری شکل دے کر سراج کو آخری بار فون کرتی ہے تاکہ وہ اس کی تحریر کو لے جائے۔ سراج وہ تحریر حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے لیکن شیخ حامد کو مرنے والی کے موبائل سے اس بات کا علم ہوجاتا ہے کہ اس نے مرنے سے پیشتر آخری کال سراج کو کی تھی۔ سراج کو قابو کرنے کی خاطر وہ اس کی بیوی الماس کو اغوا کرا لیتا ہے مگر لیاقت حسین کی ماورائی قوت بروقت سراج ہی کے ذریعے الماس کو رسوائی سے بچا لیتی ہے۔ ایس پی اورنگ زیب صبا بیگم کی خودکشی کی تفتیش شروع کرتا ہے۔ انسپکٹر دانش جس کے پاس صبا بیگم کی اہم فائل تھی وہ سراج کو بھی اس سے آگاہ کر دیتا ہے۔ مگر شیخ حامد کو اس کی اطلاع اپنے زرخرید ڈی ایس پی لودھی سے ملتی ہے۔ وہ اس پورے تھانے کو دانش سمیت آگ لگوا دیتا ہے۔ لودھی معمولی زخمی ہونے کے باوجود اسپتال میں داخل ہوجاتا ہے۔ سیٹھ عثمان حالات سے دور اور محفوظ رہنے کی خاطر اپنی رہائش کے قریب دوسری کوٹھی خرید کر اپنا ہیڈ آفس بنا لیتا ہے۔ اسی کوٹھی کی انیکسی میں لیاقت حسین اور فرحین بھی رہائش اختیار کرتے ہیں۔ شیخ حامد ایک موقع پر لیاقت حسین کو بھی اغوا کرا لیتا ہے۔ اس موقع پر لیاقت حسین کا ہم شکل (ہمزاد) لیاقت حسین کو نکل جانے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ پرتاب بھوشن جو سفلی کا ماہر تھا، اپنے نیبو والے عمل کی ناکامی کے بعد لیاقت حسین کو مار ڈالنے کی خاطر برابر اپنی شیطانی قوتوں سے کام لیتا ہے مگر روحانی قوتیں اسے کامیاب نہیں ہونے دیتیں پھر بھی وہ باز آنے کو تیار نہیں ہوتا۔ دریں اثنا میڈم روبی سیون اسٹار کے پاس ورڈ سے سیاہ فام ہاشم اور جہانگیر بٹ عرف جگا کو شیخ حامد کی رہائش گاہ پر حملہ کرنے کا حکم دیتی ہے جس سے شیخ حامد اور چراغ پا ہوجاتا ہے۔ اسی دوران وہ اپنی ذاتی سیکریٹری کنول سے شادی کر کے اس کو پوش علاقے کے ایک بنگلے میں رکھتا ہے۔ بعد میں شیخ حامد کو پے در پے دو جھٹکے لگتے ہیں۔ ایک طرف ایس پی اورنگ زیب تھانے میں آگ لگنے کی واردات میں ملوث پا کر لودھی کو معطل کرا دیتا ہے۔ دوسری جانب میڈم روبی کے ایجنٹ ہاشم اور ڈوما شیخ حامد کے اہم ترین آدمی "بلیک ٹائیگر" کو گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ سراج جو لیاقت حسین کی ماورائی قوتوں کا بذاتِ خود تماشا دیکھ چکا تھا، کچھ دنوں کے لیے سیٹھ عثمان (جو سراج کا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا) سے اس کی خدمات حاصل کر لیتا ہے، اب اورنگ زیب، سراج اور لیاقت حسین مل جل کر شیخ حامد کو گھیرنے کی پلاننگ کرتے ہیں۔ دوسری جانب جہانگیر بٹ عرف جگا اپنے سابق پڑوسی اور پولیس کے ریٹائرڈ ہیڈ کانسٹیبل امداد علی سے ملاقات کرتا ہے جس نے جگا کو کسی جرم کی سزا بھگتنے کے بعد غلط راستہ اختیار کرنے کے بجائے فرنیچر کا کاروبار کرنے کی خاطر رقم فراہم کی تھی۔ سیاہ فام ہاشم کو سیون اسٹار کی جانب سے بگ باس کو ختم کرنے کی اجازت مل جاتی ہے لیکن ایک غلطی کی وجہ سے اسے خودکشی کرنی پڑتی ہے۔ اسی دوران رستم علی آغا خانی کو فون پر دھمکی ملتی ہے جسے اس کا لڑکا دارا سن لیتا ہے۔ دارا اپنے دوست سابق میجر عاطف کو حالات سے باخبر کر دیتا ہے۔ اورنگ زیب اور سراج اسپتال سے ملازمہ گلابو کی خودکشی کی تفتیش کر کے واپس لوٹ رہے تھے جب لیاقت حسین اچانک گاڑی کا رخ پھیر دیتا ہے۔ وہ ایسا نہ کرتا تو سب موت کے منہ میں چلے جاتے۔ لیاقت حسین کی بروقت کارروائی سے کسی قسم کا جانی نقصان نہیں ہوا البتہ سراج معمولی زخمی ہوا۔ دوسری جانب شیخ حامد کی کنول سے شادی کی سہاگ رات کی ساری کارروائی مووی کیمرے کے ذریعے محفوظ کر لی گئی تھی۔ لیاقت حسین فرحین کے رشتے دار کی موت کی خبر سن کر اسے گاؤں بھیج دیتا ہے۔ دوسری جانب جگا اور اپنے سرپرست امداد علی کے پاس پہنچ کر اسے صورتِ حال سے آگاہ کرتا ہے امداد علی اسے فی الحال صبر کی تلقین کرتا ہے۔ شبنم اور افضل خان کے فلیٹ سے شبنم کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ شیخ حامد کی کوٹھی پر حملہ ہوتا ہے جس پر وہ چراغ پا ہوتا ہے اور پولیس کے سربراہ کو سخت سست سناتا ہے اور اورنگ زیب ملزمان کو گرفتار کر کے سخت پوچھ گچھ کرتا ہے جس کے نتیجے میں کئی انکشافات سامنے آتے ہیں خاص طور پر یہ کہ وہ جگا کا آدمی ہے اور اس نے یہ کارروائی کسی بیوہ کے کہنے پر کی تھی۔ جبکہ سراج کی بیوی الماس کے اغوا کی کوشش ناکام بنانے کی کوشش میں پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر لیتی ہے اور اس پر تشدد کیا جاتا ہے۔ ایس پی اورنگ زیب اینڈ کمپنی شیخ حامد کے خلاف گھیرا تنگ کرتی ہے۔ شبنم کے اغوا کا ڈراما بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا، اورنگ زیب نے شبنم سے مل کر اسے اعتماد میں لیا اور وہ ان کا ساتھ دینے پر راضی ہوگئی۔ دوسری جانب شیخ حامد کے ایجنٹ نے اسے الماس کے اغوا میں لیاقت حسین کے سبب ناکامی کی اطلاع دی اور بتایا کہ پولیس لیاقت حسین کو گرفتار کر کے لے گئی ہے جہاں ایس پی اورنگ زیب نے اس کارروائی کو ڈکیتی کی واردات کا رنگ دے کر رپورٹ بنائی ہے۔ گاؤں سے فرحین نے فون پر اطلاع دی کہ شاہ پری کے ذریعے اسے معلوم ہوا ہے کہ لیاقت کے باپ کی کسی سیٹھ سے کاروباری بدمزگی ہوئی ہے، لیاقت حسین جان گیا کہ سیٹھ عثمان سے ہی معاملہ ہوا ہے لہٰذا اس نے

ان سے مل کر اپنی اصلیت ظاہر کرتے ہوئے گلے شکوے دور کرا دیے۔ واپسی پر لیاقت پر قاتلانہ حملے کی ناکامی پر بچ جانے والے زخمی حملہ آور کو اپنی تحویل میں لے کر تمام کارروائی پر اپنے قابلِ اعتماد افسر کو ہدایت دیں۔ حملہ آور سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق بلیک ٹائیگر کے بعد نمبر ٹو کے کوڈ سے کام کرنے والے۔ ایجنٹ کی بنیادی حیثیت تھی جو انڈر ورلڈ میں اسلم ڈنکا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ شیخ حامد کے رہائش گاہ پر لوچن اور ڈوما نے حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا تھا۔ اسی حملے کے دوران ڈوما مارا گیا جبکہ لوچن کو ایس پی اورنگ زیب نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اس کے تین اہم بندوں کی لاشیں بھی تابوت میں بند اس کی حویلی کے سامنے ڈال دی گئی تھیں اور کنول نے فون کر کے کسی اجنبی کی دھمکی آمیز کال کی اطلاع دی تھی۔ شیخ حامد سخت طیش کے عالم میں ڈی آئی جی آغا منظور سے جواب طلبی کرتا ہے اور ایس پی اورنگ زیب کے رویے کی شکایت مرکزی وزیرِ داخلہ سے کرتا ہے اس پر اورنگ زیب معذرت کر کے اسے کچھ دن کی مہلت طلب کرتا ہے اور ناکامی کی صورت میں شیخ حامد کو فیصلے کا اختیار دیتا ہے۔ دوسری جانب لیاقت حسین کو سیٹھ عثمان اپنے آفس کا سپروائزر بنا کر اس کی تنخواہ میں اضافہ کر دیتا ہے لیاقت اپنی خوشی میں فرحین کو یاد کرتا ہے، اور اسی دوران پلید پرتاب بھوشن اپنے عمل کے ذریعے پجارن مدھو کو فرحین کے روپ میں لیاقت حسین کے پاس بھیجتا ہے لیکن یہاں بھی غیبی طاقت اسے بچا لیتی ہے۔ جبکہ ثریا کے مشورے پر میڈم آغا منظور کے دل میں اپنے متعلق جذبات کے تحت اس سے ملاقات کا اہتمام کرتی ہے۔ یہ ملاقات ان دونوں کے مابین رشتے کو آمادگی پر منتج ہوگی۔ لیاقت حسین اپنے باپ سے معافی کا خواست گار ہوا اور اس کے باپ نے اسے معاف کر دیا۔ دوسری جانب افضل خان غیر معمولی حالات میں دوسری جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے اور اورنگ زیب اس کی پاداش میں شبنم پر الزام لگا کر اسے بگ باس کے حوالے کرنے کا عندیہ دیتا ہے جو کہ اس کی ایک چال بھی ہوسکتی ہے۔ افضل خان اور شبنم دوبارہ بگ باس کی تحویل میں چلے گئے۔ افضل خان، اسلم ڈنکا کی زیرِ نگرانی بگ باس کے احکامات کا پابند تھا یہاں اس سے جگا کو اس کے سرپرست امداد علی کے ذریعے پھانسنے کا کام لیا گیا۔ کیونکہ جگا کے نام سے بگ باس کو چند تصویریں موصول ہوئی تھیں جن میں اس کے کنول کے ساتھ سہاگ رات کے مناظر واضح تھے۔ دوسری جانب لوچن کی ملاقات زخمی قیدی سے کرائی گئی جہاں اس نے اسے دیال سنگھ عرف وشنو کے طور پر شناخت کر لیا۔ لیاقت حسین گاؤں سے فرحین کو واپس لے آیا، اس کی ماں نے اسے حفاظت کے لیے ایک تعویذ دیا جبکہ میڈم روبی شیخ حامد کے انجام میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے بے چین تھی۔ شیخ حامد کے خلاف برسرِ پیکار گروپ میں ماسٹر مائنڈ کا کردار اورنگ زیب ادا کر رہا تھا جبکہ بعض معاملات میں سراج بھی لاعلم تھا، ملٹری انٹیلی جنس بھی اس اہم معاملے میں انوالو تھی اور شیخ حامد کے خلاف گھیرا تنگ سے تنگ تر ہوتا جا رہا تھا جبکہ اس کا ذہن مختلف الجھنوں کا شکار تھا۔ شیخ حامد کے گرد گھیرا تنگ ہوگیا اگرچہ اس نے شبنم اور اسلم ڈنکا کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن اسے ناکامی کا سامنا ہوا۔ بالآخر بگ باس نے ہیلی کاپٹر میں فرار ہونے کی کوشش کی مگر سمندر برد ہوگیا، البتہ لاش نہ مل سکی۔ دوسری جانب وشنو اور لوچن کرنل احتشام کی گرفت سے فرار ہوگئے۔ اورنگ زیب اور سراج آرمی کے تعاون سے مجرموں کے گرد جال بُن رہے تھے۔ لیاقت حسین اپنے والد کی شہر آمد پر خوش تھا مگر اسی دوران ان پر قاتلانہ حملہ ہوگیا۔ حملہ کرانے والے کا کچھ پتا نہ چل سکا۔ لیاقت حسین کی ماں نے جو کہ خود بھی لیاقت کی طرح ماورائی قوتوں کے زیرِ سایہ ہے کچھ مبہم تفصیلات فراہم کیں لیکن مکمل معلومات حاصل نہ ہوسکیں۔ اورنگ زیب ہنوز یہ ماننے پر تیار نہیں کہ شیخ حامد مر چکا ہے۔ حالانکہ اس کے اعزاز میں ایک تقریب میں اسے فوجی اعزاز بھی دیا گیا۔ میڈم روبی لوچن سے کنٹریکٹ بڑھانا چاہتی ہے۔ ایک غیر یقینی کی کیفیت ہے اسی دوران لودھی بھی اورنگ زیب سے ملتا ہے لیکن اس کے بعد اس کا وحشیانہ قتل ہوجاتا ہے اور اس کے تانے بانے آکٹوپس یعنی بگ باس سے ملتے ہیں۔ میڈم روبی ڈی آئی جی سے نکاح پر تیار ہوگئی اور اس کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ سرفراز خان واپس جانے پر بضد ہے لیکن اسے پندرہ دن کے لیے روک دیا گیا۔ شہر میں کئی وارداتیں ایسی ہوئیں جن میں آکٹوپس کی مہر استعمال کی گئی تھی۔ شیخ حامد کی موت یا حیات بہ دستور ایک معما بنی ہوئی تھی۔ سب اس کی موت پر مطمئن تھے جبکہ اورنگ زیب اپنے موقف پر قائم تھا غرض ایک غیر یقینی کی فضا تھی۔ شیخ حامد کی کوٹھی کو باوجود سخت پہرے کے تباہ کر دیا گیا۔ شیخ حامد کی بیوہ کنول کو دوبارہ اغوا کر لیا گیا اور اس کی ماں کو قتل۔ دوسری جانب راحیلہ بیگم کی کار جو کہ لیاقت حسین ڈرائیو کر رہا تھا، کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی گئی ادھر ڈی آئی جی اور میڈم روبی کی منگنی کی تقریب منعقد کی گئی جس میں سراج و اورنگ زیب کے علاوہ سیٹھ عثمان کی فیملی کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

"آپ جانتے ہیں کہ اس منگنی کو آخری انجام تک پہنچانے سے پیشتر میں آپ سے کیا سوال کروں گی؟"

"میرا ذاتی مشورہ ہے کہ آپ کو کسی ایک شخص کے واہمے کے مقابلے میں اکثریت کی رائے کو قبول کر لینا چاہیے۔" اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ "یہی مناسب بھی ہوگا۔"

"یہ میرا بھی انفرادی معاملہ ہے اس لیے اگر میں آپ سے آکٹوپس کے بارے میں جاننے کی دوبارہ درخواست کروں تو......؟"

"تو میں آپ کو ایک انتہائی قیمتی مشورہ بالکل مفت دوں گا۔" سراج نے کچھ سوچ کر سنجیدگی سے کہا۔ "ہمیں آکٹوپس کے لیے جاننے کی خاطر لیاقت حسین سے رابطہ کرنا زیادہ کارآمد ثابت ہوگا...... اس کی روحانی قوتوں کا کرشمہ ہم میں سے بیشتر افراد دیکھ چکے ہیں۔"

"میں سراج کی اس بات کی تائید کروں گا......" سیٹھ عثمان نے کہا۔ "زندگی اور موت تو خدا کے اختیار کی بات ہے لیکن دو تین موقعوں پر لیاقت حسین کی روحانی قوتیں مجھے اور راحیلہ کو بھی موت کے منہ سے نکال چکی ہیں۔"

"آپ کو بھی اس کا ذاتی تجربہ ہوگا۔" سراج نے دوبارہ کہا تو روبی لاجواب ہوگئی لیکن یہ بات سب ہی نے محسوس کی تھی کہ اس کی خاموشی اس کا حتمی فیصلہ نہیں ہے۔

"آپ کے نئے آئی جی صاحب کس ٹائپ کے ہیں؟" سیٹھ عثمان نے وقت کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے

بڑی خوب صورتی سے موضوع بدل دیا۔
''ابھی تک ان کے بارے میں محکمے کے اکثر افسران بھی کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکے ہیں۔''
''کوئی سبب بھی ضرور ہوگا......؟''
''جی ہاں......'' ڈی آئی جی نے پہلو بدل کر کہا۔ ''ہماری اطلاع کے مطابق پہلے وہ ایکٹو (Active) آفیسران کی فہرست میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے لیکن چار سال قبل بیوی کے فوت ہو جانے کے بعد ان کی زندگی میں ایسا انقلاب آیا جس کے بعد انہیں ملازمت سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ سنا ہے خاندان میں بھی قریب کے ایسے رشتے دار نہیں تھے جو ان کا غم بانٹ سکتے۔ اس لیے وہ ایک سال کی رخصت لے کر بیرون ملک چلے گئے تھے۔ وہاں سے وہ بار بار چھٹیاں بڑھواتے رہے اور اب طویل عرصے کے بعد جب سے آئے ہیں وہ کئی بار ملازمت سے استعفیٰ کی درخواست دے چکے ہیں لیکن ان کے سابقہ ریکارڈ کے پیش نظر ابھی تک ان کی درخواست منظور نہیں ہوئی۔'' ڈی آئی جی نے بات جاری رکھی۔ ''یہاں وہ پہلی بار تبادلہ ہونے کے بعد آئے ہیں۔ بہ ظاہر پہلی کانفرنس میں بھی موصوف نے تمام افسران کو ایکٹو رہ کر کام کرنے کو کہا ہے لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اب وہ ملازمت سے اکتا چکے ہیں۔ ان کے استعفیٰ کی درخواست اب بھی حکومت کے زیر غور ہے۔ واقف کاروں کا بھی یہی خیال ہے کہ ان میں اب وہ پہلی جیسی بات نہیں رہی۔''
''آکٹوپس کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے......؟''
میڈم نے پھر دبی زبان میں کریدنے کی کوشش کی۔
''فی الحال انہوں نے کھل کر اس موضوع پر بھی کوئی بات نہیں کی۔'' ڈی آئی جی نے کن انکھیوں سے اورنگ زیب کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''ملٹری انٹیلی جنس کے ذمے داروں کا بھی ایک ہی خیال ہے کہ چٹان سے کی جانے والی فائرنگ کی زد میں آکر دونوں ہلاک ہو گئے، پھر ان کی لاشیں سمندر کی تہ میں جا کر گوشت خور مچھلیوں کا شکار ہو گئی ہوں گی۔''
''جن وارداتوں میں آکٹوپس کی شبیہہ مل رہی ہے ان کو کیا نام دیں گے آپ؟''
''یہ سب عوام میں دہشت پھیلانے کا ایک بھونڈا حربہ...... میرا خیال ہے کہ یہ شیخ حامد کے پالتو بدمعاشوں کا ڈھونگ ہے۔''
''انگوٹھی کی رسم ادا ہونے کے بعد اس وقت آکٹوپس کا ذکر بھی نامناسب ہے۔'' راحیلہ بیگم نے روبی سے کہا۔ ''میرا ذاتی خیال ہے کہ اب کوئی تاریخ بھی طے ہو جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔''
''میں آپ کے اس مبارک خیال کی بھرپور تائید کروں گا۔'' اورنگ زیب نے بھی میڈم کو اکسانے کی کوشش کی۔
''میڈم سے اس سلسلے میں میری بات ہو چکی ہے۔'' تھریسا نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ نیک کام بھی بہت جلد ہو جائے گا۔ تاریخ کے بارے میں بھی کوئی اعلان دو ایک دن میں کر دیا جائے گا۔''
''آپ اس سلسلے میں کیا کہنا پسند کریں گے؟'' الماس نے ڈی آئی جی کو شوخی سے مخاطب کیا۔
''میں آپ لوگوں کے رحم و کرم پر ہوں۔ میڈم کا جو فیصلہ بھی ہوگا وہ مجھے قبول ہوگا۔'' ڈی آئی جی نے اتنی تابعداری اور انکساری سے یہ جملے ادا کیے کہ سب ہی مسکرا دیے پھر...... کافی کے دور کے بعد جب محفل برخواست ہوئی تو روبی نے جاتے ہوئے اورنگ زیب کے قریب سے گزرتے وقت مسکرا کر شکوہ کیا۔
''الماس کے رشتے سے میرا بھی کچھ حق بنتا ہے آپ پر لیکن اس وقت آپ نے افسری ماتحتی کا زیادہ خیال رکھا......''
''بات نمک کی آ گئی تھی۔'' اورنگ زیب نے برجستہ جواب دیا۔ ''آپ کے ہاں دعوت ہوگی تو گھٹنا آپ ہی کی طرف جھکے گا۔''
''آپ کا گھر ہے جب چاہیں تشریف لے آئیں لیکن ایک بات میری بھی سن لیں۔ جب تک آپ غیر جانبدار ہو کر آکٹوپس کے بارے میں زبان نہیں کھولیں گے۔ آپ کے ڈی آئی جی کی دال بھی نہیں گلے گی۔''
میڈم نے آخری جملہ بڑی مدھم آواز میں ادا کیا پھر سب سے اجازت طلب کی اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اس کے جانے کے بعد ڈی آئی جی نے بھی سیٹھ عثمان کو رخصت کرتے وقت بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا پھر راحیلہ بیگم سے کہا۔ ''آپ نے جس اپنایت سے میڈم کو انگوٹھی پہنانے میں پہل کی تھی اسے میں بھی فراموش نہیں کروں گا۔''
واپسی پر بھی اورنگ زیب، سراج اور الماس کے ساتھ تھا لیکن کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ الماس نے اسے چھیڑنے کی خاطر پوچھا۔ ''میڈم نے جاتے جاتے کیا کہہ دیا جو آپ اس قدر سنجیدہ نظر آ رہے ہیں؟''
''میں اپنے کارڈز قبل از وقت شو کرنے کا عادی نہیں ہوں۔'' اورنگ زیب نے مسکرا کر جواب دیا پھر کسی خیال میں گم ہو گیا۔ سراج نے اس وقت اسے الماس کی موجودگی میں کریدنا مناسب بھی نہیں سمجھا۔

☙☙☙

ماربل کے ایکسپورٹ کے کام کی وجہ سے لیاقت حسین کی دفتری مصروفیات بھی بڑھ گئی تھیں۔ آفس کے علاوہ اسے اکثر باہر کے کاموں کی نگرانی بھی کرنی پڑتی تھی۔ پہلے گودام سے مال اٹھا کر شپنگ کمپنی تک پہنچانے کا کام کسی اور کے ذمے تھا لیکن اب یہ کام بھی لیاقت حسین خود کرنے لگا تھا۔ سیٹھ عثمان کے مشورے پر اس نے ایک لوڈنگ پک اپ بھی خرید لی تھی۔ شپنگ کمپنی تک مال پہنچانے کا مشورہ بھی اسے سیٹھ عثمان ہی نے دیا تھا۔ پہلے یہ کام جو شخص کرتا تھا اس کے بارے میں یہی رپورٹ ملی تھی کہ وہ بزنس کے راز بھی دوسروں کے ہاتھ فروخت کرتا تھا۔ اس بات کا علم بھی اس وقت ہوا جب ''ماربل ایکسپورٹرز'' کے نام سے اس شعبے کو علیحدہ کیا گیا تھا۔ اس کے کچھ دنوں بعد ہی اس ملازم نے اچانک ملازمت بھی چھوڑ دی تھی، بعد کی اطلاعات کے مطابق اس نے ماربل کا کام کرنے والی ایک اور فرم میں ملازمت اختیار کر لی تھی جس کا مال بھی سرفراز خان کے بجائے کسی اور کے ذریعے خریدا جاتا تھا۔
بہرحال، اب گودام سے مال اٹھانے اور شپنگ کمپنی تک پہنچانے کا سارا کام لیاقت حسین خود دیکھ رہا تھا۔ اس کی ایمانداری سے دوسرے عملے کے افراد بھی واقف تھے اس لیے وہ بھی محتاط ہو گئے تھے۔
اس وقت دوپہر کے دو بجے کا عمل تھا جب لیاقت حسین...... مال کی دوسری کھیپ بھی شپنگ کمپنی تک پہنچانے کے بعد واپس آ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں حاصل ہونے والے منافع کے سلسلے میں بہت سی باتیں گردش کر رہی تھیں سیٹھ عثمان کے احسانات اس پر بے حساب تھے، براہ راست بیرونی منڈیوں سے کاروبار کا مشورہ بھی انہوں نے سرفراز خان کو دیا تھا، یہ بھی محبت کا ثبوت تھا۔ ان کے پاس عملے کی کمی بھی نہیں تھی، وہ چاہتے تو خود بھی کئی طریقے اختیار کر کے اس کام کو براہ راست بھی کر سکتے تھے لیکن انہوں نے نہ صرف سرفراز خان کو نیک مشورہ دیا تھا بلکہ دفتر کی جگہ اور تجربہ کار عملہ بھی فراہم کر دیا تھا۔ سرفراز خان نے منافع میں آدھے کی شرط رکھی تھی جسے سیٹھ عثمان نے وقتی طور پر قبول کر لیا تھا لیکن سرفراز خان کے جانے کے بعد انہوں نے لیاقت حسین پر یہ بات واضح کر دی تھی کہ صرف اپنے سابقہ کاروبار کی حد تک منافع لیں گے، باقی سب لیاقت حسین کو براہ راست اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرنا ہوگا۔
لیاقت حسین نے کبھی سیٹھ عثمان کے سامنے زبان نہیں کھولی تھی اس لیے وہ خاموش ہو گیا تھا لیکن اس وقت وہ اسی پہلو پر غور کر رہا تھا کہ کوئی ایسی صورت نکالے کہ سیٹھ عثمان کو کل کاروبار کا نصف لینے پر آمادہ کر سکے۔ وہ ان ہی خیالوں میں مستغرق تھا جب اچانک اس کی نظر اپنے ہاتھ کی اس انگوٹھی پر پڑی جو اس کی ماں نے تعویذ گم ہو جانے کے بعد اسے دی تھی۔ انگوٹھی پر نظر پڑتے ہی وہ چونکا۔ اس میں جڑے ہوئے چپٹے کیچی رنگ کا عقیق اس وقت کسی سرخ رنگ کے انگارے کے مانند دہک رہا تھا۔ لیاقت حسین کے ذہن میں کسی آنے والے خطرے کا احساس ابھرا پھر غیر اختیاری طور پر اس نے اسٹیئرنگ موڑا، لوڈنگ پک اپ اب ایک ویران سڑک پر آنے کے بعد فراٹے بھر رہی تھی۔ لیاقت حسین کی نظریں بہ دستور انگوٹھی کے نگینے پر مرکوز تھیں جب ماں کی آواز کہیں دور سے اس کے کانوں میں گونجی۔
''ماں کا زندگی...... تیرا جان کا دشمن پھر تجھے نقصان پہنچانے کی خاطر گندا عمل کر رہا ہے۔''
''وہ کون ہے ماں؟'' لیاقت حسین کے ہونٹ آپ ہی آپ متحرک ہو گئے۔
''وہی پلید۔ جس کا خوب صورت عورت تیرے تعویذ کے جال میں پھنس کر جہنم رسید ہو گیا تھا۔''
''وہ...... وہ اس وقت کہاں ہوگا......؟''
''سب اوپر والے پر چھوڑ دے ماں کا جان...... جس نے اس کا عورت کو چٹ کر دیا وہی اس کو بھی غرق کرے گا۔''
لیاقت حسین کے پیروں کا دباؤ ایکسی لریٹر پر بتدریج بڑھتا جا رہا تھا۔ کوئی غیبی قوت اس کی رہنمائی کر رہی تھی۔ انگوٹھی کی طرف سے نظر ہٹا کر اب وہ سنسان سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن اس کے ذہن پر ایک دھندسی طاری تھی، وہ کہاں جا رہا تھا؟ کیوں جا رہا تھا؟ اس کا علم اسے نہیں تھا جب ماں کی آواز پھر اس کے کانوں میں گونجی۔
''تو اس کا قریب مت جانا لیاقت...... وہ گندا بدذات اس قابل بھی نہیں ہے کہ تو اس کو ہاتھ لگائے۔ دور سے انگوٹھی اس کے سامنے کر دینا، وہ سارا جنتر منتر بھول جائے گا۔''
''ماں...... وہ کب تک ہمارا پیچھے لگا رہے گا...... کیا بڑے نانا کا طاقت اسے......''

”توبہ کر لیاقت...... توبہ کر۔“ ماں کے لہجے میں خوف کا عنصر بھی گھل گیا۔ ”مارنے اور جلانے کا اختیار صرف اوپر والا کو ہے۔ اس کا اشارے کے بغیر تو پتھر بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹ سکتا۔“

”پھر...... تو میرے لیے خدا سے دعا مانگ؟“

”پریشان مت ہو لیاقت...... ماں کی دعا تیرے ساتھ ہے...... اوپر والا ہمارا پکار ضرور سنے گا...... کب؟ یہ اس کی مرضی کا بات ہے میری جان...... اس کا ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتا ہے...... فرعون کو بھی اسی نے ڈھیل دے رکھا تھا پھر...... اس طرح غرق کیا کہ اس کے پلید جسم کو مچھلیوں نے بھی نہیں کھایا...... وہ بھی نشان عبرت بن کر رہ گیا۔ وہ غفور الرحیم اس گندے پجاری کو بھی ضرور مارے گا۔ کب؟ اس کے لیے تجھے وقت کا انتظار کرنا ہوگا......“

لیاقت حسین کے ذہن میں اس وقت سناٹوں کا راج تھا۔ وہ جسمانی طور پر حاضر ہونے کے باوجود ذہنی طور پر غیر حاضر ہی تھا۔ پک اپ کی رفتار بڑھتی گئی پھر...... وہ شہر سے دور سمندر کے ایک ایسے اجاڑ اور غیر آباد حصے میں پہنچ کر رک گئی جسے ہندو شمشان کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

ہندوؤں کے مردے جہاں جلائے جاتے تھے اس کے قریب ہی ایک ٹوٹا پھوٹا مندر بھی تھا۔ پک اپ اسی مندر کے قریب جا کر رکی، لیاقت حسین اتر کر نیچے آ گیا پھر اس کی نظروں میں پرتاب بھوشن بھی آ گیا جو اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے منڈل کے درمیان آلتی پالتی مارے بیٹھا نہ جانے کس منتر کے جاپ پڑھ رہا تھا۔ لیاقت حسین کی نظریں اسے گھور رہی تھیں جب ماں کی آواز نے پھر اس کی رہنمائی کی۔

”لیاقت...... میرا بات غور سے سن...... اس بدذات اور پلید پجاری کو للکار کر اس کا بدبدانا بند کر دے...... اس کا گندا عمل اگر پورا ہو گیا تو اچھا نہیں ہوگا...... اس حرام کے تخم نے جو دائرہ کھینچ رکھا ہے اس کے اندر جانے کا غلطی بھی نہ کرنا۔“

لیاقت حسین نے ماں کی آواز سنی تو اس نے قریب سے دو چار پتھر اٹھا کر پرتاب بھوشن کی طرف پھینکنے شروع کر دیے، اسے اپنے مقصد میں ناکامی نہیں ہوئی، ایک پتھر پجاری کے شانوں سے ٹکرایا تو اس نے بدک کر آنکھیں کھول دیں، دہکتی ہوئی نظروں سے غضب ناک انداز میں نظریں گھما کر لیاقت حسین کو دیکھا تو اس کے گندے ہونٹوں پر ایک مکروہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

”تو...... تو آ گیا ملیچھ......“ پجاری کے لہجے میں گھمنڈ تھا۔ ”میں جانتا تھا کہ دیوی کی شکتی تجھے کھینچ لائے گی۔ آج تو میرے ہاتھ سے نہیں بچے گا، ایسی کھاٹ کھڑی کروں گا کہ تیرے اگلے پچھلے بھی یاد رکھیں گے۔“

”بڑا ناز ہے تجھے اپنی طاقت پر تو مردوں کی طرح خم ٹھونک کر سامنے آ جا...... کون کتنے پانی میں ہے آج اس کا فیصلہ بھی ہو جائے۔“

جواب میں پرتاب بھوشن نے قہقہہ لگا کر کہا۔

”تیری زبان سے جو شبد نکل رہے ہیں وہی تیری پول بھی کھول رہے ہیں مورکھ آج...... تیری موت ہی تجھے یہاں تک گھسیٹ لائی ہے...... جے بھوانی۔“

”بھوانی نہیں...... نانی کو یاد کر۔“ لیاقت حسین نے گرج کر کہا۔ ”گندی مٹی سے اٹھ کر سامنے آ...... دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی بھی ہو جائے گا۔“

پرتاب بھوشن کی پیشانی پر سلوٹیں جال بننے لگیں، وہ غضب ناک ہو کر کھڑا ہو گیا، شعلہ اگلتی نظروں سے لیاقت حسین کو دیکھنے لگا لیکن اس نے منڈل سے باہر قدم نہیں نکالا۔

”تیری پجارن کا کیا انجام ہوا تھا پلید پجاری؟...... یاد ہے کہ اتنی جلدی بھول گیا۔“ لیاقت حسین نے بہ دستور سپاٹ آواز میں کہا۔ ”اس دن بھی تیری بھوانی اور دیوی دیوتا بغلیں جھانکتے رہ گئے تھے...... آج بھی تیرا جادو نہیں چلے گا کمین ذات......“

پرتاب بھوشن دیوی دیوتاؤں کی شان میں استعمال کیے جانے والے جملے سن کر بپھر گیا۔ غصے میں کانپتا ہوا منڈل سے باہر آ گیا، اس کی آنکھوں میں آگ کے بھڑکتے شعلوں کا رقص اور تیز ہو گیا...... ہونٹ پھر تیزی سے جنبش کرنے لگے۔ شاید وہ کسی خطرناک منتر کا جاپ کر رہا تھا جب لیاقت حسین کے کانوں میں پھر ماں کی آواز ابھری۔

”دیر مت کر لیاقت...... انگوٹھی اس پلید کے سامنے کر دے......“

لیاقت حسین نے ماں کی بات پر عمل کیا تو پرتاب بھوشن کے ہونٹوں کی جنبش تھم گئی، اس کی نظریں انگوٹھی کے نگینے پر پڑیں تو اس کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی غیر مرئی قوت نے اسے بے بس کر دیا تھا۔ خاصی دیر وہ اسی کیفیت سے دوچار رہا پھر اس نے بڑی مشکل سے اپنی توجہ نگینے کی طرف سے ہٹائیں، ہانپتا ہوا بولا۔

”پلٹ کر بھی دیکھ لے مورکھ...... تیری موت تیرے سر پر کھڑی ہے......“

لیاقت حسین نے اس جملے پر تیزی سے پلٹ کر دیکھا، وہاں اس کے سوا کوئی اور نہیں تھا، اس نے دوبارہ نگاہوں کا

زاویہ بدلا لیکن پرتاب بھوشن جہاں کھڑا تھا اب وہاں دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ موقع پا کر نکل چکا تھا۔

”تو اس چنڈال کی بات میں آ گیا لیاقت......“ ماں کی آواز ابھری۔ ”وہ پھر بچ کر نکل گیا لیکن اوپر والا کی شاید اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی...... اب...... اب تو واپس چلا جا۔“

لیاقت حسین مشینی انداز میں گھوم کر دوبارہ پک اپ میں بیٹھ گیا...... واپس دفتر پہنچا تو سیٹھ عثمان اس کے منتظر تھے۔ وہ ان کے کمرے میں گیا تو سیٹھ عثمان نے دریافت کیا۔

”تم نے اتنی دیر کہاں لگا دی لیاقت حسین؟ تمہارے والد کا فون آیا تھا۔ میں نے تمہارے موبائل پر کال بھی کیا لیکن تم نے وہ بھی اٹینڈ نہیں کیا؟“

”تعجب ہے......“ لیاقت حسین نے خود بھی حیرت سے جواب دیا۔ ”میں تو مارٹل شپنگ کمپنی پہنچا کر سیدھا واپس آ رہا ہوں۔“

جواب میں سیٹھ عثمان نے اسے غور سے دیکھا، کچھ دیر خاموش رہے پھر بڑی اپنائیت سے بولے۔

”تم بیٹھو...... میں آپریٹر سے کہتا ہوں کہ تمہارے والد سے رابطہ قائم کرے۔“

لیاقت حسین خاموشی سے بیٹھ گیا...... اسے حیرت تھی کہ سیٹھ عثمان نے اس سے دیر سے آنے کی بات کیوں کی تھی جبکہ اس نے اپنے خیال کے مطابق کہیں دیر نہیں لگائی تھی......

دوسری جانب سیٹھ عثمان بھی لیاقت حسین کے بیان کی روشنی میں کچھ گزری ہوئی حیرت انگیز باتوں پر غور کر رہے تھے۔

⁂⁂⁂

دونوں حسب معمول اس وقت بھی ہوٹل کے کمرے میں تھے۔ دونوں کی نظریں ٹی وی پر متحرک ایک مزاحیہ فلم پر مرکوز تھیں جب وشنو نے بیزاری کا اظہار کیا۔

”ہم کب تک اس طرح کمروں میں بند بیٹھے ان مزاحیہ فلموں کو دیکھ دیکھ کر بور ہوتے رہیں گے۔“

”کہو تو کوئی رومانوی فلم لگا دوں؟“ لوچن نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”لیکن ایک شرط پر، تم کسی مخصوص منظر کو دیکھ کر کلونت کی بے وفائی کا شکوہ نہیں کرو گے۔“

جواب میں وشنو نے لوچن کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کوئی خطرناک چیتا اپنے شکار کو دبوچنے کی خاطر آخری چھلانگ لگانے کا ارادہ کر لیتا ہے۔ ایک لمحے وہ لوچن کو گھورتا رہا پھر پھنکارتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں کہ کلونت کا ذکر کسی بھی انداز میں نہ چھیڑا کرو...... آئندہ خیال رکھنا۔"

"جس کو تم نے اپنے ہاتھوں سے مار ڈالا، اب اس کے ذکر سے چڑتے کیوں ہو......؟" لوچن نے بھی جواب میں سنجیدگی اختیار کرلی۔

"وہ میرا ذاتی معاملہ ہے لیکن تم......"

"میرا نام لوچن ہے وشنو...... میں حکم سننے کا عادی نہیں ہوں۔" لوچن نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ "مرنا اور مارنا میرا پیشہ ہے۔ یہ تم بھی جانتے ہو۔"

"تم مجھے چیلنج کررہے ہو؟" وشنو کے تیور بھی بدلنے لگے۔

"جو چاہے سمجھ لو......" لوچن شانے اچکا کر بولا۔ "میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔"

وشنو کی نگاہوں کی سرخی پھیلنے لگی تھی، جب اس کے موبائل پر سگنل موصول ہوا، اس نے ہونٹ چباتے ہوئے فون آن کرلیا پھر دوسری جانب سے جو کوڈ استعمال کیا گیا اسے سن کر اس نے لوچن کو دیکھا پھر اٹھ کر بالکونی میں چلا گیا۔ لوچن نے بھی وشنو کے اٹھتے ہی ٹی وی کی آواز کم کردی۔ اس کی نظریں بہ دستور ٹی وی پر تھیں لیکن پوری توجہ بالکونی کی سمت تھی، وشنو کے چہرے پر ابھرنے والی کسی نامعلوم خوشی نے اسے پوری طرح چوکنا کردیا تھا۔

"کس لیے فون کیا ہے؟" وشنو کی مدھم آواز لوچن کے کانوں میں سنائی دی پھر ایک لمحے بعد اس نے بڑے جذباتی انداز میں کہا تھا۔ "میں براہ راست اس سے بات کرنا پسند کروں گا...... ہاں تم اسے میری ضد ہی سمجھ لو...... میں جانتا ہوں لیکن پہلے کی بات اور تھی...... نہیں، بات پیشے کی نہیں، وقت کی نزاکت کی ہے...... ہو بھی سکتا ہے...... ٹھیک ہے، میں اس کا انتظار کروں گا۔"

وشنو دوبارہ کمرے میں آیا تو لوچن نے آواز کا والیوم بھی بڑھا دیا۔ بہ ظاہر وہ ٹی وی پر متحرک تصویروں میں دلچسپی لیتا نظر آرہا تھا لیکن اس کے ذہن میں وشنو کی جانب سے کہے جانے والے جملے گونج رہے تھے، وہ ان جملوں کو اپنے تجربے کی روشنی میں ڈی کوڈ کررہا تھا۔

کلونت کے نام پر وہ جھلا گیا تھا، لوچن نے اسے ترکی بہ ترکی جواب دیا تو اس کے تیور بدلنے لگے پھر...... اس کال کے آتے ہی اب وہ خاصے خوش گوار موڈ میں نظر آرہا تھا...... یقیناً اسے دوسری جانب سے کوئی ایسی خبر ملی تھی جسے سن کر اس نے خلاف توقع کینچلی بدل لی تھی۔ وہ خبر کیا تھی؟ لوچن اس بات پر غور کررہا تھا جب وشنو نے اسے مخاطب کیا۔

"ہم دونوں کے لیے موجودہ حالات میں یہی بہتر ہے کہ ہم جب تک ایک ساتھ ہیں...... دوستوں کی طرح رہیں۔ ہماری آپس کی کھینچا تانی دوسروں کے لیے فائدہ مند بھی ہوسکتی ہے۔"

"اگر یہ تمہارا خیال ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے مگر ہم دونوں کون ہیں، ہمارا تعلق اور شمار کن لوگوں میں ہوتا ہے، تمہیں بھی اس کا خیال رکھنا ہوگا۔ میں زبان پر تالے ڈالنے کا عادی بھی نہیں رہا۔"

"کلونت میری دکھتی رگ ہے دوست......" وشنو نے اس کے شانو پر ہاتھ رکھ کر عجیب انداز میں کہا۔ "میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے لہولہان کیا تھا، یہاں تک کہ وہ آخری ہچکی لے کر دم بھی توڑ گئی۔ میں اس کے شریر کے ان کومل اور سندر حصوں پر کرپان چلاتا رہا جن کو کبھی میں بڑے پیار سے چوما کرتا تھا۔ وہ مرنے کے بعد بھی میری محبت ہے، اس لیے میں بنتی کرتا ہوں کہ تم اس کا ذکر نہ چھیڑا کرو۔ میں اندر سے تڑپ اٹھتا ہوں۔ بھرتے ہوئے زخموں کو بار بار کریدا جائے تو وہ ناسور بن جاتے ہیں۔"

"تم کہتے ہو تو میں مان لیتا ہوں۔" لوچن نے ٹی وی آف کرکے وشنو کی طرف دیکھا پھر موضوع بدل کر پوچھا۔ "کس کی کال تھی؟"

"کسی کا وفادار اور پالتو کتا تھا۔"

"کیا خبر دے رہا تھا......؟" لوچن نے بھی سرسراتے لہجے میں دریافت کیا۔

"وہ...... وہ...... کہہ رہا تھا کہ بل ڈاگ ابھی مرا نہیں، زندہ ہے۔" وشنو نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "میں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ میں نے براہ راست بات کرنے کی شرط لگادی ہے۔"

"اگر بات ہوگئی تو؟" لوچن نے اسے مسکراتی مگر معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ "کیا تم دوبارہ اس کے لیے کام کرنے پر آمادہ ہوجاؤ گے؟"

"ضروری نہیں ہے لیکن......" وشنو کسمسا کر بولا۔ "تم جانتے ہو کہ ہمارا پیشہ نیلام کی آخری بولی پر ختم ہوتا ہے۔ جدھر سے زیادہ مال اور سہولت کی آفر ہوئی، میں اسی کو قبول کروں گا۔ تمہارا کیا اصول ہے؟"

"میں جو سودا کرچکا ہوں اس کے ختم ہونے میں ابھی تقریباً دو مہینے باقی ہیں۔ تم جانتے ہو کہ میرا تعلق کس تنظیم سے ہے۔ ہمارے بڑے غداری کی سزا صرف موت ہی تجویز کرتے ہیں۔"

"جانتا ہوں لیکن...... میں کسی کا پابند نہیں ہوں۔"

"ہاں...... آں! تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر یہ بھی نہ بھولو کہ ملٹری انٹیلی جنس والوں نے ہمیں کسی کے اشارے پر کسی اہم مقصد کے حصول کی خاطر فرار ہونے کا موقع دیا تھا۔ وہ ہماری طرف سے بے خبر بھی نہیں ہوں گے۔"

"اس کے باوجود میں ان کی ناک کے نیچے سے گزر کر نکل گیا تھا۔ کام نمٹا کر ان ہی کی نظروں کے سامنے سے واپس بھی آگیا۔" وشنو کے لہجے میں اعتماد جھلک رہا تھا۔ "تخت یا تختہ...... میں نے شروع سے اسی کہاوت پر عمل کیا ہے۔"

"اعتماد مردانگی کی نشانی ہے لیکن کبھی کبھی یہی اعتماد انسان کو دھوکا بھی دے جاتا ہے۔"

"میں سمجھا نہیں؟" وشنو نے پہلو بدل کر وضاحت چاہی۔

"ہوسکتا ہے کہ ملٹری یا پولیس کے کچھ لوگوں نے تمہیں جان بوجھ کر موقع دیا ہو...... اس طرح وہ تمہاری نقل و حرکت کو دیکھنا چاہتے ہوں۔" لوچن نے پہلو بدل کر بے حد سنجیدگی سے کہا۔ "زندگی میں میرا واسطہ بھی بڑے بڑے سورماؤں سے پڑ چکا ہے مگر ایس پی اورنگ زیب!...... شطرنج کی بساط پر وہ بڑے ماہرانہ انداز میں مہروں کو استعمال کرتا ہے، کیا تم اس حقیقت سے انکار کرو گے؟"

"نہیں......" وشنو نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ "وہ مرد آدمی ہے۔ زبان کا دھنی بھی ہے، پولیس کی نفری میں ایسے جانباز آٹے میں نمک کے برابر ہوتے ہیں لیکن جب انسان موت کو ہتھیلی پر رکھ لے تو پھر اسے کسی بات کی چنتا بھی نہیں رہتی۔"

"تم جانو......" لوچن نے بے پروائی سے شانوں کو جنبش دی۔ "ہم ایک دوسرے کے پابند بھی نہیں ہیں۔ کیا اچھا ہے؟ کیا برا؟ اس کا فیصلہ بھی ہمیں خود کرنا ہے۔"

کچھ دیر دونوں کے درمیان ادھر ادھر کی بات ہوتی رہی پھر وشنو نے سنبھل کر پوچھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے...... کیا وہ زندہ ہوگا......؟"

لوچن نے چونک کر وشنو کو دیکھا۔ سرسراتے لہجے میں بولا۔ "اگر زندہ ہو تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔ اس کی موٹی گردن پر میرے دو ساتھیوں کی موت کا قرض بھی باقی ہے۔ ہم تینوں ایک ہی جہاز میں آئے تھے، ہماری واقفیت بھی جہاز کے سفر کے دوران ہی اتفاقیہ ہوگئی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے سے دوستی کا ہاتھ ملایا تھا۔ وہ زندہ ہوا تو میں ان دونوں کی دوستی کا قرض بھی چکتا کردوں گا۔"

وشنو کوئی جواب دینا چاہتا تھا کہ اس کے موبائل پر

پھر سگنل موصول ہوا۔ اس بار اس نے بالکونی کی سمت جانے کے بجائے لوچن کے برابر بیٹھے ہی بیٹھے موبائل آن کرلیا۔

''ہاں...... میں وشنو ہی بول رہا ہوں...... اس نے جو کہا وہ وعدہ نہیں تھا، براہ راست بات کرنے کی بات میں نے کہی تھی...... ہاں، وہ بھی جانتا ہے کہ وشنو کس چڑیا کا نام ہے...... یہی سمجھ لو...... انجام کی بات دوبارہ کبھی مت کرنا، وشنو موت سے کبھی نہیں ڈرا...... اٹل ہی سمجھو۔''

''کس کا فون تھا؟'' لوچن نے بات ختم ہونے کے بعد وشنو کو کریدا۔ ''کیا اسی کی طرف سے کسی نے کال کیا تھا جو ہم سب کے لیے معما بن کر رہ گیا ہے؟''

''ہاں......'' وشنو نے مختصر جواب دیا۔

''وہ کس بات کا اصرار کر رہے ہیں؟''

''ایک دو بندوں کو پھڑکانے کی بات کر رہے ہیں۔''

''کوئی آفر بھی ضرور دی ہوگی؟''

''ہاں...... جتنا مطالبہ میں کروں گا وہ اس سے انکار نہیں کریں گے۔''

''پھر...... تمہیں خطرہ کس بات کا ہے؟''

''بات خطرے کی نہیں میرے دوست، اصول کی ہے۔'' وشنو نے لمبی سانس لے کر صاف گوئی سے کہا۔ ''میں بلاوجہ کسی کے خون سے ہولی کھیلنے کو بھی پاپ ہی سمجھتا ہوں۔''

''اور اگر سربراہ سے تمہاری ڈائریکٹ بات ہوجائے تو......؟''

''تب...... سوچنا پڑے گا؟''

''کیا تم اس سے بھی انکار کردو گے؟''

''شاید نہیں......'' وشنو نے کسمسا کر کہا۔ ''تم بھی جانتے ہو کہ انٹرپول کے شکاری کتے ہر طرف میری بو سونگھتے پھر رہے ہیں، بارڈر کراس کرنے کے بعد اس ویس میں اسی بگ باس نے میرا ہاتھ تھاما تھا۔ وشنو اس کی بات نہیں ٹال سکتا۔''

''تمہاری ایک بات میرے حلق کے نیچے نہیں اتر رہی۔'' لوچن نے وشنو کو بہت غور سے دیکھا۔ ''جب تم سامنے موجود ہو تو کیا انٹرپول کے شکاری کتے تمہیں نہیں پہچان لیں گے؟''

''پہچان لیا ہوتا تو اب تک الیکٹرک چیئر پر بٹھانے میں دیر بھی نہ کرتے۔'' وشنو نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

''کیا بتانا چاہتے ہو......؟''

''جو وشنو زندہ تھا اس کے اصل چہرے کو آخری بار اس کی کلونت ہی نے دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ کسی کو نظر نہیں آیا۔''

لوچن اس جواب کو سن کر بری طرح چونکا۔ اس کی تجربے کار نظریں وشنو کے چہرے پر منڈلانے لگیں۔ اگر وہ اس وقت بھی میک اپ میں تھا تو کم از کم لوچن کا ذہن اسے قبول نہیں کر رہا تھا۔

***

اسے معلوم تھا کہ اس کی ممبر شپ کی معیاد ختم ہوئے دو ماہ سے اوپر ہوچکے تھے۔ بہرحال اسے کلب کی ریسپشنسٹ ماریا تک جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ ماریا کسی سے فون پر بات کرنے میں مصروف تھی لیکن اس نے آنے والے کو ایسی ہی نظروں سے دیکھا جیسے وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

''فرمائیے۔'' اس نے فون کا ریسیور رکھنے کے بعد آنے والے کو مہذب انداز میں مخاطب کیا۔

''میری ممبر شپ دو ماہ پیشتر ختم ہوسکتی ہے۔ میں اسے ری نیو کرانے آیا ہوں۔'' آنے والے نے سنجیدگی سے کہا پھر اپنا کارڈ نکال کر ماریا کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ ماریا نے کارڈ پر نظر ڈالی تو ایک لمحے کو چونکی پھر مسکرا کر بولی۔

''آج کل کس کے لیے کام کر رہے ہو؟ بہت عرصے بعد نظر آئے ہو۔''

''مجھے اس وقت ماسٹر مجید سے ملنا ہے۔'' آنے والے نے بہ دستور سنجیدگی سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اگر وہ بدلا نہیں ہے تو اس وقت یہیں ہوگا۔''

''ممبر شپ کے بارے میں کیا چاہتے ہو؟''

''اسے بھی ری نیو کردو......'' اس نے جیب سے ایک بڑا نوٹ نکال کر ماریا کے سامنے رکھ دیا۔ ''ہوسکتا ہے دوبارہ پھر کبھی ادھر آنے کی ضرورت پڑے۔''

جتنی دیر ماریا ممبر شپ ری نیو کرنے میں مصروف رہی، آنے والے کی نظریں وہاں موجود میزوں کے اطراف منڈلاتی رہیں پھر وہ ماریا کی آواز سن کر اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ماریا نے وہی پہلا سوال اس سے دوبارہ کیا تھا۔

''فی الحال کسی خاص گروپ کے لیے کام نہیں کر رہا۔'' اس نے کارڈ اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔

''مجھ سے چھپا رہے ہو؟'' ماریا نے بے تکلفی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''اس وقت جو حلیہ بنا رکھا ہے، اسے کیا سمجھوں؟''

''میں نے ماسٹر مجید کے بارے میں دریافت کیا تھا......؟'' ایک ممبر قریب آیا تو اس نے ماریا سے پھر ماسٹر مجید کے بارے میں دریافت کیا۔

''میرا خیال ہے کہ وہ اس وقت بلیئرڈ روم میں ہوگا۔''

اس نے ماریا کو ایک نظر بھر کر دیکھا پھر قدم اٹھاتا بلیئرڈ روم کی طرف چلا گیا، ماریا کا اندازہ غلط نہیں تھا، ماسٹر مجید اس وقت وہیں مل گیا، وہ تنہا نہیں تھا، اس کے ساتھ ایک خوب صورت ممبر بھی تھی۔

نووارد نے لڑکی کی موجودگی میں اسے مخاطب کرنا مناسب نہیں سمجھا...... قریب ہی ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ماسٹر مجید کے ساتھ بیٹھی لڑکی کچھ دیر بعد اٹھ گئی تو وہ قدم اٹھاتا اس کے قریب چلا گیا۔

''مجھے تم سے ایک ضروری بات معلوم کرنی ہے ماسٹر۔'' نووارد نے ٹھوس لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ''بگ باس کے گھر کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت کس نے کی ہے؟''

''تم......'' ماسٹر مجید اس کی آواز سن کر بری طرح چونکا۔ ایک لمحے تک وہ اسے سرتاپا دیکھتا رہا پھر مسکرا کر بولا۔ ''تمہیں اچانک باس کی عزت کا خیال کیسے آگیا جبکہ باس نے تو تمہیں دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا تھا۔''

''خود وہ بھی غرق ہوگیا۔'' جواب مسکرا کر دیا گیا۔

''ہمارے کاروبار میں اونچ نیچ اسی طرح ہوتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی ایک بات تمہیں ضرور یاد ہوگی۔ تم بھی میرے حکم پر دم ہلانے کے عادی تھے۔''

''تم اب اس پوزیشن میں نہیں ہو اس لیے......''

ماسٹر مجید اپنا جملہ مکمل نہ کرسکا، نووارد کی گرفت اس کے بائیں بازو پر کسی آہنی شکنجے کی طرح جم گئی تھی۔ دوستانہ لہجے میں بولا۔ ''مجھے صرف اتنا بتادو کہ وہ کون تھا اور اس وقت کہاں ملے گا؟ بلاوجہ مجھ سے الجھوگے تو اس کلب میں دوبارہ منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں چھوڑوں گا۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ میں جو کہتا ہوں اسے کر گزرنے سے دریغ نہیں کرتا۔''

''مم...... میں، یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن......'' ماسٹر مجید نے نووارد کو...... جو افضل خان کے سوا کوئی اور نہیں تھا، دیکھتے ہوئے مدھم آواز میں جواب دیا۔ ''میں اس گھر کی عزت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا لیکن...... میرا خیال ہے کہ اس سلسلے میں جبرو کو کچھ نہ کچھ علم ضرور ہوگا۔''

''جبرو......'' افضل خان نے ماسٹر مجید کے چہرے پر نظریں جما کر کہا۔ ''میری اطلاع کے مطابق اسے اور اسلم ڈنگا کو اس وقت پولیس نے رنگے ہاتھوں گرفتار کیا تھا جب وہ شبنم کول باٹنٹ کر ہضم کرنے کی سازش کر رہے تھے۔''

''تمہاری اطلاع غلط نہیں ہے۔ یہ بھی جانتے ہوگے کہ جبرو عورتوں کے معاملے میں کتنا بدنیت آدمی ہے۔ جس ہانڈی میں کھاتا ہے اس میں چھید کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ پولیس نے اسے اور اکرم ڈنگا کو گرفتار کیا تھا، دونوں زخمی تھے اس لیے انہیں اسپتال میں رکھا گیا جہاں اسلم زخموں کی تاب نہ لاکر چل بسا تھا، اسی کی تدفین کے سلسلے میں پولیس کی توجہ ہٹی تو جبرو چھومنتر ہوگیا۔ ہوسکتا ہے باس کے غرق ہونے کی خبر سن کر اس نے کسی اور کے ساتھ مل کر اس کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی ہو...... یہ کام اس نے اکیلے کرنے کی حماقت نہیں کی ہوگی لیکن اب کسی رگڑے سے بچنے کی خاطر کہیں چوہے کے بل میں چھپا بیٹھا ہوگا۔''

''وہ چوہے کا بل کہاں ہوسکتا ہے؟''

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا مگر روپوش ہونے کے لیے بنگالی پاڑا سب سے محفوظ سمجھا جاتا ہے، وہاں کچے پکے مکانوں اور جھونپڑیوں کی تنگ گلیوں اور بھول بھلیوں میں پولیس بھی چکرا جاتی ہے لیکن تم اس لباس میں......''

''اس کی فکر مت کرو۔ وہاں کے کچھ پیشہ ور کاروباری مجھے جانتے ہیں۔'' افضل خان نے پہلی بار مسکرا کر جواب دیا پھر وہ رینبو کلب میں زیادہ دیر نہیں رکا۔

آدھے گھنٹے بعد اس نے اپنی گاڑی بکی آبادی کے ایک مکان کے قریب سے گزرنے والی سڑک پر پارک کی پھر وہاں سے وہ پیدل ہی دو چار موڑ کاٹ کر بنگالی پاڑے کی تنگ گلیوں میں داخل ہوگیا جہاں ننگ دھڑنگ بچے اچھل کود کرنے میں مصروف تھے، وہ قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا جب دو آدمی ایک موڑ سے نکل کر اچانک اس کے سامنے آگئے۔

''کہاں جانا ہے صاحب؟'' ایک نے سرسراتے لہجے میں افضل خان کو سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے سوال کیا۔ دوسرا دو قدم پیچھے کھڑا افضل خان کو نگاہوں نگاہوں میں تول رہا تھا۔

''مجھے جبرو کی تلاش ہے۔''

''ہم کسی جبرو وبرو کو نہیں جانتے۔'' دوسرے نے تیور بدل کر خشک لہجے میں جواب دیا۔ ''تم غلط جگہ آگئے ہو صاحب۔''

دونوں جانے کے لیے پلٹے تھے لیکن پھر افضل خان نے اپنی آواز میں انہیں مخاطب کیا تو وہ دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔

''معاف کرنا صاحب...... ہم نے آپ کو اس حلیے میں پہچانا نہیں تھا۔'' ایک نے معذرت کی۔

’’جبرو سے کیا کام پڑ گیا آپ کو؟‘‘ دوسرا بولا۔ ’’دو روز پہلے پولیس کے کھوجی بھی اس کی تلاش میں ادھر آئے تھے۔‘‘

’’وہ کہاں مل سکے گا؟‘‘ افضل خان نے ہونٹ چباتے ہوئے سوال کیا تو دونوں ہی اس کو سوالیہ نظروں سے گھورنے لگے۔

’’آپ کو جبرو سے ایسا کیا کام پڑ گیا جو ہم نہیں کر سکتے؟‘‘ ایک نے مدھم لہجے میں کہا۔ ’’آج کل بنگال سے ایک نئی کھیپ آئی ہوئی ہے۔‘‘

’’پھر کسی وقت فرصت سے آؤں گا......‘‘ افضل خان جانے کے لیے مڑا تو وہ دونوں پھر سامنے آ گئے۔

’’جبرو کی تلاش آپ کو کس سلسلے میں ہے؟‘‘ پستہ قد والے نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ ’’کہیں آپ بھی پولیس کی طرح اس پر کسی کے اغوا اور قتل کا شبہ تو نہیں کر رہے؟‘‘

افضل خان اس کے جملے کی ساخت پر چونکا۔

’’تم نے یہ بات کیوں پوچھی......؟‘‘ اس نے پستہ قد والے کو حیرت سے دیکھا۔ ’’تمہارا اشارہ کس واردات کی طرف ہے؟‘‘

’’ہمارا اشارہ اس بڑے مگر مچھ کی مادہ کی طرف ہے جو اٹھائی گئی۔ اس کی ماں کو وارداتیوں نے اوپر کا ٹکٹ بھی کٹا دیا تھا۔‘‘

’’تم کیا جانتے ہو اس سلسلے میں؟‘‘

’’ایک بات یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ کم از کم جبرو اتنی اونچی اڑان نہیں اڑ سکتا۔‘‘

’’پھر......؟‘‘

’’اپنے دو ایک یار ادھر بھی مچھلیوں کا دھندا کرتے ہیں جدھر مگر مچھ اور اس کا ساتھی ہوائی چرخے (ہیلی کاپٹر) سے کودے تھے، فوج اور پولیس کے آدمی بھی دو روز تک سمندر کی تہ تک ان دونوں کو کھوجتے رہے لیکن کامیاب نہیں ہو سکے۔‘‘

’’تمہارے آدمیوں کا کیا کہنا ہے؟‘‘

’’پولیس اور فوج والوں کی نظریں بچا کر وہ بھی گہرائی تک گئے تھے۔‘‘ جواب سنجیدگی سے دیا گیا۔ ’’ان کو پولیس سے انعام ملنے کے لالچ نے ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا لیکن وہ بھی گوشت کی ایک بوٹی بھی نہیں تلاش کر سکے۔ ان کا یہی خیال ہے کہ جن دونوں نے چھلانگ لگائی تھی، وہ پانی کے اندر ہی اندر کہیں اڑن چھو ہو گئے ہوں گے...... مچھلیوں کا شکار ہوتے تو کہیں نہ کہیں ایک آدھ ہڈی بوٹی بھی ضرور ملتی۔‘‘

’’ہمارا نام بیچ میں نہیں آنا چاہیے صاحب۔‘‘ پستہ قد والے نے پراسرار انداز میں کہا۔ ’’کچھ دنوں پہلے جبرو کو کہیں سے لمبی رقم ملی تھی، اس روز اس نے نشہ بھی زیادہ کیا تھا۔ نمبر ون کی شراب کی چمچماتی بوتل خرید کر لایا تھا۔ ہمارے پوچھنے پر اس نے ایک ہی بات کہی تھی کہ اس کا مرا ہوا حرامی باپ دوبارہ زندہ ہو گیا ہے۔ اس کے ایک روز بعد پولیس نے اس کی تلاش میں چھاپا بھی مارا لیکن شاید اسے چھاپے کی اطلاع بھی پہلے سے مل گئی تھی جو بچ کر صاف نکل گیا۔‘‘

’’اب وہ کہاں مل سکے گا۔‘‘ افضل خان نے پوچھا۔ ’’تمہیں اس کے ایک دو ٹھکانے تو ضرور معلوم ہوں گے؟‘‘

’’آپ فکر نہ کریں...... اپنا موبائل نمبر دے جائیں، ہم اسے کھوج کر آپ کو اس کی مخبری کر دیں گے۔‘‘

جواب میں افضل خان نے ایک کاغذ پر اپنا موبائل نمبر لکھ کر اسے دیا۔ ساتھ ہی ایک ایک بڑا نوٹ بھی دونوں کی مٹھیوں میں دبا دیا۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ سیدھا اپنے فلیٹ پر ہی آیا جہاں شبنم بے چینی سے اس کی منتظر تھی۔

’’کیا رہا......؟ کچھ سراغ ملا؟‘‘

’’فی الحال یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر جو دو چار کلیو ملے ہیں وہ معتبر نہ ہونے کے باوجود یہی ظاہر کرتے ہیں کہ بگ باس شاید غرق نہیں ہوا۔‘‘

افضل خان نے تھکے تھکے انداز میں رک رک کر پوری روداد سنا دی تو شبنم نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بڑی اپنایت سے پوچھا۔

’’کیا موجودہ حالات میں پولیس کے لیے ہمارا کام کرنا مناسب ہوگا؟‘‘

’’اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں ہے۔‘‘ اس نے شبنم کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ’’اورنگ زیب اور سراج صاحب کے بارے میں بھی ایک بات میں اپنے تجزیوں کی روشنی میں بڑے یقین سے کہہ سکتا ہوں، وہ ہمیں ڈبل کراس کرنے کی کوشش بھی نہ کریں گے۔‘‘

’’اور اگر وہ زندہ ہوا تو......؟‘‘

’’اس نے ہم دونوں کو اپنا کام نکل جانے کے بعد نظروں سے گرا دیا تھا۔‘‘ افضل خان نے بڑے زہریلے انداز میں بل کھا کر کہا۔ ’’اگر وہ زندہ ہے تو ہمیں بھی اسے اپنی حیثیت کا احساس ضرور دلانا ہوگا۔ اس کے علاوہ فرار کا کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں ہے۔‘‘

شبنم نے کوئی جواب نہیں دیا، بڑی گرم جوشی سے افضل خان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

لباس کی تراش خراش اور صورت شکل کے اعتبار سے وہ دونوں ہی مہذب نظر آ رہے تھے، جس گاڑی میں آئے تھے وہ بھی نئے ماڈل کی کرولا تھی۔ دونوں نے گاڑی سے اترنے میں بھی عجلت کا مظاہرہ کیا تھا پھر انہوں نے فرنیچر ہاؤس کے باہر نکلنے والے منیجر ہی کو مخاطب کیا۔ ’’شاہ جی پلیز...... ہمیں فوری طور پر ایک بیڈ روم سیٹ درکار ہے۔‘‘

دوسرا شخص اس ملازم کے قریب جا کر رکا جو دکان کا ایک دروازہ بند کرنے لگا تھا۔

’’ادھر کچھ دنوں سے پولیس نے وقت کی پابندی میں کچھ زیادہ ایمانداری دکھانی شروع کر دی ہے۔‘‘ منیجر نے کہا۔ ’’آپ صبح تشریف لے آئیں۔‘‘

’’پاس پڑوس کی کچھ دکانیں تو ابھی تک جگمگا رہی ہیں۔‘‘ آنے والے نے مسکرا کر سوال کیا۔ ’’کیا ان پر پولیس کا زور نہیں چلتا؟‘‘

’’ان کا لین دین کھلا ہوا ہے جناب لیکن ہم بھتہ نہیں دیتے اس لیے وقت کی پابندی بھی لازم ہے۔ آپ چاہیں تو کسی اور دکان سے اپنا مطلوبہ فرنیچر خرید لیں۔‘‘

’’ہمیں دراصل کشمیری کام کا سیٹ دیکھنا ہے۔‘‘ آنے والے نے قدرے عاجزی سے کہا۔ ’’ایسا کرتے ہیں کہ اگر آپ اجازت دیں تو ہم اپنا مطلوبہ فرنیچر دکان کے دروازے بند کر کے اندر ہی دیکھ لیتے ہیں، صبح ہماری وین آ کر اسے اٹھا لے گی۔‘‘

’’اتنی جلدی کیا ہے؟‘‘ منیجر نے پوچھا۔

’’چٹ منگنی پٹ بیاہ کا معاملہ درپیش آ گیا ہے محترم ورنہ ہم آپ کو زحمت بھی نہ دیتے۔‘‘

’’ٹھیک ہے......‘‘ منیجر اس کا جواب سن کر راضی ہو گیا۔

تینوں دکان کے اندر آ گئے، منیجر کے کہنے پر ملازم نے دروازے اندر سے بھیڑ دیے پھر وہ بھی آنے والوں کو کاروباری انداز میں بیڈ روم سیٹ دکھانے لگا۔

’’آپ کیا دکان کے مالک ہیں؟‘‘ فرنیچر دیکھنے والوں نے سوال کیا۔

’’جی نہیں...... مالک شام پانچ بجے چلے جاتے ہیں۔ میں منیجر ہوں۔‘‘

’’اوہ......‘‘ دوسرے نے کہا پھر مسکرا کر بولا۔ ’’قیمت میں کمی بیشی کا اختیار تو آپ کو بھی ہوگا؟‘‘

’’سوری جناب۔‘‘ منیجر نے نمایاں طور پر نظر آنے والی اس تختی کی سمت اشارہ کیا جو دکان کے درمیان میں اسٹینڈ پر نظر آ رہی تھی۔ ’’ہمارے ہاں ایک ہی دام ہوتے ہیں۔ فکسڈ پرائس، نو بارگیننگ۔‘‘

’’جہانگیر بٹ صاحب ہوتے تو شاید وہ بھی ہمیں اتنا کھرا جواب نہ دیتے۔‘‘ آنے والے ایک شخص نے تلملا کر کہا۔ ’’آپ منیجر ہو کر سرخ جھنڈی دکھا رہے ہیں۔‘‘

’’آپ اگر مالک کے واقف کار ہیں تو فون پر ان سے بات کر لیں۔‘‘ منیجر نے انکساری سے کام لیا۔ ’’کمی بیشی کا اختیار کم از کم مجھے نہیں ہے۔‘‘

’’لیکن ہم بااختیار لوگ ہیں میری جان۔‘‘ ایک نے اچانک پستول نکال لیا، اگر چاہیں تو اپنی مرضی کے فرنیچر کے ساتھ تمہیں بھی اٹھا کر مفت لے جا سکتے ہیں۔‘‘

’’م م...... میں نے...... آپ لوگوں سے کوئی غلط بات بھی نہیں کی جو آپ گرمی دکھا رہے ہیں۔‘‘ منیجر نے ہمت کر کے کہا۔

’’زبان بند ہی رکھو میری جان۔‘‘ پستول والے کا لہجہ اچانک سفاک ہو گیا۔ ’’اپنے ملازم کو بھی سمجھا دو کہ وہ تمہارے ساتھ ایک طرف پالتو کتے کی طرح دم دبا کر کھڑا ہو جائے۔ ہمارے جانے سے پہلے تمہیں ہمارے اس وقت آنے کا اصل مقصد بھی معلوم ہو جائے گا۔‘‘

منیجر کے جواب دینے سے پہلے ہی ملازم چکراتا ہوا اس کے قریب ہی فرش پر گرا تھا، دوسرے آدمی نے اس کو اچانک ہی ایسا نپا تلا ہاتھ مارا تھا کہ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ منیجر کے چہرے کے تاثرات یکلخت بدل گئے پھر بھی اس نے ہمت کر کے کہا۔ ’’آپ...... یہ اچھا نہیں کر رہے...... جہانگیر بٹ صاحب بھی اینٹ کا جواب......‘‘

پستول والے کا ہاتھ بھی برق رفتاری سے گھوم گیا، ضرب اتنی شدید تھی کہ منیجر بھی لڑکھڑا گیا۔

’’ہم جانتے ہیں کہ تمہارے جہانگیر بٹ کی اوقات کیا ہے۔‘‘ دوسرے نے حقارت سے منیجر کو گھورا۔ ’’دو نمبر کے اٹھائی گیرے جگا کا نام سن کر لوگ ضرور خوفزدہ ہوتے ہوں گے لیکن ہم جس کے آدمی ہیں وہ جگا کا بھی باپ ہے۔‘‘

’’وقت ضائع مت کرو......‘‘ پستول والے نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ’’پسندیدہ فرنیچر کا مول تول جلدی کر لو۔‘‘

اس کے بعد منیجر کی آنکھیں بھی پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ دوسرے شخص نے بڑے نپے تلے انداز میں قیمتی فرنیچر کی توڑ پھوڑ شروع کر دی تھی، اس بات کا خیال بھی رکھا تھا کہ آواز برابر کی دکانوں تک نہ پہنچ سکے، منیجر اور ملازم دونوں سہمے کھڑے تھے۔ جب فرنیچر کی مرمت کرنے والے نے

سرسراتے ہوئے لہجے میں اپنے ساتھی سے کہا۔
"اتنا لمبا کھٹ راگ پالنے کے بجائے اگر کہو تو میں انہیں آگ دکھادوں۔ جب تک دھواں پھیلے گا ہم دونوں نکل چلیں گے، صبح جگا کو راکھ کے ڈھیر کے ساتھ اپنے آدمیوں کی روسٹ شدہ لاشیں ملیں گی تو اسے باس کی طاقت کا اندازہ بھی ہوجائے گا۔ پھر وہ کبھی دم ہلانے کی غلطی نہیں کرے گا۔"
"نہیں......" پستول والے نے اپنے ساتھی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "باس نے جتنا حکم دیا ہے ہمیں صرف اسی حد تک کارروائی کرنی ہے۔ جگا کے لیے یہ پہلا سبق اگر کافی نہ ہوا تو پھر جلاب دینا بھی ہمیں آتا ہے۔"
"ہم نے آپ کا کیا بگاڑا ہے جناب۔" ملازم گھگیانے لگا۔ "ہم دونوں پر رحم کریں۔"
"منیجر......" پستول والے نے منیجر کو خونخوار نظروں سے دیکھا، پستول تان کر سوال کیا۔ "کیا تمہیں ہمارا حلیہ یاد رہے گا؟"
"کچھ نہ کچھ تو جھوٹ بولنا بھی پڑے گا۔" منیجر نے بے بسی سے مردہ آواز میں کہا۔ "مالک نے معاف کردیا تو پولیس کے کارندے...... بھی ہمارا بخیا ادھیڑنے سے گریز نہیں کریں گے۔"
"پھر...... تم کیا پسند کرو گے؟"
"آپ ہم دونوں کے ہاتھ پیر باندھ کر ڈال دیں۔ اسی میں ہماری بچت ہے۔"
"کہو تو تم دونوں کی دو چار ہڈیاں بھی توڑ دیں۔ اسپتال میں بھی کچھ دنوں آرام کرلیتا۔" پستول والے نے طنز کیا۔ "تمہارے جہانگیر بٹ صاحب بھی کیا یاد کریں گے کہ ہم نے تمہیں زندہ چھوڑ کر ان پر کیا احسان کیا ہے۔"
منیجر کے علاوہ ملازم بھی خاموش رہا۔ جتنی دیر پستول والا ان پر رعب گانٹھتا رہا اتنی دیر میں دوسرے آدمی نے بیشتر قیمتی فرنیچر کو خاصا ناکارہ بنا ڈالا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے ساتھی کے قریب آکر بولا۔
"اب نکل چلو...... جگا کے لیے فی الحال یہی سبق کافی ہوگا۔"
"ان دونوں کا کیا کرنا ہے؟" پستول والے نے غرا کر کہا۔ "ہمارے جانے کے بعد یہ نطفۂ ناتحقیق بھی شور مچانے سے باز نہیں آئیں گے۔"
"نن...... نہیں......" ملازم نے سہم کر ہاتھ جوڑ دیے۔ "ہم پر رحم کریں۔"
ریوالور والا کچھ دیر ان دونوں کو سفاک نظروں سے گھورتا رہا پھر اس نے جیب سے رومال نکال کر اپنے ساتھی کی طرف بڑھا دیا۔ رومال سے کلوروفارم کی تیز خوشبو پھوٹ رہی تھی، دوسرے ساتھی نے باری باری منیجر اور ملازم کی ناک پر رومال رکھ کر دبایا تو دونوں بے ہوش ہوگئے۔ اس کے بعد...... بہ ظاہر مہذب نظر آنے والوں نے بھی وہاں رکنے کی غلطی نہیں کی تھی۔

ماں کی موت کا غم لاحق ہونے کے باوجود وہ شیخ حامد کے اشاروں پر چلنے پر مجبور تھی، ملازمت کے دوران اس نے بہت قریب سے اس کی قوت کا اندازہ لگایا تھا۔ وہ خوب صورت لڑکیوں کا رسیا تھا لیکن اس نے کبھی کنول کے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اگر چاہتا تو اسے بھی روند اور مسل کر ملازمت سے برطرف کردیتا۔ کئی بار اس نے کنول کے خوب صورت خدوخال کو سراہا تھا، اس کے جسم کے نشیب وفراز کو بھی ٹٹولا تھا لیکن ایک حد سے تجاوز کرنے کی کوشش کبھی نہیں کی تھی۔ یہی ایک بات تھی جس وجہ سے اس نے شیخ حامد کے رشتے کو قبول کرنے میں دوراندیشی کا ثبوت دیا تھا۔ انکار کی صورت میں وہ زبردستی بھی گھر سے اٹھوا کر اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کی قوت رکھتا تھا۔
اس کی ماں نے بھی اس رشتے کو قبول کرنے میں کسی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیا تھا۔ شادی کے بعد شیخ حامد نے اسے جو عزت اور کوٹھی بنگلے سے نوازا تھا وہ بھی اسے یاد تھا لیکن...... ماں کی دردناک موت کے بعد اس کے وجود کے اندر شیخ حامد کے خلاف نفرت اور انتقام کا جذبہ بڑی شدت سے سر ابھار رہا تھا مگر...... وہ اس کے اشاروں پر چلنے پر بھی مجبور تھی۔ کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھی جب وہ اس سے اپنی ماں کا انتقام لے سکے لیکن شیخ حامد پوری طرح محتاط رہنے کا عادی تھا۔
اس وقت بھی اپنے کمرے میں بیٹھی وہ اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ دوسروں کی طرح وہ بھی اخباروں میں شائع ہونے والی خبریں پڑھ چکی تھی، سب ہی کی ایک رائے تھی کہ وہ ہیلی کاپٹر سے گرنے کے بعد سمندر کی تہ میں ڈوب چکا تھا۔ اس نے بھی اس پر صبر کرلیا تھا لیکن موجودہ حالات میں بھی ماں کی دردناک موت اسے سکون نہیں لینے دے رہی تھی۔
شیخ حامد نے اس کی ماں کی موت کا جو جواز پیش کیا تھا ممکن ہے وہ اس کے خیال سے درست ہو لیکن کنول کو ماں کی

موت کا غم اندر ہی اندر ڈس رہا تھا۔ شیخ حامد نے اگر اسے اپنی اصلی آواز میں مخاطب نہ کیا ہوتا تو شاید وہ شناخت بھی نہ کرسکتی، اسے علم تھا کہ وہ میک اپ کے فن میں ماہر تھا۔ نہ ہوتا تو شاید پولیس اب تک اسے اس کے انجام تک پہنچا چکی ہوتی، اب بھی وہ سامنے آنے کے باوجود قانون کے نگہبانوں کی نظروں سے بہت دور تھا۔
دروازے پر قدموں کی آواز ابھری تو کنول نے چونک کر ادھر دیکھا، اس وقت شیخ حامد اس کے سامنے سفید ڈاڑھی میں موجود تھا، وہ دل پر جبر کرکے بستر سے نیچے آگئی۔ جانتی تھی کہ آنے والا کس مقصد سے آیا ہے لیکن ماں کی موت کے غم کی وجہ سے اس نے پیش قدمی نہیں کی۔ خاموش کھڑی اس چہرے کو تکتی رہی جس کی مکروہ اصلیت پر تقدس کا ملمع بڑی مہارت سے چڑھایا گیا تھا۔ "میں جانتا ہوں ڈارلنگ کہ وقت اور حالات نے تم کو میرا پہلو گرم کرنے پر مجبور کردیا ہے ورنہ تمہارے اندر ماں کا انتقام لینے کی خواہش ضرور مچل رہی ہوگی۔"
کنول نے کوئی جواب نہیں دیا...... اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔
"گھبراؤ مت۔" وہ کنول کے قریب آکر بولا۔ "میرے تجربے نے مجھے تمہارے بارے میں دھوکا نہیں دیا تھا، تمہارے اندر مرد کے جذبات کو تسکین پہنچانے کی وہ خوبی موجود تھی جو کسی کو بھی دیوانہ کرسکتی ہے لیکن اب تم ماں کے غم کی وجہ سے اس صلاحیت کو کھوتی جارہی ہو۔"
"کیا کوئی لڑکی اپنی ماں کے غم کو آسانی سے......"
"فضول باتیں مت کرو۔" شیخ حامد نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ "میرے لیے اب بھی لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ غم زدہ لڑکیوں سے بھی کس انداز میں لطف حاصل کیا جاتا ہے۔"
"میں......" کنول نے ہچکچا کر کہا۔ "ہمارے درمیان اب بھی ایک مقدس رشتہ قائم ہے اس لیے......"
"شٹ اپ......" جواب بڑی سختی سے دیا گیا۔ "میں آج اس رشتے کو بھی ختم کررہا ہوں۔" اس نے جیب سے نکاح نامہ نکال کر ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہوا میں بکھیر دیا۔ بڑے زہریلے انداز میں بولا۔ "اب تم میری بیوی نہیں ہو...... ایک مجبور لڑکی ہو جس کی مجبوری کو میں زبردستی روندوں گا تو اس کی مزاحمت مجھے لطف اندوز کرے گی۔"
"کیا تمہیں میری بے بسی پر رحم نہیں آئے گا؟" کنول مجسم سوال بن گئی۔
"یہ اس چھت کے نیچے تمہاری آخری رات ہے...... کل پولیس کے شکاری کتے تمہارے مسلے ہوئے لباس سے میری مہک کے ذریعے میری تلاش شروع کردیں گے لیکن کوئی میری گرد کو بھی نہیں پاسکے گا۔"
کنول کے لیے وہ جواب غیر متوقع نہیں تھا لیکن اس کے بعد شیخ حامد نے اس کی مجبوری کو جس بے دردی سے روندا وہ بھی کنول کے لیے بڑی اذیت ناک تھا۔ اس نے خود کو بچانے کی خاطر ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن بپھرے ہوئے طوفان کے تیز ریلے کے آگے اس کی ساری مزاحمت دم توڑ گئی۔

اورنگ زیب اپنے آفس میں بیٹھا ضروری فائلوں کو دیکھنے میں مصروف تھا جب اسے وکی کی کال موصول ہوئی، فون پر دوسری جانب کی آواز ابھرتے ہی اورنگ زیب کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔ وکی عرف بیٹھر جگا کا خاص آدمی تھا جسے اس نے بہت عرصہ پہلے حوالات سے رہائی دلائی تھی۔ جب سے وہ اورنگ زیب کے لیے نہایت ایمانداری سے کام کررہا تھا۔ اسے ہدایت دی گئی تھی کہ صرف اہم معلومات کی خاطر اس سے رابطہ قائم کیا جائے مگر صرف موبائل پر چنانچہ "ہیلو" کے بعد وکی نے دوسری جانب سے فوراً ہی فون کرنے کی وضاحت بھی کردی تھی۔
"آپ اسے میری مجبوری سمجھ لیں صاحب جو میں آپ کو ایک فون بوتھ سے کال کررہا ہوں۔"
"میرے پاس وقت کم ہے۔" اورنگ زیب نے خشک لہجے میں کہا۔ "اور آئندہ بھی......"
"معاملہ اس...... وشنو کا نہ ہوتا صاحب تو ایسا کبھی نہ کرتا......"
وشنو کا نام سن کر اورنگ زیب سنبھل کر بیٹھ گیا۔ "کیا خبر ہے؟"
"بیس منٹ پہلے آج بھی وہ ہوٹل سے پھر تنہا ہی نکلا ہے، ایک منٹ پہلے وہ ٹیکسی سے اتر کر "آل ان ون" سپر اسٹور میں گیا ہے، میرا خیال ہے کہ اسے مجھ پر شبہ ہوگیا ہے، ایسی صورت میں وہ اندر رہ کر بھی چھپ کر کہیں سے میرے بارے میں اپنے شبہے کی تصدیق ضرور کرے گا۔ اسی غرض سے میں نے موٹر سائیکل سے اتر کر جیب سے موبائل نکالنے کی غلطی نہیں کی۔"
"اب کیا سوچا ہے؟"
"آپ کو اسی لیے فون کررہا ہوں کہ اب میرا اس

کے تعاقب میں جانا مناسب نہیں ہوگا۔"

"گڈ......" اورنگ زیب نے اس کی ذہانت کو سراہا۔ "تم کال ختم کر کے کسی اور طرف نکل جاؤ۔"

"ٹھیک ہے جناب...... ٹیکسی نمبر وہی ہے، جس پر وہ دوبار پہلے بھی نظر آچکا ہے۔"

"آئی نو دیٹ۔" اورنگ زیب نے فون بند کر کے لوچن سے موبائل پر رابطہ لیا۔ "روم میٹ کے بارے میں کیا اطلاع ہے؟"

"وہ باسٹرڈ ابھی آدھا گھنٹے پہلے کمرے سے نکلا ہے۔" دوسری جانب سے لوچن کی جھلائی ہوئی آواز ابھری۔ "میں نے ابھی روم سروس سے برف کی تھیلی منگوائی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں......؟"

"خود کو ٹھنڈا رکھنے کا یہ آخری فارمولا اختیار کر رہا ہوں جناب...... اس کے بعد ہوسکتا ہے کہ میں خود اس کو اوپر پہنچا دوں۔" لوچن نے بہ دستور اکھڑے اکھڑے لہجے میں اس کے اصل چہرے کے حوالے سے اس کی بکواس کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ "وہ بنیا...... تیلی مرچنٹ، مجھے بالکل ہی اناڑی سمجھ رہا ہے، میں اسے زیادہ دنوں برداشت نہیں کرسکتا۔"

"فکر مت کرو...... میں اس کی دم سیدھی کرنے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

"ایک دن کے لیے مجھے فری ہینڈ، الاٹ کردیں۔" لوچن نے سرسراتی آواز میں جواب دیا۔ "دوسرے دن سے وہ بلف (Blufe) کرنا بھول جائے گا۔"

"اور کچھ......"

"مخصوص فون کالیں اب بھی اس کے پاس آتی ہیں۔ اس کے خیال میں اس کا مسلم باپ ابھی زندہ ہے لیکن وہ ہر بار اس سے ڈائریکٹ بات کرنے کی کنڈیشن رکھ کر فون بند کردیتا ہے۔ کل اس نے ایک اہم بات اور کہی تھی۔"

"وہ کیا......؟"

"فون کرنے والے چاہتے ہیں کہ وہ دو بندوں کو اوپر پارسل کردے...... ممکن ہے اس نے یوں ہی بکواس کی ہو لیکن اس نے یہی کہہ کر ٹال دیا تھا کہ باس سے بات کرنے کے بعد ہی ان کی ڈیمانڈ پوری کرے گا۔"

"تمہارا کیا اندازہ ہے ان دو آدمیوں کے بارے میں؟" اورنگ زیب نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"اس نے نام نہیں بتائے تھے لیکن لوچن اپنے تجربے کی روشنی میں کہہ سکتا ہے کہ اگر دو غلے ہندو نے جھوٹ نہیں بولا تو پہلا نمبر ہنڈریڈ پرسنٹ آپ ہی کا ہوگا۔"

"میں تم سے ڈس ایگری نہیں کروں گا۔" اورنگ زیب نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "تمہارے اس خیال کے بعد دوسرا نام بھی میرے ذہن میں آگیا ہے لیکن تم میری فکر مت کرو...... ہوسکتا ہے کہ میں ایک دو دن میں وشنو کو کہیں اور شفٹ کرادوں۔"

"میں اس بات سے ایگری نہیں کروں گا جناب......" جواب بے حد سنجیدگی سے دیا گیا۔ "اگر وشنو کو ہٹایا گیا تو ہوسکتا ہے کہ ہمارا شکار...... اگر زندہ ہے تو مزید الرٹ ہوجائے گا۔"

"او۔ کے، میں تمہارے اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کروں گا۔"

اورنگ زیب نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ اس کے چہرے پر خون کی تمازت بڑھتی نظر آرہی تھی...... اگر لوچن نے وشنو کے حوالے سے دو بندے کھڑکانے والی بات غلط نہیں کی تھی تو اس کے خیال میں دوسرا نمبر لیاقت حسین ہی کا ہوسکتا تھا جس کی نادیدہ قوتوں نے کئی موقعوں پر آکٹوپس کا کھیل خراب کردیا تھا۔ اس بات سے اورنگ زیب کے اس خیال کو بھی تقویت پہنچی تھی کہ آکٹوپس سمندر کی تہوں میں کہیں نہ کہیں ضرور سانس لے رہا ہوگا۔ وہ ان ہی خیالوں میں غرق تھا جب اس کے ان لسٹڈ نمبروں پر ڈی آئی جی کی کال موصول ہوئی۔

"کیا آج پھر کوئی اہم حادثہ پیش آگیا ہے؟" ڈی آئی جی نے دوسری جانب سے اورنگ زیب کی آواز سنتے ہی پہلا سوال یہی کیا تھا۔

"جی نہیں...... کم از کم میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے......"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" ڈی آئی جی نے بہ دستور سنجیدہ انداز میں کہا۔ "ابھی دس منٹ پہلے آئی جی نے مجھے اپنے بنگلے سے کال کیا تھا۔ پہلے اس نے مجھے اور آپ کو اپنے دفتر آنے کو کہا تھا پھر اس نے صرف آپ کو بھیجنے کی ہدایت کی ہے...... اس وقت پونے گیارہ بجے ہیں، آئی جی نے پونے بارہ کا وقت رکھا ہے۔"

"او۔ کے سر...... میں پہنچ جاؤں گا۔" اورنگ زیب نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ اس نے صرف آپ ہی کو کیوں طلب کیا ہے؟"

"اس کا جواب تو میں وہاں سے آنے کے بعد ہی دے سکوں گا۔"

"جب نیا آفیسر آتا ہے تو لوگ اس کے کان بھرنے سے بھی باز نہیں آتے...... ہر شخص کا اپنا اپنا پرسنل انٹرسٹ ہوتا ہے لیکن آپ آئی جی سے ملتے وقت ایک بات ذہن میں ضرور رکھیے گا۔"

"آپ حکم دیں سر......"

"حکم نہیں...... یہ دوستانہ مشورہ ہے۔" ڈی آئی جی نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔ "میرے ہوتے ہوئے آپ بھی خود کو تنہا نہ سمجھیے گا، میں ہر حال میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

"تھینک یو سر......" اورنگ زیب نے زیر لب مسکرا کر جواب دیا۔

کال ختم ہونے کے بعد وہ پانچ سات منٹ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر وشنو کے بارے میں کچھ غور کرتا رہا پھر اس نے دستی گھڑی پر ایک نظر ڈالی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ دو منٹ بعد ہی وہ اپنی کار میں بیٹھا آئی جی آفس کی طرف جارہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اگر آئی جی نے صرف اسے تنہا طلب کیا ہے تو اس کا کوئی نہ کوئی اہم سبب بھی ضرور ہوگا۔

ٹھیک پونے بارہ بجے وہ آئی جی کے سامنے تنہا بیٹھا تھا، کچھ دیر تک رسمی باتیں ہوتی رہیں پھر آئی جی نے سنجیدگی سے کہا۔

"مسٹر اورنگ زیب! قبل اس کے کہ ہمارے درمیان گفتگو کا آغاز ہو، میں ایک بات واضح کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ جو بات اس وقت ہمارے درمیان ہو وہ لیک آؤٹ نہیں ہونی چاہیے۔"

"آپ مجھ پر اعتماد کرسکتے ہیں...... سر!" اورنگ زیب نے سنبھل کر سنجیدگی سے جواب دیا۔

"ہر چند کہ مجھے اس ملازمت سے کوئی دلچسپی نہیں رہی لیکن استعفیٰ منظور ہونے تک میں اپنی ڈگنٹی (Dignity) برقرار رکھنا پسند کروں گا۔" آئی جی نے پروقار لہجے میں کہا۔ "میں نے اوپر کے دباؤ کو بھی کبھی اہمیت نہیں دی...... پھر بھی کچھ پروٹوکول کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔"

اورنگ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پرسکون انداز میں بیٹھا آئی جی کے چہرے کے تاثرات دیکھتا رہا۔

"تین روز میں مجھے اوپر سے دو فون آچکے ہیں اور...... اتفاق سے دونوں آپ ہی کے بارے میں تھے۔" آئی جی نے تھوڑے توقف سے بات جاری رکھی۔ "پہلا فون کنول کی بازیابی کے سلسلے میں تھا۔ دوسرے میں کہا گیا کہ میں آپ کو موجودہ سیٹ سے ہٹادوں۔"

"کنول کی بازیابی کے سلسلے میں متعلقہ تھانے کا انسپکٹر تفتیش کر رہا ہے۔ میں ذاتی طور پر بھی اس میں دلچسپی لے رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس میں کچھ وقت لگے گا۔"

"کوئی خاص وجہ؟"

"یس سر...... وہ چونکہ شیخ حامد کی منکوحہ ہے اس لیے اسے کسی خاص مقصد کے پیش نظر ہی اغوا کیا گیا ہوگا۔ چھوٹے موٹے مجرموں نے یہ کام نہیں کیا ہوگا......"

"آئی۔ سی!" آئی جی نے لمبی سانس لی پھر پہلی بار معنی خیز انداز میں مسکرا کر پوچھا۔ "موجودہ سیٹ سے ٹرانسفر کے سلسلے میں آپ کیا کہنا پسند کریں گے؟"

"اس کا فیصلہ آپ کے اختیار میں ہے لیکن میں جنرل میٹنگ کے دوران بھی عرض کرچکا ہوں کہ میں کچھ ذمے داریاں حب الوطنی کے جذبے کے تحت نبھانے کا عادی ہوں اور جو میرا فرض بھی ہے۔ اس کے لیے کسی مخصوص سیٹ یا عہدے پر ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"گویا اس سیٹ سے ہٹنے کے بعد بھی آپ آکٹوپس کے معاملے سے دستبردار نہیں ہوں گے؟" آئی جی نے پہلو بدل کر اسے گھورا۔

"ایسا نہیں ہے سر۔" اورنگ زیب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "ایجنسی کی ملازمتوں میں اوپر کے احکامات کی خلاف ورزی بھی جرم کے زمرے میں آتی ہے اس لیے میں پہلی فرصت میں اپنا ریزگنیشن پیش کردوں گا۔"

"گڈ......" آئی جی نے خلاف توقع اسے ستائشی نظروں سے دیکھا۔ "جب تک میں اس کرسی پر ہوں آپ کو موجودہ سیٹ سے کوئی نہیں ہٹا سکتا، دس از مائی کمٹمنٹ (Comitment)۔"

"تھینک یو سر......"

"بائی دی وے۔" آئی جی نے دوستانہ انداز اختیار کیا۔ "میں نے سنا ہے کہ مرکز کے کچھ بڑے لوگوں سے آپ کے بھی اچھے تعلقات ہیں۔"

"یس سر...... لیکن میں نے ان کو کبھی کسی غلط مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا۔" اس بار بھی اورنگ زیب نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"کنول کے اغوا کے سلسلے میں اوپر والے ایک دو افراد بڑی دلچسپی لے رہے ہیں۔" آئی جی نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ "آپ اس سلسلے میں انہیں پروگریس سے آگاہ کرتے رہیے گا۔"

"او۔ کے......" جواب اختصار سے دیا گیا۔

”رائٹ......“ آئی جی نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آئی، وش یو آل دی بیسٹ۔“

”ویری کائنڈ آف یو سر۔“ اورنگ زیب نے اس سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ دو قدم پیچھے ہٹ کر سیلیوٹ کیا پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔

٭٭٭

لیاقت حسین کو یاد تھا کہ اس دن ہفتہ ہے لیکن راحیلہ بیگم کی ڈیوٹی پر ہونے کے سبب اسے دیر ہوگئی تھی، اسے یقین تھا کہ فرحین کو بھی اس کی اتفاقیہ مصروفیت کا علم ضرور ہوگا اس لیے وہ برا نہیں مانے گی، پھر بھی وہ دبے قدموں گھر میں داخل ہوا۔ فرحین کو بستر پر موجود نہ پاکر اس نے سکون کا سانس لیا، اس کے ذہن میں فوری طور پر یہی خیال آیا کہ وہ راحیلہ بیگم کی طرف ہوگی۔ اکثر جب عثمان صاحب راحیلہ بیگم ساتھ جاتے تھے تو فرحین کو اپنے گھر پر ہی چھوڑ جاتے تھے۔

اس نے خاموشی سے لباس تبدیل کیا پھر وہ بستر پر بیٹھا ہی تھا کہ اس کے کانوں میں غسل خانے سے پانی گرنے کی مدھم آواز سنائی دی، وہ آہستہ سے اٹھ کر قدم بڑھاتا غسل خانے کے قریب چلا گیا، پانی کے گرنے کی آواز بہ دستور آرہی تھی لیکن اندر روشنی نہیں تھی، شاید غسل خانے کا بلب فیوز ہوگیا ہو؟

”لائٹ کیوں بند کر رکھی ہے میڈم جان......“ لیاقت حسین نے دروازے کے قریب جاکر اسے پیار سے آواز دی۔

”بیگم جان نہیں...... سواٹ ہنی، بولا کر۔“

فرحین کی آواز کے ساتھ ہی باہر کی لائٹ بھی روشن ہوگئی، لیاقت حسین نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا پھر...... دیکھتا ہی رہ گیا، فرحین جس لباس میں تھی لیاقت حسین کے لیے نہ صرف نیا تھا بلکہ اسے اس لباس میں دیکھ کر لیاقت حسین کے سارے بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگی تھیں۔

وہ تولیے کا سفید گاؤن تھا جو بڑے گھر کی خواتین نہانے کے بعد پہنتی تھیں، گاؤن کے سفید پٹے سے گرہ بھی اس انداز میں لگائی گئی تھی کہ اوپر کا چمکتا دمکتا جسم دعوت نظارہ دے رہا تھا، گاؤن کے نیچے کوئی زیر جامہ بھی نہیں تھا جس کی وجہ سے سڈول اور خوب صورت پاؤں بھی رانوں تک نظر آرہا تھا۔ پیروں میں اسی مناسبت سے سفید ٹاول کی سلیپر تھی۔

لیاقت حسین کی توجہ کے برعکس فرحین ہاتھوں میں برش لیے اپنے لمبے اور گھنے بالوں کو سنوار رہی تھی، مدھم آواز میں گنگنانے کا عمل بھی جاری تھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اسے لیاقت حسین کی وہاں موجودگی کا علم ہی نہ رہا ہو۔ لیاقت جانتا تھا کہ یہ لباس بھی اسے راحیلہ بیگم نے لے کر دیا ہوگا۔ وہ ہمیشہ ہی فرحین کا خیال رکھتی تھیں۔ سرفراز خان کے آنے کے بعد تو انہوں نے فرحین کے علاوہ لیاقت حسین کو بھی گھر کا ایک فرد ہی سمجھنا شروع کردیا تھا۔

وہ سمجھ رہا تھا کہ اس لباس میں ہونے اور غسل خانے سے پانی گرنے کی آواز کا کیا مقصد تھا۔ خاموش کھڑا وہ فرحین کو ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی محبت بھری والہانہ نظروں سے دیکھتا رہا، اچھی غذا اور صاف ستھرے ماحول میں وہ پہلے سے زیادہ صحت مند نظر آنے لگی تھی۔

کچھ لمحے خاموشی سے گزر گئے پھر لیاقت حسین نے اس کے قریب جاکر کہا۔

”آج تو اس لباس میں تو بلخ لگ رہی ہے۔“

”واٹ......؟“ فرحین نے اسے دیکھ کر بیگموں والے انداز میں کہا۔ ”تم...... ادھر اندر کیسے آیا...... گٹ وٹ۔“

”گٹ وٹ نہیں...... گیٹ آؤٹ بولتے ہیں۔“

”او۔ کے...... ابھی تم ادھر سے جاؤ...... کوئی کام ہوگا تو ہم تم کو بلالے گا۔“

”کام تجھے نہیں...... مجھے ہے میری بلبل۔“ لیاقت حسین نے اسے آگے بڑھ کر اپنے بازوؤں کے حصار میں دبوچ کر اٹھالیا، اسی طرح لیے لیے بستر پر آگیا۔

”سچ بتا......“ فرحین نے اپنا گاؤن ٹھیک کرتے ہوئے شوہر کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”کیسی لگ رہی ہوں اس لباس میں؟“

”تو روز اول سے لیاقت کی جان ہے...... اگر تو نہ ہوتی میں زندہ بھی نہ رہتا۔“

”چپ کر جا لیاقت۔“ فرحین نے سہم کر شوہر کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”ایسی بات دوبارہ کبھی مذاق میں بھی نہ بولنا۔“

”نہیں بولوں گا جان۔“ لیاقت حسین نے اس کے گھنے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔ ”میں تو سمجھا کہ آج دیر ہونے کی وجہ سے تو خفا ہوگی لیکن تو، تو پہلے سے میم بنی ہوئی ہے۔“

”یہ بے شرمی والا لباس ہے لیکن بیگم صاحب نے کہا تھا کہ گھر کے مردوں کو مٹھی میں رکھنے کی خاطر ایسے ہی پہناوے کام آتے ہیں۔“

”اور کیا کہا تھا بیگم صاحبہ نے مردوں کو لبھانے کے لیے؟“ لیاقت حسین نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔

”بہت سی گر کی باتیں بتائی ہیں لیکن وہ میں تجھے نہیں بتاؤں گی۔“ فرحین نے شوخی سے جواب دیا۔ ”تو پہلے ہی

گرو گھنٹال ہے۔ سب باتیں بتادیں تو پھر فائدہ کیا ہوگا؟''
''یہ سب بڑے آدمیوں کی بڑی بڑی باتیں ہیں میری جان......'' لیاقت حسین نے اسے خود سے اور قریب کرلیا، انگریزی کشتی میں وہ مزہ بھی نہیں ہوتا جو اکھاڑے کی اٹھا پٹخ میں دونوں پہلوانوں کو ملتا ہے، سمجھ رہی ہے میری باتیں......''
''پہلے دن سے سمجھ رہی ہوں۔'' اس نے شوخی سے کہا۔ ''چل ہٹ ایک طرف، میں یہ لباس بدل لوں، آج ہی بیگم صاحبہ نے دیا ہے۔''
''اس کی فکر مت کر...... اس کے خراب ہونے اور بار بار دھونے میں بھی بڑا سواد ملتا ہے۔''
''سچ کہہ رہا ہے؟''
''ایک دم سولہ آنے سچ......''
''پر تو نے یہ تجربہ کب اور کہاں کیا؟'' فرحین نے اسے پہلی بار ایک عورت کی نظروں سے دیکھا۔
''شادی کے بعد انسان آہستہ آہستہ سب کچھ آپ ہی آپ سیکھ جاتا ہے۔'' لیاقت حسین نے اس کی آنکھوں میں دور تک جھانکا۔ ''پہلے دن تو بھی بالکل اناڑی تھی لیکن اب تجھے بھی اکھاڑے کے سارے داؤ پیچ آگئے ہیں...... رہی سہی کسر بیگم صاحبہ پوری کر رہی ہیں۔''
لیاقت حسین کا جواب سن کر فرحین کسی چھوئی موئی کے پودے کی طرح اس کے کشادہ سینے میں سمٹ گئی۔ لیاقت حسین نے ایک ہاتھ سے اسے سمیٹا۔ دوسرے ہاتھ سے نائٹ بلب کی مدھم روشنی بھی آف کر دی۔

⁂⁂⁂

جگا کے نام کی پرچی دیکھ کر اورنگ زیب چونکا۔ ایک لمحے میں اس کے ذہن میں بے شمار خیالات گڈمڈ ہو کر رہ گئے۔ جگا نے اس سے پیشتر بھی اس کے قریب آنے کی غلطی بھی نہیں کی تھی پھر...... اس نے دفتر پہنچ کر سپاہی کے ذریعے اپنے نام کی پرچی اندر بھیجنے کی جرأت کیسے کی؟
وہ جانتا تھا کہ جگا کے ہاتھ صاف ہیں...... نہ ہوتے تو ملٹری انٹیلی جنس والے آسانی سے اس کا پیچھا بھی نہ چھوڑتے۔ قانون کے ہاتھوں ملنے والی سزا پوری کرنے کے بعد اس نے کاروبار شروع کر دیا تھا۔ اپنے تحفظ کی خاطر اس نے کچھ سر پھرے افراد بھی جمع کرلیے تھے جنہیں وہ ضرورت مندوں کو ان کے تحفظ کے لیے فراہم کرتا تھا مگر ان سب کو بھی اس نے سختی سے تاکید کر دی تھی کہ وہ قتل و غارت گری سے دور ہی رہیں۔
جگا کی رہائی کی سفارش بھی اورنگ زیب نے اس کا سابقہ ریکارڈ دیکھ کر کرنل احتشام سے کی تھی لیکن ان تمام حقیقتوں کے باوجود اسے کسی بدنام آدمی کا اس طرح اپنے دفتر آنا پسند بھی نہیں تھا۔ شرپسند عناصر اس بات کو دوسرا رنگ بھی دے سکتے تھے۔ وہ ایک لمحے تک اپنے خیالوں میں گم رہا پھر کانسٹیبل سے پوچھا۔
''اور کون ہے جہانگیر بٹ کے ساتھ......؟''
''وہ تنہا آیا ہے سر لیکن......'' کانسٹیبل نے ہچکچا کر دبی زبان میں کہا۔ ''کسی وجہ سے جھلایا ہوا لگ رہا ہے۔''
''اسے اندر بھیج دو...... اور، جب تک وہ اندر رہے کسی اور کو نہ آنے دینا۔''
سپاہی الٹے قدموں واپس لوٹ گیا، اورنگ زیب کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ایک منٹ بعد ہی جگا اس کے سامنے موجود تھا، سپاہی نے جو کہا تھا وہ بھی غلط نہیں تھا۔ جگا اس وقت کچھ الجھا الجھا سا نظر آرہا تھا۔ اورنگ زیب نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔
''کیسے زحمت کی میرے پاس آنے کی؟'' اورنگ زیب نے کھردرے لہجے میں سوال کیا۔
''میں جانتا ہوں صاحب کہ آپ کو اس وقت میرا یہاں تک آنا......''
''میرے پاس وقت کم ہے......'' اورنگ زیب نے اس کا جملہ کاٹ کر کہا۔ ''آنے کا مقصد کیا ہے؟''
جواب میں جگا نے چار عدد تصویریں نکال کر اورنگ زیب کے سامنے رکھ دیں۔ وہ تصویریں اس نے خود اتاری تھیں جس میں فرنیچر کی بربادی اور دکان کی تباہ کاری کے سارے مناظر موجود تھے۔ اورنگ زیب نے ان تصویروں کو غور سے دیکھا پھر اس کی نظریں جگا کی سمت اٹھ گئیں۔
''یہ کیا ہے؟''
''یہ جگا کی شرافت اور اس خاموشی کے منہ پر ایک بھرپور تھپڑ ہے صاحب۔'' جگا نے اسے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''میں اس وقت آپ کے پاس نہ آتا تو بعد میں آپ کو بھی مجھ سے شکایت ہی ہوتی۔''
''کس بات کی شکایت......؟''
''مجھے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینا آتا ہے صاحب لیکن......'' جگا نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کوئی قدم اٹھانے سے پیشتر آپ سے مل لینا ضروری سمجھا ہے۔''
''اگر میں تم کو بہ دستور برداشت کرنے کا مشورہ دوں تو......؟''

''تو......'' جگا نے کسمسا کر جواب دیا۔ ''میں انکار نہیں کروں گا صاحب لیکن ایسی صورت میں اس شہر میں کسی کو منہ بھی نہ دکھاؤں گا۔''
''تم نے اس حادثے کی ایف۔آئی۔آر درج کرائی؟''
''جی نہیں......'' جگا نے نظریں جھکا کر کہا۔
''کیوں......؟''
''اس لیے کہ ابھی تک قانون کی نظریں بھی اس کی تلاش میں ہیں جس کے اشارے پر یہ سب کیا گیا ہے۔ ایف آئی آر کا پیٹ بھرنے کی خاطر پھر کسی جہانگیر بٹ کو بے گناہ پکڑ لیا جائے گا۔ میں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ شاید وہ بھی زندہ رہنے کی خاطر جیل میں استادوں سے سیکھے ہوئے طریقوں کو زندہ رہنے کا ذریعہ بنالے...... یہ مجھے منظور نہیں ہے۔''
''میری طرف سے سبز جھنڈی دکھائے جانے کے بعد تم کیا کرو گے؟''
''بڑی مچھلی کے حلق میں کانٹا پھنسانے کی خاطر کچھ چھوٹی مچھلیوں کی قربانی بھی دینی پڑتی ہے۔'' جگا نے دبی زبان میں کہا۔ ''میں کچھ ایسے لوگوں پر ہاتھ صاف کروں گا جن لوگوں نے یہ کام کیا ہے...... ہوسکتا ہے میرا دوٹوک جواب ملنے کے بعد وہ بھی سامنے آجائے جس کے اشارے پر یہ سب کچھ کیا گیا ہو......''
''تم چاہو تو ان کے نام مجھے بھی بتا سکتے ہو۔''
''قانون ثبوت اور گواہیوں کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتا جناب۔ جبکہ ایسے معاملات میں غیر قانونی اقدامات زیادہ موثر کے مطابق ثابت ہوتے ہیں۔''
''تم جس کی سمت اشارہ کر رہے ہو وہ بیشتر لوگوں کے خیال اس دنیا میں نہیں ہے۔''
''سانپ کے بچے بھی سنپولیے ہوتے ہیں صاحب۔'' جگا نے بل کھا کر جواب دیا۔ ''خود کو بڑا منوانے اور اقتدار کی جنگ بھی پشت ہا پشت تک چلتی رہتی ہے۔''
اورنگ زیب نے اس بار کوئی جواب نہیں دیا، اس کی تجربے کار نظریں کچھ دیر جگا کے چہرے پر منڈلاتی رہیں پھر اس نے ریسیور اٹھا کر متعلقہ تھانے سے رابطہ کر کے کشمیر فرنیچرز پر ہونے والی واردات کی ایف۔آئی۔آر درج کرنے کو کہا۔ کچھ ضروری ہدایتیں دینے کے ساتھ ہی اس بات کی تاکید بھی کی کہ اس معاملے میں بلاوجہ دکان کے مالک کو ہراساں نہ کیا جائے، پھر اس نے ریسیور رکھ کر جگا سے کہا۔
''تم میرے حکم کے بغیر کوئی قدم فی الحال اٹھانے سے گریز ہی کرو گے۔''
''اگر آپ کا بھی یہی حکم ہے صاحب تو پھر ٹھیک ہے۔'' جگا ضبط کرتے ہوئے اٹھا، جانے کے لیے مڑا تو اورنگ زیب نے تیزی سے آواز دی۔
''ون منٹ......''
''اور کیا حکم ہے بڑے صاحب؟'' جگا نے پلٹ کر بڑی بے بسی سے پوچھا، اس کے لہجے میں شکوہ تھا۔
''میں نے تمہیں جو مشورہ دیا ہے اسے دوستانہ ہی سمجھنا، کوئی حماقت نہ کرنا۔'' اورنگ زیب کے لہجے میں اپنایت کے ساتھ ہی کوئی ایسا پیغام بھی ضرور تھا جسے سمجھ کر جگا کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ ایک لمحہ وہ خاموش کھڑا اورنگ زیب کو عقیدت بھری نظروں سے دیکھتا رہا پھر نظریں جھکا کر خاموشی سے چلا گیا۔

⁂⁂⁂

آنے والی ٹیکسی کو ملٹری انٹیلی جنس کے پھاٹک سے دس گز دور ہی روک لیا گیا۔ ایک آرمڈ گارڈ نے اندر دیکھا جہاں پچھلی نشست پر ایک جوان خاتون سر جھکائے بیٹھی تھی، ایک لمحے تک گارڈ اس حسین مہمان کو بہت غور سے نگاہوں میں ٹٹولتا رہا۔ اس کے جسم پر لباس بھی قیمتی ہی تھا لیکن لباس کے ساتھ ہی خاتون کی حالت میں اداسی اور بیزاری کی کیفیت بھی نظر آرہی تھی۔
''کہاں جانا ہے بی بی......؟'' گارڈ نے خاتون سے سوال کیا۔
''مجھے کرنل احتشام سے فوری ملنا ہے۔'' خاتون نے جو کنول کے سوا کوئی اور نہیں تھی گارڈ کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''میں کام کی نوعیت تمہیں نہیں بتا سکتی اور...... میرے پاس زیادہ وقت بھی نہیں ہے۔''
''آپ کا نام......؟''
''کنول......''
گارڈ نے کنول کی مناسبت سے اسے ایک بار پھر سر سے پاؤں تک دیکھا پھر قدرے خشک لہجے میں بولا۔
''کرنل صاحب، بغیر پیشگی اپائنٹمنٹ کے کسی سے ملاقات نہیں کرتے۔''
''وقت مت ضائع کرو......'' کنول نے اسے گھور کر کہا۔ ''میں اگر اس وقت کرنل سے ملے بغیر چلی گئی تو تمہاری ملازمت بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔''
''تم ادھر ہی ٹھہرو۔'' گارڈ نے برا سا منہ بنا کر ٹیکسی

ڈرائیور سے کہا پھر الٹے قدموں لوٹ گیا۔ لڑکی نے جس انداز میں اسے ملازمت قائم نہ رہنے کی دھمکی دی تھی وہ ایسی نہیں تھی جسے وہ نظرانداز کردیتا۔ بہت سی ایسی خفیہ اور راز کی باتیں ہوتی تھیں جو صرف آفیسران کو بتائی جاتی تھیں۔

مین گیٹ پر پہنچ کر اس نے ڈیوٹی آفیسر کو صورت حال سے آگاہ کردیا۔ ڈیوٹی آفیسر نے اوپر کی ہدایت کے مطابق فوراً ہی کرنل احتشام سے رابطہ قائم کر کے اسے آنے والی کے نام سے آگاہ کردیا پھر دوسری طرف سے جواب ملنے کے بعد وہ گارڈ سے کچھ کہنے کے بجائے خود ہی اٹھ کر گیٹ پر آگیا۔ اس کے حکم پر ہی ڈیوٹی گارڈ نے ٹیکسی ڈرائیور کو آگے آنے کا اشارہ کیا تھا ٹیکسی گیٹ پر پہنچ کر رکی۔ ڈیوٹی آفیسر کی ہدایت پر ایک گارڈ اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ دو تین منٹ بعد ٹیکسی کو ایک بیرک کے سامنے روک دیا گیا۔ ڈیوٹی گارڈ نے نیچے اتر کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے لڑکی سے بڑے مہذب انداز میں کہا۔ ”آپ سامنے والے کمرے میں چلی جائیں بی بی...... کرنل صاحب ادھر ہی ہوتے ہیں۔“

وہ ٹیکسی سے اتر کر کرنل کے کمرے میں داخل ہوگئی۔ درمیان میں کسی نے مداخلت نہیں کی۔ کمرے میں کرنل احتشام کے ساتھ ایک اور جوان بھی یونیفارم میں موجود تھا۔ کنول کرنل کا اشارہ ملنے کے بعد اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ چند لمحے تک کرنل احتشام کنول کی ظاہری کیفیت کا اندازہ لگاتا رہا پھر سنجیدگی سے بولا۔

”پولیس رپورٹ کے مطابق آپ کو دو تین روز قبل اغوا کرلیا گیا تھا؟“

”آپ کی اطلاع غلط نہیں ہے۔“ کنول نے خالی خالی نظروں سے کرنل کو دیکھ کر اداس لہجے میں کہا۔ ”مجھے کہاں لے جایا گیا تھا، میں اس کی نشان دہی بھی نہیں کرسکوں گی۔ رہائی کے وقت بھی میری آنکھوں پر بلائنڈر چڑھا کر اوپر سے ٹیپ کرایا گیا تھا۔ ایک گھنٹے پیشتر مجھے ایک مصروف سڑک کے قریب اتار دیا گیا، میری آنکھوں کی پٹی بھی کھول دی گئی۔“ وہ رکے بغیر بولتی رہی۔ ”وہاں سے ٹیکسی پکڑ کر میں ایک واقف کار نیوز رپورٹر کے پاس گئی، اسے کچھ تفصیل سے آگاہ کیا پھر اسی کے مشورے پر آپ کے پاس آگئی۔“

”کیا تم نے اغوا کرنے والوں کو پہچان لیا ہے؟“

”صرف ایک کو...... وہ بھی اس کے حلیے یا صورت سے نہیں بلکہ اس کی آواز سے۔“ کنول کے مردہ ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ ابھری، اس نے دراز پلکیں جھپکا کر اس انداز میں کرنل کو دیکھا جیسے وہ گہری نیند کی کیفیت سے دوچار ہو۔

”کون تھا وہ......؟“

”وہ......وہ...... وہی ہے کرنل، جس نے سب کی نیندیں خراب کررکھی ہیں۔“ کنول زہرخند سے بولی۔ ”اس کے ایک نہیں کئی نام ہیں...... سنگدل...... عیاش...... بدمعاش......قاتل......آکٹوپس......شیخ حامد۔“

”کیا......!“ کرنل احتشام نے حیرت سے کنول کو دیکھا۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا جب ایس پی اورنگ زیب بھی اندر داخل ہوا، کرنل نے کنول کے آنے کی خبر سنتے ہی اسے آگاہ کردیا تھا۔ کرنل کی نظروں کے تعاقب میں کنول نے بھی اورنگ زیب پر ایک نظر ڈالی پھر ہونٹ چبانے لگی، اورنگ زیب کے بیٹھ جانے کے بعد کرنل نے دوبارہ کنول کو مخاطب کیا۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ شیخ حامد ہی تھا؟“

”میں کل تک اس کی منکوحہ تھی کرنل......“ کنول نے جماہی لیتے ہوئے جواب دیا۔ ”ماں اپنی اولاد اور بیوی اپنے شوہر کو چھونے کے بعد اسے شناخت کرنے میں بھی غلطی نہیں کرتی۔“ پھر اس نے شیخ حامد کے آخری جملے بھی تفصیل سے دہرادیے۔

”تمہاری ماں کے قتل میں جو لوگ ملوث تھے کیا تم ان کی کوئی نشاندہی کرسکتی ہو؟“ اس بار اورنگ زیب نے سوال کیا۔

”وہ......سب اس کے شکاری اور پالتو کتے تھے...... جو ہمیشہ پولیس کی نظروں سے بچنے کی خاطر میک اپ میں رہنے کے عادی ہیں۔“

”ون منٹ......“ کرنل احتشام نے کسی فوری خیال کے تحت کنول کو متوجہ کیا۔ ”تم نے ابھی کہا تھا کہ کسی نیوز رپورٹر کے مشورے کے بعد ہی تم یہاں آئی ہو......؟“

”میں نے غلط نہیں کہا تھا کرنل...... ویسے بھی اس وقت میں کوئی غلط بیانی نہیں کروں گی۔“

”تم نے رپورٹر سے شیخ حامد کے بارے میں کیا کہا تھا؟“

”یہی کہ وہ ابھی مرا نہیں...... زندہ ہے۔“ کنول نے دوبارہ جماہی لی ”میں اس کو اپنا تحریری بیان بھی دے چکی ہوں۔“

”اوہ تو......“ کرنل نے تلملا کر کہا۔ ”تم نے ٹھیک نہیں کیا بی بی...... یہ خبر اگر اخباروں میں آگئی تو وہ باسٹرڈ اور زیادہ ہوشیار ہوجائے گا۔“

کنول نے کرنل کو خوابیدہ نظروں سے دیکھا۔ کوئی جواب نہیں دیا، اس کی پلکیں نیند سے بوجھل ہورہی تھیں۔ کرنل کے برابر بیٹھا ہوا جوان، جو پوری توجہ سے اسے شروع سے واچ کررہا تھا، چونکا۔ اس نے منہ قریب کر کے کرنل سے کچھ سرگوشی کی پھر اٹھ کر تقریباً ڈبل مارچ کرتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔

”کیا بات ہے کرنل؟“ اورنگ زیب نے کرنل احتشام سے اس کی وجہ جاننے کی کوشش کی۔

”تم......تم......“ کرنل نے اپنے ساتھی کے جانے کے بعد کنول کو بڑے پیار سے مخاطب کیا۔ ”تم نے اچھا نہیں کیا بی بی...... جب تم نے ہمارے پاس آنے کا ارادہ کرلیا تھا تو پھر تمہیں کوئی حماقت نہیں کرنی چاہیے تھی۔“

کرنل کا جملہ سن کر اورنگ زیب بھی چونکا، اس کی نظریں بھی کنول پر مرکوز ہوگئیں جس کی پلکیں آہستہ آہستہ بند ہورہی تھیں۔ اسی وقت لیب کوٹ میں ملبوس ایک ڈاکٹر تیز تیز قدم اٹھاتا اندر داخل ہوا، اس کے پیچھے اسٹریچر لانے والے بھی تھے، اورنگ زیب کو صورت حال سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔

ڈاکٹر نے تیزی سے قریب آکر کنول کی الٹی کلائی پر ہاتھ جما کر اس کی نبض ٹٹولی۔

”نو ڈاکٹر...... نو...... پلیز۔“ کنول نے بڑی مضمحل آواز میں کہا۔ ”اگر تم...... تت...... تم میرے ہمدرد ہو تو مجھے بچانے کی کوشش نہ کرنا...... پل...... پلی...... ایز۔“ جملے کے اختتام کے ساتھ ہی کنول نے میز پر سر ٹیک دیا، اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

”ڈاکٹر......!“ کرنل کے ساتھ ہی اورنگ زیب بھی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

”نبض بڑی مدھم رفتار میں چل رہی ہے...... پھر بھی میں پوری کوشش کرتا ہوں۔“

کنول کو اسٹریچر پر ڈال کر کمرے سے لے جایا گیا، ڈاکٹر بھی ساتھ ساتھ تھا۔ کرنل کچھ دیر خاموش کھڑا رہا پھر دوبارہ بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر خون کی سرخی کی تمازت بڑھتی جارہی تھی۔ اس نے اورنگ زیب سے کہا۔

”پلیز...... آپ اپنے ذرائع استعمال کریں۔ شیخ حامد کے زندہ ہونے کی خبر پریس میں نہیں آنی چاہیے۔“

اورنگ زیب نے جیب سے موبائل نکال کر یکے بعد دیگرے چار پانچ فون کیے لیکن اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوسکا۔

”بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی ہے کرنل...... جو وعدے کیے جارہے ہیں، میں ان پر یقین بھی نہیں کرسکتا۔“

کرنل کے چہرے پر بھی اشتعال کی کیفیت گہری ہونے لگی پھر اس نے اورنگ زیب کو تفصیل سے ان باتوں سے آگاہ کردیا جو اس کے اور کنول کے درمیان ہوچکی تھیں۔

”آئی۔ سی!“ اورنگ زیب نے کسمسا کر کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ کنول نے جو قدم اٹھایا ہے وہ سوچ سمجھ کر ہی اٹھایا ہوگا۔“

”میں سمجھا نہیں......؟“ کرنل نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

”جنگل کا قانون بھی یہی ہے......شیر جب شکار سے پیٹ بھر کر ایک طرف ہوجاتا ہے تو پھر بھیڑیے اور لکڑ بھگے بھی اپنا اپنا حق وصول کرنے سے باز نہیں آتے ہیں۔ ہڈیوں پر بچا کھچا گوشت بھی گدھ نوچ ڈالتے ہیں۔“ اورنگ زیب نے بڑے زخمی لہجے میں وضاحت کی۔ ”آکٹوپس کے طلاق دینے کے بعد اس کی غیرت کو جس طرح مجروح کیا گیا۔ اس کے بعد دو ٹکے کے مجرم بھی اپنا اپنا حق وصولنے سے باز نہ آتے۔“

”یو آر رائٹ...... لیکن اگر وہ پریس میں بیان دینے کے بجائے براہ راست ہمارے پاس آجاتی تو ہم اسے تحفظ بھی فراہم کرسکتے تھے۔ خود وہ بھی ہماری رہنمائی کرنے میں خاصی موثر ثابت ہوسکتی تھی۔“

”آئی ایگری ود یو کرنل لیکن کنول کی جگہ اگر کوئی دوسری شریف لڑکی ہوتی تو شاید وہ بھی خود اپنی نظروں میں گر جانے کے بعد زہر کھانے سے گریز نہ کرتی......“

”ہوسکتا ہے لیکن...... لٹ اس فورگٹ آل اباؤٹ اٹ۔“ کرنل نے ہونٹ چباتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ”اب ہمیں کنول کے بیان کی روشنی میں نئے سرے سے اس باسٹرڈ کو ٹریس کرنے کی خاطر بہت محتاط اور موثر کارروائی کرنی ہوگی۔ اگر وہ زندہ ہے تو اسی شہر میں کہیں نہ کہیں ضرور چھپا ہوگا...... ہمیں ہر مشکوک شخص پر نظر رکھنی ہوگی۔“

”ڈونٹ وری کرنل......“ اورنگ زیب نے جواب دیا۔ ”میں ایک لمحہ بھی اس کی طرف سے غافل نہیں رہا ہوں۔“

کرنل احتشام کوئی جواب دینا چاہتا تھا جب میڈیکل یونٹ کا ایک میل نرس دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس نے معذرت کر کے کہا۔ ”سر...... ڈاکٹر نے آپ کو سلام کہا

ہے، مریضہ بے ہوشی کی حالت میں کچھ بڑبڑا رہی ہے۔"
کرنل احتشام اور اورنگ زیب دونوں ایک ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

ڈاکٹر کا پیغام سنتے ہی اورنگ زیب اور کرنل احتشام میڈیکل وارڈ کے اس سائڈ میں گئے جہاں کنول کو رکھا گیا تھا۔ وہ بستر پر مردوں کی طرح بے سدھ پڑی تھی، سینے کے مدھم مدھم انداز میں متحرک ہونے سے ایک شبہ سا ہوتا تھا کہ ابھی جسم اور روح کا رشتہ ختم نہیں ہوا۔ کچھ سانس باقی رہ گئے ہیں جنہیں وہ پورے کر رہی تھی۔

"ڈاکٹر......" کرنل نے ڈاکٹر کے قریب جا کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"کبھی کبھی یہ بے ہوشی کی حالت میں کچھ بڑبڑانے لگتی ہے۔"

اورنگ زیب کی نظریں بہ دستور کنول کے چہرے پر مرکوز تھیں...... اس کی آنکھوں میں رہ رہ کر چنگاریاں سی چمکنے لگتی تھیں جس سے اس نفرت اور انتقام کی شدت کا احساس ہو رہا تھا جو اس کے دل میں آکٹوپس کے خلاف سر ابھار رہی تھی۔

کرنل ڈاکٹر سے بات کر رہا تھا جب اچانک کنول کے جسم میں کسی دم توڑتے پرندے کی سی پھڑپھڑاہٹ ہوئی۔ اس کے ہونٹوں سے بے ربط الفاظ نکل رہے تھے۔

"نہیں...... نہیں...... خدا کے لیے......مت کرو...... ایسا مت کرو...... آہ...... ظالم......قسائی......تم تم......تم میری ماں کے قاتل ہو......مم میں......میں تم سے......نفرت کرتی ہوں......تھوکتی ہوں...... چھ......چھوڑ دو مجھے...... خدا......کے لیے......اف......آہ......تت......تم بھی......"

بے ربط جملوں کے درمیان میں وہ اچانک ہذیانی انداز میں چیخی۔ "ماں...... ماں...... مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ مم...... میں...... میں بھی آ رہی......ہی......ہوں......آ آ......"

پھر اس کی آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ دوبارہ اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ ڈاکٹر نے اس کی نبض پر...... ہاتھ رکھ دیا۔

"ڈاکٹر......" کرنل احتشام نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔ "اسے بچانے کی کوشش کرو......"

"نبض کی رفتار تشویشناک حد تک گر رہی ہے...... میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا...... ہوپ از اونلی ٹین پرسنٹ۔"

ڈاکٹر نے کنول کو ایک اور انجکشن لگایا پھر وہ تینوں باہر آ گئے۔

"ذہن ایک بار مکمل طور پر ڈیپ سلیپ (گہری نیند) کی کیفیت سے دوچار ہو جائے تو سکون بھی ملتا ہے لیکن مریضہ کو کسی نے بہت ٹارچر کیا ہے۔"

ڈاکٹر نے بات جاری رکھی۔ "کون تھا وہ؟"

"اسے گولی مارو ڈاکٹر۔" کرنل نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ مریضہ ہر قیمت پر زندہ رہے۔"

"محاذ جنگ پر بھی ہم سب اپنی جیت کے لیے پُر امید ہوتے ہیں کرنل لیکن...... ہم فوجی ہیں...... جیت گئے تو غازی...... مر گئے تو شہید۔ مگر مریضہ فوجی نہیں ہے اور میں...... میں صرف اپنی سی کوشش کر رہا ہوں۔"

"او۔کے ڈاکٹر......" کرنل نے طویل سانس لے کر کہا پھر اورنگ زیب کے ساتھ قدم اٹھاتا دوبارہ اپنے کمرے میں آ گیا۔

"موت اور زندگی خدا کے اختیار کی بات ہے کرنل۔" اورنگ زیب نے لب کشائی کی۔ "لیکن اگر کنول مر گئی تو میں آکٹوپس کو اس کے آخری انجام تک پہنچاتے وقت بھی کسی قانونی تقاضوں کا احترام نہیں کروں گا۔"

"آئی...... ایگری ود یو......" کرنل نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ "میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ مریضہ زندہ رہے۔"

خاصی دیر تک دونوں کنول کی باتیں کرتے رہے پھر دونوں کی نظریں دروازے کی جانب اٹھ گئیں۔ آنے والا ڈاکٹر کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔

"اب کیا پوزیشن ہے ڈاکٹر......"

"میں نے مریضہ کا تنفس بحال کرنے کے لیے آکسیجن ماسک بھی لگا دیا ہے لیکن......"

"لیکن کیا......" اورنگ زیب نے بے چینی سے پوچھا۔

"امید کا گراف بڑھنے کے بجائے گرتا ہی جا رہا ہے پھر بھی میں اسے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہوں گا۔ ہمارے پروفیشن کا تقاضا بھی یہی ہے مگر اتنی خوب صورت لڑکی کے ساتھ ایسا وحشیانہ سلوک کرنے والا کون تھا؟"
ڈاکٹر نے پہلی بار سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔ "کیا وہ پکڑا گیا؟"

"نہیں......" کرنل نے جھلا کر کہا۔ "وہ...... وہی باسٹرڈ ہے جو ہمارے خیال میں ڈوب گیا تھا۔"

"اوہ......تو۔" ڈاکٹر نے حیرت کا اظہار کیا۔ "لیکن اس لڑکی سے اس کا کیا تعلق تھا؟"

"وہی...... جو جنگل میں کسی آدم خور چیتے کا معصوم ہرن سے ہوتا ہے......" کرنل نے حقارت سے جواب دیا۔

اسی وقت وارڈ بوائے نے اندر داخل ہو کر ڈاکٹر سے کچھ کہا تو وہ اٹھ کر تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

"کرنل......" اورنگ زیب نے کچھ دیر بعد اٹھتے ہوئے درخواست کی۔ "میں آپ سے مریضہ کی حالت معلوم کرتا رہوں گا۔"

"او۔کے۔" کرنل نے اٹھ کر فوجی انداز میں اورنگ زیب سے مصافحہ کیا پھر اس کے جانے کے بعد اس نے ریوالونگ چیئر پر بیٹھ کر ریسیور اٹھالیا۔ شیخ حامد کے بارے میں پھر اپنی ٹیم کے افراد کو دوبارہ ایکٹو ہونے کی ہدایتیں دینے لگا۔

دوسرے دن اخباروں نے شیخ حامد کے زندہ ہونے کی خبریں کنول کی تصویر اور اس کے تحریری حوالے کے ساتھ جلی سرخیوں سے شائع کیں تو متعلقہ حلقوں میں پھر سے بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ کاروباری لوگوں کے ایک گروپ کا سانس پھر تیز تیز چلنے لگا۔ ان میں سرفہرست رستم علی آغا خانی تھا۔

میڈم روبی نے جہاں اس خبر کو پڑھ کر منگنی کی انگوٹھی ہاتھ سے اتار کر سیف میں رکھ دی تھی۔ وہیں ڈی آئی جی بھی تلملا کر رہ گیا تھا۔ صبح صبح اورنگ زیب اور سراج کی پیشی کا مقصد بھی یہی تھا۔ اسے ایک طرف میڈم روبی کے ساتھ گھر بسانے کا خواب ٹوٹنے کا غم تھا تو دوسری جانب کچھ ذاتی خدشات بھی اس کے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔

"میرا خیال ہے کرنل احتشام نے آپ کو کنول ہی کے سلسلے میں بلایا ہوگا۔" اس نے اورنگ زیب سے پوچھا۔

"جی ہاں...... اس کی اطلاع میں آپ کو کل رات بھی مختصراً دے چکا ہوں۔"

"اب کنول کس پوزیشن میں ہے؟"

"ڈاکٹر کو اس کے بچنے کی زیادہ امید نہیں ہے۔"
اورنگ زیب نے بہ دستور سنجیدگی برقرار رکھی۔

"میرا ذاتی خیال ہے کہ کنول نے پریس کو اپنا تحریری بیان دے کر کسی دانش مندی کا ثبوت نہیں دیا۔"
ڈی آئی جی نے پہلو بدل کر کہا۔ "اس طرح ہمارا شکار اور چوکنا ہو جائے گا۔"

"اس خبر سے اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔"
اورنگ زیب نے مسکرا کر کہا۔ "وہ جس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے وہاں ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی کوئی فکر نہیں کی جاتی۔ آکٹوپس تو اس قبیلے کے ایک سردار کی حیثیت رکھتا ہے۔"

"جس سے اوپر والوں نے پھر میری نیند حرام کر رکھی ہے۔" ڈی آئی جی ہونٹ چباتے ہوئے بولا۔ "جبھی اس بار پہلے سے زیادہ محتاط رہنا ہوگا۔"

"میں پہلے بھی محتاط ہی تھا سر لیکن......"

"لیکن کیا......؟" ڈی آئی جی نے اسے وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

"میں کسی ایک کی نشاندہی نہیں کروں گا جناب لیکن بہت سے ذمے دار حیثیتوں کے مالک بھی آکٹوپس کے سلسلے میں ڈبل رول پلے کرتے رہے ہیں...... اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید......"

"جو کچھ ہو چکا اب اس کو دہرانے سے کیا فائدہ؟"
ڈی آئی جی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "اب آپ کو زیادہ محتاط رہ کر ایسی پلاننگ کرنی ہوگی کہ وہ زیادہ دیر ہاتھ پاؤں نہ چلا سکے۔"

اورنگ زیب خاموش رہا۔

"آپ کے ذہن میں کوئی نہ کوئی پلاننگ تو ضرور ہوگی۔" ڈی آئی جی نے اس بار الفاظ چباتے ہوئے اسے دیکھا۔ "خاص طور پر ایسی صورت میں کہ جب آپ نے اسے سرے سے مردہ تصور ہی نہیں کیا تھا۔"

"میں برابر اسی کے بارے میں ورک کرتا رہا ہوں...... آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔"

"اس خبر کے اخبارات میں شائع ہونے کے بعد آپ نے کچھ نہ کچھ تو سوچا ہوگا؟"

"یس سر......" اورنگ زیب نے سنبھل کر جواب دیا۔ "مجھے بساط پر اپنے کچھ مہروں کی پوزیشن تبدیل کرنی ہوگی لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی پلاننگ کو کامیاب ہونے تک زبان سے نہیں نکالوں گا۔"

"کیا مطلب......؟ کیا آپ مجھے بھی بتانا پسند نہیں کریں گے؟"

"موجودہ حالات میں ایسا کرنا ضروری ہے سر......"

"آئی۔سی......" ڈی آئی جی تلملا کر رہ گیا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی تو اس نے ایک لمحے ریسیور کو گھور کر دیکھا پھر ریسیور اٹھالیا۔

"یس......"

"میں روبی بول رہی ہوں......"

"زہے نصیب...... اس وقت کیسے فون کیا؟" ڈی آئی جی نے کشمکش کا شکار ہو کر بھی دوستانہ لہجے میں بات کی۔

"میرا خیال ہے کہ اخبارات کے ذریعے اب تک......"

"جی ہاں...... میں بھی اس وقت اپنی ٹیم کے ساتھ سر

جوڑے بیٹھا ہوں اس کے علاوہ......" ڈی آئی جی نے میڈم کے لہجے کو محسوس کرتے ہوئے وہ بات بھی خود ہی کہہ دی جو شاید میڈم کہنا چاہتی تھی۔ "مجھے آپ کی شرط یاد ہے۔"

مختصر گفتگو کے بعد اس نے دوبارہ اورنگ زیب اور سراج کو باری باری دیکھا۔

"کنول کے بارے میں آخری خبریں کیا ہیں۔ وہ ہمارے لیے خاصی کارآمد ثابت ہوسکتی ہے۔"

"ملٹری کے ڈاکٹر نے صرف دس فیصد امید دلائی ہے۔" اورنگ زیب نے کہا۔

"بہرحال......" ڈی آئی جی نے اس بار کسی ہارے ہوئے جواری کے انداز میں دونوں افسران کو مخاطب کیا۔ "میں آپ دونوں کو فری ہینڈ دیتا ہوں۔ میری جانب سے آپ کے کسی اقدام میں کوئی مداخلت نہیں ہوگی۔"

"شکریہ سر......"

ڈی آئی جی کے آفس سے فارغ ہوکر دونوں باہر نکلے تو اورنگ زیب نے سراج سے مسکرا کر پوچھا۔

"تم کس نتیجے پر پہنچے......؟"

"خوب صورت خواب ٹوٹ جائیں تو پھر آدمی مجبوراً گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔" سراج نے جواب دیا۔ "مجھے یقین تھا کہ میڈم ان خبروں کو پرکھنے کے بعد منگنی کو کوئی اہمیت نہیں دے گی۔"

"میرے بارے میں کیا کہو گے؟"

"اس وقت ڈیوٹی پر ہوں جناب۔" سراج نے شوخی سے کہا۔ "رات کو الماس کی موجودگی میں تفصیلی بات ہوگی۔"

اورنگ زیب، ڈی آئی جی کی کیفیت پر خاصا لطف اندوز ہورہا تھا جب اس کے موبائل پر سگنل ملا، اس نے نمبر دیکھ کر کال اٹینڈ کرنے میں دیر نہیں کی۔

"اب کیا صورت ہے کرنل......؟"

"ویری سیڈ نیوز فار اس (Very sad news for us)" کرنل احتشام نے اداس لہجے میں کہا۔ "ڈاکٹر کی کوششیں بھی مریضہ کے ساتھ دم توڑ گئیں۔"

"اوہ......" اورنگ زیب کے چہرے کے تاثرات یکسر بدل گئے۔ "ڈیڈ باڈی کا کیا ہوگا؟"

"ڈونٹ وری...... ہم مرنے والی کو پورے اعزاز اور احترام سے سپرد خاک کریں گے۔"

دوسری جانب سے جملے کے اختتام کے ساتھ ہی رابطہ بھی منقطع کردیا گیا۔

اورنگ زیب کے چہرے کے بدلتے تاثرات...... کرنل اور ڈیڈ باڈی کے حوالے ہی سے سراج نے سمجھ لیا تھا کہ اورنگ زیب کو کنول کے انتقال کی خبر دی گئی ہوگی۔ اس نے فوری طور پر اورنگ زیب سے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ خود بھی اس خبر کو سن کر کسی گہری سوچ میں غرق نظر آرہا تھا۔

دو چار منٹ خاموشی سے گزر گئے پھر اورنگ زیب نے موبائل پر کچھ نمبر پنچ کرکے اسے آن کردیا۔ رابطہ قائم ہونے کے بعد اس نے بڑی بے تکلفی اور اپنائیت سے گفتگو کا آغاز کیا۔

"کیسی ہو الماس...... ہاں، میں اور سراج اس وقت ڈی آئی جی سے مل کر واپس آفس جارہے ہیں...... میٹنگ میں سوائے وقت کی بربادی کے اور کیا ہوتا ہے...... ٹھیک ہے لیکن اس وقت میں نے تمہیں ایک خاص مقصد سے فون کیا ہے......" اورنگ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ "اوپر کا اسٹور روم صاف کرا کے اس میں میرے لیے ایک بیڈ ڈلوا دو...... نہیں...... گیسٹ روم مناسب نہیں رہے گا۔ اوکے۔" اورنگ زیب نے کال ختم کی تو سراج نے دبی زبان میں پوچھا۔

"کیا آپ بھی......"

"خطرہ نہیں...... صرف احتیاط سمجھ لو۔ کنول کا بیان اخبارات میں آنے کے بعد آکٹوپس سب سے پہلے میرا شکار کرنے کی کوشش کرے گا۔ تم لیاقت حسین کو بھی محتاط رہنے کی تاکید کردو...... افضل خان اور شبنم کی حفاظت کا بھی خاص خیال رکھنا۔ وہ دونوں ابھی ہمارے لیے بہت کارآمد ہیں۔"

اورنگ زیب نے جن خدشات کا اظہار کیا اس کے پیش نظر سراج بھی بے حد سنجیدگی سے حالات کی تحلیل نفسی کرنے لگا۔

ہوٹل کی پارکنگ میں گاڑی کھڑی کرکے وہ باہر آیا تو وہاں موجود ڈیوٹی دینے والے نے اسے بہت غور سے دیکھا۔

اس وقت وہ جینز کی پتلون اور ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔ ٹی شرٹ کے سامنے کے دو بٹن کھلے تھے جس سے اس کا صحت مند اور کشادہ سینہ نظر آرہا تھا، گلے میں اس نے مصنوعی سونے کی ایک موٹی چین پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں جوگرز تھے۔ اس کے چہرے کی رنگت مائل گندمی تھی۔ عمر تیس کے لپیٹے میں رہی ہوگی۔ وقت اور حالات نے اسے اس قدر مصروف کررکھا تھا کہ اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں وقت ضائع کرتا۔

گاڑی سے باہر نکل کر وہ سیدھا مین گیٹ کی جانب

بڑھا جہاں رنگ برنگے لباس میں سر پر کلف شدہ اونچی پگڑی جمائے ایک ملازم آنے جانے والوں کے لیے دروازہ کھولنے پر تعینات تھا۔ نوجوان کو دیکھ کر اس نے دروازہ کھولنے کے بجائے بڑے مہذب انداز میں کہا۔

"ہوٹل میں اس قسم کا لباس پہن کر......"

"میرے پاس مس ڈکسن کا دعوت نامہ موجود ہے۔" نوجوان نے مسکرا کر کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اس سے ملاقات کے لیے یہ لباس بھی اضافی ہی ثابت ہوگا۔"

ڈیوٹی پر مامور کارندے نے اسے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا پھر دروازہ کھول دیا۔ وہ جانتا تھا کہ مس ڈکسن ایک عالمی شہرت رکھنے والی مستقبل شناس تھی۔ اس ہوٹل میں مقیم تھی، اس کی فیس کی ادائیگی کرنا بھی معمولی لوگوں کے بس کی بات نہیں تھی۔

دروازے سے گزر کر نوجوان سامنے داہنی جانب رکھی ہوئی اس میز کی طرف بڑھا جس پر ایک ادھیڑ عمر کی عورت بیٹھی تھی، میز پر مس ڈکسن کے حوالے سے ایک بلے کارڈ دور سے نظر آرہا تھا جس نے نوجوان کی رہنمائی کے لیے کچھ آسانی بھی کردی۔

وہ میز کے قریب پہنچ کر سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"مجھے مس ڈکسن سے ملنا ہے۔"

"اوہ......" عورت کے چہرے پر کاروباری مسکراہٹ ابھری۔ "آپ کا نام؟"

"جونی......"

بوڑھی عورت نے سامنے میز پر رکھے پیڈ پر نظر ڈالی، اس نے بھی ایک بار جونی کو بہت غور سے دیکھا۔ فہرست میں جونی کا نمبر آٹھواں تھا جبکہ مس ڈکسن ایک دن میں سات آدمیوں سے زیادہ پروفیشنل ملاقات نہیں کرتی تھی، یہ بات دنیا میں اس کے تمام کلائنٹس کو معلوم تھی کہ وہ کسی قیمت پر بھی اپنا اصول نہیں توڑتی تھی۔

"تم خوش قسمت ہو نوجوان جس نے آج مس ڈکسن کے سالہا سال پرانے اصول کو توڑ دیا ہے۔" اس نے اپنی بات کی وضاحت کی تو جونی نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ اسے ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

"میرا خیال ہے کہ تمہیں ابھی دس پندرہ منٹ اور انتظار کرنا ہوگا۔" عورت نے دستی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "جو کلائنٹ اندر ہے اس کے باہر آتے ہی وہ مجھے کال کردے گی۔ اس کے بعد تمہیں لفٹ کے ذریعے آخری منزل پر جانا ہوگا جہاں مس ڈکسن نے ایک سوٹ (Suite) لے رکھا ہے، وہاں جو اٹینڈنٹ ہوگا وہ تمہاری رہنمائی کردے گا۔"

"شکریہ......" جونی نے بے پروائی سے جواب دیا پھر آنے جانے والے بھانت بھانت کے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ اس وقت بھی اس کے ذہن میں ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا۔

اصول کے مطابق مس ڈکسن سے ملنے والوں کو ایک دن پہلے اپنے نام کے اور فون نمبروں کے ساتھ بھی پسندیدہ پھول کا نام لکھ کر دینا پڑتا تھا۔ بعد میں جن لوگوں کو ملاقات کا وقت دیا جاتا تھا انہیں بذریعہ فون آگاہ کردیا جاتا تھا۔ جونی نے پسندیدہ پھول کی جگہ "گوبھی کا پھول" لکھ دیا تھا اور...... اب وہ بڑی سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ مس ڈکسن کس انداز میں اس کی پذیرائی کرے گی؟

پندرہ منٹ بعد میز پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجی، ادھیڑ عمر کی عورت نے سنبھل کر کال ریسیو کی پھر "یس میڈم!" کہہ کر اس نے ریسیور کریڈل پر رکھتے ہوئے جونی کو مخاطب کیا۔

"وش یو گڈ لک نوجوان...... تمہارا نمبر آگیا ہے۔"

جونی مسکراتا ہوا اٹھا۔ لفٹ کے ذریعے آخری منزل تک پہنچنے کے دوران وہ صرف اور صرف مس ڈکسن کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس سے ملاقات کا مقصد محض یہ تھا کہ وہ اپنے ماضی کے بارے میں وہ باتیں بھی جاننے کا خواہش مند تھا جو اس کے علم میں نہیں تھیں۔ مس ڈکسن کے بارے میں اس نے اخبارات میں یہی پڑھا تھا کہ وہ ملاقات کرنے والوں کو "گہوارے سے لے کر قبر تک" کے تمام حالات اس طرح بتا دیتی ہے جیسے وہ سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہی ہو۔

مطلوبہ سوٹ تک پہنچنے میں جونی کو کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہاں موجود ہوٹل کے اٹینڈنٹ نے ضروری معلومات کرنے کے بعد اسے ملاقات کمرے میں پہنچا دیا جہاں مس ڈکسن ایک صوفے پر موجود تھی۔ جونی نے اسے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا، اس کی عمر چالیس سے کچھ تجاوز کرتی نظر آرہی تھی۔ وہ خوب صورت خدوخال کی مالک تھی۔ اس نے جونی کو بس ایک پل کے لیے غور سے مسکرا کر دیکھا پھر سنبھل کر بولی۔ "تم وہ پہلے خوش نصیب ہو جسے میں نے آج پہلی بار آٹھواں نمبر دیا ہے۔"

"یہ بات مجھے بتائی جاچکی ہے۔" جونی نے محتاط رویہ اختیار کیا۔

''تم...... اپنے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہو......؟''

''ماضی کی وہ تمام باتیں جو سلسلے وار میرے علم میں نہیں ہیں۔''

''تم نے شاید اسی لیے مجھ سے ایک بھونڈا مذاق کیا ہے۔'' مس ڈکسن یکلخت سنجیدہ ہو گئی۔ ''گوبھی کا پھول فلاورز میں شمار نہیں کیا جاتا۔''

''میں معذرت خواہ ہوں......'' جونی نے اعتراف کرنے میں عار نہیں سمجھا۔

جواب میں مس ڈکسن نے اس کے نام کا لفافہ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''یہ فیس کی وہ رقم ہے جو تم نے مجھ سے ملاقات کی خاطر پیشگی ادا کی تھی۔''

''گویا مجھے یہاں سے مایوس جانا پڑے گا۔'' جونی لفافہ لے کر اٹھا تو مس ڈکسن نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''بیٹھ جاؤ جونی...... تم رقم کی واپسی کا غلط مطلب اخذ کر رہے ہو۔ میں ایک دن میں چونکہ صرف سات لوگوں کو وقت دیتی ہوں اس لیے فیس بھی سات افراد سے لیتی ہوں۔ تمہارا نمبر آٹھواں ہے اس لیے میں تم سے فیس کی رقم نہیں لے سکتی۔ یہ میرے اصول کے خلاف ہوگا۔''

جونی نے پہلی بار مس ڈکسن کے اصول کو دل ہی دل میں سراہا پھر دوبارہ بیٹھ گیا۔ کمرے میں پانچ منٹ تک خاموشی مسلط رہی پھر مس ڈکسن نے پہلو بدل کر دوستانہ انداز میں کہا۔

''تمہارا ماضی کھلی کتاب کی طرح میری نظروں کے سامنے ہے۔''

''کیا آپ میرے ان تمام صفحات کو پڑھ سکتی ہیں جو میں نے ابھی تک نہیں پڑھے؟''

مس ڈکسن نے جونی کے سوال پر اسے مسکراتی نظروں سے دیکھا پھر اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی مسلط ہو گئی۔ اس نے جونی کے چہرے سے نظر ہٹا کر خلا میں گھورنا شروع کیا پھر...... اس کے ہونٹ متحرک ہو گئے۔

''آج سے ٹھیک اٹھتیس سال گیارہ ماہ قبل تم نے اس دنیا میں آنکھ کھولی تھی۔ وہ تمہاری ماں کے لیے اس کی زندگی کا سب سے منحوس ترین دن تھا۔ تمہاری پیدائش کے بعد تمہارے باپ کی نگاہوں کے زاویے بھی تبدیل ہونے لگے...... وہ...... وہ ایک عیاش اور فریبی شخص تھا جس نے تمہاری ماں کو محبت کا فریب دے کر اس سے رشتہ جوڑا تھا جو تمہارے دنیا میں قدم رکھنے کے بعد کچے دھاگے کی طرح رفتہ رفتہ ٹوٹ گیا۔ شاید اس لیے کہ تمہیں جنم دینے کے بعد وہ غریب عورت وقتی طور پر تمہارے باپ کے لیے کسی کام کی نہیں رہ گئی تھی۔ اس نے دوسری عورتوں سے دل بہلانا شروع کر دیا۔ تین سال تک تمہاری ماں کی کشتی ڈگمگاتی رہی اس کے بعد تمہارا باپ تم دونوں کو چھوڑ کر کہیں غائب ہو گیا۔''

مس ڈکسن کی نظریں بہ دستور خلا میں چکرا رہی تھیں۔ جونی دھڑکتے ہوئے دل سے اسے دیکھتا رہا۔

''تمہاری ماں بڑے نامساعد حالات میں تمہاری پرورش کا بوجھ اٹھاتی رہی۔ چار سال تک گھریلو ملازمہ کی طرح کام کرتی رہی۔ کسی ایک جگہ نہیں ٹک سکی اس لیے...... اس لیے کہ وہ خوب صورت تھی۔ بہر حال، وہ خود کو ہوس پرست مردوں کے ہاتھوں سے بچاتی رہی لیکن کب تک...... جنگل میں رہنے والی ہرنی بھی کبھی نہ کبھی کسی شیر یا چیتے کی درندگی کا شکار بن جاتی ہے۔ تمہاری ماں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ جب تم دس سال کے ہوئے تو جس گھر میں وہ ملازمت کرتی تھی وہاں کے ایک مرد نے اس کی عزت طاقت کے بل پر لوٹ لی۔ وہ پاکباز اور خود دار عورت تھی۔ اس نے رسوا ہونے سے پیشتر ہی خودکشی کر لی۔ تم بے سہارا ہو گئے۔''

مس ڈکسن ایک لمحے کو خاموش ہوئی پھر اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔

''تمہاری پرورش جس ماحول میں ہوئی وہ نہایت نامناسب تھی۔ گلی کے کم حیثیت بچوں کے ساتھ کھیل کود کر تمہاری شخصیت مسخ ہوتی رہی پھر...... تمہاری ماں کی موت کے بعد کچھ لوگوں نے تم کو ایک یتیم خانے کے حوالے کر دیا۔ یتیم خانے کے مالکان بہ ظاہر خدمت خلق کے نام پر پیسے بٹور رہے تھے۔ در پردہ وہ ناجائز کاروبار میں بھی ملوث تھے۔ جب تمہاری عمران لکی (Un-Lucky) کے ہندسوں نمبر تیرہ کی تھی، اس وقت کسی نے یتیم خانے والوں کے خلاف مخبری کر دی۔ پولیس کی ریڈ کے دوران کچھ لوگ پکڑے گئے۔ کچھ فرار ہو گئے۔ اس افراتفری کے عالم میں تمہاری عمر کے کچھ لڑکوں کو بھی فرار ہونے کا موقع مل گیا۔

سر چھپانے کی خاطر تم کو بھی گھریلو ملازمت کرنی پڑی۔ ماں کی طرح تم نے بھی خود کو بچانے کی کوشش کی لیکن اس بار ایک شادی شدہ عورت نے تمہارے اندر پوشیدہ مرد کو تلاش کر لیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب تم نے ایک انوکھی لذت کا ذائقہ چکھا۔ ماں کی طرح تم نے بھی خوف سے وہ ملازمت چھوڑ دی۔ تمہاری پرورش درست خطوط پر نہیں ہوئی تھی اس لیے تم کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملا۔ ملازمت

چھوڑنے کے بعد تم آوارہ لڑکوں کی صحبت میں پڑے رہے پھر چار سال بعد، اس روز تم کو اپنی قیمت کا اندازہ ہوا جب تم نے پہلی بار بازار حسن کے گندے ماحول میں قدم رکھا۔ تم نے ایک جام گاہک کی طرح ہی اس طوائف زادی کی فیس ادا کر دی تھی۔ بعد میں اس نے تمہیں فیس واپس کرنے کے ساتھ ساتھ چار گنا زیادہ رقم بھی دی...... یہ بھی کہا تھا تم رات کے بجائے دن میں اس سے ملتے رہنا۔ ہر بار وہ تم کو اتنی ہی رقم ادا کرتی رہے گی۔ اس نے ایسا ہی کیا اور...... اس طرح تم اس کے غلام بن گئے۔''

مس ڈکسن نے خلا میں گھورتے گھورتے اپنی پلکیں بار بار جھپکائیں پھر اس نے براہ راست جونی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''میں نے اب تک تمہیں جو کچھ بتایا، اس میں کچھ غلط تو نہیں تھا؟''

''نہیں......'' جونی نے کسمسا کر اقرار کیا۔

''تمہیں یہ بھی یاد ہوگا کہ اس کے بعد تم کس طرح شیلا ورما تک پہنچے جو بیوٹی پارلر چلا رہی ہے۔'' مس ڈکسن نے معنی خیز انداز میں سوال کیا۔ ''کیا یہ بھی بتا دوں کہ تمہاری ملاقات کے بعد شیلا ورما نے اپنے شوہر سے کیوں علیحدگی اختیار کی تھی اور اب تم کس قدر شاہانہ زندگی گزار رہے ہو؟''

''میں اعتراف کرتا ہوں مس ڈکسن کہ تم نے اب تک جو کچھ کہا اس کا ایک حرف بھی غلط نہیں...... لیکن...... میں شیلا ورما کے اشارے پر جو کام انجام دے رہا ہوں وہ آج تک میری سمجھ میں نہیں آ سکا...... کیا اس کے بارے میں بھی تم مجھے کچھ بتا سکتی ہو؟''

''کیوں نہیں......'' مس ڈکسن نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔ ''تمہاری زندگی میرے سامنے کھلی کتاب کی طرح ہے۔'' اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''پہلے تمہارا نام جان محمد تھا، جس عورت نے تمہیں پہلی بار برباد کیا اس نے تمہیں جانو کا نام دیا...... بازار حسن میں تم جس طوائف زادی کے پاس گئے اس نے رخصت کرتے وقت تمہیں جونی کہہ کر مخاطب کیا تھا اور اب...... شیلا ورما نے تمہیں مکمل طور پر جونی کے روپ میں ڈھال دیا ہے۔''

''میں نام کے بارے میں نہیں بلکہ اس کام کے بارے میں معلوم کرنا پسند کروں گا جو مجھ سے لیا جا رہا ہے۔'' جونی نے پھر اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ ''مجھے آئے دن شیلا کے کہنے پر کسی خوب صورت اور کمسن لڑکی کو اس کے دیے ہوئے مختلف پتوں پر پہنچانا پڑتا ہے...... میں جانتا ہوں کہ ان لڑکیوں کو کیا خدمت کرنی پڑتی ہے لیکن وہ...... وہ کون ہے جو لڑکیوں کے عوض منہ مانگی رقم دیتا ہے؟...... ایک لڑکی کا نمبر کبھی دوسری بار نہیں آتا...... کبھی کبھی کوئی لڑکی معصوم ہونے کے باوجود شیلا کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس کر تباہ ہو جاتی ہے۔''

''آئی ایم سوری جونی...... میں غیر ضروری سوالات کا جواب دینے میں وقت برباد نہیں کرتی پھر بھی...... اتنا بتا سکتی ہوں کہ خود شیلا ورما بھی نہیں جانتی کہ وہ لڑکیاں کتنے ہاتھوں سے گزر کر کہاں پہنچائی جاتی ہیں لیکن...... ذاتی طور پر میں تم کو ایک ہی مشورہ دے سکتی ہوں۔''

''پلیز...... مس ڈکسن۔'' جونی نے عاجزی سے کہا۔

''جتنی جلدی ممکن ہو شیلا ورما کی دنیا سے نکل کر کہیں دور چلے جاؤ...... کسی ایسی جگہ جہاں تک اس کی رسائی ممکن نہ ہو۔''

''کیا یہ ممکن ہوگا......؟''

جواب میں مس ڈکسن نے دوبارہ خلا میں گھورنا شروع کیا پھر لمحوں بعد اس نے جونی کی طرف دیکھ کر پہلی بار بڑے روکھے انداز میں کہا۔

''تم اب جا سکتے ہو...... میں تمہیں زیادہ وقت نہیں دے سکتی......''

''میں اگر ضد کروں تو......؟''

''مجھے مجبوراً ہوٹل کی انتظامیہ کو کال کرنا پڑے گا جو تمہیں دھکے دے کر نکال دیں گے۔'' مس ڈکسن ہونٹ چباتے ہوئے اٹھی۔ ''ناؤ...... پلیز گٹ لاسٹ......''

جونی کے لیے اس کا نیا طرز عمل ناقابل فہم تھا لیکن اس نے وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا، مس ڈکسن کو آخری بار گھور کر دیکھا پھر تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔ پندرہ منٹ بعد وہ دوبارہ شیلا ورما کے بیوٹی پارلر کی طرف جا رہا تھا جس کے اوپر اس کی رہائش تھی۔ وہ مس ڈکسن کے آخر جملوں اور یکلخت بدلے ہوئے انداز پر غور کرنے میں اتنا منہمک تھا کہ یہ بھی نہ دیکھ سکا کہ ایک ٹیکسی ہوٹل سے نکلنے کے بعد ہی کچھ فاصلے سے اس کا تعاقب کر رہی تھی۔

***

لیاقت حسین کچھ دیر پہلے ہی راحیلہ بیگم کی طرف سے ہو کر آیا تھا، کچھ مہمان آئے ہوئے تھے اس لیے انہوں نے فرحین کو روک لیا تھا، اسے خوشی تھی کہ فرحین راحیلہ بیگم کے ساتھ گھل مل جانے کے بعد شہر کے مہذب طور طریقے بھی سیکھتی جا رہی تھی۔

گھر آ کر لیاقت حسین نے لباس تبدیل کیا پھر وہ کچھ

دیر آرام کرنے کے ارادے سے لیٹ گیا۔ دن بھر کا تھکا ماندہ تھا اس لیے اس کی آنکھ بھی لگ گئی، کچھ دیر بعد فرحین ہی نے اسے آواز دے کر جگایا تھا۔

"میرے بغیر آج تیری آنکھ کیسے لگی؟" اس نے معصوم انداز میں شکوہ کیا۔

"تیرے ہی خواب دیکھ رہا تھا۔" لیاقت حسین نے حسب دستور اسے اپنے قریب کرلیا۔

کچھ دیر تک وہ باتیں کرتی رہی۔ آنے والے مہمانؑ خواتین کے رکھ رکھاؤ اور ہنسنے بولنے کے طور طریقے بتاتی رہی۔ لیاقت حسین ہوں، ہاں کرتا رہا پھر دوبارہ اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ کتنی دیر سویا اسے یاد نہیں لیکن کوئی بات تھی جس نے اسے سوتے ہی سوتے ایک ڈراؤنے خواب سے دوچار کردیا تھا۔ ایک متحرک فلم اس کی نگاہوں کے سامنے چلنے لگی۔

اس نے دیکھا کہ بنگلے کا چوکیدار گیٹ کے ساتھ ہی اپنی رائفل سمیت فرش پر پڑا ہے، شاید وہ کچھ دیر آرام کرنے بیٹھا تھا پھر نیند کے جھونکوں نے اسے کرسی سمیت فرش پر لڑھکا دیا تھا...... اس نے چوکیدار کو ٹٹولنا مناسب نہیں سمجھا، قدم اٹھاتا آگے بڑھا تو اس کے آفس کا کمرا جسے وہ بند کر گیا تھا، اس کے دروازے کھلے نظر آرہے تھے، دروازے کے ساتھ ہی ایک انسانی ہیولا بھی دیوار سے چپکا کھڑا تھا۔ اس کی نظریں اندر کی جانب تھیں اس لیے وہ لیاقت حسین کو نہیں دیکھ سکا۔

ایک لمحے میں لیاقت حسین نے اپنی پوزیشن تبدیل کی، وہ پنجوں کے بل لپکتا ہوا کمرے کی ایک کھڑکی کے قریب پہنچ گیا جہاں دیوار کے ساتھ ہی ایک اور آدمی اوندھا پڑا تھا، لیاقت حسین نے جھک کر اسے دیکھا پھر اس کی سانسوں کی رفتار تیز ہوگئی، زمین پر کسی آدمی کی لاش پڑی تھی جس کی گردن پر خون ہی خون نظر آرہا تھا۔ پل بھر میں ساری سچویشن اس کے ذہن میں آگئی۔

وہ یقیناً ڈاکو ہی تھے جو بنگلے میں کسی نیک ارادے سے نہیں آئے ہوں گے۔ چوکیدار نے مزاحمت کی ہوگی، اس نے کسی کو گولی کا نشانہ بنایا ہوگا پھر خود بھی کوئی سنساتی ہوئی اندھی گولی اس کے وجود کو چاٹ گئی ہوگی۔ آنے والوں نے اپنے ساتھی کی لاش کو سامنے سے ہٹا دیا ہوگا لیکن...... اب وہ لیاقت حسین کے کمرے میں کیا تلاش کر رہے تھے؟...... اس کا ذہن تیزی سے کئی امکانات پر غور کر رہا تھا، ابھی وہ کوئی حتمی نتیجہ قائم نہیں کرسکا تھا۔ جب دروازے پر کھڑا ہوا ہیولا اپنے کسی دوسرے ساتھی کے قریب آکر مدھم آواز میں بولا۔

"خیال رکھنا...... کوئی بھی سامنے آئے تو ٹھکانے لگانے سے دریغ نہ کرنا۔"

"تم لوگ اندر کیا کر رہے ہو؟" دوسرے نے سرسراتے لہجے میں پوچھا۔ "اسے اٹھا کر ساتھ کیوں نہیں لے چلتے۔ موج میلا بھی ہوجائے گا اور باس کا حکم بھی سکون سے پورا کرلیں گے۔"

"نہیں...... ہمیں وہی کرنا ہے جس کا حکم دیا گیا ہے۔"

"تم بھول رہے ہو۔" پہلے نے تنک کر جواب دیا۔ "ہمارا ایک ساتھی کام آچکا ہے۔"

"اس کے بدلے میں ہم نے بھی چوکیدار کے خطرے کو ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا کردیا ہے۔"

"لیکن اندر......"

"وہ کسی زخمی شیرنی کی طرح بپھری ہوئی ہے۔" پہلے نے کہا۔

"فکر مت کرو، ہمارے ساتھی اسے قابو کرلیں گے۔"

"اور اگر اتنی دیر میں وہ ادھر آگیا جو انیکسی میں سو رہا ہے تو......؟"

"وہی سب سے ٹیڑھی کھیر ہے! باس کا خیال ہے کہ وہ انسان نہیں کوئی جن بھوت ہے جس پر کوئی حربہ اثر نہیں کرتا۔"

"ایسی صورت میں تصویروں سے کیا بنے گا؟" دوسرا بولا۔ "اگر یہی خوب صورت بلا اس کی کمزوری ہے تو اسی کو بوری میں سمیٹ لے چلو، اس کے پیچھے وہ بھی ہمارے جال میں پھنس جائے گا۔"

"میں نے بھی یہی مشورہ دیا تھا لیکن باس نے میری بات نہیں مانی۔"

متحرک فلم کے کلائمکس کے بارے میں لیاقت حسین کے سوتے ذہن نے سوچا تو وہ اس طرح ہڑبڑا کر جاگا جیسے کسی زہریلے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس نے پلٹ کر بستر پر نظر ڈالی تو فرحین وہاں نہیں تھی۔ کمرے کا دروازہ بھی کھلا نظر آرہا تھا۔ باہر ایک سایہ بھی موجود تھا، شاید وہ لیاقت حسین کی چوکیداری پر مامور تھا۔

اس پراسرار اور تحیر آمیز سلسلے کے مزید واقعات آیندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

اندھیر نگری

محمد الیاس

جیسے نیند آدھی موت اور موت مکمل نیند کا نام ہے اسی طرح آزادی درحقیقت ایک ایسی قید کا احساس ہے جس کی حدود کا تعین ہمیں خود کرنا پڑتا ہے اور جب اس تعین میں ہم سے کوئی غلطی سرزد ہوجائے تو تمام عمر اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑتا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال ان بدحال لوگوں کا بھی تھا جہاں آزادی کی کوئی حد مقرر تھی اور نہ ہی قید وبند کی صعوبتوں کا کوئی شمار تھا... لہٰذا جب رشتوں کے تقدس اور تقاضوں کو نظر انداز کردیا جائے تو انسان دھیرے دھیرے اذیتوں کی دلدل میں اترتا چلا جاتا ہے۔

مزاج کے خلاف سمجھوتوں اور ذہنی تفاوتوں کا سبق آموز ماجرا

وقت انسان کو بدل ڈالتا ہے۔ ماضی کے احمد دین نے پچیس برس قبل راولپنڈی میں سکونت اختیار کرتے ہی اخبار میں نام کی تبدیلی کا اشتہار چھپوایا کہ آئندہ اُس کو احمد دین کے بجائے آفاق احمد کے نام سے پکارا جائے۔ نام ہی نہیں رفتہ رفتہ اُس کا مزاج بھی بدلتا گیا اور اُس کی سابقہ شناخت قصۂ پارینہ بن گئی۔ اُس نے زمیندارہ کالج گجرات سے بی اے کیا تھا۔ آبائی گھر جس مضافاتی بستی میں تھا، زمانہ طالب علمی میں ہی، عفریت کی طرح پھیلتے گجرات شہر کے

نرغے میں آئی اور چند برسوں میں اپنی شناخت کھو بیٹھی۔ اُس کی بیوہ ماں نے گھر میں ہی ایک سادہ سی مشین لگا رکھی تھی جس پر بجلی کے پنکھوں میں استعمال ہونے والا پلاسٹک کا معمولی سا پرزہ بنایا کرتی۔ وقت نکال کر وہ خود بھی ماں کا ہاتھ بٹایا کرتا۔ دن رات محنت کرنے کے باوجود ماں بیٹے کا گزارہ ذرا مشکل سے ہی ہوا کرتا۔ کم و بیش سارے ہی چھوٹے بڑے لڑکے اُس وقت کے احمد دین پر حاوی تھے۔ وہ دور اُس نے سہتے ہوئے ہی گزارا۔ ماں نے اُس کا نام یقیناً عقیدت سے رکھا تھا مگر رشتہ داروں میں وہی نام مذاق بن گیا۔ اُس کو دینا یا دینو کہہ کر پکارتے۔ زچ کرنے پر آتے تو اُس کے بارے میں جوڑا ہوا کبت دُہرایا کرتے۔ ”ایک جہلم سے آگے دینہ ہے، یہ اپنی ماں کا دینہ ہے۔“

ماں کو ایک ہی دھن سوار تھی کہ بیٹے کو چودہ جماعتیں پڑھا کر دم لینا ہے۔ گھر کے کام کاج، انتھک محنت، پنجگانہ نماز، نفلی روزے اور طویل وظائف کرنے سے شریفاں بی بی بڑی تیزی سے گھلتی جا رہی تھی۔ اُس کا پختہ ایمان تھا کہ رزقِ حلال کھانے اور اللہ کی عبادت کرنے سے آخرت کے ساتھ ساتھ دنیا بھی سنور جاتی ہے۔ وہ اپنی ہر عرضی بذریعہ وظائف اللہ کے حضور پیش کرتی۔ شاید اُس نیک بخت نے نوجوانی میں گجرات شہر کے بی اے پاس افراد کو بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوتے دیکھا تھا۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ وطن آزاد ہو چکا اور زمانہ بدل گیا ہے۔ آزادی کی خوش خصال دیوی، بختاور قوموں پر مہربان ہوتی ہو گی۔ سوختہ بختوں کے آنگن میں اتر کر جون بدل لیتی ہے اور پہلی فرصت میں اپنے آشنائے دیرینہ، حرص و ہوس کے دیوتا کو مسندِ اقتدار پر بٹھاتی ہے۔ طاغوتی قوتوں کے مالک دیوتا کے لاتعداد ہاتھ ہیں جو نیک نفس ماؤں کی دعائیں آسمان تک بلند ہونے سے پہلے ہی روک لیتا ہے۔ ایسی ریاستوں کے بے نوا شہری آسیب کے سائے میں شب و روز گزارتے ہیں۔

راولپنڈی، اسلام آباد کے جڑواں شہروں میں، سابقہ احمد دین اور حال کے آفاق احمد نے خوب خوار ہو کر بہت کچھ جان لیا تھا۔ نیک طینت بیٹے اپنی سادہ لوح ماؤں کے روبرو سارا سچ نہیں بولا کرتے۔ اُن کو اپنی ماؤں سے محبت ہوتی ہے۔ آفاق احمد یہی سمجھا کرتا کہ یہ سرزمین ایسی ہی مائیں پیدا کرتی ہے جو اپنے وجود سے جنم لینے والی ننھی جان کی خاطر بھری جوانی تیاگ دیتی ہیں۔ اُس نے ایک اور ماں بھی دیکھ رکھی تھی۔ صغریٰ اپنے چھ سات سالہ بیٹے مہدی علی کے ہمراہ ان کے صحن کے کونے میں کوٹھری نما بوسیدہ کمرے میں کرائے پر رہنے لگی تھی۔ آفاق احمد نے راولپنڈی، اسلام آباد میں بڑی ادنیٰ حیثیت کی ملازمتوں سے عملی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ جن کی جیب میں سفارشی خط ہو، نہ بھاری مالیت کے کرنسی نوٹ، وہ اسی طرح در در کی ٹھوکریں کھایا کرتے ہیں۔ بدعنوانوں کے عہد میں سفارش بھی سکہ رائج الوقت کا نعم البدل ہوا کرتی ہے۔ غاصب طبقوں کے افراد کا پسندیدہ، آزمودہ بارٹر سسٹم ”میں نے تیری سفارش پر کام کر دیا، میرے اکاؤنٹ میں کریڈٹ کر لے۔ جب میرا رقعہ یا فون کال موصول ہو تو حساب برابر کر دینا۔“ جن سے کوئی فائدہ پہنچنے کی توقع نہ ہو، اُن کو سفارشی خط نہیں ملا کرتے۔

آفاق احمد ابھی اس قابل نہیں ہوا تھا کہ مناسب مکان کرائے پر لے کر ماں کو پاس لے آتا۔ یوں چوداں جماعتوں کا پول بھی کھل جاتا۔ بعض بیٹے سمجھتے ہیں کہ خوش گمان ماؤں کا دل ٹوٹنے سے عرش کا کنگرہ ٹوٹ جائے گا۔ ظلم و جبر کے استحصالی نظام میں بیشتر چھوٹے بڑے حکومتی اہل کاروں نے ابلیس کے ہاتھ پر بیعت کر رکھی ہوتی ہے۔ ہر روز لاکھوں ماؤں کے دل پیروں تلے کچل کر گزر جاتے ہیں۔ اندھیر نگری چوپٹ راج میں مقدر بھی شاید بے کسوں سے ناراض ہو جاتا ہے۔ ہمت مرداں، مددِ خدا کو ترس جاتی ہے۔ تاہم کچھ مرد، طاغوتی دیوتا کے چرن چھو کر آشیرباد حاصل کرتے ہیں۔ ریاستی قانون کو سدھا کر نکیل ڈال لیتے ہیں۔ آفاق خوب جانتا تھا کہ آبائی گھر خالی ہوتے ہی منہ زور کزنز کے قبضے میں چلا جائے گا۔ وہ آج بھی اُس کو دیکھتے ہی ”او دینو، اوئے دینیا“ کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ اپنی نئی شناخت اور نام بھی دیتا تو ٹھٹا اڑایا جاتا۔ مہینے دو مہینے بعد گھر جاتا تو یوں گویا چور اندھیرے میں دبے پاؤں آیا ہو۔ ایک آدھ دن اندر ہی گزار کر سحری کو نکل آتا۔

مہدی علی کی ماں صغریٰ بھی شریفاں بی بی کے نقشِ قدم پر چل رہی تھی۔ اندرون شہر سے اس لیے نکل آئی کہ قریبی رشتہ داروں کی اولادیں، اُس کے یتیم اکلوتے بیٹے کو مذاق کا نشانہ بنائے رکھتیں۔ صغریٰ کے مشاغل بھی شریفاں بی بی کے سے تھے۔ عبادت گزار تھی۔ بیٹے کو ذہن نشین کرا دیا کہ چوری کرنے اور جھوٹ بولنے سے برکت اٹھ جاتی ہے۔ حالانکہ گھر میں کچھ تھا ہی نہیں کہ برکت شامل ہو پاتی۔ برتنوں کی فیکٹری میں پیالوں کی چھانٹی کرتی اور نماز پڑھتی۔ بیٹے کو اچھا انسان بننے کی ہر وقت نصیحتیں کرتی۔ لینڈ لیڈی شریفاں بی بی کی روشن مثال کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھتی، جس نے نفلی روزے رکھ کر اور وظائف کر کر کے بیٹے کو چودہ جماعتیں پڑھوا دیں۔ اُس نے بھی یہی مقصدِ حیات بنا لیا۔ انیس بیس برس کی عمر میں شادی ہوئی۔ بیٹا پیدا ہونے کے دو ماہ بعد ہی خاوند ٹریفک حادثے میں مر گیا۔ بے نوا شہری کے مر جانے کے باوجود افرادوں کو اطمینانِ قلب کی وافر نعمت میسر رہتی ہے کہ جیا اللہ کی رضا تھی وہی ہوا۔ بیوہ اور اس کے بچے کا پالن ہار وہی نیلی چھت والا ہے۔ لہٰذا وہ حکمتوں والا جانے اور اُس کا کام۔ اہلِ ثروت کے محلوں پر ہُن برستا ہے اور غریب بستیوں پر بھوک اترتی ہے تو یہ اوپر والے کی منشا سے ہے۔

صغریٰ اپنی ماں اور بہن بھائیوں کے لاشے اور سب اثاثے مشرقی پنجاب میں ہی چھوڑ آئی تھی مگر بولی اور مخصوص لب و لہجہ بڑی چابکدستی سے بلوائیوں کی نظروں سے بچا لائی۔ خود کو آپاں، بیٹے کو پُت، قمیص کو جھگا اور گھومنے کو گھسوں کہتی۔ لیموں کے خشک چھلکے جیسی رنگت والی اس عورت کی چھب اور تیکھے نقش کبھی بڑے پُرکشش رہے ہوں گے۔ بیٹا بھی ماں جیسا ہی تھا۔ دین کے ماننے والوں کا معاشرہ، جوانی میں بیوگی کاٹنے والیوں کو جس کڑے امتحان سے گزارتا ہے، اس سے سرخرو ہو کر نکلنے والی ماں کا رتبہ ولیوں سے کم نہیں ہوتا۔

شریفاں بی بی اپنے بیٹے کو ”سی شن“ جج (session judge) کی کرسی پر بٹھانے کے لیے وظیفہ کرتے کرتے اتنی بے قرار ہوئی کہ اپنا جسدِ خاکی مصلے پر چھوڑ کر، دستی عرضی لیے بذاتِ خود اللہ کے حضور حاضر ہو گئی۔ مہدی علی ابھی تیسری جماعت میں تھا، اس لیے صغریٰ نے دربارِ الٰہی میں ذاتی پیشی موخر کیے رکھی۔ چوری نہیں کرنی، جھوٹ نہیں بولنا اور ہر وہ کام جس سے اللہ کے رسول ﷺ نے منع کیا ہے، نزدیک نہیں جانا۔ یہی راہنما اصول اس کم سن لڑکے کی فطرتِ ثانیہ بن گئے۔ ماں نے ذہن نشین کرا رکھا تھا کہ مجبوری بن جائے تو بندہ چیز مانگ لے، یا جن سے کچھ لیا ہو، اُن کا کوئی محنت طلب کام کر کے حساب چکا دے۔ صبر کرنے والے کو اللہ اجر ضرور دیتا ہے۔ ایک دن کا فاقہ ہو جانے سے بندہ مر نہیں جاتا۔

مہدی علی کو کوئی پیچیدہ الجھن درپیش تھی کہ پڑھائی میں لائق ہونے کے باوجود تتلا کر بولتا۔ جن الفاظ کی املا صحیح لکھتا، زبان سے ان کی ادائیگی درست نہ کر پاتا۔ تھوڑی کو کھوڑی بولتا۔ ایسی مائیں جو بے سر و سامانی کے عالم میں اپنی ذات کی نفی کر کے اولاد کے لیے جیتی اور مرتی ہیں، وہ واقعی اپنی جندڑی گھول دیتی ہیں۔ صغریٰ جندڑی کو جند بولتی۔ بچے کے ننھے دماغ میں ”ماں جند گھولی“ کے بجائے صرف ”ماں گھولی“ کے الفاظ نقش ہو کر رہ گئے۔ وہ ماں کو مخاطب بھی اسی طرح کیا کرتا۔ ”ماں گھولی، اوہ ماں گھولی۔“

اندرون شہر میں قریبی رشتہ داروں کے ہمراہ رہتے ہوئے صغریٰ کے دل پر چرکے لگتے ہی رہتے تھے۔ اس کی غیر موجودگی میں بیٹے کو کزنز کی تفریح کا سامان بننا پڑتا۔ تین منزلہ بڑے سے گھر کا ایک ہی صحن تھا۔ ماں بیٹے کے حصے میں صرف ایک کمرا آیا تھا۔ صغریٰ پاٹری فیکٹری میں پیالوں کی چھانٹی کر کے دن بھر میں دال روٹی کے پیسے کما لیا کرتی۔ گرمیوں کا موسم ماں بیٹے کے لیے زیادہ سازگار ہوا کرتا۔ ماں کہتی۔ ”پُت کا جھگا پائے تے جھگا لاہ دے۔ ایدھاں ای گھس جاؤ۔“ (بیٹا! کچھا پہن لو اور قمیص اتار دو۔ ایسے ہی گھس جائے گی) مہدی کا پیٹ بڑھا ہوا تھا۔ اس کے تایا زاد بڑے بھائی روزانہ ہی چھوٹے لڑکوں کی کشتیاں کروا دیتے۔ بھائی خادم پچیس پیسے کا سکہ سامنے رکھ کر اعلان کرتا۔ ”یہ انعامی رقم ہے، شرط نہیں۔ شرط لگانا اسلام میں حرام ہے اور انعام حلال۔ اللہ کا حکم ہے کہ مسلمان قوم طاقت ور ہو۔ ورزشیں کرے اور پہلوان بنے۔ آج کا پہلوان مہدی علی ہے۔ کون ہے مائی کا لعل..... جو اِس کے مقابلے میں آئے۔ جیتنے والے کے لیے انعام تیار ہے۔“ مہدی علی ہر روز ایک نئے عزم سے اکھاڑے میں اترتا، مگر ہار جاتا۔ سب لڑکیاں لڑکے نعرے لگانے لگتے۔ مہدی نے کبھی ہمت نہیں ہاری۔ اعلان کرنے لگتا۔ ”اوئے سنو، سب میری بات سنو۔ رات کو میں نے دال کھوڑی (تھوڑی) پی تھی۔ آج تین روٹیوں کے ساتھ دو پیالے دال پیوں گا۔ بچو جی! کل کشتی جیت کے دکھاؤں گا۔“

دن کے وقت ماں فیکٹری گئی ہوتی۔ مہدی اسکول سے واپس آ کر صبح کی پکی ہوئی روٹی، پیاز یا گڑ کے ساتھ کھایا کرتا۔ اس لڑکے کی شخصیت جس طرح سے منفرد انداز میں تشکیل پائی، وہ ایک لحاظ سے قدرت کا کرشمہ ہی تھا۔ ٹھٹا مخول اڑائے جانے پر مشتعل ہونے کے بجائے پند و نصائح کرنے لگتا۔ باقاعدہ کسی مبلغ کی طرح بہ آوازِ بلند تقریر شروع کر دیتا۔ ”میرا مذاق اڑانے سے تم سب کو گناہ ہو رہا ہے اور میرے گناہ معاف ہو رہے ہیں۔ یہ بات ماسٹر نذیر صاحب نے بتائی ہے اور میری اماں نے بھی۔ شاباش بچو! خوب میرا مذاق اڑاؤ۔ میرا فائدہ ہو رہا ہے۔“

مہدی کی چودہ پندرہ سالہ پھوپی زاد بہن سکینہ اس بھولے بھالے لڑکے کو تختۂ مشق بنا کر کچھ زیادہ ہی حظ اٹھاتی۔ اپنے ذمے پڑے کاموں میں سے کئی اس ننھے

ماموں زاد سے کروانے کے لیے کوئی بچی کچی چیز کھلا دیا کرتی۔ وہ خود ہی پیشکش کردیتا۔

"باجی! اب کوئی کام بتاؤ۔ اماں کہتی ہے، مزدوری کر کے کھانے میں کوئی خرابی نہیں۔" نیاز کھا کر بھی بخوشی کام کرنے پر آمادہ ہو جایا کرتا۔ کسی روز تائی چاچی پھوپو میں سے کوئی کھانا کھلا دیتی تو خوب سیر ہو کر کھڑا ہو جاتا اور پھولے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر کہتا۔ "اتنا اچھا کھانا کھلایا ہے، اب کوئی بڑا سا کام بتاؤ۔"

مہدی ایک اور مخمصے کا بھی شکار ہوا رہتا۔ اس کو پتا نہیں چلتا تھا کہ پیٹ بھر گیا ہے یا نہیں۔ ماں بیٹا اکثر سرِ شام ہی کھانا کھا لیا کرتے۔ اصل میں چوبیس گھنٹوں کے دوران دونوں کا یہی ایک پورا کھانا ہوا کرتا تھا۔ ماں روٹی پکا رہی ہوتی اور وہ کھائے چلا جاتا۔ ماں کہتی۔ "پیٹ بھرا یا ابھی نہیں؟" وہ بھولا سا منہ بنا کر کہتا۔ "مجھے نہیں پتا ماں گھولی! تم بتاؤ، اگر بھر گیا ہے تو کھانا چھوڑ دیتا ہوں۔" ماں کا دل نادیدہ گرفت میں آجاتا۔ روہانسی ہو کر بیٹے کو دیکھتی۔ سوچنے لگتی کہ دو چپاتیوں کے ساتھ پیالہ دال بھی سڑپ گیا ہے۔ کیا کروں؟ روک دوں یا کھانے دوں؟ کیا پتا، ابھی بھوکا ہو۔ اس خیال کے آتے ہی دل پر گھونسا پڑتا۔ بول اٹھتی۔ "تھوڑی سی اور کھالو۔" روٹی کا تیسرا حصہ توڑ کر بیٹے کے آگے رکھتی اور تھوڑی سی دال بھی پیالے میں ڈال دیتی۔ مہدی جلد ہی روٹی ختم کر لیتا اور ماں سے کہتا۔ "ماں گھولی! تھوڑی سی دال بچ گئی ہے، تھوڑی سی روٹی اور دے دو۔" اگلے مرحلے پر کہتا۔ "ماں گھولی، تھو۔ڑ۔ی سی روٹی بچ گئی ہے، تھوڑی سی دال اور دے دو۔" اس حکمتِ عملی کا حاصل یہ ہوتا کہ وہ کم و بیش ایک روٹی اور کھا جاتا۔ دال چونکہ پانی جیسا پتلا شوربا ہوا کرتی اس لیے روٹی کھانے کا انداز وہی تھا، جس طرح صبح کے ناشتے میں نوالہ منہ میں ڈال کر چائے کا گھونٹ لیا جاتا۔

صغریٰ اندر ہی اندر غم کھانے والی عورت تھی۔ چھوٹے بڑے رشتہ دار بچوں کی جانب سے مہدی کے ساتھ روا رکھی گئی زیادتیوں پر چپ چاپ آنسو بہا کر صبر کر لیا کرتی۔ مگر ایک دن ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ فیصلہ کرلیا کہ جلد سے جلد بیٹے کو لے کر یہاں سے نکل جائے۔ اُس روز حسبِ معمول عصر کے بعد فیکٹری سے واپس گھر پہنچی تو دیکھا کہ بیٹے کا پیٹ قدرے زیادہ پھولا پھولا سا ہے اور نیل پڑے ہوئے ہیں۔ دل گرفتہ ہو کر وجہ پوچھی تو خداداد ہمت اور حوصلے کا مظہر ننھا مرد، سینہ پھلا کر حسبِ عادت بلند آواز میں بولا۔ "ماں گھولی!

اسکول سے آکر میں نے باجی سکینہ سے کہا۔ تھوڑا سا گڑ دے دو یا گھنڈا (پیاز)...... روٹی کھانی ہے۔ اماں فیکٹری سے واپسی پر گھنڈے لائے گی تو تم واپس لے لینا، ابھی کوئی کام کروالو۔ باجی کہنے لگی۔ برتن اور رسوئی کا فرش دھولیا ہے۔ صحن میں جھاڑو بھی دے چکی ہوں۔ اس وقت کوئی کام نہیں۔ میں گھنڈا دے دیتی ہوں مگر یہ ہیں سب بہت بڑے بڑے۔ تم مفت میں لیتے بھی نہیں۔ ایسا کرو، اپنے پیٹ پر گن کے دس جوتے مارو۔ میرا تیرا حساب برابر ہو جائے گا۔ باجی نے پاؤں سے سلیپر اتار کر کہا کہ بے ایمانی نہ کرنا۔ اگر تم نے جوتے آہستہ مارے تو بڑا سخت گناہ ہوگا۔ گھنڈا کھانا تم پر حرام ہو جائے گا۔ اگلے جہان میرا حساب کیسے برابر کرو گے؟ وہاں گھنڈے ملیں گے ہی نہیں اور پیسے بھی نہیں ہوتے۔ میں نے کہا کہ بات ہی کوئی نہیں باجی! اماں گھولی نے بتایا ہوا ہے، بے ایمانی بالکل نہیں کرنی۔ تم دیکھتی رہنا...... میں نے سات جوتے اپنے پیٹ پر اتنے زور سے مارے کہ سب نے تالیاں بجا کر شاباش دی......" تب تک صغریٰ کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ وہ پیروں کے بل چولہے کے قریب بیٹھی تھی۔ خود کو سنبھالنا مشکل ہوا تو پیڑھی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ تب تک ہمت جواب دے چکی تھی۔ دھم سے بدن فرش پر ڈال دیا۔

مہدی پر اپنی اعلیٰ کارکردگی اور دیانت داری کا احوال بیان کرنے کی دھن بہ دستور سوار تھی۔ اپنا دایاں بازو اونچا کر کے بڑے جوش سے بولنے لگا۔ "یہ بازو تھک گیا تو میں نے بائیں ہاتھ سے تین جوتے اور مارے۔ مگر وہ بہت آہستہ لگے۔ میں سمجھ گیا کہ بے ایمانی ہو گئی ہے اور یہ بہت بری بات ہے۔ اللہ سب کچھ دیکھ لیتا ہے۔ پھر میں نے مرغے کی طرح دونوں بازو زور زور سے پھڑپھڑائے تو طاقت آگئی۔ پھر تین جوتے اور مار دیے۔ وہ بڑے ٹھیک لگے۔ کل تیرہ جوتے لگے۔ مگر اصلی والے دس ہی تھے۔ سب بہن بھائیوں نے اور زیادہ شاباش دی۔ باجی کہنے لگی۔ اب تم پر گھنڈا بالکل حلال ہے۔ جاؤ کھاؤ عیش کرو۔" بے کس ماں کی روح فنا ہو گئی اور بیٹے کو بانہوں میں بھر کر زاروقطار روئی۔

کہتے ہیں، مظلوم کی فریاد ساتویں آسمان تک پہنچتی ہے۔ حقیقت ہے یا افسانہ یا پھر ایک ایسا معما، جو شاید کبھی نہ کھل پائے۔ رقت بھرے اُن لمحات میں ساتوں آسمان، زمین اور کل کائنات کا نظام اسی طرح مربوط اور قائم و دائم رہا یا پھر ننھا مہدی علی اپنے موقف پر مضبوطی سے ڈٹا ہوا تھا۔ ماں کی گردن کے گرد بازو ڈال کر، گال چومتے ہوئے معمول کے اونچے لہجے اور اعتماد سے بولا۔ "روتی کیوں ہو ماں

گھولی! خود ہی کہتی ہو، حرام کا ایک نوالہ بھی منہ میں چلا جائے تو اللہ کو حساب دینا پڑے گا۔" ماں نے خوب رو لیا تو بیٹے کو الگ کیا۔ ایک نگاہ پھر پیٹ پر ڈالی۔ نیلی رگیں زیادہ نمایاں ہو رہی تھیں۔ ڈوبتی ہوئی آواز میں بولی۔ "پت! اچھا پائے" (بیٹا! قمیص پہن لو)۔

جن ریاستوں میں ظلم، ناانصافی اور لوٹ کھسوٹ کا نظام قائم ہوتا ہے، ان کی بیشتر مائیں بھکارنیں یا کسبیاں بن جاتی ہیں اور مرد کم و بیش سارے ہی بے غیرت۔ بھکارن اپنی بھیک اور کسبی اپنی خرچی میں سے جو روٹی بچوں کے لیے خرید کر گھر لاتی ہے، اس پر ریاست پیشگی ٹیکس وصول کر چکی ہوتی ہے۔ اس ٹیکس پر حکومتی اہل کاروں کے علاوہ حاکمِ وقت عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ عالی شان محلات، ریشم و کمخواب، ہیرے جواہرات، اعلیٰ ترین پھل میوے ماکولات و مشروبات، شراب اور عورتیں۔ جو مائیں جوانی میں بیوہ ہو کر ذلت آمیز کسمپرسی میں آلائشوں سے دامن بچا کر نکل جاتی ہیں، ان کی داد استحصالی معاشروں میں نہیں ملا کرتی۔

ماں کی دائمی جدائی کے بعد آفاق احمد نے بڑی رازداری سے مکان بیچ کر اسلام آباد کے مضافات میں پانچ مرلے کا پلاٹ خرید لیا اور اس پر تعمیر شروع کر دی۔ دوبارہ کبھی بھول کر بھی گجرات نہیں گیا۔ مہدی علی کی باتیں یاد تھیں۔ اُس کو اپنے کمرے کی کھڑکی سے صحن میں کئی بار دیکھا تھا۔ مہدی نے بھی شاید اس کو سرسری سا دیکھا ہو۔ اولاد کو حلال کا رزق کھلانے والی مائیں مر کر اپنے پیچھے درد بھری یادیں چھوڑ جاتی ہیں۔ آفاق احمد کو ماں بہت یاد آیا کرتی اور اس موقع پر صغریٰ کا چہرہ بھی نظروں کے سامنے آجاتا۔ کبھی کبھی دل میں خواہش پیدا ہوتی کہ ان ماں بیٹا کے بارے میں پتا لگائے۔ لیکن وہ رشتہ داروں میں اپنا سراغ نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس پر چھائی ازلی اداسی اور سنجیدگی ہر طلوع ہونے والے دن میں مزید گمبھیر ہوتی جاتی۔ وہ اب حکمرانوں کے شہر کا مستقل شہری تھا۔ آفاق کے پاس رہنے کو شاندار پُرآسائش گھر اور مقبولِ عام میک کی گاڑی زیرِ استعمال تھی۔ پھر بھی دن بھر لبوں پر مسکراہٹ نہ آتی۔ مگر بیٹی کے یونیورسٹی سے لوٹنے پر دل سے حقیقی خوشی پھوٹ کر لبوں پر آجاتی۔ دونوں باتیں کرتے، خوب ہنستے، گویا یہی اس کی زندگی کا حاصل ہو۔ سلجھی ہوئی، پرکشش اور نفیس طبع ایم اے کی طالبہ۔ باپ بیٹی اکٹھے گھومنے نکلتے، تفریحی مقامات اور ریسٹورنٹ میں نظر آیا کرتے۔ کبھی کبھی لمبی ڈرائیو پر نکل جاتے۔ دونوں کے مابین بے تکلفی تھی، مگر ہمیشہ ایک چلمن بھی

حائل رہی۔ باپ بیٹی کے باہمی تقدس کی اوٹ۔ دل میں خواہش بیدار ہوتی کہ بیٹی کو زندگی کا اچھا ساتھی ملے، مخلص اور وفادار جس کی نظر اس کی دولت پر نہ ہو محض شخصی خوبیاں مدِنظر ہوں۔ سوچنے لگتا کہ بیٹی کے لیے ایسا گوہرِ نایاب کہاں سے ڈھونڈ لائے۔ باتوں باتوں میں پوچھ بھی لیا کہ شاید کوئی یونیورسٹی فیلو دل کو بھایا ہو۔ سمن جھینپ کر مسکرا دی اور بولی۔
”نہیں ابو! اتنے چھچھورے، اوچھے، شوخے اور بونگے لڑکے، کوئی سنجیدہ دکھائی دیا بھی تو سوڈو انٹلیکچوئل ...... جھوٹا اور مکار۔ فیض احمد فیض کے اسٹائل میں اسموکنگ کرنے اور شعر پڑھنے یا چی گویرا کا سا حلیہ بنا لینے سے بندہ انقلابی نہیں ہو جاتا۔ میرا کوئی ایسا خاص آئیڈیل بھی نہیں۔ بھلے عام سا ہو، سادہ قبول صورت مگر ظاہر و باطن میں ایک جیسا۔“ ذرا سا توقف کر کے مسکرائی اور مزید کہا۔ ”آپ جیسا۔“ باپ نے بیٹی کے سر پر بوسہ دیا۔ آنکھیں نم ہو گئیں۔ کہنے لگا۔
”بیٹا! مجھے کبھی آئیڈیلائز نہ کرنا۔ بہت معمولی انسان ہوں۔ مجھے صرف زندگی میں ماں نے پسند کیا تھا۔ تم میری روح کا حصہ ہو۔ اپنی نگاہ بلند رکھو۔“

آفاق احمد نے سب سے پہلا پلاٹ بیگم طاہرہ خان سے خریدا تھا۔ پانچ مرلہ رقبے پر سادہ مگر پائیدار دو منزلہ گھر تعمیر کے آخری مراحل میں تھا کہ تقریباً تین لاکھ روپے منافع پر کھڑے کھڑے بک گیا۔ وقت ضائع کیے بغیر، اسی خاتون سے دس مرلہ کا ایک اور پلاٹ خرید کر تعمیراتی کام کا آغاز کر دیا۔ راولپنڈی کی مقامی عورت طاہرہ خان سے دوسرا پلاٹ خریدتے ہوئے کاروباری تعلقات میں تھوڑی سی بے تکلفی راہ پا گئی۔ اسلام آباد راولپنڈی میں درجنوں رہائشی و کمرشل پلاٹوں کے علاوہ مضافات میں ایکڑوں زمین کی مالک مالدار خاتون اپنے نجی اور کاروباری معاملات میں خودمختار تھی۔ آفاق احمد سے عمر میں آٹھ دس برس بڑی ہو گی۔ پہلے مرحلے پر آفاق کو بھائی بنایا مگر سنجیدہ اور سادہ مزاج بھائی پر بہت جلد منہ بولی بہن کے اصل عزائم کھل گئے۔ تب بھی اخلاص کا دامن نہیں چھوڑا اور نکاح کر لیا۔ سمن کی صورت میں قدرت کی طرف سے اولاد کا تحفہ بھی مل گیا۔ تاہم زچگی کے موقع پر پیچیدہ آپریشن ہوا جس کے نتیجے میں آئندہ اس نعمت کی توقع نہ رہی۔ آفاق کا ذاتی کاروبار خوب چمکا اور بہ دستور وسعت پذیر تھا۔ جلد ہی انکشاف ہو گیا کہ بیگم صاحبہ اس کے عقد میں آنے سے قبل دو بار خلع لے چکی تھیں۔ اب بھی گوناگوں دلچسپیوں کا محور ایک ہی تھا۔ جائداد کی دیکھ بھال اور بھاگ دوڑ کے لیے کوئی نوجوان، بہ طور منیجر رکھ لیتی اور جب جی میں آتا، فارغ کر دیتی۔

عورت ذات کے بارے میں آفاق کا بلند تصور مجروح ہوا مگر تہیہ کر لیا کہ وہ کسی بھی صورت میں ہارے نہیں۔ خود کو یاد دلایا کرتا کہ اس نے عورت ذات شریفاں بی بی کے روپ میں دیکھ رکھا ہے۔ اور ایک معزز بھی تھی۔ اللہ کرے وہ اور اس کا بیٹا، دونوں حیات ہوں۔ بیٹی سے بے پناہ محبت تھی۔ سینے پر صبر کی بھاری سِل رکھ اور دل سے فیصلہ کر لیا کہ عزیز از جان معصوم رُوح کو ٹوٹے ہوئے گھر کے اذیت ناک تجربے سے کبھی نہیں گزارے گا۔ اولاد کی محبت میں بھری جوانی قربان کرتے ہوئے ماں کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آتی تو باپ اتنا بودا کیوں ثابت ہو؟ آبائی گھر کے صحن میں صغریٰ اس کی مرحومہ ماں سے باتیں کرتی ہوئی سنائی دینے لگتی۔ ”بازو ایک بار دیکھا یا دس بار، میں اب شادی کبھی نہ کروں گی۔“ ...... ماں گھولی! تھوڑی روٹی بچ گئی ہے، تھوڑی دال دے دے ...... پیٹ پر پڑے نیل اور ابھری رگیں دیکھ کر ماں نے بیٹے سے کہا تھا۔ ”پُت! اچھا پائے“ صغریٰ اپنے سارے درد شریفاں کے سامنے کھول دیا کرتی۔ دونوں عورتوں کی باتیں ہی ختم نہ ہوتیں۔ اپنے بیٹے کی خاطر گھر کے وارثتی حقوق سے دست بردار ہو گئی۔ وہ قریبی رشتہ داروں کی اصل سازش سمجھ گئی تھی۔ ایک دن یہ پوچھنے پر کہ مہدی کو کتنی بھوک لگتی ہے، کہنے لگی۔ ”کیا بتاؤں خالہ جی! اس لڑکے کی ساری باتیں ہی نرالی ہیں۔ جب بھی پوچھوں، پُت! روٹی کب کھاؤ گے؟ ہمیشہ ایک ہی جواب دیتا ہے۔ ماں گھولی! ابھی دے دو، شام کو دے دو، جب دو گی، کھا لوں گا۔ میں کہوں، اگر آج نہ ہوئی تو؟ کہتا ہے۔ پھر کل کھا لوں گا۔ میں پوچھتی ہوں، کتنی بھوک ہے؟ گردن ٹیڑھی کر کے جواب دیتا ہے، پتا نہیں ماں گھولی! تھوڑی ہوئی تھوڑی کھا لوں گا۔ زیادہ ہوئی زیادہ کھا لوں گا...... کبھی کسی چیز کی ضد نہیں کی۔ جو کہوں فوراً مان جاتا ہے۔“

طاہرہ خان کسی پیچیدہ نفسیاتی مرض کا شکار تھی۔ کبھی کبھی خوداحتسابی کا دورہ بھی پڑتا۔ اپنے آپ کو خوب کوستی، معافیاں مانگتی اور آفاق سے لپٹ کر آٹھ آٹھ آنسو روتی۔ چہرے پر بوسے دیتی اور ہاتھ چومتی۔ وہ بانہوں میں لے کر سینے سے لگا لیتا اور تسلیاں دیتا۔ مگر رات گئی اور بات گئی۔ موقع برابر آتے ہی آنکھیں ماتھے پر رکھ لیتی۔ وہی نخوت عود کر آتی۔ بڑی ڈھٹائی سے خم ٹھونک کر کہتی۔ ”کر جو کرنا ہے۔“

بیٹی اسکول جانے لگی تو میاں بیوی میں طویل مکالمہ ہوا۔ آخرکار وہ زچ ہو کر بولی۔ ”مجھے طلاق لینے کا شوق بھی نہیں۔ لیکن تم میرے معاملات میں دخل نہیں دو گے۔ مجھے خوشی ہے کہ تمہیں بیٹی سے محبت ہے اور اس کے مستقبل کی فکر رکھتے ہو۔ میرا بھی سمن کے سوا کوئی نہیں۔ میں خود چاہتی ہوں کہ تمہارے اور میرے ٹوٹے ہوئے تعلق کی حقیقت کسی پر نہ کھلے۔ تمہاری تجویز ٹھیک ہے۔ تم باپ بیٹی اوپر والے پورشن میں شفٹ ہو جاؤ۔ کاروبار پہلے ہی ہم دونوں کا اپنا اپنا ہے۔ گھر صرف مشترکہ ہے۔ سمن کے سوا اس کا کوئی اور وارث بھی نہیں۔ اسٹیئر کیس اور لاؤنج کی پارٹیشن جس طرح تم نے سوچ رکھی ہے، بے شک کرا لو۔ لیکن ہلکی پھلکی اور نفیس ہونی چاہیے۔ لکڑی اور گراؤنڈ گلاس وغیرہ لگواؤ۔ میں تمہیں دیکھوں نہ تم آتے جاتے مجھے دیکھ پاؤ۔ باقی گھر کا نظام اسی طرح چلتا رہے گا۔ صفائی ستھرائی اور دوسرے کام کرنے والی عورتیں دوپہر تک فارغ ہو کر چلی جایا کریں گی۔ گھر میں ملازموں کی ہر وقت موجودگی مجھے بری لگتی ہے۔ تم باپ بیٹی کی غیرموجودگی میں اوپر سارے کام ہو جایا کریں گے۔“

چودہ پندرہ برس اسی طرح بیت گئے۔ بہت سوچ بچار کے بعد آفاق نے بیٹی سے کہا کہ امتحانات نزدیک ہیں، بہتر ہو گا کہ وہ دو تین ماہ کے لیے یونیورسٹی ہوسٹل میں شفٹ ہو جائے۔ سمن نے لحہ بھر باپ کی آنکھوں میں دیکھا، مگر سوال کرنے سے کترا گئی۔ مبادا مناسب جواب دینے میں شفیق باپ کو مشکل پڑے۔ بیٹی کے بولنے سے پہلے ہی وہ دوبارہ بول پڑا۔ ”میں روزانہ شام کو آ جایا کروں گا اپنی بیٹی سے ملنے ...... کھانا ہر روز باہر کھایا کریں گے۔ کبھی فائیو اسٹار اور کبھی فوڈ اسٹریٹ۔“ سمن مسکرا کر رہ گئی۔ وہ سب سمجھتی تھی مگر باپ پر یہی ظاہر کرتی، گویا کچھ نہیں جانتی۔ باپ کی تقلید کرتے ہوئے دل میں اترتی اداسی پر بھاری سِل رکھ دی۔ کہنے لگی۔
”ٹھیک ہے ابو۔ میں ہوسٹل چلی جاتی ہوں۔ لیکن آپ ہر روز کیوں آئیں گے؟ ...... کام کا حرج ہو گا۔“
باپ کے چہرے سے طمانیت جھلکنے لگی۔ پیار سے پچکار کر بولا۔ ”وہ اس لیے کہ ابا اپنی بیٹی کی جدائی سے اداس ہو جایا کرے گا۔ اور حرج کیا ہونا ہے؟ چاروں پانچوں کام بڑے اسموتھ چل رہے ہیں۔ دن کے وقت ایک چکر ہی لگانا ہوتا ہے۔ شام کو حسبِ معمول میری بھی آؤٹنگ ہو جایا کرے گی۔“ ذرا سوچ کر مسکرایا اور بولا۔ ”باپ بیٹی کو عادت بھی ہو گئی ہے ناں شام کو آوارہ گردی کرنے کی۔“

دونوں یک بارگی ہنس پڑے۔ اولاد سے روح کا رشتہ جڑا ہو تو دوطرفہ نازک احساسات اور ضروری پیغامات لاسلکی واسطے سے ہی ایک دوسرے کو منتقل ہو جاتے ہیں۔

بُرے سے بُرے عہد میں بھی، خوش گمان ماؤں میں سے اِکا دُکا کی دعا، بدی کے دیوتا کو جُل دے کر آسمان تک بلند ہو ہی جاتی ہے۔ آفاق احمد، سیشن جج نہ بن سکا مگر کل جگ میں گنا ہوں یا جانوں کا بیوپار جتنا مال کھینچا جا سکتا ہے، کم و بیش اتنا ہی وہ ہر نوتعمیر شدہ مکان کی فروخت پر بہ آسانی کما لیا کرتا۔ آمدن کے مقابلے میں اخراجات نہ ہونے کے برابر تھے۔ گزشتہ بیس بائیس برسوں سے گھر کے معمولات تقریباً لگے بندھے تھے۔ وہ بہت صبح اٹھ کر اپنا ناشتا خود تیار کیا کرتا اور مستریوں مزدوروں کے آنے سے پہلے کسی نہ کسی تعمیراتی کام پر پہنچ جاتا۔ جہاں جہاں کام ہو رہے ہوتے، دن بھر گھوم پھر کے باری باری سب کی نگرانی کیا کرتا۔ دن کو ہلکا پھلکا کھانا باہر ہی کھا لیتا۔ پچھلے پہر گھر لوٹ کر سردیوں گرمیوں میں آدھے پونے گھنٹے کی نیند ضرور پوری کیا کرتا۔ شام کو باپ بیٹی تیار ہو کر باہر گھومنے کو نکل جایا کرتے۔ اب بھی وہی معمول رہا۔ فرق صرف اتنا پڑا کہ شام کو ہوسٹل چلا جاتا اور باپ بیٹی دو اڑھائی گھنٹے ایک ساتھ گزار لیا کرتے۔

جڑواں شہروں میں سردیاں ظلم ڈھاتی ہیں۔ بارش ہونے لگے تو برفیلا پانی برستا ہے۔ بیٹی کو ہوسٹل چھوڑ کر آفاق واپس ہونے لگا تو ہلکی بارش برسنے لگی۔ جس طرح کی گھٹا چھائی ہوئی تھی، امکان تھا کہ موسلا دھار برسے گی۔ سوچنے لگا، سیدھا گھر جاؤں اور ناشتے کے لیے ڈبل روٹی ساتھ والی مارکیٹ سے لے لوں۔ مگر دل نہیں مانا۔ پسند کی ڈبل روٹی مرکز سے ہی دستیاب تھی۔ لہٰذا ایک آدھ میل کے چکر کو خاطر میں لائے بغیر گاڑی موڑ لی۔ اس اثنا میں بارش بھی کھل کر ہونے لگی۔

بیکری سے ڈبل روٹی کے ساتھ کچھ اور اشیائے خورد و نوش لے کر باہر آیا تو آسمان سے پانی آبشار کے مانند گرنے لگا۔ برآمدے میں چلتا ہوا پارکنگ کے نزدیک آ گیا۔ سامنے کھڑے نوجوان پر نظر پڑی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں میں شاپنگ بیگ لٹکا رکھے تھے، جن سے تازہ پکے ہوئے گوشت اور دیگر لوازمات کی تیز مہک اٹھ رہی تھی۔ سر پر تنی چھتری کو سنبھالنے میں وہ دقت محسوس کر رہا تھا۔ بارش کی تیز بوچھاڑ آئی تو دونوں پیچھے ہٹ گئے۔ اسی نوجوان نے گزشتہ دو ماہ سے انیکسی آباد کر رکھی تھی۔ اس کے جوگرز اور جینز گھٹنوں تک بھیگ رہی تھی۔ وہ متلاشی نگاہوں سے پارکنگ کی طرف دیکھ

رہا تھا، گویا گھر جانے کی جلدی ہو۔ گھر میں جب بھی دونوں کا سامنا ہوا تو آفاق نے نظر انداز کرنے کی کوشش کی مگر نوجوان نے ہر مرتبہ سلام دعا کرنے میں بڑی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ اس دراز قد، خوش شکل نوجوان کے پاٹ دار آواز میں بولنے کے مخصوص انداز اور لب و لہجے سے آفاق کو دماغ میں ہر مرتبہ اتھل پتھل سی ہوتی محسوس ہوئی۔ مگر کچھ سمجھ نہ پایا۔ آفاق نے اس کو اپنی جانب متوجہ کر کے کہا کہ وہ اتنی دور سودا لینے پیدل کیوں آیا ہے۔ اُس نے جھٹ گردن گھمائی اور آفاق پر نظر پڑتے ہی چونک گیا۔ قدرے بلند آواز میں بولا۔ ''السلام علیکم۔ سر آپ......!'' اُس کی پُرتپاک لاؤڈ آواز سن کر آفاق کا ذہن الجھنے لگا۔ وہ اسی گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''سر! کھانا بنوایا ہے اور انڈے ڈبل روٹی لی ہے۔'' چہرے کا رُخ ریسٹورنٹ کی طرف کرتے ہوئے دوبارہ بولنے لگا۔ ''یہاں سے بون لیس ہانڈی بنوائی ہے...... اور ڈبل روٹی بھی اس سامنے والی بیکری سے لینی تھی۔''

آفاق نے کوئی جواب نہیں دیا مگر وہ بولتا گیا۔ ''ٹیکسی نہیں ملی، اس لیے پیدل چل پڑا۔'' ...... ذرا سا ہنسا اور بات وہاں سے پھر شروع کر دی، جہاں چھوڑی تھی۔ ''آدھا فاصلہ طے ہو گیا تو تین ٹیکسی والوں نے باری باری ہارن دے کے مجھے متوجہ کیا۔ لیکن میں نے سوچا، اب آدھے پونے کلومیٹر کے لیے کیوں ٹیکسی لوں...... سر! مجھے پیدل چلنے کی ویسے بھی بہت عادت ہے۔ دن بھر میں بیس تیس کلومیٹر پیدل چلنا میرے لیے کوئی مشکل نہیں۔ ویسے امی جان مجھے گاڑی چلانا سکھا رہی ہیں۔ انہی نے گاڑی نکالنے کو کہا لیکن میں خود ہی نہیں لایا۔ ابھی پوری مہارت حاصل نہیں ہوئی، اس لیے......''

آفاق کو یوں لگا، جیسے آسمان پر چمکنے والی بجلی کا کوندا اس کے بدن سے چھو گیا ہو۔ وہ مسلسل بولے جا رہا تھا، مگر اس نے ٹوک دیا۔ ''کون امی جان؟''

وہ جھٹ بولا۔ ''سر! یہی جی...... میڈم طاہرہ خان۔ بڑی رحم دل خاتون ہیں۔ اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اڑھائی ماہ پہلے میری نظر چھوٹے سے ایڈ پر پڑ گئی۔ لکھا تھا۔ ینگ اسمارٹ منیجر کی ضرورت ہے جو جائداد کی دیکھ بھال کر سکے۔ تجربہ ضروری نہیں۔ امیدوار کا گریجویٹ ہونا کافی ہے۔ ڈرتے ڈرتے آ گیا۔ مرحومہ ماں کی دعائیں قبول ہوئی ہیں۔''

سیدھے سادے نوجوان کی بے لاگ سی باتیں سن کر آفاق احمد کے دماغ میں پھر وہی کھد بد ہونے لگی۔ اس کا نام پوچھا تو جواب ملا۔ ''سر مہدی علی نام ہے میرا۔'' اب کی بار بجلی کا کوندا آفاق احمد کے بدن سے چابک کے مانند لپٹ گیا۔ جسم گویا شل ہو رہا ہو۔ یہ نام وہ کبھی نہ بھول سکا۔ پہلی بار سنا تو حیرت ہوئی تھی۔ ماسوائے کسی شاعر، راجا مہدی علی خان کے، یہ نام کبھی سنا ہی نہ تھا۔ صرف مہدی یا علی ہوتا تو تعجب کی بات نہ تھی۔ آج تک دوبارہ کوئی ایسا شخص نہ ملا جس کا نام مہدی علی ہو۔ صغریٰ مرحومہ ہو چکی۔ عجیب سا اطمینان قلب محسوس ہونے لگا۔ شریفاں بی بی کو ہم نشین مل گئی۔ ہم خیال و ہم نفس۔ ذہنی ہم آہنگی عمروں کے فاصلے پاٹ دیتی ہے۔ اللہ نے یہ فرمان اپنے کن بندوں کے لیے جاری کیا ہے؟ ''اے اطمینان والی روح، تُو اپنے ربّ کی طرف لوٹ چل۔ اس طرح کہ تُو اس سے راضی، وہ تجھ سے خوش۔ پس، میرے خاص بندوں میں داخل ہو جا اور میری جنت میں چلی جا'' ...... پاک روحیں وہی ہوتی ہیں جو بھلائی کے راستے پر چلی ہوں۔ اس استقامت کے ساتھ کہ کہیں پاؤں نہ رپٹے۔ آفاق احمد نے بلا جھجک مہدی علی کے پیٹ پر نگاہ ڈالی۔ وہ ریڑھ کی ہڈی سے لگا ہوا محسوس ہوا۔ دن میں بیس تیس کلومیٹر پیدل چلنے والے نوجوان کا جسم ایسا ہی ہونا چاہیے۔ نوکِ زبان پر آنے کو یہ الفاظ لپکے۔ ''پت! اچھا پائے۔''

دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے تو آفاق نے کہا۔ ''گھر کے ساتھ والی مارکیٹ میں جو ہوٹل ہے، بون لیس ہانڈی وہاں بھی بن جاتی۔ اور ساتھ ہی بیکری بھی تھی۔''

مہدی کہنے لگا۔ ''سر! امی جان نے منع کر رکھا ہے۔ مارکیٹ اب میں جاتا ہی نہیں۔ بیکری والا راجا بڑا عجیب بندہ ہے۔ شروع میں اس سے ایک دن انڈے لیے۔ سب پر بیٹ لگی ہوئی تھی۔ میں نے اتنا ہی کہا کہ آپ نے جس ہاتھ سے انڈے اٹھائے ہیں اسی سے باقی سودا نکال رہے ہیں۔ کہنے لگا ہر بار نیا ہاتھ کہاں سے لاؤں؟ ...... اور ہر مرتبہ دھونے بیٹھ جاؤں تو چھ مہینوں میں میرے ہاتھوں کی چھٹی ہو جائے گی۔ میں نے مزید بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا مگر اُس کو چین نہیں آیا اور پھر بول پڑا۔ ''آپ فکر نہ کریں صاحب بہادر! آج فارم والوں سے کہہ دوں گا کہ مرغیوں کو ہر روز استنجا کروایا کریں۔ ان کے انڈا دینے سے پہلے پہلے، تاکہ صاف ستھرے انڈے دیں۔ بس، آپ ایک وعدہ کریں کہ سودا مجھ سے لیا کریں گے۔'' آفاق کی ہنسی چھوٹ گئی۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے ہیٹر، ڈی فوگر، وائپر اور لائٹس آن کیں۔ اگلی پچھلی اسکرین صاف ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ مہدی کے بچپن کی باتیں ہجوم کیے ہوئے تھیں۔ اس کی آزمائش کرنے کا خیال آیا تو بول پڑا۔

''تم نے ناحق مشقت اٹھائی۔ پیدل چلے اور بھیگ

بھی گئے۔ اتنی تیز بارش اور جھکڑوں میں چھتری اُلٹی مصیبت گلے پڑ جاتی ہے۔ چپ کر کے سودا مارکیٹ سے لے لیا ہوتا۔ تمہاری میڈم کو کیا پتا چلنا تھا۔''

مہدی کے بدن میں تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہونے کے آثار نظر آئے۔ اُس نے بے چینی سے بدن کو لایعنی سی حرکت دی اور معمول سے بلند آواز میں بولا۔ ''نہیں سر! امی جان کو پتا چلے نہ چلے، میں جھوٹ بول کر اپنا اندر میلا کیوں کر لوں؟ ایک ڈیڑھ کلو میٹر کوئی فاصلہ نہیں۔ بھیگنے سے مجھے کچھ نہیں ہوتا۔ بڑا سخت جان ہوں۔ گھر جا کے کپڑے بدل لوں گا۔ غلط کام کرنے سے بندے کی نیند ہی اڑ جاتی ہے۔''

آفاق احمد کے لبوں پر مسکراہٹ کھل گئی۔ دل میں اطمینان اترنے لگا۔ گاڑی پارکنگ سے نکال کر گھر کا رخ کرتے ہوئے مہدی سے پوچھا کہ اس کی تعلیم کہاں تک ہوئی ہے۔ وہ کہنے لگا۔ ''میں نے ایم اے ہسٹری کا داخلہ بھیجا ہوا ہے۔ اچھی تیاری ہو رہی ہے۔ ایف اے اور بی اے کا امتحان بھی پرائیویٹ امیدوار کے طور پر پاس کیا تھا۔ اللہ امی جان کو جزا دے۔ بہت حوصلہ افزائی کر رہی ہیں۔ رات کو بارہ ایک بجے تک بڑے سکون سے اسٹڈی کرتا ہوں۔ صبح نو دس بجے کے درمیان امی جان اٹھ جاتی ہیں تو ناشتا بناتا ہوں۔ پھر ہم باہر کام کاج پر نکل جاتے ہیں۔ جہاں رش ہو، وہاں گاڑی خود چلاتی ہیں۔ سڑک کھلی ملے تو مجھے موقع دیتی ہیں۔ میں شلوار قمیص میں آیا تھا۔ نیچے لنڈے کی گرم بنیان پہن رکھی تھی اور پیروں میں ربڑ کے سلیپر تھے۔ چار بہترین گرم لباس دلوائے اور تنخواہ بھی پوری دس ہزار۔ کئی بار گزارش کی ہے کہ مجھ سے کوئی بڑا کام لیا کریں۔ اس طرح روزی حلال نہیں ہوتی۔'' مہدی بولے جا رہا تھا۔ آفاق کا سر چکرانے لگا۔ یوں جیسے موت کے کنویں میں اڑھائی سو کلو میٹر فی گھنٹا کی رفتار سے گاڑی چلا رہا ہو۔

☆☆☆

رات بارہ بجے کے قریب نیچے لاؤنج میں چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ کچھ برتن یکے بعد دیگرے پارٹیشن کے ساتھ ٹکرا کر نیچے گرے اور ٹوٹ گئے۔ ساتھ ہی پارٹیشن کا ایک شیشہ بھی چھناکے سے ٹوٹ کر بکھر گیا۔ آفاق احمد ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور ننگے پاؤں سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ فوراً ہی واپس پلٹا اور بیڈ سائڈ ٹیبل کی دراز سے ریوالور نکال کر نیچے کی طرف دوڑا۔ وہ یہی سمجھا کہ گھر میں ڈاکو گھس آئے ہیں۔ اوسان خطا ہونے لگے۔ ابھی چند سیڑھیاں ہی اترا تھا کہ بڑی پاٹ دار آواز سنائی دی۔ ''امی جان! میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ آپ نے مجھے بیٹا کہا ہے۔'' آفاق انہی قدموں پر رُک گیا۔ جواب میں طاہرہ خان کی چلاہٹ سنائی دی۔

''نکل جاؤ میرے گھر سے ورنہ ابھی پولیس بلا لوں گی۔ پانچ چھ سال جیل میں سڑو گے۔'' آفاق احمد مزید چند سیڑھیاں اترا مگر ہمت جواب دے گئی اور وہ لینڈنگ پر بیٹھ گیا۔ سیڑھیوں پر قالین بچھا ہوا تھا مگر ٹھنڈک بدن میں سرایت کرنے لگی۔

مہدی کہہ رہا تھا۔ ''باہر بارش ہو رہی ہے۔ میں صبح ناشتا کر کے چلا جاؤں گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ کلام پاک پڑھیں۔ میں بھی پڑھتا ہوں۔ انشا اللہ بلا ٹل جائے گی۔''

طاہرہ نہ جانے کیا کیا ہذیان بک رہی تھی۔ لڑکے کے مرے ہوئے والدین کے بارے میں نازیبا کلمات بولتے ہوئے چلا کر کہا۔

''ناشتا کیوں، میں تمہیں زہر نہ کھلاؤں؟ تم ابھی دفع ہو جاؤ۔ ایک منٹ کے اندر اندر...... اور یہ لباس اتارو۔ اپنی شلوار قمیص پہن کر نکلو۔ تمہارے سلیپر آسیہ نے کوڑے میں پھینک دیے تھے۔ ننگے پاؤں جاؤ گے۔''

اس مرتبہ مہدی بولا تو آواز پہلے کی بہ نسبت دھیمی تھی۔ اتنا ہی کہا۔ ''میں چلا جاتا ہوں امی جان! آپ آیت الکرسی پڑھیں۔ میں بھی پڑھتا ہوں۔''

آفاق احمد اپنے کمرے میں آیا۔ عجلت میں لباس تبدیل کیا۔ چھوٹے گیٹ کی چابی لی اور سرونٹ کوارٹر کی بالکونی سے لوہے کی سیڑھیاں اتر گیا۔ مین گیٹ کے سامنے پورٹیکو میں طاہرہ کی ذاتی گاڑی کھڑی ہوتی تھی، جبکہ آفاق احمد اپنی گاڑی گھر کے کونے پر چھوٹے گیٹ کے اندر سائڈ پورچ کے نیچے کھڑی کیا کرتا تھا۔ بغیر کھٹکا کیے گیٹ کھولا تو باہر گلی کا سیکیورٹی گارڈ کھڑا نظر آیا۔ اُس کو ہاتھ کے اشارے سے تسلی دی۔ حسبِ عادت گاڑی کے ہینڈ بریک کھولے تو بغیر اسٹارٹ کیے ریمپ کی ڈھلان اتر گئی اور اسی جھونک میں موڑ تک چلنے دی۔ نکڑ والی کوٹھی کی اوٹ میں روک کر واپس آیا اور گیٹ بند کر دیا۔ گاڑی میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ نظریں عقبی آئینے پر جمار کھی تھیں۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد مہدی علی کالا شاپنگ بیگ اٹھائے سڑک پر نمودار ہوا۔ اسٹریٹ لائٹ میں نظر آ رہا تھا کہ اُس نے شلوار قمیص پہن رکھی ہے۔ آفاق کی نظریں بے اختیار اُس کے پیروں پر پڑیں۔ وہ ننگے پاؤں تھا۔ پیشتر اس کے کہ وہ گاڑی سے آگے نکل جاتا، آفاق نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور

اُسے آواز دے کر بیٹھنے کو کہا۔ مہدی نے جھک کر دیکھا اور پہچانتے ہی معمول کی بلند آواز میں بولا۔ ''اوہ، یہ آپ ہیں سر!'' سیٹ پر بیٹھتے ہی کہا۔ ''میں نے پیرودھائی لاری اڈے پر جانا ہے یا فیض آباد...... آپ اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟'' آفاق نے جواب دینے کے بجائے گاڑی اسٹارٹ کی اور اس کا ہیٹر آن کر کے تاب پوری گھما دی۔ گرم ہوا کا رخ پیروں کی طرف ہو گیا۔ چند منٹ کی خاموشی طاری رہنے کے بعد مہدی نے پاؤں سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''سر! بڑی گرم ہوا ہے۔ آپ نے ہیٹر میرے لیے چلایا ہوگا۔ اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے سردی نہیں لگتی۔ جوتے اسکول جانے کے لیے پہنا کرتا تھا۔'' آفاق اس مرتبہ بھی کچھ نہیں بولا۔ مہدی سے خاموش نہیں رہا گیا اور گردن دائیں جانب گھما کر ایک نگاہ آفاق کے چہرے پر ڈال کر کہنے لگا۔ ''سر! ہیٹر اپنی طرف کر لیں۔ میرے پاؤں جلنے لگے ہیں۔'' آفاق نے بغیر کوئی لفظ بولے ہیٹر بند کر دیا۔ بارش بہ دستور جاری تھی۔ مہدی سے چپ نہیں رہا گیا۔ پھر بول پڑا۔ ''سر! آپ گاڑی بہت تیز چلا رہے ہیں۔ بارش بھی ہو رہی ہے...... اور آپ بولتے کیوں نہیں؟ شاید ناراض ہیں۔ مجھے کسی اسٹاپ پر اتار دیں۔ میرے پاس پیسے کافی ہیں۔ تنخواہ کی رقم میں سے ایک روپیہ بھی امی جان نے واپس نہیں مانگا۔ وہ بہت اچھی خاتون ہیں۔ دراصل اُن پر کوئی بڑا سخت جن آتا ہے۔ اللہ کرے، کوئی نیک نیت والا سیانا مل جائے۔ جن بھی بڑے لوز کریکٹر والا ہے۔ جس طرح انسان، اچھے اور برے ہوتے ہیں، سنا ہے جنات میں بھی نیک و بد ہوتے ہیں۔ مجھے امی جان کی بڑی فکر لگی ہوئی ہے۔''

گاڑی اس وقت اسلام آباد ہائی وے پر تھی۔ طاہرہ کو جن چمٹنے کی بات سنتے ہی آفاق کی ذہنی کیفیت بدل گئی۔ یوں جیسے بند تاریک اجنبی عمارت میں بھٹکتے ہوئے اچانک سوئچ بورڈ پر ہاتھ پڑنے سے روشنی ہو جائے اور راستہ نظر آنے لگے۔ اعصاب پُرسکون ہونے لگے۔ گاڑی بھی متوازن رفتار پر چلنے لگی۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے تک وہ سوچ رہا تھا کہ گاڑی سڑک کے کنارے روک کر ڈگی سے وہیل پانہ نکالے اور اس احمق کے سر پر دے مارے۔ مگر اب سوچ کا زاویہ ہی مختلف ہو گیا۔ ذہن میں اچھوتا خیال آیا کہ پیچیدہ نفسیاتی الجھن اور جن میں فرق ہی کیا ہے؟ مہدی کا دامن صاف تھا۔ گھر میں جو کچھ ہوتا رہا وہ جن کے تذکرے سے میل کھاتا تھا۔ طاہرہ خان نفسیاتی مرض کا شکار تھی۔ کوئی اچھا سائیکرسٹ یا روحانی عامل اس کا معالج ہو سکتا تھا...... اس کے تن بدن میں سکون کی ایک گہری لہر سی سرایت کر گئی۔ اس نے سڑک پر نظریں جمائے، ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ائیر پورٹ کالونی میں اپنا ایک مکان تقریباً فنش ہو چکا ہے۔ چوکیدار ہے۔ گزارے لائق بستر مل جائے گا۔ گیس بھی لگی ہوئی ہے۔ فی الحال گجرات جانے کی ضرورت نہیں۔ کل بات کریں گے کہ تمہیں کیا کام کرنا ہے۔'' اس مرتبہ مہدی کے خاموش رہنے کی باری تھی۔ صرف ایک نظر آفاق پر ڈال کر سامنے سڑک کا منظر دیکھنے لگا۔ آفاق نے اس کی گود میں پڑا کالا شاپنگ بیگ دیکھ کر پوچھا کہ اس میں کیا ہے تو جواب ملا۔

''اس میں کتابیں، ایک تولیا، پاجامہ، بنیان، ریزر اور کنگھی وغیرہ......'' ذرا سا توقف کر کے مسکرایا اور بولا۔ ''سر! صابن اور کریم بھی ہے۔''

آفاق نے گردن گھمائی اور نظر ملا کر پوچھا ''کیسی کریم۔''

مہدی ہنس پڑا اور جھینپ گیا۔ تاہم لمحہ بھر خاموش رہ کر بول پڑا۔ ''سر! بیوٹی کریم...... رنگ گورا کرنے والی۔''

آفاق کی بے ساختہ ہنسی نکل گئی۔ کہنے لگا۔ ”تمہیں کریم کی کیا ضرورت ہے؟ اچھے خاصے گورے ہو...... اور یہ اشتہاری کریمیں ویسے بھی جلد کے لیے نقصان دہ ہوتی ہیں۔“

مہدی کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ ”سر! میری ماں کا حکم تھا کہ اور کوئی پیسا خرچ کروں نہ کروں، کریم ضرور لگایا کروں۔ اس خیال سے حکم عدولی نہیں کرتا کہ اُس کی روح کو صدمہ نہ پہنچے۔“ کھل کے ہنس دیا اور کہنے لگا۔ ”میری ماں فکر مند ہو کر کہا کرتی تھی کہ میرے بیٹے کا چاند چہرہ دھوپ میں پھرنے سے کالا ہو جائے گا...... سر! جب میں ہائی اسکول جانے لگا تو وہ دال روٹی میں سے پیسے بچا کر بھی میرے لیے کریم لے آیا کرتی تھی۔“ آفاق نے محسوس کیا کہ مہدی کا گلا رندھ گیا ہے۔ اس کی اپنی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ شریفاں بی بی اور صغریٰ صحن میں بیٹھی باتیں کرتی سنائی دینے لگیں۔ مہدی کی بھوک کے بارے میں باتیں...... اور صبر کی باتیں۔

آفاق احمد نے مہدی سے اس کی بھوک کے بارے میں سوال کرنا چاہا، مگر اس احتیاط سے کہ صغریٰ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ نہ دہرائے جائیں۔ اسکرین کے پار سڑک پر نظریں جمائے بولا۔ ”مہدی علی! کھانا اور ناشتا وغیرہ کس وقت کرتے ہو۔ کیا پسند ہے......؟ میرا مطلب ہے، ذرا تمہاری روٹین کا پتا چل جائے۔“

وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”کوئی خاص روٹین اور ٹائم نہیں سر! جو ملے، جب اور جیسا بھی، کھا لیتا ہوں۔ نہ ملے تو پانی کے دو تین گلاس پی کر سو جاتا ہوں۔ ایک آدھ دن کی بھوک مجھے زیادہ تنگ نہیں کرتی، نیند آ جاتی ہے۔ ویسے اب میرے پاس کافی پیسے ہیں لیکن میں ہوٹل سے کھانا پسند نہیں کرتا۔ جتنے پیسوں میں وہاں ایک وقت کا کھانا ملتا ہے، اتنے میں گھر پر تین گنا بن جاتا ہے۔ بندہ ایک ہی بار کھا لے تو دن بھر فکر نہیں رہتی۔ بلکہ اگلے روز تک نہ ملے تب بھی گزارہ ہو جاتا ہے۔“ آفاق نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس کو صغریٰ کے الفاظ سنائی دیے۔ ”خالہ جی! اس لڑکے کی ساری باتیں ہی نرالی ہیں۔ کہتا ہے، روٹی آج نہیں ملتی تو کل کھا لوں گا...... ماں گھولی! کل تو مل جائے گی ناں۔“ آفاق کی بصارت دھندلانے لگی۔

سامنے ایئرپورٹ چوک تک ٹریفک روک دی گئی تھی۔ چوکس کھڑی پولیس دیکھ کر آفاق سمجھ گیا کہ روٹ لگا ہوا ہے۔ حکومتِ وقت کی کسی اعلیٰ شخصیت کو گزرنا ہے۔ اس کے راستے پر کوئی معمولی سے معمولی رکاوٹ بھی نظر نہیں آ رہی۔ دیگر راستوں پر لمبی قطاریں لگ گئی ہیں۔ اتنے میں اس کے دائیں ہاتھ رنگ برنگی روشنیاں چمکیں، ہوٹر بجا اور درجنوں گاڑیوں پر مشتمل قافلہ گزرنے لگا۔ گولی کی رفتار سے گزرتی گاڑیوں کو گننا محال ہو گیا۔ لگ بھگ پچاس گاڑیاں گزری ہوں گی۔ اعلیٰ و ارفع نظریات کی امین قوموں کے رنگ نیارے۔ قائدین اور حکمران بڑی ثابت قدمی سے مزدور ماں کی مزدوری، بھکارن کی بھیک اور کسبی کی خرچی سے حصہ بٹور کر کیا شان کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایئرپورٹ سے اسلام آباد تک صرف فیول کی مد میں لاکھوں روپے پھونک ڈالے۔ روکی گئی ٹریفک کا وقت اور پیسا ملا کر بات شاید کروڑوں تک پہنچی ہو۔ روٹ کھل گیا اور گاڑیاں رینگنے لگیں۔

مہدی کہہ رہا تھا ”سر! اس وقت آپ کو گھر پر ہونا چاہیے تھا۔ امی جان کو آپ کی زیادہ ضرورت ہے۔ بھوت پریت کا سایہ ہو یا کوئی بڑی بیماری، آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اس میں بندے بے چارے کا قصور نہیں ہوتا۔ کوئی بھی اپنے سر آفت مول لینا پسند نہیں کرتا۔ میری مرحومہ ماں نے بڑی حسرتوں سے مجھے زمیندارہ کالج میں داخلہ دلایا مگر بے چاری بیمار رہنے لگی۔ میں نے کالج چھوڑ دیا اور پاٹری فیکٹری میں مزدوری کرنے لگا۔ ڈیڑھ سال بعد معلوم ہوا کہ ماں کو کینسر ہے۔ اماں رو رو کر خدا سے فریاد کرتی، کیدھاں جان چھٹو میرے پُت دی؟ میں اُس کے چہرے پر بوسہ دے کر کہا کرتا کہ ساٹھ سال بعد، جب میری ماں ایک سو ایک سال کی ہو جائے گی...... سر! اپنے پیاروں کا خیال خود رکھنا پڑتا ہے۔ بندے کو وفادار ہونا چاہیے۔“

آفاق شاید اب بھی چپ رہتا، مگر مہدی کی تشفی کے لیے بول پڑا۔ ”تم طاہرہ کی فکر نہ کرو۔ وہ بہت جلد سو گئی ہو گی۔ اب وہ کل دس گیارہ بجے سے پہلے نہیں اٹھے گی۔ دورہ پڑنے کے بعد وہ بہت سی دوائیاں لے کر سو جایا کرتی ہے۔“

ایئرپورٹ کالونی سے آفاق واپس گھر پہنچا اور لباس بدل کر نیچے آ گیا۔ بیوی بے سدھ پڑی سو رہی تھی۔ بغیر ڈسٹرب کیے بیڈ پر بائیں پہلو لیٹ گیا۔ صبح چھ بجے کے قریب وہ اٹھی اور سوئی جاگی سی حالت میں واش روم چلی گئی۔ چند منٹ بعد واپس آئی تو شوہر پر نگاہ پڑی۔ آنکھیں بھیگ گئیں۔ بہت آہستگی سے اپنا بدن بستر پر ڈال دیا۔ آفاق نے بازو بڑھا کر بیوی کو ساتھ لگا لیا۔ دونوں باہم لپٹ گئے مگر کچھ نہیں بولے۔ آفاق کو اپنے گال پر نمی محسوس ہونے لگی۔ آنکھیں کھول کر بیوی کے چہرے پر نظریں ڈالیں۔ اُس کی آنکھوں سے لگاتار آنسو بہہ رہے تھے۔ نیم دراز ہو کر ٹیبل سے ٹشو لیے اور اُس کا چہرہ اور آنکھیں اچھی طرح صاف کر دیں۔ چپکے سے دوبارہ ساتھ لگا لیا۔ وہ جلد ہی گہری نیند سو گئی۔

تقریباً ایک ماہ اسی طرح گزر گیا۔ میاں بیوی گو اکٹھے رہے۔ گاہے قربت ہو جاتی، مگر جذبات میں وہ شوریدگی نہ آئی۔ عمومی سی بات چیت ہوا کرتی۔ تعمیراتی منصوبوں یا سمن کے بارے میں۔ اُس کی روم میٹ کون ہے؟ امتحان کی تیاری کیسی جا رہی ہے؟ آج باپ بیٹی کہاں گھومے اور کھانا کہاں کھایا؟ تمہاری صحت کیسی ہے؟...... میں ٹھیک ہوں۔ گھر میں دن کیسا گزرا، تم ٹھیک ہو ناں!...... ہاں، شکر ہے۔ ایک دن اور گزر گیا۔ کسی اختلافی مسئلے پر بات نہیں ہوئی۔ تم ایسی ہو...... تم ویسے ہو۔ جو ہوا سو ہوا، اب گلہ شکوہ کیسا۔ وہ دونوں ایک ایسے ادھیڑ عمر کم گو اور سنجیدہ جوڑے کی طرح رہ رہے تھے جنہیں ایک دوسرے سے محبت ہو نہ کوئی شکایت۔

سہ پہر کی چائے کے لیے آفاق احمد کچن کی طرف جانے لگا تو طاہرہ کی آواز کانوں میں پڑی۔ ”آفاق! میں نے چائے بنا رکھی ہے۔ اِدھر آ جاؤ۔“ دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ طاہرہ پر سنجیدگی طاری تھی۔ شوہر کے آگے کپ رکھ کر اپنے کپ سے گھونٹ بھرا۔ میز پر اُس کا پاسپورٹ اور ٹریول ایجنسی کا لفافہ بھی پڑا تھا، جس پر دزدیدہ نگاہ ڈال کر آفاق نے کہا۔ ”تھینک یو فار ٹی۔“ وہ چپ رہی۔ چند لمحے مزید اسی طرح گزر گئے۔

دھیمی آواز میں بول پڑی۔ ”میں کچھ عرصہ کے لیے بھائی جان کے پاس جا رہی ہوں...... بھائی کو میرے پرابلم کا تب سے علم ہے، جب ہم دونوں کالج میں کلاس فیلوز تھیں۔ اُس نے کسی اسپیشلسٹ سے کنسلٹ کر کے ہی مجھے بلایا ہے۔“...... پھر خاموشی چھا گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں لمحہ بھر کو دیکھا۔

آفاق نے ہاتھ بڑھا کر بیوی کا ہاتھ تھام لیا۔ اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ دوبارہ بول پڑی۔ ”صبح چار بجے قطر ایئر لائنز سے دوہا اور آگے ہیوسٹن۔“ آفاق نے دوسرا ہاتھ بھی بیوی کے ہاتھ پر رکھ دیا اور بڑے آرام سے اُس کا بازو کھینچتے ہوئے گویا عندیہ دیا کہ وہ اٹھ کر ساتھ صوفے پر آن بیٹھے۔ ذرا سا سوچ کر اٹھی مگر جذباتی ہو گئی۔ ساتھ بیٹھتے ہوئے توازن برقرار نہ رہا اور اندازے کی غلطی بھی ہوئی، لہٰذا دھم سے گری اور زیادہ ہی جڑ کے بیٹھ گئی۔ دونوں کے زانو دب گئے۔ ذرا سنبھل کر سرکنے لگی مگر اِس اثنا میں آفاق نے اُس کو بازوؤں میں بھر کر سینے سے لگا لیا اور گال سے گال ملا کر دھیمی آواز میں بولا۔

”آئی ایم ویری سوری۔“

طاہرہ کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”فار وہاٹ؟“

آفاق نے اُسی طرح دھیمے سے سرگوشی کی۔ ”تم سے لاتعلق ہو گیا اور تمہارا خیال نہیں رکھا۔“ طاہرہ پر رقت طاری ہو گئی۔ اُس نے سمٹے ہوئے بازو پھیلائے اور میاں کو بھینچ لیا۔

تھوڑی دیر بعد طاہرہ ذرا ہٹ کر بیٹھ گئی۔ پاسپورٹ اٹھا کر اس کے نیچے رکھی شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی اٹھائی اور شوہر کی طرف بڑھا کر بولی۔ ”آفاق! یہ لڑکا تمہارے آبائی شہر کا ہے۔ اس کا پتا لگا کر کسی طرح واپس لے آؤ۔ وہ تمہارا ڈپلیکیٹ ہے۔“

آفاق نے کاغذ لے کر میز پر رکھ دیا اور بولا۔ ”میں اس لڑکے کے مقابلے میں صفر ہوں۔ اتنا محنتی، ذمے دار اور قابلِ بھروسا نوجوان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ تم نے ہیرا تلاش کر لیا۔ میں نے اُس کو کیری ڈبا دے رکھا ہے۔ اتنی جانفشانی سے ہر کام کی نگرانی کرتا ہے، میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔ ہر دوسرے تیسرے روز تمہاری زمینوں پلاٹوں پر ایک نظر ڈالنے کے لیے چکر لگاتا ہے۔ تمہارے لیے بہت فکر مند تھا۔ ہر روز پوچھا کرتا کہ امی جان کا کیا حال ہے؟ مجھے تسلیاں دیتا کہ میں کام کی فکر چھوڑ دوں، صرف تمہارا خیال رکھوں۔“

طاہرہ پھوٹ پھوٹ کر روئی اور بولی۔ ”آفاق! میں دنیا کی ذلیل ترین عورت ہوں۔“

آفاق نے بیوی کو دوبارہ بانہوں میں لے لیا اور اُس کے ہونٹ چوم کر بولا ”تم بہت اچھی عورت ہو۔ نادانستگی میں مجھ سے غفلت ہوئی۔ ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے۔ تمہیں تنہا چھوڑ کر میں نے بہت بڑا ظلم کیا۔ آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔ سمن کے امتحانات ختم ہوتے ہی ہم باپ بیٹی تمہارے پاس پہنچ جائیں گے۔ تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔ ہم تینوں اکٹھے واپس آئیں گے۔“

یکایک آفاق احمد کی آنکھیں بھی بھیگنے لگیں۔ اسے اپنی ماں یاد آ گئی تھی جس نے حرام و حلال کی تمیز گویا اس کی گھٹی میں ڈال دی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں بڑے کرب والم سہے لیکن ماں کے سکھائے ہوئے سبق سے جڑا رہا۔ آخرکار رزق حلال کا کمال زندگی کے ہمہ جہت سکھ کی صورت میں اسے میسر آ ہی گیا تھا۔ صغریٰ کا مہدی بھی اس ثمر سے محروم نہیں رہا تھا۔ آفاق، دینو یا دینا فیصلہ کر چکا تھا کہ اپنے ساتھ مہدی کو بھی اسی شجر سے پیوست رکھے گا جس کی آبیاری شریفاں اور صغریٰ نے کی تھی۔

فسادِ جہل

ملک صفدر حیات

جب انسان جہالت میں فسادات کا سبب بنتا ہے تو مقدر کی تاریکیاں اسے سورج کی روشنی میں بھی منزل سے بھٹکا دیتی ہیں اور... محبت جب بے اعتباری کا شکار ہوجائے تو بعض اوقات اپنے ہی خون کی بھینٹ لے لیتی ہے- وہ کیسے بڑے تھے جن کی نادانیوں نے بچوں کا بچپن تک چھین لیا۔

نفسانفسی کی دوڑ میں نفس کے غلاموں کا

عبرت اثر واقعہ

گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے بچے کا ماموں اعجاز میرے پاس پہنچا تھا۔ میں نے اسے بٹھایا اور پوچھا۔

''بچے کا نام کیا ہے اور وہ کب سے گم ہے......؟''

''اس کا نام تو جاوید ہے جناب۔'' اعجاز نے جواباً بتایا۔ ''لیکن سب اسے ''جیدا'' کہتے ہیں، جیدا آج دوپہر ہی سے غائب ہے۔''

اس وقت شام ہونے والی تھی۔ وہ ماہِ اگست کی اختتامی تاریخیں تھیں۔ بھادوں جوبن پر تھا۔ ساون نے جو کسر چھوڑی تھی اسے بھادوں بڑی ذمے داری کے ساتھ پورا کر رہا تھا۔ میں نے اعجاز حسین کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''جیدا دوپہر سے غائب ہے اور تم اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے اب میرے پاس آئے ہو......؟''

''ہم لوگ اب تک اپنے طور پر جیدا کو گاؤں میں تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''ایک ایک گھر میں جھانک لیا ہے۔ پورے ''شاہ پور'' میں اس کا نام ونشان نہیں ملا۔''

شاہ پور میرے تھانے سے نزدیک ترین ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ تھانے سے گاؤں کا فاصلہ بہ مشکل ایک فرلانگ ہوگا۔ شاہ پور میں لگ بھگ سوا سو گھر ہوں گے۔ اس حساب سے یہاں کی آبادی کو چار سو سے پانچ سو نفوس تک شمار کیا جاسکتا ہے۔

''ہوسکتا ہے، جیدا گاؤں سے کہیں باہر چلا گیا ہو؟'' میں نے ایک واضح امکان کی جانب اشارہ کیا۔

اعجاز حسین نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ایسا نہیں ہوسکتا جناب۔ ابھی اس کی عمر اتنی نہیں کہ وہ اکیلا گاؤں سے باہر چلا جائے۔''

''جیدا کی عمر کتنی ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔

اعجاز نے بتایا۔ ''لگ بھگ آٹھ سال۔''

''اوہ......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی

اور پوچھا۔ ”جیدا کے ماں باپ کہاں ہیں؟“

”ماں اور نانی تو گھر پر ہے تھانے دار صاحب!“ وہ ہونٹ بھینچتے ہوئے بولا۔ ”اور جیدا کا باپ لاہور میں رہتا ہے۔“

شہر لاہور، موضع شاہ پور سے کم و بیش پینتیس میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ میں اعجاز سے پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ”کیا جیدا کے باپ کو اس کی گمشدگی کا پتا ہے؟“

”ابھی تک تو پتا نہیں ہے جناب۔“ وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”اور پتا چل بھی جائے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں......!“

”یہ کیا بات کی تم نے!“ میں نے حیرت بھری نظر سے اعجاز کی طرف دیکھا۔ ”سب سے پہلے تو جیدا کے باپ ہی کو اس واقعے کی خبر ہونا چاہیے تھی۔ تم نے ایسے کیوں کہا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں؟“

”وہ بات دراصل یہ ہے تھانے دار صاحب......!“ وہ بددلی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”جیدا کے باپ علی نواز نے چار سال پہلے میری بہن کو طلاق دے دی تھی۔ جب سے خالدہ امی کے پاس ہی رہ رہی ہے...... علی نواز نے ادھر لاہور میں دوسری شادی کر رکھی ہے...... اس کے ساتھ ہمارا جینا مرنا چار سال پہلے ہی ختم ہو گیا تھا۔“

”اوہ...... تو یہ بات ہے!“ میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی۔ ”تم نے دوسرے بچوں سے جیدا کے بارے میں پوچھ تاچھ کی ہے؟“

”جی، سب سے پوچھ کے دیکھ لیا۔“ اعجاز نے بتایا۔ ”وہ دوپہر میں تین بچوں کے ساتھ چھپڑ کے پاس کھیل رہا تھا۔ اس کے بعد ہی سے وہ غائب ہے۔“

چھپڑ بہ معنی جوہڑ...... پنجاب کے گاؤں دیہات میں جوہڑ کو چھپڑ کہا جاتا ہے۔ چھپڑ بہت کام کی چیز ہوتا ہے۔ کچے مکانوں کی لیپا پوتی کے لیے اسی چھپڑ سے مٹی نکالی جاتی ہے۔ گاؤں کی بھینسیں اور دیگر ڈھور ڈنگر اسی چھپڑ سے نہ صرف اپنی پیاس بجھاتے ہیں بلکہ ان کا نہانا دھونا بھی چھپڑ ہی میں ہوتا ہے۔ بعض بچے اور بڑے بھی چھپڑ میں ڈبکیاں لگاتے نظر آتے ہیں۔ جب اعجاز نے چھپڑ کا ذکر کیا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔

”کہیں جیدا چھپڑ میں دوسرے بچوں کے ساتھ نہا تو نہیں رہا تھا؟“ میں نے ایک فوری خیال کے تحت سوال کیا۔

”تھانے دار جی! یہ تو بچوں کا پسندیدہ کھیل ہے۔“ وہ معتدل لہجے میں بولا۔ ”آج کل تو ویسے بھی گرمی کا موسم ہے اور حالیہ بارشوں نے چھپڑ کو کناروں تک بھر رکھا ہے......“

میرے ذہن میں اس خدشے نے سر ابھارا کہ کہیں جاوید عرف جیدا چھپڑ میں نہاتے ہوئے ڈوب نہ گیا ہو۔ ٹھیک ہے، کناروں پر چھپڑ کی گہرائی زیادہ نہیں ہوتی لیکن جیسے جیسے آگے بڑھیں، اس کی گہرائی میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اور عین وسط میں تو جوان بندے کے سینے تک پانی کھڑا ہوتا ہے۔ جیدا کے ڈوبنے کے خدشے کے پیش نظر میں نے اعجاز سے سوال کیا۔

”جیدا آج دوپہر میں جن بچوں کے ساتھ چھپڑ کے قریب کھیل رہا تھا، ان کے نام کیا ہیں اور انہوں نے اس کے بارے میں کیا بتایا ہے؟“

”بچوں کے نام تو ہیں جی...... بوٹا، کرمو اور بھولا۔“ اعجاز نے بتایا۔ ”میں نے بہت کرید کرید کر ان سے پوچھا ہے، سب نے ایک جیسا بیان دیا ہے جناب...... وہ کہتے ہیں، انہیں جیدا کے بارے میں کوئی خبر نہیں۔ وہ سب مل کر ایک ساتھ کھیل رہے تھے، پھر جیدا اپنے گھر چلا گیا تھا...... اس کے بعد انہیں کچھ پتا نہیں۔“

”جیدا...... بچوں کے مطابق، اپنے گھر چلا گیا تھا مگر وہ اپنے گھر پہنچا نہیں۔“ میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا پھر اعجاز سے پوچھا۔ ”جیدا نے لباس اور جوتے کس طرح کے پہن رکھے تھے......؟“

”اس بارے میں تو مجھے کچھ پتا نہیں جناب۔“ وہ معذرت خواہانہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آپ کے اس سوال کا جواب تو جیدا کی ماں خالدہ ہی دے سکتی ہے یا پھر وہ بچے جن کے ساتھ وہ کھیل رہا تھا۔ میرے ذہن میں بالکل نہیں آیا کہ ان سے پوچھوں......!“

”کوئی بات نہیں اعجاز! تمہارے ذہن میں نہیں آیا تو میں پوچھ لوں گا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جیدا کی ماں سے بھی اور اس کے دوستوں سے بھی۔“

”جیدا مل تو جائے گا نا تھانے دار صاحب؟“ وہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”فکر نہ کرو اعجاز اور اللہ سے امید رکھو۔ میں جلد از جلد جیدا کو ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کروں گا۔“

”اللہ آپ کا بھلا کرے!“ وہ دعائیہ انداز میں بولا۔ ”مجھ سے خالدہ کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ جیدا اس کے لیے خوشیوں کا واحد سہارا تھا۔“

”میں تمہاری بہن کے درد کو سمجھ سکتا ہوں۔“ میں نے

گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”تم حوصلہ رکھو اور خالدہ کو بھی حوصلہ دو۔ سمجھو کہ میں نے ابھی سے جیدا کی تلاش کا کام شروع کر دیا ہے اور اندھیرا ہونے سے پہلے میں خالدہ سے ملنے اس کے گھر بھی آ رہا ہوں۔ تم کوشش کرنا کہ جیدا کے وہ تینوں دوست مل جائیں، گمشدگی سے پہلے وہ جن کے ساتھ چھپڑ کے کنارے کھیل رہا تھا۔ میں ان سے پوچھ گچھ کروں گا۔“

”آپ فکر نہ کریں جناب۔“ وہ ٹھوس انداز میں بولا۔ ”میں ان بچوں کو جمع کر کے رکھوں گا۔ آپ جب آئیں گے تو میں ان تینوں کو خالدہ کے گھر لے آؤں گا۔ وہ جائیں گے کہاں۔ آس پاس ہی کے بچے تو ہیں......“

میں نے تسلی دلاسا دے کر اعجاز کو رخصت کر دیا۔

جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا، موضع شاہ پور میرے تھانے سے فرلانگ بھر کے فاصلے پر واقع تھا۔ شہروں میں رہنے والے اور ”فرلانگ“ سے ناآشنا افراد اس فاصلے کو دو سو بیس گز سمجھ لیں۔ تھانے سے بڑے آرام سے ٹہلتے ہوئے شاہ پور جایا جا سکتا تھا۔ شاہ پور کا رہنے والا ایک کانسٹیبل بھی میرے تھانے میں ہوتا تھا۔ اس کا نام افضل تھا اور ظاہر ہے، وہ جیدا کی گمشدگی والے واقعے سے واقف نہیں ہوگا۔ وہ بے چارہ صبح ہی سے ڈیوٹی پر تھا۔

میں نے افضل کو اپنے ساتھ شاہ پور لے جانے کا فیصلہ کیا اور ضروری تیاری کے لیے اسے اپنے پاس بلا لیا۔

XXX

میں نے جیدا کے ڈوبنے والے امکان کو ذہن میں رکھتے ہوئے تفتیش کا آغاز کیا اور بوٹا، کرمو، بھولا وغیرہ کو ساتھ لے کر گاؤں کے جوہڑ پر پہنچ گیا۔ اندھیرا ہوتے میں زیادہ دیر باقی نہیں تھی۔ میں دن کی روشنی ہی میں یہ کام نمٹا دینا چاہتا تھا۔

بوٹا، کرمو اور بھولا کی عمریں سات اور دس سال کے درمیان تھیں اور ان میں بھولا نسبتاً زیادہ سمجھ دار تھا۔ وہ پورے دس سال کا تھا۔ جیدا کے گھر سے جوہڑ کی جانب آتے ہوئے میں نے ان تینوں کا مفصل انٹرویو بھی کر ڈالا تھا لیکن کوئی ایسی بات سامنے نہ آئی جو جیدا کی تلاش میں میری مددگار ثابت ہو سکتی۔ ان سے مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ اعجاز مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا۔

میں اور کانسٹیبل پولیس یونیفارم میں تھے لہٰذا ہمیں دیکھ کر نصف درجن سے زیادہ لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ چند افراد اس وقت بھی بھینسوں کے ساتھ جوہڑ کے اندر موجود تھے۔ میں نے بھولا سے پوچھا۔

”بھولا! اس وقت تم لوگ کس جگہ کھیل رہے تھے؟“

بھولا نے ایک جگہ کی نشاندہی کر دی۔

میں نے جوہڑ کے اندر موجود لوگوں سے کہا کہ وہ اس کنارے پر پانی میں ہاتھ پاؤں چلا کر یہ جاننے کی کوشش کریں کہ جیدا کہیں پانی کے اندر ڈوبا ہوا تو نہیں۔ جب گاؤں کے ایک نوعمر بچے کے ڈوبنے کے بارے میں ان لوگوں کو پتا چلا تو انہوں نے ماہر تیراکوں کے مانند جیدا کی تلاش کا کام شروع کر دیا۔

بوٹا، کرمو اور بھولا کے بیان سے تو یہی بات سامنے آئی تھی کہ جیدا ان سے جدا ہو کر سیدھا اپنے گھر کی طرف گیا تھا لیکن میں نے پھر بھی اپنا شک دور کرنے کے لیے جوہڑ میں جیدا کی تلاش کا کام ضروری سمجھا تھا۔

بیس پچیس منٹ کی کڑی تلاش کے بعد میرا شک دور ہو گیا۔ یعنی جیدا کا جوہڑ کے اندر کوئی سراغ نہ مل سکا۔ وہاں پر موجود لوگوں میں سے ایک عمر رسیدہ شخص آگے بڑھا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”تھانے دار صاحب! اگر بچہ اس چھپڑ میں ڈوبا ہوتا تو اب تک اس کی لاش اوپر آ چکی ہوتی، دوپہر سے اب تک کافی وقت گزر چکا ہے......“

میں نے بہ غور اس شخص کا جائزہ لیا اور پوچھا۔ ”چاچا...... تمہارا نام کیا ہے؟“

”میرا نام ہے جی...... برکت۔“ اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

”چاچا برکت! تم جس نکتے کی طرف اشارہ کر رہے ہو نا، وہ میرے ذہن میں بھی ہے لیکن پھر بھی تفتیش کے دوران ہر پہلو کو نظر میں رکھنا پڑتا ہے...... اب یہ تسلی تو ہو گئی نا کہ جیدا اس چھپڑ میں کہیں غائب نہیں ہوا۔“

”یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے وہاں موجود لوگوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور بہ آواز بلند کہا۔ ”تم سب اس حقیقت سے اب تک واقف ہو چکے ہو کہ اعجاز کا بھانجا جاوید عرف جیدا آج دوپہر سے غائب ہے۔ اعجاز نے جیدا کی تلاش میں پورا گاؤں چھان مارا ہے۔ آپ لوگ بھی اپنی آنکھیں کھلی رکھیں۔ جیسے ہی جیدا نظر آئے یا اس کے بارے میں کوئی اہم بات معلوم ہو، آپ سیدھے تھانے آ کر مجھے بتائیں گے......“

انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ جیدا ان کے اپنے بچوں جیسا بچہ ہے۔ وہ بھی اس کی گمشدگی پر بہت پریشان ہیں۔

انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ جیدا کو اپنے تئیں تلاش کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔

میں مطمئن ہو کر جیدا کے گھر آ گیا۔

اس گھر میں جیدا کی ماں خالدہ اور اس کی نانی گلزار بی بی کے سوا اور کوئی نہیں رہتا تھا۔ اعجاز کی زبانی مجھے پتا چلا کہ اس کی رہائش یہاں سے ایک گلی چھوڑ کر تھی جہاں وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ میں خالدہ کو لے کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

خالدہ کی عمر تیس کے آس پاس نظر آتی تھی۔ وہ ایک قبول صورت اور فربہ اندام عورت تھی تاہم اس وقت اکلوتے بیٹے کی جدائی نے اسے ملول کر رکھا تھا۔ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

"خالدہ بی بی! میں تمہارے دکھ میں برابر کا شریک ہوں اور میرا یہ وعدہ ہے کہ جیدا کو جلد از جلد ڈھونڈ نکالوں گا لیکن اس کام کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے......!"

وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "جی...... میں آپ کی بھلا کیا مدد کر سکتی ہوں......؟"

"مجھے جیدا کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات کی ضرورت ہے۔"

"کس قسم کی معلومات؟" اس کی الجھن میں اضافہ ہو گیا۔

میں نے کہا۔ "آپ کو کب پتا چلا کہ جیدا غائب ہے؟"

"دن میں جب وہ کھانا کھانے کے لیے گھر نہیں آیا تو مجھے فکر ہوئی۔" اس نے بتایا۔ "میں بھائی اعجاز کے گھر گئی۔ وہ کبھی کبھی اس کے بچوں کے ساتھ کھیلنے بھی چلا جاتا تھا لیکن ادھر جا کر پتا چلا کہ جیدا وہاں گیا ہی نہیں۔ بھائی اعجاز کو فکر ہوئی۔ اس نے دکانداری چھوڑی اور جیدا کو ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا۔ اس نے سارا پنڈ چھان مارا مگر جیدا کہیں نہیں ملا۔ تھک ہار کر اعجاز رپورٹ لکھوانے آپ کے پاس چلا گیا......" وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوئی، ایک گہری سانس خارج کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"یہ ہے کل کہانی تھانے دار صاحب......!"

"ہوں......!" میں نے متاسفانہ انداز میں گردن ہلائی اور پوچھا۔ "وہ آج کتنے بجے گھر سے نکلا تھا؟"

"میرا خیال ہے، دس بجے۔" خالدہ نے جواب دیا۔ "پھر وہ واپس نہیں آیا۔"

"کیا پہلے بھی کبھی ایسا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں جی، یہ پہلا واقعہ ہے۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "کھیلنے کے لیے تو وہ روز ہی گھر سے باہر جاتا تھا لیکن دن میں کھانے کے وقت وہ واپس آ جاتا تھا مگر......" بولتے بولتے اس کی آواز رندھ گئی اور وہ دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگی۔

میں نے لمحاتی توقف کے بعد اس سے پوچھا۔ "آج جب وہ گھر سے نکلا تھا تو اس سے پہلے کوئی خاص واقعہ تو پیش نہیں آیا تھا؟"

"مثلاً؟" وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ "کس قسم کا واقعہ تھانے دار صاحب......!"

"مثلاً یہ کہ......" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "آپ لوگوں میں سے کسی نے اسے ڈانٹا ہو، جھڑکا ہو یا بہت زیادہ غصہ کیا ہو اس پر؟"

"ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔" وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی پھر مجھ سے پوچھا۔ "کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ وہ ناراض ہو کر کہیں چلا گیا ہے......؟"

"تمہارا اندازہ درست ہے۔" میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "پولیس آفیسر ہونے کے ناتے مجھے ہر انداز میں سوچنا پڑتا ہے۔ میں اس امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ وہ کسی بات پر خفا ہو کر ادھر ادھر نکل گیا ہو، ویسے......" میں نے تھوڑی دیر رک کر سوچتی ہوئی نظر سے خالدہ کو دیکھا اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس بات کا ثبوت تو مل گیا ہے کہ وہ دوپہر تک چھپڑ کے کنارے اپنے دوستوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ بوٹا، کرمو اور بھولا نے مجھے بتایا ہے کہ وہ انہیں یہ بتا کر آیا تھا کہ گھر جا رہا ہے...... ساری گڑبڑ چھپڑ سے لے کر تمہارے گھر تک کے راستے میں ہوئی ہے۔"

"جو بھی ہوا ہے یہ تو مجھے نہیں پتا......" وہ روہانسے لہجے میں بولی۔ "مجھے جیدا چاہیے۔ آپ جلد از جلد اسے تلاش کریں۔ وہ سب کی آنکھ کا تارا تھا۔ پتا نہیں...... میرے جیدا کو کس کی نظر کھا گئی ہے......!"

خالدہ کی حالت کو دیکھتے ہوئے میں نے اس کے بھائی اعجاز کو بھی قریب بلا لیا۔ اعجاز کی کریانے کی دکان تھی جو اس نے جیدا کی گمشدگی کی وجہ سے آج دوپہر ہی کو بند کر دی تھی۔ میں نے اعجاز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ لوگوں کی کسی سے کوئی دشمنی وغیرہ تو نہیں تھی؟"

"بالکل نہیں جناب!" وہ جلدی سے بولا۔ "ہم صلح صفائی سے رہنے والے امن پسند لوگ ہیں۔ دشمنیاں پالنا

ہمارے بس کا کام نہیں۔"

میں نے ایک فوری خیال کی تسکین کے لیے پوچھ لیا۔ "کیا خالدہ کے سابق شوہر یعنی جیدا کے باپ علی نواز کا تعلق بھی شاہ پور ہی سے ہے؟"

"جی ہاں، وہ یہیں کا رہنے والا تھا۔" اعجاز نے جواب دیا۔ "لیکن اب کافی عرصے سے وہ مستقل لاہور ہی میں رہ رہا ہے۔ بس کبھی کبھار ہی ادھر کا چکر لگا لیتا ہے......!"

"بھائی اعجاز!" خالدہ نے شاکی نظر سے اپنے بھائی کی طرف دیکھا۔ "آپ تھانے دار جی کو آدھی بات بتا رہے ہیں......"

"اچھا......" میں نے چونک کر خالدہ کی جانب دیکھا۔ "تو اس کے علاوہ اور کچھ بھی ہے......؟"

اعجاز جزبز ہو کر رہ گیا۔ میں نے خالدہ سے کہا۔ "میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔ باقی کی آدھی بات تم بتا دو۔"

وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔ "دراصل، علی نواز کے ماں باپ بچپن ہی میں خاندانی دشمنی کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ اسے اس کے چاچا اور چاچی نے پالا ہے جو ادھر شاہ پور ہی میں رہتے ہیں۔ علی نواز کو کھیتی باڑی اور زراعت کے کاموں سے چڑ تھی لہٰذا وہ نوکری کی تلاش میں لاہور چلا گیا۔ جب میری شادی ہوئی، اس وقت بھی وہ لاہور میں ملازمت کرتا تھا۔ مہینے میں ایک دو دن کے لیے یہاں آتا تھا اور پھر واپس چلا جاتا تھا، پھر ہمارے بیچ جھگڑے شروع ہو گئے اور......" وہ یک دم، بے حد اداس ہو گئی۔

"اور پھر......؟" میں نے کریدا۔

"پھر ہمارے راستے الگ ہو گئے۔" وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولی۔ "چار سال پہلے علی نواز نے مجھے طلاق دے دی۔ اس وقت جیدا چار سال کا تھا......"

"اس افسوس ناک واقعے کے بعد ہی اس نے دوسری شادی کی ہو گی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" خالدہ نے بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلائی۔ "دوسری شادی اس نے ایک سال پہلے کی ہے اور ہمارے درمیان جھگڑے کی بنیادی وجہ بھی علی نواز کی دوسری شادی ہی تھی۔ یہ تنازع ایک سال تک چلتا رہا پھر علی نواز نے نورین کے حق میں فیصلہ کیا اور مجھے طلاق دے دی......"

"نورین، علی نواز کی دوسری بیوی کا نام ہے؟" میں نے تصدیقی انداز میں پوچھا۔

خالدہ نے تائیدی انداز میں گردن ہلا دی۔

میں نے پوچھا۔ "طلاق کے وقت علی نواز نے اپنے بیٹے کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی؟"

"بالکل نہیں تھانے دار صاحب!" اعجاز نے جواب دیا۔ "اس نے جھوٹے منہ سے بھی ایک بار جیدا کو لینے کا مطالبہ نہیں کیا......!"

"یعنی اس کے دل میں جیدا کے لیے کوئی طلب، کوئی تڑپ نہیں تھی۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔

"آپ سیانے بیانے ہیں تھانے دار صاحب!" اعجاز نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "جس شخص کو اپنی اولاد سے محبت ہو، وہ اپنی بیوی کو طلاق نہیں دیتا اور نہ ہی وہ دوسری شادی کے بارے میں سوچتا ہے۔"

میں نے اعجاز سے پوچھا۔ "تم نے تھوڑی دیر پہلے بتایا ہے کہ علی نواز کبھی کبھار ادھر چکر لگا لیتا ہے تو کیا جب وہ یہاں آیا ہوتا ہے تو اس نے اپنے بیٹے کو دیکھنے یا اس سے ملنے کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی۔"

"یہی تو میں آپ کو بتانا چاہ رہی تھی تھانے دار صاحب!" خالدہ جلدی سے بولی۔ "بھائی اعجاز نے کسی مصلحت کی وجہ سے آپ کو پوری بات نہیں بتائی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب مجھے طلاق ہوئی اس کے بعد سے تو علی نواز نے شاہ پور میں قدم ہی نہیں رکھا، جیدا کو دیکھنے یا اس سے ملنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔"

"تم نے کس مصلحت کی بنا پر مجھ سے غلط بیانی کی ہے؟" میں نے اعجاز کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی مصلحت نہیں جناب!" وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ "بس، وہ کیا کہتے ہیں کہ...... قمیص اٹھاؤ تو اپنا ہی پیٹ ننگا ہوتا ہے......"

میں نے باری باری خالدہ اور اعجاز کی جانب دیکھتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں پوچھا۔ "کیا جیدا کی گمشدگی میں علی نواز کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟"

"بہ ظاہر ایسا لگتا تو نہیں تھانے دار صاحب!" اعجاز نے جواب دیا۔

"بہ ظاہر جو شے نظر نہ آ رہی ہو اس کے بارے میں زیادہ سوچنے کی ضرورت ہوتی ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھے علی نواز کا اتا پتا بتائیں۔ میں اسے بھی چیک کروں گا۔"

"اس کا پتا تو ہمارے پاس نہیں ہے۔" خالدہ نے جواب دیا۔ "اس کے چاچا، چاچی سے مل سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں علی نواز کے چاچا چاچی سے بھی مل لوں گا۔" میں نے کہا۔ "آپ لوگ جیدا کی گمشدگی کے

حوالے سے اور کچھ جانتے ہیں تو مجھے بتائیں......؟"

جب خالدہ اور اعجاز اس سلسلے میں مجھے مزید معلومات فراہم نہ کر سکے تو میں انہیں تسلی دلاسا دے کر واپس آگیا۔

XXX

اگلے روز میں نے دو اہم کام کیے۔

نمبر ایک، میں نے ایک بندہ بھیج کر علی نواز کے چاچا نذیر حسین کو تھانے بلالیا۔ نمبر دو، میں نے دو سادہ لباس پولیس اہل کاروں کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ شاہ پور میں گھوم پھر کر جیدا کے بارے میں معلومات اکٹھی کریں۔ اس کے ساتھ ہی میں نے کانسٹیبل افضل کو بھیج کر کھوجی شرافت علی کو بلا لیا۔ ایک بات کا میں ذکر کرنا بھول گیا کہ میں نے رات خالدہ سے بات کرتے ہوئے جیدا کی تصویر کے بارے میں سوال کیا تھا تاکہ اس بچے کی تلاش کے کام کو آسان بنایا جا سکے لیکن خالدہ اور اعجاز نے مجھے بتایا کہ ان کے پاس جیدا کی کوئی تصویر موجود نہیں۔ اب مجھے دوسرے ذرائع ہی سے اس کا کھوج لگانا تھا......!

میں تھانے میں بیٹھا جیدا کی گمشدگی کے بارے ہی میں سوچ رہا تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔ بھادوں کی بارش انتہائی ناقابل اعتبار ہوتی ہے۔ ایک لمحے میں سورج چمک رہا ہوتا ہے اور دوسرے لمحے بارش شروع ہو جاتی ہے اور بعض اوقات تو دھوپ اور بارش ایک ساتھ اپنی اپنی جھلک دکھا رہی ہوتی ہیں۔ بھادوں کی بارش کی ایک خاصیت یہ ہے کہ بارش کے فوراً بعد دھوپ نکل آتی ہے اور دھوپ بھی ایسی کہ بدن میں سوئیاں چبھونے والی۔ اس موسم میں ویسے بھی جسم گرمی دانوں سے بھرا ہوتا ہے۔ ایسے میں دھوپ کی چمک اور بارش کے کھڑے پانی کی تپش مل کر قیامت ڈھاتی ہیں۔

اس اچانک شروع ہو جانے والی بارش نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا اور اس تشویش کا سبب تھا جیدا کا کھرا......!

میں نے سوچا تھا کہ کھوجی شرافت علی سے جیدا کا کھرا نکلواؤں گا تاکہ پتا تو چلے کہ وہ چھیڑ سے اپنے گھر جاتے ہوئے راستے میں کہاں غائب ہو گیا تھا لیکن اس بارش نے جیدا کیا، باقی لوگوں کے پاؤں کے نشانات کو بھی ملیامیٹ کر دیا تھا۔ اب کھرے کی مدد سے جیدا کا سراغ لگانا ممکن نہیں رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد نذیر حسین میرے پاس پہنچ گیا۔ نذیر حسین کی عمر پچپن سے متجاوز دکھائی دیتی تھی۔ وہ وضع قطع سے ایک عام دیہاتی معلوم ہوتا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ کھیتی باڑی کا کام کرتا ہے۔ گویا، وہ ایک چھوٹا زمیندار تھا۔

"نذیر حسین!" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ "جانتے ہو، میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟"

"کچھ کچھ اندازہ تو ہے تھانے دار جی۔" اس نے جواب دیا۔

"مثلاً......کیا کچھ کچھ؟"

"خالدہ کا بچہ کل سے غائب ہے۔" وہ عام سے لہجے میں بولا۔ "میرا خیال ہے، آپ نے جیدا کے بارے میں کچھ پوچھنے کے لیے مجھے بلایا ہے۔"

"تمہارا خیال بالکل درست ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "میں نے جیدا ہی کے سلسلے میں تمہیں بلایا ہے لیکن تم نے جیدا کے لیے "خالدہ کا بچہ" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ کیا وہ علی نواز کا بھی بچہ نہیں ہے......؟"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں تھانے دار صاحب!" وہ گڑبڑائے ہوئے انداز میں بولا۔ "لیکن چار سال پہلے علی نواز نے خالدہ کو طلاق دے دی تھی۔ اس کے بعد دونوں خاندانوں کا میل ملاپ نہیں رہا اس لیے میرے منہ سے نکل گیا......خالدہ کا بچہ!"

"کون سے دونوں خاندان؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"مم......میرا مطلب ہے، خالدہ اور علی نواز کا خاندان......" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

"لیکن میں نے تو سنا ہے، خالدہ کو طلاق دینے کے بعد علی نواز مستقل لاہور ہی کا ہو کر رہ گیا ہے؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ "پچھلے چار سال سے اس بے وفا نے پلٹ کر آپ لوگوں کی بھی خبر نہیں لی......!"

وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں......!"

"آپ لوگوں کے ساتھ علی نواز کی کیا ناراضی ہے؟" میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ "مجھے پتا چلا ہے وہ چھوٹا سا تھا جب اس کے والدین کا انتقال ہو گیا تھا۔ آپ دونوں میاں بیوی نے اسے پال پوس کر جوان کیا، اس کی شادی کرائی اور وہ......آپ لوگوں ہی کو چھوڑ کر چلا گیا۔ یہ کیا ماجرا ہے نذیر حسین؟"

"ماجرا کیا تھانے دار صاحب......!" وہ ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولا۔ "زمانے کا دستور یہی ہے۔ جس کے ساتھ نیکی کرو، وہی ڈنک مارتا ہے......!"

"میں تفصیل جاننا چاہتا ہوں نذیر حسین؟" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

نذیر حسین اپنے بھتیجے علی نواز کی طرف سے خاصا خفا اور دل برداشتہ نظر آتا تھا۔ میں اسی لیے اسے ٹٹولنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ جیدا کی گمشدگی کے سلسلے میں کوئی مفید نکتہ ہاتھ آسکے۔ چند لمحات تک چپ رہ کر وہ اپنی یادداشت میں ماضی کے واقعات کو مجتمع کرتا رہا پھر ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگا۔

"بڑے بھائی صاحب یعنی علی نواز کا باپ فرید احمد اور بھابی رفعت موضع جمال نگر میں رہتے تھے۔ ان کی پانچ اولادیں تھیں۔ ایک ایک کر کے چار بچے اور بھائی بھابی خاندانی دشمنی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ علی نواز چھوٹا سا تھا کہ میں اسے اپنے گھر لے آیا۔ اس کی پرورش کی۔ پال پوس کر جوان کیا۔ اپنے بیٹے طفیل سے زیادہ اس کا خیال رکھا۔ اسے زمیں داری کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ روزگار کے سلسلے میں لاہور کا رخ کرنا بھی اس کا اپنا فیصلہ تھا۔ دس سال پہلے میں نے اس کی شادی اعجاز کی بہن خالدہ سے کرادی۔ چھ سال تک یہ شادی روتے دھوتے چلتی رہی پھر میاں بیوی کے درمیان ایسا تنازع اٹھا کہ جس کے نتیجے میں علی نواز نے خالدہ کو طلاق دے دی......"

"یہ تنازع علی نواز کی دوسری شادی کی وجہ سے اٹھا تھا یا کوئی اور سبب بھی تھا؟" وہ سانس لینے کے لیے تھما تو میں نے پوچھ لیا۔

"ایک سبب تو دوسری شادی بھی تھی جناب......!" وہ گول مول انداز میں بولا۔

"اور دیگر اسباب کیا تھے؟" میں نے سوال کیا۔

"جناب تھانے دار صاحب! میں نے مرنے کے بعد اپنی قبر میں جانا ہے اس لیے آپ سے کوئی غلط بیانی نہیں کروں گا۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "چاہے کوئی بات علی نواز کے حق میں جاتی ہو یا اس کی مخالفت میں......"

"سمجھ داری کا تقاضا بھی ہے نذیر حسین کہ کم از کم پولیس اور ڈاکٹر سے کوئی بات نہیں چھپانا چاہیے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"میری گھر والی عنایت بی بی ہمیشہ مجھ سے کہتی تھی کہ میں علی نواز پر محنت کر کے زندگی کی سب سے بڑی غلطی کر رہا ہوں۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔ "لیکن میں سگے بھائی کی اولاد سمجھ کر علی نواز کو اپنی اولاد کی طرح پالتا رہا۔ اس کی زندگی میں کبھی کوئی کمی نہیں آنے دی لیکن وہی ہوا جو عنایت بی بی مجھ سے اکثر کہتی رہتی تھی۔ علی نواز نے ہم سے وفا نہیں کی بلکہ ہماری ناک کٹوادی۔ جب سے اس نے خالدہ کو طلاق دی ہے واپس پلٹ کر گاؤں کی طرف نہیں آیا۔ اپنی دوسری بیوی اور بچوں کے ساتھ لاہور ہی میں رہتا ہے۔ نورین سے اس کی دو اولادیں ہیں۔ یہ بھی مجھے اس وقت پتا چلا جب پچھلے سال میں کسی کام سے لاہور گیا تو علی نواز سے ملنے اس کے گھر بھی چلا گیا تھا۔ اس وقت مہوش دو سال کی اور فراز چھ ماہ کا تھا......"

"یہ سب تو ٹھیک ہے نذیر حسین!" میں نے اسے ٹوک دیا۔ "تم مجھے خالدہ کی طلاق کے دوسرے اسباب کے بارے میں بتا رہے تھے؟"

"جی......!" وہ لفظ کو اچھا خاصا کھینچنے کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔ "ہمارے لیے سب سے زیادہ شرمندگی کی بات یہ ہے کہ علی نواز، خالدہ کے کردار پر شک کرنے لگا تھا اور ڈھکے چھپے الفاظ میں کئی بار کہہ چکا تھا کہ جاوید عرف جیدا اس کا خون نہیں ہے۔ اصل فساد یہیں سے شروع ہوا تھا۔ جب بعد میں پتا چلا کہ اس نے لاہور میں دوسری شادی کر رکھی ہے تو یہ فساد بڑھ کر خطرناک جنگ کی صورت اختیار کر گیا اور ایک سال کے اندر اندر خالدہ کو طلاق ہو گئی۔ پہلے وہ ہمارے ساتھ رہتی تھی۔ طلاق کے بعد وہ اپنی ماں گلزار بی بی کے پاس چلی گئی۔ اعجاز ان لوگوں کی ہر قسم کی مدد کرتا رہتا ہے۔"

"کردار پر شک" والی بات خالدہ یا اعجاز نے مجھے نہیں بتائی تھی۔ اب یہ نکتہ اچھی طرح میری سمجھ میں آگیا کہ علی نواز نے خالدہ کو طلاق دینے کے بعد اپنے بیٹے جیدا کے حصول کے لیے چارہ جوئی کیوں نہیں کی تھی۔ جب وہ جیدا کو اپنا خون ہی نہیں مانتا تھا تو پھر کسی قسم کی چارہ جوئی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا!

میں مزید آدھے گھنٹے تک نذیر حسین سے گھما پھرا کر مختلف نوعیت کے سوالات کرتا رہا جس سے بس یہی پتا چل سکا کہ علی نواز کا ان لوگوں سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ بس، نذیر حسین نے ایک سال پہلے علی نواز کو لاہور میں اس کے گھر میں ہی دیکھا تھا۔ اس کے بعد کی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔

میں نے علی نواز کا لاہور کا ایڈریس اور اس کے کام کاج کے بارے میں نذیر حسین سے تفصیل حاصل کی اور اسے رخصت کر دیا۔ نذیر حسین جس حد تک میرے لیے کار آمد ہو سکتا تھا وہ میں نے جان لیا تھا۔

نذیر حسین کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد افضل میرے پاس آ گیا۔ افضل نامی اس کانسٹیبل کا تعلق موضع شاہ پور ہی سے تھا۔ میں نے افضل کو کھوجی بابا شرافت علی کو لانے کے لیے بھیجا تھا۔

"کیا رپورٹ ہے افضل؟" وہ آ کر میرے سامنے بیٹھا تو میں نے پوچھ لیا۔

"رپورٹ تسلی بخش نہیں ہے ملک صاحب!" وہ مایوسی بھرے لہجے میں بولا۔ "کھوجی شرافت علی دو دن سے چکوال گیا ہوا ہے اور اس کی واپسی میں ابھی دو تین دن مزید لگیں گے۔"

"تو اس میں پریشانی والی کون سی بات ہے؟" میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔ "اس کی اب مجھے ضرورت نہیں رہی۔"

"ضرورت نہیں رہی......!" کانسٹیبل نے حیرت بھری نظر سے میری طرف دیکھا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ملک صاحب؟"

"اوئے جھلیا......!" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "پچھلے دو گھنٹے سے وقفے وقفے سے بارش کا جو سلسلہ جاری ہے اس نے ...... کھرا نشان سب کا سوا ستیاناس پھیر دیا ہے۔ پانی میں ڈوبی ہوئی گیلی زمین پر کھوجی کیا خاک کھرا تلاش کرے گا......!"

"اوہ......!" وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ "اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔"

"اپنے دھیان کو ریڈار کی طرح چاروں جانب حرکت دیتے رہا کرو۔" میں نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔ "تم پولیس والے ہو، کوئی سائنس داں نہیں جو تمہارا دھیان کسی ایک طرف لگا رہتا ہے۔"

"بس جی، غلطی ہو گئی۔" وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ "آئندہ میں اس بات کا خیال رکھوں گا۔"

"پولیس کا محکمہ بہت زیادہ ہوشیاری اور چالاکی کا تقاضا کرتا ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "انسان کو ہر وقت آنکھ، کان اور دماغ کے دروازے کھلے رکھنا پڑتے ہیں۔"

"میں آپ کی نصیحت کو یاد رکھوں گا ملک صاحب......!"

"یاد رکھنے ہی میں تمہاری بھلائی ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "ورنہ محکمے میں زندگی گزر جائے گی اور تم کانسٹیبل کے کانسٹیبل ہی رہو گے......"

افضل نے مجھے یقین دلایا کہ وہ زیادہ محنت اور لگن سے خدمات انجام دے گا۔ وہ محکمۂ پولیس میں بہت زیادہ ترقی کا خواہاں تھا اور میں نے اسے ترقی کا گر بتا دیا تھا۔ ہمارے درمیان لگ بھگ آدھا گھنٹا جیدا کی گمشدگی کے حوالے سے گفتگو ہوتی رہی۔ افضل چونکہ مقامی تھا لہٰذا ان میں سے بہت ساری باتیں وہ بھی جانتا تھا جو خالدہ اور نذیر حسین کی زبانی مجھ تک پہنچی تھیں۔ اس کا بھی نذیر حسین کی طرح یہی خیال تھا کہ جیدا کی گمشدگی میں اس کے باپ علی نواز کا کوئی ہاتھ نہیں ہو سکتا تھا لیکن میں ذرا وکھری ٹائپ کا تھانے دار تھا اور میرا سوچنے کا ایک مخصوص انداز تھا۔ میں کسی معمولی سے معمولی امکان کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے افضل ہی کو بھیج کر اے ایس آئی مظفر کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ مظفر میرے تھانے کا ایک ہونہار پولیس اہل کار تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔

وہ میرے سامنے ایک کرسی پر بیٹھ چکا تو میں نے پوچھا۔ "مظفر تمہاری مصروفیات کیسی چل رہی ہیں؟"

"مصروفیات تو سب آپ کے سامنے ہیں ملک صاحب۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "آپ حکم کریں......؟"

مظفر ایک کم گو، سنجیدہ اور بردبار شخص تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہاری مصروفیات میں، میں اضافہ کرنے والا ہوں۔ آج کا دن تمہیں میرے بغیر اس تھانے کا انتظام سنبھالنا ہو گا۔"

"آپ کہیں جا رہے ہیں؟" مظفر نے مجھ سے پوچھا۔

"ہاں، میرا لاہور جانے کا ارادہ ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "ابھی نکلوں گا اور کوشش کروں گا رات تک واپس آ جاؤں اور...... میری واپسی میں دیر بھی ہو سکتی ہے۔"

"آپ بے فکر ہو کر جائیں ملک صاحب!" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "انشاء اللہ! میں آپ کو کسی شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔"

"مجھے تم سے یہی امید تھی مظفر......!"

"ملک صاحب! آپ خیریت سے لاہور جا رہے ہیں نا؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"خیریت کہاں ہے مظفر......!" میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میں گمشدہ جیدا کے سلسلے میں اس کے باپ علی نواز سے ملنے جا رہا ہوں......!"

"ہوں......!" وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

وہ مزید تھوڑی دیر تک میرے پاس بیٹھا رہا اور

ہمارے درمیان تھانے کے انتظامی امور کے حوالے سے بات چیت ہوتی رہی۔ ان دنوں تھانے میں زیادہ مصروفیات نہیں تھیں۔ جاوید عرف جیدا والا کیس اگست کے مہینے کا پہلا ایسا کیس تھا جس میں، صحیح معنوں میں ہاتھ پاؤں ہلانے کا موقع مل رہا تھا......!

XXX

میں سہ پہر تین بجے لاہور میں تھا۔ سب سے پہلے میں نے متعلقہ پولیس آفس جا کر اپنی آمد کی غرض و غایت سے انہیں آگاہ کیا پھر علی نواز کے گھر کا رخ کیا۔ نذیر حسین سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق علی نواز لاہور کے علاقے گڑھی شاہو میں رہتا تھا اور جب ایک سال پہلے نذیر حسین اس سے مل کر گیا تھا تو وہ کسی فیکٹری میں کام کرتا تھا اور نذیر حسین کو اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ بہت جلد فیکٹری کی ملازمت چھوڑ کر کوئی اور کام کرے گا، اسی خیال کے پیش نظر میں نے فیکٹری کے بجائے اس کے گھر کا رخ کیا تھا۔

گڑھی شاہو میں علی نواز کا گھر ڈھونڈنے میں مجھے زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ یہ علاقہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ میں نے مطلوبہ دروازے پر جا کر دستک دی۔ دوسری دستک کے جواب میں اندر سے آواز آئی۔

"کون ہے جی......؟"

آواز نسوانی تھی لہٰذا مجھے یہ اندازہ لگانے میں مشکل پیش نہ آئی کہ وہ علی نواز کی بیوی نورین ہو گی۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بہ آواز بلند کہا۔

"نورین بی بی! میں علی نواز سے ملنے آیا ہوں......!"

"وہ تو گھر میں نہیں ہیں......"

"علی نواز کہاں گیا ہے؟"

"وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ڈیوٹی پر گئے ہیں۔"

"اس وقت ڈیوٹی پر......" میں نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔ "کیا علی نواز آج کل رات کی ڈیوٹی کر رہا ہے؟"

"جی ہاں...... آپ کو نہیں پتا کیا......!" نورین کی متذبذب آواز ابھری۔ "وہ روزانہ اسی وقت جاتے ہیں اور آدھی رات کو واپس آتے ہیں۔" لمحاتی توقف کے بعد اس نے اضافہ کرتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

"آپ نے بتایا نہیں، کون ہیں...... آپ کو علی نواز سے کیا کام ہے؟"

"میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔" میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا۔ "مجھے علی نواز سے بہت ضروری کام ہے۔ میں موضع شاہ پور سے آیا ہوں۔"

"شاہ پور......!" الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔

"ہاں، شاہ پور!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اور میں وہاں کا تھانے دار ہوں......!"

"پولیس......!" اس کی گھبرائی ہوئی آواز نکلی۔ "آپ...... ہمارے دروازے پر کیوں آئے ہیں...... ادھر سب خیریت تو ہے نا......؟"

"پولیس کی آمد کا مطلب خیریت نہیں ہوتا نورین بی بی!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "تم دروازہ کھولو۔ مجھے تم سے بھی چند باتیں کرنا ہیں۔ میں گلی میں زیادہ دیر کھڑا رہا تو لوگوں کو تشویش ہو گی کہ تمہارے گھر پولیس کیوں آئی ہے......؟"

بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے میرے لیے دروازہ کھول دیا۔ اگلے ہی لمحے میں نورین کی معیت میں اس کی بیٹھک میں پہنچ گیا۔

وہ لگ بھگ تین مرلے رقبے پر بنا ہوا دو کمروں کا ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ آگے پیچھے دو کمرے اور بیچ میں چھوٹا سا صحن۔ ہم اس وقت گھر کے اگلے کمرے یعنی بیٹھک میں بیٹھے تھے۔ وہ ایک سادہ سی سجاوٹ والی عام بیٹھک تھی۔ میں نے بیٹھتے ہی نورین کا تنقیدی جائزہ لیا۔

وہ علی نواز کی دوسری بیوی تھی۔ میں اس کی پہلی...... بلکہ سابق بیوی خالدہ سے بھی مل چکا تھا۔ خالدہ کے مقابلے میں نورین کہیں زیادہ خوب صورت اور دلکش عورت تھی۔ علی نواز کا اس کی جانب جھکاؤ سمجھ میں آنے والی بات تھی۔

"آخر ہوا کیا ہے...... کچھ بتائیں تو سہی؟" وہ پریشان لہجے میں بولی۔

"ہوا یہ ہے کہ علی نواز کا بیٹا جاوید عرف جیدا کہیں غائب ہو گیا ہے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے بتانا شروع کیا۔ "پورے شاہ پور میں اسے ڈھونڈ لیا گیا ہے۔ میں اسی سلسلے میں علی نواز سے بات کرنے آیا ہوں۔"

"لیکن علی نواز کا ان لوگوں سے کیا تعلق۔ یہ تو پچھلے چار سال سے شاہ پور گئے ہی نہیں۔" وہ بکھری ہوئی آواز میں بولی۔ "جب سے انہوں نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دی ہے، اپنی سسرال والوں سے ہر رشتہ ناتا توڑ دیا ہے......"

"زبان سے قائم کیے گئے رشتے زبان سے توڑے جا سکتے ہیں نورین۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن خون کے رشتے ہر حال اور ہر قیمت پر [illegible] ہیں۔ علی [illegible] نے لاکھ خالدہ کو طلاق دے دی [illegible] سے ناتا توڑ رکھا ہو اور چاہے وہ اپنے [illegible]، چاچی سے بھی منہ موڑے بیٹھا ہو لیکن جیدا تو اس

کا بیٹا ہے، اس کا خون ہے......!‘‘
’’ہاں...... آپ ٹھیک کہتے ہیں تھانے دار جی پر......!‘‘
’’پر کیا......؟‘‘ اس نے جملہ نامکمل چھوڑا تو میں نے جلدی سے پوچھا۔
’’وہ جی...... میری کئی بار علی نواز سے اس موضوع پر بات ہوئی ہے۔‘‘ وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ ’’لیکن وہ تو جیدا کو اپنا خون ہی نہیں سمجھتے......‘‘
’’میں اس کہانی سے بھی واقف ہو چکا ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’اور میں یہاں اس سلسلے میں کوئی ریسرچ کرنے نہیں آیا کہ علی نواز جیدا کو اپنا بیٹا سمجھتا ہے یا نہیں...... میں تو یہ دیکھنے آیا ہوں کہ کہیں جیدا کی گمشدگی میں علی نواز کا ہاتھ تو نہیں......؟‘‘
میرے انداز نے نورین کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔ وہ بے حد الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ’’علی نواز کیوں جیدا کو غائب کریں گے......؟‘‘
’’یہ تو میں اسی سے پوچھوں گا۔‘‘ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ’’ذرا اس سے میری ملاقات تو ہو جائے......‘‘
’’علی نواز سے ملنا ہے تو آپ سینما چلے جائیں۔‘‘ وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔
’’سینما؟‘‘ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
’’ہاں، وہ سینما ہی میں تو کام کرتے ہیں۔‘‘ وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔
’’تو کیا فیکٹری کی نوکری اس نے چھوڑ دی؟‘‘
’’ہاں...... کافی دن ہو گئے۔‘‘ اس نے جواب دیا۔ ’’آٹھ دس ماہ سے تو وہ سینما جاتے ہیں...... اور رات کو دیر سے واپس آتے ہیں۔‘‘
’’وہ سینما میں کیا کرتا ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔
’’ٹکٹ وغیرہ دیتے ہیں......‘‘ اس نے بتایا۔
میں نے سوال کیا۔ ’’کس سینما میں؟‘‘
نورین نے ایک سینما کا نام بتایا۔ گڑھی شاہو میں پہلو بہ پہلو دو سینماز بنے ہوئے تھے۔ ان کے نام ظاہر کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ علی نواز ان ہی میں سے ایک میں ٹکٹ کلرک تھا۔ میں نے نورین کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔
’’علی نواز سے تو میں سینما جا کر ہی ملاقات کر لوں گا کیونکہ میں آدھی رات تک یہاں بیٹھ کر اس کی واپسی کا انتظار تو کر نہیں سکتا۔ لیکن اس سے پہلے میں تمہارے گھر کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔‘‘
’’سیدھی طرح یہ کیوں نہیں کہتے کہ گھر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔‘‘ وہ تیکھے لہجے میں بولی۔ ’’تاکہ اس بات کا اطمینان کر سکیں کہ کہیں خالدہ کے بچے جیدا کو ہم نے اپنے گھر میں تو نہیں چھپا رکھا......‘‘
’’اگر تم ایسا سمجھتی ہو تو ایسا ہی سہی۔‘‘ میں نے سرسری انداز میں کہا۔
آئندہ پندرہ منٹ میں، میں نے اس مختصر سے مکان کا تفصیلی معائنہ کر لیا اور بلاشبہ اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ گھر جیدا کے وجود سے خالی تھا۔ ہم دوبارہ بیٹھک میں آبیٹھے۔
’’اب تو آپ کی تسلی ہو گئی نا؟‘‘ نورین نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔
’’میں ایک پولیس آفیسر ہوں۔‘‘ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ’’کسی گھر کے چھوٹے موٹے سروے سے اگر پولیس والوں کی تسلی ہونے لگے تو پھر سب کیس تھانے میں بیٹھے بٹھائے ہی حل ہو جائیں...... لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔
’’جیدا کی گمشدگی کے بارے میں تو میں سینما جا کر علی نواز سے پوچھ گچھ کر ہی لوں گا...... تم ذرا مجھے علی نواز کی گمشدگی کے بارے میں تو بتاؤ؟‘‘
’’علی نواز کی گمشدگی؟‘‘ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ’’میں سمجھی نہیں تھانے دار صاحب...... علی نواز کہاں گم ہو گیا ہے؟‘‘
’’لاہور میں!‘‘ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ’’وہ علی نواز جو شاہ پور سے ملازمت کی تلاش میں شہر لاہور آیا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔‘‘
اس نے متذبذب انداز میں مجھے دیکھا تاہم منہ سے کچھ نہ بولی۔
میں نے کہا۔ ’’نورین بی بی! میں تمہاری اور علی نواز کی شادی کی کہانی سننا چاہتا ہوں......؟‘‘
وہ چند لمحات تک خاموش رہ کر اپنے ذہن میں بکھرے ہوئے خیالات کو ایک نقطے پر مرکوز کرتی رہی پھر ٹھہرے ہوئے انداز میں مجھے اپنی کہانی سنانے لگی۔ میں نورین کی داستان میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔
نورین اپنی بوڑھی ماں سلطانہ کے ساتھ اس گھر میں رہتی تھی۔ عرصہ پہلے اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ یہ گھر ان کا اپنا تھا لہٰذا نورین کے باپ اکرام اللہ کی وفات کے بعد ان ماں بیٹی کے لیے رہائش کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ ان کے لیے ایک کمرا کافی تھا چنانچہ سلطانہ بی بی نے بیٹھک کو کرائے پر دے دیا جس سے ایک مخصوص رقم گھر میں آنے لگی۔ علاوہ ازیں وہ گھر پر بچوں اور عورتوں کے کپڑے سلائی کر کے بھی کچھ پیسے کما لیا کرتی تھی۔ اس کام میں نورین بھی اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتی تھی جس کے نتیجے میں بڑے اچھے انداز میں ان کی گزر بسر ہو رہی تھی۔ انہیں کبھی مالی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔
گھر کی بیٹھک میں، مختلف ادوار میں مختلف کرایہ دار آکر رہائش اختیار کرتے رہے تھے۔ انہی کرایہ داروں میں علی نواز سب سے آخری ثابت ہوا تھا۔ علی نواز کسی فیکٹری میں ملازم تھا اور اس نے سلطانہ بی بی کی بیٹھک کرائے پر لے رکھی تھی۔ اسی قیام کے دوران میں علی نواز اور نورین کے بیچ پسندیدگی کا رشتہ استوار ہو گیا۔ علی نواز نے نورین یا سلطانہ بی بی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ شادی شدہ ہے اور گاؤں میں اس کی بیوی اور بچہ بھی ہے۔
سلطانہ بی بی کی صحت خراب رہنے لگی تو اسے اپنی بیٹی کے مستقبل کی فکر ہوئی۔ وہ نورین اور علی نواز کے درمیان پسندیدگی کے پروان چڑھتے ہوئے جذبات سے بے خبر نہیں تھی لہٰذا ایک روز اس نے علی نواز سے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔
اس ’’صاف صاف بات‘‘ کے نتیجے میں نورین اور علی نواز کی شادی ہو گئی۔ ان کی شادی کے دو ماہ بعد سلطانہ بی بی کا انتقال ہو گیا۔ اب نورین اور علی نواز اس گھر کے مالک و مختار بن گئے تھے۔ کچھ ہی عرصے کے بعد علی نواز نے نورین کو خالدہ اور جیدا کے بارے میں پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا۔
نورین کو حقیقت جان کر اتنا دکھ نہیں ہوا تھا جتنا افسوس اسے علی نواز کے جھوٹ بولنے پر ہوا تھا۔ بہرحال علی نواز نے کسی طرح منت خوشامد کر کے نورین کو منا لیا اور یہ وعدہ کیا کہ نہ صرف وہ خالدہ کو طلاق دے دے گا بلکہ کبھی پلٹ کر شاہ پور بھی نہیں جائے گا۔ نورین مطمئن ہو گئی۔
علی نواز نے طلاق کے حوالے سے اپنا وعدہ پورا کر دیا اور پچھلے چار سال سے اس نے پلٹ کر شاہ پور کی طرف بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہا تھا۔ نورین سے اس کی دو اولادیں تھیں۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔ بیٹی کا نام مہوش تھا جو اب تین سال کی تھی۔ اس سے چھوٹے بیٹے فراز کی عمر ڈیڑھ سال تھی۔ وہ دونوں اپنی ماں کی طرح خوش شکل اور پرکشش بچے تھے۔
میں نے مہوش اور فراز کو پیار کیا اور نورین کا شکریہ ادا کر کے اس کے گھر سے نکل آیا۔
شاہ پور واپسی سے پہلے میں نے متعلقہ سینما جا کر علی نواز سے بھی ملاقات کی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ عمر پینتیس کے آس پاس رہی ہوگی۔ اس کے بال سلکی تھے اور انہی بالوں کی ایک موٹی سی لٹ بار بار اس کے چہرے پر آجاتی تھی۔
علی نواز کی ڈیوٹی ڈریس سرکل والی ٹکٹ ونڈو پر تھی۔ اس وقت ہال کے اندر شو چل رہا تھا لہٰذا وہ فارغ ہی بیٹھا تھا۔ میں نے وہاں پہنچ کر اپنا تعارف کرایا اور رسمی علیک سلیک کے بعد اسے اپنی آمد کی غرض و غایت سے آگاہ کیا۔ اس نے جیدا کی گمشدگی پر کسی خاص ردعمل کا اظہار نہیں کیا، بس افسوسناک انداز میں گردن ہلا کر رہ گیا۔
’’علی نواز!‘‘ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ’’ایسا کیوں...... تمہیں جیدا کی گمشدگی کا دکھ کیوں نہیں ہوا...... وہ تمہارا خون ہے......؟‘‘
اس نے زخمی نظر سے مجھے دیکھا اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ’’تھانے دار صاحب! اس ذکر کو چھوڑ ہی دیں تو اچھا ہے......‘‘
’’اگر اس ذکر کو چھوڑنا ہوتا تو میں شاہ پور سے سفر کر کے یہاں تک نہیں آتا۔‘‘ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ’’یہ ٹھیک ہے کہ میں جیدا کی تلاش میں تم تک پہنچا ہوں۔ میں اس امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ جیدا کی گمشدگی میں تمہارا ہاتھ بھی ہو سکتا ہے لیکن جیدا والے معاملے کے علاوہ بھی میرا تم سے ملنے کا ایک خاص مقصد تھا......‘‘
’’خاص مقصد؟‘‘ اس نے چونک کر سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا۔
میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ’’ہاں علی نواز...... یہ بات مجھے ادھر شاہ پور ہی میں پتا چل گئی تھی کہ تم جیدا کو اپنا خون تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہو اور اس حوالے سے تم خالدہ کے کردار کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے جبھی تم نے اسے طلاق دی تھی۔‘‘
’’کہیں آپ اسی وجہ سے تو مجھ پر شک نہیں کر رہے تھانے دار صاحب!‘‘ وہ فکرمندی سے بولا۔ ’’آپ مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں، میں جیدا کی گمشدگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ آپ چاہیں تو میرے گھر کی تلاشی بھی لے سکتے ہیں......‘‘

''میں نے یہ چاہا تھا اور تمہاری اطلاع کے لیے بتاتا چلوں کہ میں تمہارے گھر کی تلاشی لینے کے بعد ہی ادھر آیا ہوں اور میں نے تمہاری بیوی کا بھی انٹرویو کرلیا ہے۔'' میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ ''اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ہی میں تمہاری طرف آیا ہوں۔''

وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے بولا۔ ''اس کا مطلب ہے جیدا کی گمشدگی کے حوالے سے آپ کی تسلی ہوگئی ہے......؟''

''ہاں......صرف جیدا کی گمشدگی کے حوالے سے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ابھی ایک اہم حوالہ باقی ہے اور اس حوالے سے صرف تم ہی میری تسلی کرسکتے ہو......''

''کون سا حوالہ تھانے دار صاحب؟'' وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تمہیں خالدہ کے کردار پر کیوں شک تھا اور یہ کہ تم جیدا کو اپنا خون تسلیم کرنے سے گریزاں کیوں ہو......؟''

''آپ نے اس موضوع کو چھیڑ ہی دیا ہے تو پھر سنیں۔'' وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''اور مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے سوالات کے جوابات حاصل کیے بغیر جائیں گے نہیں۔''

''تمہیں بالکل درست یقین ہے۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''اس نکتے نے میرے ذہن میں اچھا خاصا انتشار پیدا کر رکھا ہے۔''

''میں بتاتا ہوں آپ کو سارا چکر۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ ساتھ ساتھ چائے بھی پیتے جائیں......''

ایک بات کا ذکر کرنا میں بھول گیا کہ علی نواز نے میرے منع کرنے کے باوجود بھی چائے منگوالی تھی۔ میں نے چائے کی پیالی اٹھائی اور ایک چسکی لینے کے بعد سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''تھانے دار صاحب! میرے ماں باپ کا بہت پہلے انتقال ہوگیا تھا جب میں بہت چھوٹا سا تھا......''

''یہ ساری کہانی میرے علم میں آچکی ہے علی نواز!'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے والدین اور گھر کے دوسرے لوگ خاندانی دشمنی کی بھینٹ چڑھ گئے تھے اور تمہاری پرورش چاچا چاچی نے کی ہے۔'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم مجھے اپنی خالدہ سے شادی کے بعد کی کہانی سناؤ......؟''

''ٹھیک ہے جی۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''خالدہ سے میری شادی چاچا نذیر حسین کے زور دینے پر ہوئی تھی ورنہ چاچی عنایت کا تو کوئی اور ہی ارادہ تھا۔''

''تمہاری چاچی کا کیا ارادہ تھا؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''وہ اپنی بہن جمیلہ کی بیٹی نرگس سے میری شادی کرنا چاہتی تھی۔'' علی نواز نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''لیکن نرگس مجھے بالکل پسند نہیں تھی۔''

''ناپسندیدگی کی وجہ؟''

''بس، مجھے اس کی آنکھیں بڑی عجیب لگتی تھیں۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''اس کو دیکھ کر میری ہنسی نکل جاتی تھی۔''

''تمہارا مطلب ہے، نرگس بھینگی تھی؟''

''بھینگی سے بھی دس ہاتھ آگے۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''میری آخری معلومات کے مطابق، ابھی تک نرگس کی شادی نہیں ہوئی۔''

میں نے اپنی تسلی کی خاطر پوچھ لیا۔ ''یہ آخری معلومات تمہیں کب اور کس نے دی تھیں۔ تم تو پچھلے چار سال سے شاہ پور گئے ہی نہیں ہو......؟''

''کوئی ایک سال پہلے چاچا نذیر حسین مجھ سے ملنے لاہور آیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''اس وقت میں ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ چاچا کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ نرگس ابھی تک بیٹھی ہوئی ہے۔''

''اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے لیے اس کی زندگی کا ساتھی پیدا کر رکھا ہے، بس تلاش کرنے کی بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم مجھے خالدہ کے کردار کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے......؟''

''جی......میری خالدہ سے شادی ہوگئی۔'' وہ قصے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''چاچی اس رشتے پر مجھ سے ناراض تھی کیونکہ میں نے اس کی بھانجی نرگس کو ٹھکرا دیا تھا۔ گھر میں ہلکی پھلکی نوک جھوک چلتی رہتی تھی اور پھر میں ملازمت کی تلاش میں لاہور آگیا۔ زمینداری اور کھیتی باڑی میں میرا ابھی بدل نہیں لگا تھا۔ شادی سے پہلے تو کسی نہ کسی طرح چل رہا تھا لیکن ایک ذمے دار شخص ہونے کے ناتے اب مجھے کچھ نہ کچھ لازماً کرنا تھا۔ گاؤں میں میرے لیے کچھ نہیں تھا لہٰذا روزگار کی تلاش میں، میں یہاں آگیا......''

اس نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر سلسلۂ بیان کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''شادی کے دوسرے سال ہی جیدا پیدا ہوگیا تھا لیکن پتا نہیں کیوں مجھے اس بچے میں وہ کشش محسوس نہیں ہوتی تھی جو ایک باپ کو اپنی اولاد کے لیے محسوس ہونا چاہیے۔ میں نے بہت سوچا، غور کیا اور پھر ایک حتمی نتیجے پر پہنچ گیا۔ میں نے مسئلے کا سبب ڈھونڈ نکالا تھا۔''

میں سیدھا ہوکر بیٹھ گیا اور پوچھا۔ ''تم نے کون سا سبب ڈھونڈا تھا؟''

''اس کا نام تھا اشتیاق......'' وہ پرخیال انداز میں بولا۔ ''میرے مسئلے کی جڑ صرف اور صرف اشتیاق ہی تھا۔''

''یہ اشتیاق کون تھا؟'' میں نے پوچھا۔ ''اس بندے کے بارے میں کچھ بتاؤ......''

''اشتیاق، نرگس کا چھوٹا بھائی ہے تھانے دار صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''دونوں کی عمروں میں دو تین سال کا فرق ہوگا۔ اشتیاق پہلے بھی کبھار ہی اپنی خالہ یعنی میری چاچی سے ملنے آجایا کرتا تھا لیکن جیسے ہی میں نے لاہور کا رخ کیا، گھر میں اشتیاق کی آمدورفت بڑھ گئی تھی۔ میں جب بھی شاہ پور جاتا، گھر میں سب سے زیادہ اشتیاق کا ذکر ہوتا تھا۔ یہ میرے لیے ناقابلِ یقین اور حیرت کی بات تھی کیونکہ پہلے ہر کوئی اشتیاق کو مطعون کیا کرتا تھا۔ وہ ایک آوارہ گرد اور لفنگا شخص تھا۔ سارا دن اپنے ہی جیسے آوارہ لوگوں کے ساتھ گھومتا رہتا تھا۔ ایسے لفنگے کی گھر میں تعریفیں سن کر میرا ماتھا ٹھنکا اور میں تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ گھر کے دوسرے افراد کی مجھے زیادہ پروا نہیں تھی لیکن خالدہ کی زبان سے اس لفنگے کا بار بار نام سن کر مجھے بہت اذیت پہنچتی تھی۔ میں پورا مہینا پردیس میں گزار کر ایک دو دن کے لیے خالدہ اور جیدا سے ملنے آتا تھا اور یہ لوگ مجھے پرائے پرائے سے نظر آتے تھے۔ میں کوئی بھی بات شروع کرتا تو خالدہ گھما پھرا کر قصے کو اشتیاق کی طرف لے جاتی اور اس کی بے جا تعریفیں کرنے لگتی۔ خالدہ کا یہ رویہ مجھے زہر لگنے لگا۔ دوسری طرف میں نے دیکھا کہ جیدا بھی اشتیاق کے ساتھ بہت زیادہ ہلا ہوا تھا۔ وہ میرے پاس کم آتا اور اشتیاق کی گود میں زیادہ چڑھا رہتا۔ میں کچھ عرصہ تک تو یہ بے ہودگی برداشت کرتا رہا پھر میں نے خالدہ کو سمجھانے کا فیصلہ کرلیا......''

''تمہارے سمجھانے کا کیا نتیجہ برآمد ہوا؟'' وہ خاموش ہوا تو میں نے سوال کیا۔

''ہونا تو یہی چاہیے تھا کہ خالدہ میری بات کو سنجیدگی سے سنتی لیکن نتیجہ اس کے برعکس برآمد ہوا۔'' وہ زہرخند لہجے میں بولا۔ ''وہ میری بات سنتے ہی الٹا اشتیاق کی حمایت کرنے لگی۔ میں اس کا شوہر تھا لیکن ہر خوبی اسے اشتیاق میں نظر آتی تھی۔ بیوی کا ایسا رویہ کسی بھی شوہر کا دماغ خراب کرنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ تک ہمارے درمیان اس معاملے پر سرد جنگ چلتی رہی پھر میں نے چپکے سے یہاں لاہور میں نورین سے شادی کرلی......'' وہ تھوڑی دیر کے لیے تھما، ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''ایک سال کے اندر ہی، پتا نہیں کیسے میری دوسری شادی کی خبر شاہ پور تک پہنچ گئی۔ اس دفعہ جب میں گاؤں گیا تو خالدہ نے میرے ساتھ جھگڑا کیا۔ میں نے بھی اس موقع پر اپنے دل کا سارا غبار نکال لیا۔ اشتیاق اور خالدہ کے تعلقات کے حوالے سے میرے دماغ میں جو جہنم دہک رہا تھا اس کی ساری آگ میں نے خالدہ پر اگل دی۔ گھر میں بڑا سنگین ہنگامہ ہوا۔ چاچی آستینیں چڑھا کر اشتیاق کی حمایت پر اتر آئی اور اس نے اعلان کردیا کہ اشتیاق اس کا بھانجا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اسے گھر میں آنے سے نہیں روک سکتی۔ چاچا نے بھی خالدہ کے آنسوؤں کا پاس رکھا اور مجھے ہی سمجھانے بجھانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے سب پر لعنت بھیجی، خالدہ کو طلاق دی اور لاہور آگیا۔ پھر میں نے پلٹ کر شاہ پور کی طرف نہیں دیکھا۔ میں یہاں نورین اور دونوں بچوں کے ساتھ بہت خوش ہوں اور ماضی کے کسی قصے کو دہرا کر اپنی زندگی میں تلخیاں نہیں بھرنا چاہتا۔ اگر آپ قانون کے محافظ نہ ہوتے تو شاید میں اس موضوع پر آپ سے کوئی بات نہ کرتا......''

میں نے چائے ختم کی، علی نواز کے تعاون کا شکریہ ادا کیا اور گڑھی شاہو کے پچر پاؤس سے نکل کر واپسی کے لیے لاری اڈے کی جانب روانہ ہوگیا۔

XXX

گزشتہ پوری رات وقفے وقفے سے بارش ہوتی رہی تھی۔ میں صبح تیار ہوکر تھانے پہنچا تو ایک نئی خبر میری منتظر تھی۔ میں نے جن دو سادہ لباس کانسٹیبلز کو شاہ پور کی سن گن لینے کے لیے روانہ کیا تھا ان میں سے ایک واپس آگیا تھا اور فیاض نامی وہ پولیس اہلکار میرے لیے ایک سنسنی خیز اطلاع لے کر آیا تھا۔ میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلالیا۔

''ہاں بھئی فیاض! کیا خبر لائے ہو؟'' وہ میرے

سامنے آکر کھڑا ہوا ہی تھا کہ میں نے پوچھا۔

''ملک صاحب! جس دن جیدا غائب ہوا ہے نا جی، اس سے ایک دن پہلے دو مشکوک افراد کو شاہ پور میں دیکھا گیا ہے۔'' فیاض نے بتایا۔ ''وہ اعجاز کی بہن خالدہ کا گھر ڈھونڈ رہے تھے......''

یہ اطلاع واقعی بے حد چونکا دینے والی تھی۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور فیاض کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''وہ دونوں مشکوک افراد کون تھے؟''

''جناب! ان کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون تھے اور کہاں سے آئے تھے......''

''انہوں نے گاؤں کے کس بندے سے خالدہ کا گھر پوچھا تھا؟''

''شوکت علی سے......!''

''یہ شوکت علی کون ہے؟''

''شاہ پور کا ایک چھوٹا زمیندار ہے۔''

''کیا شوکت علی بھی ان دو بندوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا؟''

''نہیں جناب!'' کانسٹیبل نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''وہ دونوں شوکت علی کے لیے بالکل اجنبی تھے۔ اس سے پہلے شوکت نے انہیں شاہ پور میں یا شاہ پور سے باہر کہیں نہیں دیکھا۔''

''کیا شوکت علی نے ان مشکوک افراد کو خالدہ کے گھر کا پتا بتا دیا تھا؟''

''جی...... شوکت نے یہی بتایا ہے۔'' فیاض نے جواب دیا۔

''تم نے شوکت سے ان بندوں کے حلیے اور وضع قطع کے بارے میں سوال نہیں کیا؟'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ملک صاحب! میں شوکت علی کو اپنے ساتھ تھانے لے آیا ہوں۔'' کانسٹیبل نے جوش بھرے انداز میں بتایا۔ ''تاکہ آپ اس سے تفصیلی پوچھ گچھ کر سکیں۔''

''یہ تم نے عقل مندی کا کام کیا ہے......'' میں نے ستائشی نظر سے فیاض کی طرف دیکھا پھر تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''شوکت کو میرے پاس بھیجو......''

تھوڑی دیر کے بعد شوکت علی نامی وہ زمیندار میرے سامنے موجود تھا۔ اس نے بڑے ادب سے مجھے سلام کیا۔ میں نے اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ ہچکچاتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

شوکت علی کی عمر چالیس اور پچاس کے درمیان تھی۔ وہ عام شکل صورت کا مالک ایک دیہاتی شخص تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''وہ دونوں بندے تمہیں کب اور کہاں ملے تھے؟''

''جس دن جیدا گم ہوا ہے اس سے پہلے والی شام۔'' شوکت نے جواب دیا۔ ''میں کھیتوں میں موجود تھا کہ انہوں نے مجھ سے اعجاز کریانے والے کی بہن خالدہ کے گھر کا پتا پوچھا۔ خالدہ اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہے۔ میں نے انہیں گلزار بی بی کے گھر کا پتا بتا دیا۔ بس جناب، میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا......''

''وہ دونوں تمہارے لیے اجنبی تھے۔'' میں نے شوکت کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے انہیں پہلے کبھی شاہ پور میں نہیں دیکھا......؟''

''نہیں جی......!'' اس نے بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلائی۔ ''نہ شاہ پور کے اندر اور نہ ہی باہر کہیں......''

''ان کے حلیے اور شکلیں وغیرہ تمہیں یاد ہیں؟'' میں نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔ ''اگر وہ دوبارہ تمہارے سامنے آجائیں تو تم پہچان لو گے......؟''

''جی بالکل پہچان لوں گا۔'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔

''ان کے حلیوں کے بارے میں مجھے بھی بتاؤ......؟''

''ان میں سے ایک دراز قد اور دبلا پتلا تھا۔ رنگ سانولا، عمر تیس سال کے قریب۔'' شوکت علی نے اپنی یادداشت پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اس کی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے بھی بنے ہوئے تھے جیسے دو تین راتوں سے جاگا ہوا ہو۔ وہ خاصا الجھا ہوا اور بیزار نظر آتا تھا۔''

''اور دوسرا؟'' شوکت علی کی بات ختم ہوئی تو میں نے پوچھ لیا۔

''دوسرا درمیانے قد اور متناسب بدن کا مالک تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اس کا رنگ گندمی اور عمر لگ بھگ پینتیس سال رہی ہوگی۔ اس بندے کے سر کے بال حد سے زیادہ سیاہ اور گھونگریالے تھے۔''

''شوکت علی!'' میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم نے بڑی وضاحت کے ساتھ ان کے حلیے بیان کیے ہیں۔ اب ذرا ان کے لباس کے بارے میں بھی بتا دو۔''

''جی تھانے دار صاحب......!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''سانولے رنگ کے لمبے تڑنگے آدمی نے بادامی رنگ پاپلین کا شلوار قمیص پہن رکھا تھا جبکہ گھونگریالے بالوں والے کے جسم پر لٹھے کا لباس تھا......

کرتہ اور شلوار!''

''شوکت علی!'' میں نے سوال کیا۔ ''تم نے ان کے نام وغیرہ نہیں پوچھے تھے؟''

''جی، میں نے پوچھا تھا لیکن انہوں نے نام بتانے کے بجائے کچھ اور ہی جواب دیا۔'' وہ سادگی سے بولا۔ ''پھر میں نے انہیں کریدنا ضروری نہیں سمجھا اور اپنے کھیتی باڑی کے کام میں مصروف ہو گیا......''

''انہوں نے ایسا کیا جواب دے دیا تھا شوکت علی کہ تمہاری بولتی بند ہو گئی۔'' میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اسے دیکھا۔

''انہوں نے کہا تھا کہ......'' شوکت نے جواب دیا۔ ''ہم لاہور سے آئے ہیں۔ علی نواز نے ہمیں بھیجا ہے۔ خالدہ کو کوئی خاص اطلاع دینا ہے......''

شوکت علی کی بات سن کر میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ فوری طور پر میرے اندر یہ خیال ابھرا...... وہ دونوں جو کوئی بھی تھے ان کا علی نواز سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں کل ہی علی نواز سے مل کر آیا تھا اور اس ملاقات میں، میں نے اس کے بارے میں جو رائے قائم کی تھی اس کی روشنی میں وہ جیدا کی گمشدگی میں ملوث نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر ان دو مشکوک اجنبی افراد نے علی نواز اور لاہور کا ذکر کیا تھا تو اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ علی نواز کو کسی چکر میں پھنسانے کی سازش کر رہے تھے اور عین ممکن تھا کہ جیدا کو انہی لوگوں نے کہیں غائب کر دیا ہو۔ اگر وہ علی نواز کے بھیجے ہوئے بندے ہوتے تو پھر یہ کبھی ظاہر نہ کرتے کہ انہیں علی نواز نے کسی ضروری کام سے خالدہ کے پاس بھیجا ہے۔ اگر وہ دونوں نامعلوم افراد میرے ہتھے چڑھ جاتے تو جیدا کی گمشدگی کا عقدہ حل ہو سکتا تھا۔

شوکت علی مجھے جتنی معلومات فراہم کر چکا تھا اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتا تھا لہٰذا مزید چند سوالات کے بعد میں نے اسے اس ہدایت کے ساتھ رخصت کر دیا۔

''شوکت علی! جب تک جیدا کی گمشدگی کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا، تم شاہ پور گاؤں سے باہر نہیں جاؤ گے اور اگر تمہارا جانا بہت ہی ضروری ہوا تو پہلے تم تھانے میں آکر مجھے اطلاع دو گے۔ اس کے بعد ہی کسی طرف کا رخ کرو گے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا......؟''

''جی، سمجھ رہا ہوں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''شاید آپ کو کسی حوالے سے مجھ پر شک ہو رہا ہے......''

''لگتا ہے، تم میری بات کو کچھ زیادہ ہی سمجھ گئے ہو......'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''ایسا کچھ بھی نہیں کہ مجھے کسی حوالے سے تم پر شک ہو۔ میں نے تمہیں محض اس لیے شاہ پور میں رکنے کی تاکید کی ہے کہ وہ دونوں مشکوک بندے کسی وقت بھی پولیس کے ہتھے چڑھ سکتے ہیں۔ ان کی شناخت کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑے گی اس لیے تمہارا گاؤں میں موجود رہنا ضروری ہے۔''

شوکت علی نے ایک سکون بھری سانس خارج کی اور مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ میں نے فوراً کانسٹیبل فیاض کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔ فیاض آیا تو میں نے اسے ان دو افراد کے حلیوں سے تفصیلاً آگاہ کیا اور ہدایت کی کہ وہ...... نہایت ہی محتاط انداز میں یہ جاننے کی کوشش کرے کہ اس وضع قطع کے بندوں کو گاؤں میں اور کس کس نے دیکھا ہے۔ ہو سکتا ہے، اس طرح ان کا سراغ لگانے میں آسانی ہو جائے۔

فیاض نے میری ہدایات پر کماحقہ، عمل کرنے کا یقین دلایا اور مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ میں نے مقامی کانسٹیبل افضل محمود کو اپنے پاس بلا لیا۔

''جی حکم ملک صاحب!'' وہ میرے سامنے باادب باملاحظہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

''افضل! تم اشتیاق کو جانتے ہو؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''کون سا...... اشتیاق ملک صاحب؟'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ ''شاہ پور میں تو تین چار اشتیاق ہیں......''

''میں نذیر حسین کی سالی جمیلہ کے بیٹے اشتیاق کی بات کر رہا ہوں۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''جس کی بہن نرگس بھینگی ہے......''

''اچھا اچھا...... وہ اشتیاق!'' وہ جلدی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ کوئی خاص بات؟''

''کوئی خاص بات نہیں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''بس، میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کس قسم کا بندہ ہے اور آج کل کس نوعیت کی مصروفیات میں لگا ہوا ہے......؟''

''بہت ہی نکما اور فضول قسم کا بندہ ہے وہ۔'' کانسٹیبل نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''اسے آوارگی ہی سے فرصت نہیں ہے، کرے گا کیا۔ جتنا زمین کے اوپر ہے اتنا ہی زمین کے اندر......''

''تمہارا مطلب ہے، وہ پستہ قامت ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''بس، تمہیں اشتیاق پر گہری نظر رکھنا ہے۔'' میں نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''اس کا وہ حصہ جو زمین کے اوپر ہے اس پر بھی اور جو حصہ زمین کے اندر ہے، اس پر بھی کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا......؟''

''آپ کی بات سمجھ میں آرہی ہے ملک صاحب!'' وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''لیکن یہ پتا نہیں چل رہا کہ اچانک اشتیاق پر نظر رکھنے کی ضرورت کیوں پیش آگئی......؟''

''یہ میں تمہیں سمجھا دیتا ہوں......'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

پھر میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں کانسٹیبل افضل کو سمجھایا کہ اشتیاق پر نظر رکھنے کی ضرورت کیوں پیش آرہی ہے۔ علی نواز کی زبانی ماضی کے جو حالات و واقعات میرے علم میں آئے تھے ان کی روشنی میں اشتیاق کو چیک کرنا بہت ضروری ہوگیا تھا۔ اپنی بات کے اختتام پر میں نے افضل سے کہا۔

''افضل! ابھی اور اسی وقت سے تمہاری ڈیوٹی اشتیاق پر ہے۔ تم نے اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھنا ہے۔ وہ کس کس سے ملتا ہے اور ان کے بیچ کیا معاملات طے پاتے ہیں وہ تمہیں خبر ہونا چاہیے۔ اگر اشتیاق گاؤں سے باہر کہیں جانے کی کوشش کرے تو تم اس کا تعاقب کرو گے اور ضرورت پڑنے پر اسے گرفتار بھی کرسکتے ہو...... خاص طور پر میں نے جن دو اجنبی مشکوک افراد کے بارے میں بتایا ہے نا، اس حوالے سے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ اگر اشتیاق اور ان لوگوں کے بیچ کوئی کنکشن نکل آئے تو فوراً مجھے بتانا ہے......''

''جی ملک صاحب...... آپ فکر ہی نہ کریں۔'' وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''میں اس سلسلے میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔''

''شاباش!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''مجھے امید ہے، تم جلد ہی کوئی خوشخبری سناؤ گے......''

''انشااللہ......!'' وہ بڑے عزم سے بولا۔

وہ جانے لگا تو میں نے کہا۔ ''افضل! تم نے ایک کام کرنا ہے......''

وہ رک گیا اور پوچھا۔ ''حکم ملک صاحب......؟''

''خالدہ کے بھائی اعجاز اور علی نواز کے چچا نذیر حسین سے کہنا کہ وہ آج کسی وقت تھانے آکر مجھ سے ملیں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے ان سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں بھیجتا ہوں انہیں......'' ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا۔ ''ملک صاحب! وہ دونوں ایک ساتھ آپ کے پاس آئیں یا......''

''جیسے بھی......!'' میں نے کہا۔ ''بس، تم انہیں میرا پیغام دے دو۔ یہ فیصلہ میں خود کروں گا کہ انہیں ایک ساتھ اپنے کمرے میں بلانا ہے یا الگ الگ......''

''ٹھیک ہے ملک صاحب، جو آپ کا حکم۔'' وہ بڑی فرماں برداری سے بولا۔

افضل کے جانے کے بعد میں جیدا کی گمشدگی پر ایک نئے زاویے سے غوروخوض کرنے لگا۔ مجھے اس شخص کی تلاش تھی جو علی نواز کو اس واردات میں ملوث کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر وہ دونوں مشکوک افراد علی نواز کے بھیجے ہوئے ہوتے تو وہ کبھی یہ ظاہر نہ کرتے کہ انہیں علی نواز نے بھیجا ہے۔ یہ کوئی دوسرا ہی چکر تھا اور مجھے اس چکر کے سرغنہ کا سراغ لگانا تھا۔

XXX

میں دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوا تو ایک عمر رسیدہ شخص مجھ سے ملنے آگیا۔ وہ اپنی وضع قطع اور چال ڈھال سے ساٹھ کے پیٹے میں نظر آتا تھا۔ اس پر نگاہ گئی تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ کہاں اور کب...... یہ یاد نہ آسکا۔

اس نے میرے سامنے بیٹھنے کے بعد جب اپنا تعارف کرایا تو میری الجھن دور ہوگئی۔ ''تھانے دار جی!'' اس نے کہا۔ ''میرا نام برکت علی ہے۔ ادھر چھپڑ کے کنارے آپ سے ملاقات ہوئی تھی جب آپ نے جیدا کی تلاش میں لوگوں کو چھپڑ کے اندر چھوڑا ہوا تھا......''

مجھے سب یاد آگیا۔ اس وقت برکت نے آگے بڑھ کر مجھ سے کہا تھا...... اگر بچہ اس چھپڑ میں ڈوبا ہوتا تو اب تک اس کی لاش اوپر آچکی ہوتی۔ دوپہر سے اب تک کافی وقت گزر چکا ہے۔

''چاچا!'' میں نے برکت علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے چہرے کے تاثرات سے لگتا ہے کہ تم کوئی الجھن لے کر میرے پاس آئے ہو۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا......؟''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے تھانے دار جی۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''پتا نہیں، آپ میری بات کا کیا مطلب نکالیں لیکن میں جو کچھ دیکھ کر آرہا

ہوں اس نے میرے دماغ کو الجھا دیا ہے۔ میں نے لکڑیوں والا گٹھر گھر میں پھینکا اور سیدھا آپ کے پاس آگیا ہوں۔''

''تم نے ایسا کیا دیکھ لیا ہے چاچا؟'' میں نے سنسنی خیز لہجے میں پوچھا۔

''میں لکڑیوں کی تلاش میں جنگل کی طرف گیا تھا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔ ''ہفتے میں ایک آدھ چکر میں جنگل کا لگا لیتا ہوں......''

میں اضطراری نظر سے اسے دیکھنے لگا کہ وہ آگے کون سا انکشاف کرتا ہے۔ ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد اس نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں لکڑیاں اٹھا کر جنگل سے واپس آرہا تھا کہ میں نے ایک درخت کے نیچے ایک چپل پڑی دیکھی ہے...... آٹھ سے دس سال تک کے بچے کی چپل!''

''جنگل میں چپل!'' میں نے چونک کر برکت علی کی طرف دیکھا۔ ''کسی آٹھ دس سال کے بچے کا جنگل میں کیا کام......؟''

''اسی سوال نے تو میرا دماغ خراب کیا ہے تھانے دار صاحب!'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''پتا نہیں کیوں...... میرے اندر سے ایک آواز اٹھتی ہے کہ کہیں وہ چپل گم شدہ جیدا کی تو نہیں......''

''چاچا......!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے اس چپل کی تفصیل بتاؤ؟''

''جناب...... وہ ہرے رنگ کی ہوائی چپل ہے جس کا ایک اسٹریپ جڑا ہوا ہے یعنی اس اسٹریپ پر موچی کے ہاتھ کا پیوند لگا ہوا ہے۔''

''اس چپل کے آس پاس تمہیں اور کچھ بھی نظر آیا؟''

''جی نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

میں نے کہا۔ ''تمہیں میرے ساتھ جنگل کے اس حصے میں جانا ہوگا جہاں تم نے وہ چپل پڑی دیکھی ہے......''

''ٹھیک ہے جناب......!'' وہ آمادگی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کے ساتھ جنگل کی طرف جانے کو تیار ہوں۔''

موضع شاہ پور کے شمال اور جنوب میں تاحد نگاہ سرسبز و شاداب کھیتوں کا لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ مشرق میں ایک فرلانگ کے فاصلے پر میرا تھانا تھا۔ اس تھانے سے نصف میل آگے ایک نیم پختہ سڑک تھی جو لاہور کی جانب جانے والی سڑک سے جا ملتی تھی جبکہ شاہ پور کے مغرب میں دو فرلانگ کے فاصلے سے جنگل شروع ہوجاتا تھا۔ یہ کوئی دس میل تک دراز ایک چھوٹا مگر گھنا جنگل تھا۔ گاؤں کے لوگ ایندھن کی تلاش میں اسی جنگل کا رخ کرتے تھے اور برکت علی بتا رہا تھا کہ اس نے اسی جنگل کے ایک حصے میں کسی بچے کی ہوائی چپل پڑی دیکھی تھی۔

اگر وہ چپل گم شدہ جیدا کی تھی تو پھر اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی تھی کہ جیدا کو کسی نے اسی جنگل میں گم کیا تھا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ وہ خود تن تنہا دو فرلانگ کا فاصلہ طے کرکے جنگل کی طرف گیا ہو اور پھر اپنی چپل وہاں پھینک کر کہیں روپوش ہوگیا ہو۔

میری یہ سوچ اس نقطے پر منحصر تھی کہ وہ چپل جاوید عرف جیدا ہی کی ہو۔ اگر میں مذکورہ چپل تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا تو خالدہ کو وہ چپل دکھا کر شناخت کرائی جاسکتی تھی اور...... چپل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے جنگل کی طرف سفر کرنا لازمی تھا۔

میں نے ضروری تیاری کی اور برکت علی کی راہنمائی میں جنگل کی جانب روانہ ہونے لگا تو کانسٹیبل افضل میرے پاس پہنچ گیا۔

''ہاں بھئی افضل! خیریت تو ہے......'' میں نے اس پر نگاہ پڑتے ہی پوچھ لیا۔ ''تم خلاف توقع اتنی جلدی کیسے واپس آگئے؟''

''آپ کو ایک ضروری اطلاع دینا تھی جناب۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''کیسی اطلاع؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں نے آپ کے حکم کے مطابق، نذیر حسین کو تو تھانے آنے کے لیے کہہ دیا ہے اور وہ میرے ساتھ تھانے آبھی گیا ہے۔'' افضل نے رپورٹ پیش کرنے والے انداز میں بتایا۔ ''لیکن اعجاز گھر پر موجود نہیں۔ اس کی گھر والی فریدہ نے بتایا ہے کہ وہ کسی ضروری کام سے کوٹ مکھن گیا ہے اور اس کی واپسی کل ہی ہوگی......''

کوٹ مکھن، موضع شاہ پور سے کوئی دو میل کے فاصلے پر واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ میں نے افضل کی بات پوری توجہ سے سنی اور اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

''اعجاز کی گھر والی نے یہ نہیں بتایا کہ اسے کوٹ مکھن میں ایسا کون سا ضروری کام پڑ گیا تھا؟''

''میں نے فریدہ سے یہ سوال کیا تھا۔'' افضل نے جواب دیا۔ ''اس نے بتایا ہے کہ وہاں کے ایک بندے

سے اعجاز نے کوئی رقم وغیرہ لینا تھی۔ وہ اسی رقم کی وصولی کے لیے وہاں گیا ہے......"

"چلو ٹھیک ہے...... وہ جب کوٹ مکھن سے واپس آئے گا تو اسے بھی دیکھ لیں گے۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "یہ بتاؤ، نذیر حسین کہاں ہے؟"

"وہ باہر برآمدے میں بیٹھا ہے ملک صاحب۔"

"ٹھیک ہے، تم جاؤ افضل۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں نذیر حسین کو خود ہی دیکھ لیتا ہوں۔"

وہ مجھے سلام کر کے واپس چلا گیا۔

میں نے نذیر حسین کو بھی اپنے ساتھ رکھا اور چاچا برکت علی کی نگرانی میں ہم جنگل کی سمت روانہ ہو گئے۔ میں نے احتیاطاً برکت علی کو آگے چلنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ اس سے میرا صرف اتنا سا مقصد تھا کہ میں نذیر حسین سے جو بھی گفتگو کروں وہ برکت علی کی سماعت تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔

"نذیر حسین!" میں نے علی نواز کے چاچا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں کل لاہور گیا تھا......" میں نے دانستہ آواز کو دھیما رکھا تھا۔

اس نے چونک کر میری جانب دیکھا اور میرے ہی انداز میں آواز دبا کر بولا۔ "آپ علی نواز سے ملنے گئے تھے؟"

"ہاں......" میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور پوچھا۔ "تم نے یہ اندازہ کس بات سے لگایا ہے نذیر حسین؟"

"آپ نے مجھ سے علی نواز کا پتا وغیرہ لیا تھا۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے اسی وقت محسوس ہو گیا تھا کہ آپ جیدا کی تلاش میں لاہور ضرور جائیں گے۔ میں پولیس کے طریقۂ کار کو اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"پھر مجھے تم پر سخت افسوس ہے۔" میں نے قدرے ترش لہجے میں کہا۔ "بلکہ مجھے تم سے سنگین شکوہ ہے......"

"کس بات کا شکوہ اور کیسا افسوس تھانے دار صاحب؟" وہ متعجب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ "نذیر حسین! تم پولیس کے طریقۂ کار سے واقفیت کے بھی دعوے دار ہو اور تم نے مجھ سے بہت سے حقائق چھپانے کی کوشش بھی کی ہے......؟"

"کون سے حقائق تھانے دار صاحب؟" اس کے تعجب میں اضافہ ہو گیا۔

"میں نے تم پر واضح کیا تھا نا کہ...... پولیس اور ڈاکٹر سے کوئی حقیقت نہیں چھپانا چاہیے ورنہ مصیبت الٹی اپنے ہی گلے میں آ جاتی ہے......"

"جناب! میں نے آپ سے کیا چھپایا ہے؟" وہ نیم احتجاجی انداز میں بولا۔ میرے پراسرار سوالات نے اس کی تشویش کو بام عروج تک پہنچا دیا تھا۔

"جب میں نے تم سے خالدہ کی طلاق کا سبب پوچھا تھا تو تم نے بتایا تھا کہ علی نواز کو خالدہ کے کردار پر شک ہو گیا تھا۔ وہ جیدا کو اپنا خون نہیں سمجھتا تھا؟"

"جی ہاں، میں نے آپ کو یہی بتایا تھا۔" وہ گہری سنجیدگی سے...... "اور حقیقت بھی یہی ہے تھانے دار صاحب......!"

"یہ آدھی حقیقت ہے نذیر حسین!" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آدھی حقیقت!" وہ مزید الجھ گیا۔ "میں کچھ سمجھا نہیں جناب......؟"

"یہ ٹھیک ہے کہ علی نواز کو خالدہ کے کردار پر شک ہو گیا تھا اسی لیے وہ جیدا کو اپنا خون تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم نے مجھ سے یہ حقیقت چھپائی کہ علی نواز کے شک کی بنیاد کون شخص تھا......؟"

"کون شخص؟" اس نے الٹا مجھ ہی سے سوال کر ڈالا۔

"اشتیاق......!" میں نے انکشاف انگیز انداز میں کہا۔

وہ کھسیانا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ "کیا میں غلط کہہ رہا ہوں......؟"

"نہیں...... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ "علی نواز کو اشتیاق ہی کے حوالے سے خالدہ کے کردار پر شک تھا۔"

"تو کیا علی نواز کا شک درست تھا؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"دلوں کے حال اور نیت کا احوال تو صرف اللہ ہی جانتا ہے تھانے دار صاحب!" وہ ذومعنی انداز میں بولا۔ "میں نے اپنی آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھا اس لیے کسی پر الزام لگانا میں ٹھیک نہیں سمجھتا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے نا کہ اشتیاق اکثر و بیشتر تمہارے گھر میں گھسا رہتا تھا؟" میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔ "اور وہ بھی علی نواز کی غیر موجودگی میں......!"

"جی ہاں، یہ ٹھیک ہے۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "وہ میری بیوی کا بھانجا ہے۔ میں اسے گھر میں آنے سے تو نہیں روک سکتا......؟"

"میں گھر میں آنے سے روکنے کی بات نہیں کر رہا ہوں نذیر حسین۔" میں نے ایک ایک لفظ کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اس پر اور اس کی حرکتوں پر نظر رکھنے کی بات کر رہا ہوں......"

"جناب! میں نے کبھی اس حوالے سے غور نہیں کیا تھا۔" وہ خجالت آمیز انداز میں بولا۔ "وہ جیدا کو بیٹا بیٹا اور خالدہ کو بھابی بھابی کہتے نہیں تھکتا تھا اور ہر وقت ان کی خدمت میں لگا رہتا تھا......"

"اور اشتیاق کا یہی "بیٹا بیٹا" اور "بھابی بھابی" والا ڈراما علی نواز کو ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "غلط یا صحیح، میں اس بات کی بحث میں نہیں پڑوں گا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اشتیاق کے اسی خدمت گارانہ رویے کی وجہ سے علی نواز کو خالدہ کے کردار پر شک ہوا تھا۔ اس نے بارہا یہ محسوس کیا تھا کہ خالدہ، اشتیاق کو اس پر اہمیت دیتی تھی اور جیدا بھی اسے نظر انداز کر کے اشتیاق کی گود میں گھسا رہتا تھا۔ جب علی نواز نے اس ایشو پر آواز اٹھائی تو تمہاری بیوی عنایت بی بی نے اشتیاق کی حمایت کی۔ اس موقع پر تم نے بھی بیوی کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اس کے ساتھ ہی خالدہ نے علی نواز کی دوسری شادی کا معاملہ بھی اچھال دیا۔ وہ بے چارہ اپنی چاچی کے رویے سے تو پہلے ہی نالاں تھا۔ جب تم نے بھی اس کا ساتھ نہیں دیا تو اس نے خالدہ کو طلاق دی اور تم لوگوں کو اپنے ذہن و دل سے نکال کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لاہور کا ہو کر رہ گیا۔"

"میں تو یہی کہوں گا کہ جی گڑے مردے اکھاڑنے کا اب کوئی فائدہ نہیں۔" وہ ڈھیلے ڈھالے لہجے میں بولا۔ "جو کچھ ہوا، بہت برا ہوا......!"

نذیر حسین کے یہ شکست خوردہ کلمات اس بات کا بین ثبوت تھے کہ علی نواز غلطی پر نہیں تھا۔ اس نے جو بھی فیصلہ کیا تھا وہ اس وقت کے حالات کا تقاضا تھا۔ اس تمام فتنے اور فساد کی جڑ صرف اور صرف اشتیاق ہی تھا۔

میں نے اندھیرے میں ایک تیر چھوڑا۔ "نذیر حسین!" میں نے رازدارانہ لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ "میں نے سنا ہے، اشتیاق خالدہ کی طلاق کے بعد بھی اس کے گھر کے چکر لگاتا رہا تھا......؟"

میرا چھوڑا ہوا تیر عین نشانے پر جا کر لگا۔ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "آپ نے ٹھیک سنا ہے تھانے دار صاحب لیکن اشتیاق کی نیت صاف تھی۔"

"نیت صاف تھی...... کیا مطلب؟" میں چونکے بنا نہ رہ سکا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اشتیاق، خالدہ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔"

"یعنی وہ اپنے جرم پر مہر تصدیق ثبت کرنے کا ارادہ رکھتا تھا؟"

"آپ کچھ بھی کہہ اور سمجھ لیں تھانے دار صاحب۔" وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ "لیکن اشتیاق کے موقف میں بھی جان تھی......!"

میں نے اپنی معلومات کی غرض سے پوچھ لیا۔ "اس نے کیا موقف اختیار کیا تھا......؟"

"اس کا کہنا یہ تھا کہ اس کے اور خالدہ کے بیچ کبھی کوئی غلط رشتہ نہیں رہا تھا لیکن یہ خالدہ کی بدقسمتی کہ اس کی وجہ سے خالدہ کو طلاق ہو گئی۔" نذیر حسین وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "وہ خالدہ کے ساتھ ہونے والی اس زیادتی کا ازالہ کرنے کے لیے اس سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔"

"کیا خالدہ بھی اس سے شادی کرنے پر آمادہ تھی؟" میں نے ایک نہایت ہی حساس سوال کیا۔

"جی ہاں، وہ تو تیار تھی لیکن......!"

اس نے جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے پوچھا۔ "لیکن کیا نذیر حسین؟"

"خالدہ کا بھائی اعجاز اس رشتے کے لیے تیار نہیں تھا۔" نذیر حسین نے بتایا۔ "اس نے دوٹوک انداز میں اپنا فیصلہ سنا دیا تھا کہ یہ کام کسی بھی صورت نہیں ہو سکتا۔ اس کی بہن کو اشتیاق کی وجہ سے بدنامی اٹھانا پڑی اور طلاق کا طوق پہننا پڑا۔ اب اگر اسی شخص سے خالدہ کی شادی کر دی گئی تو پورا گاؤں یہی کہے گا کہ علی نواز کا شک سولہ آنے درست تھا......"

"مطلب یہ کہ خالدہ اور اشتیاق کی شادی نہ ہو سکی؟"

"جی ہاں......!" نذیر حسین نے جواب دیا۔

"پھر چار سال کا عرصہ گزر گیا......؟"

اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"اور پھر چار سال کے بعد جیدا غائب ہو گیا؟" میں نے پرخیال انداز میں کہا۔

"کہیں آپ...... جیدا کی...... گمشدگی کا شک...... اشتیاق پر...... تو نہیں کر رہے...... تھانے دار صاحب؟"

نذیر حسین کی جھرجھراتی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی۔

میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "نذیر حسین! پولیس کی تفتیش کی گاڑی شک کے پیٹرول سے آگے بڑھتی ہے۔ ایک اشتیاق کی کیا بات ہے، مجھے تو ہر اس شخص پر شک ہے جو کسی نہ کسی حوالے سے جاوید اور عرف جیدا سے تعلق رکھتا ہو......" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"اسی لیے میں نے لاہور جا کر سب سے پہلے علی نواز کو چیک کیا ہے۔ کیونکہ جیدا کے ساتھ سب سے زیادہ گہرا تعلق تو اسی کا بنتا ہے۔ جب علی نواز مجھے اس معاملے میں ملوث نظر نہیں آیا تو میں نے اپنی تفتیش کو شاہ پور تک محدود کر دیا ہے اور اللہ کے فضل و کرم سے مجھے اس سلسلے میں ابتدا ہی میں، دو بڑی کامیابیاں حاصل ہو گئی ہیں۔"

"کون سی دو کامیابیاں؟" نذیر حسین نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

"ایک کامیابی تو تمہیں ابھی جنگل میں پہنچنے کے بعد نظر آجائے گی۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "اور دوسری کامیابی کے بارے میں، میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔"

میں نے دو مشکوک افراد کا ذکر دانستہ گول کر دیا تھا۔ نذیر حسین نے ہیجان بھرے لہجے میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے، آپ بہت جلد جیدا کو ڈھونڈ نکالیں گے؟"

"انشاء اللہ!" میں نے مختصر جواب پر اکتفا کیا۔

سہ پہر چار بجے ہم نے جنگل میں قدم رکھ دیا۔

"چاچا برکت!" میں نے اپنے راہنما کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ "ہمیں جنگل کے اندر کتنی دور تک جانا ہوگا؟"

"زیادہ دور نہیں جناب۔" وہ بڑے اطمینان سے بولا۔ "زیادہ سے زیادہ سو گز آگے۔ آپ لوگ میرے پیچھے آئیں......"

میں اور نذیر حسین اس کے پیچھے ہو لیے۔ برکت علی نے غلط نہیں کہا تھا۔ اسی نوے گز آگے وہ مقام آ گیا جہاں کسی بچے کی ہوائی چپل پڑی ہوئی تھی۔ میں نے چپل کے دونوں پاؤں اٹھا کر بہ غور ان کا جائزہ لیا۔ وہ آٹھ سے دس سال کے کسی بچے کی چپل تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ اتنا کم عمر کوئی بچہ خود ہی گاؤں سے تن تنہا اس جنگل کی طرف آ نکلا ہو اور چپل یہاں چھوڑ کر کہیں غائب ہو گیا ہو۔

یہ جس بچے کی چپل تھی اسے یقیناً زبردستی اٹھا کر یا بے ہوش کر کے جنگل کی طرف لایا گیا تھا۔ گاؤں میں صرف ایک بچہ کم تھا اور وہ تھا جیدا لہٰذا بڑی مضبوطی کے ساتھ یہ سوچا جا سکتا تھا کہ یہ چپل جیدا ہی کی ہوگی۔

میں نے وہ چپل نذیر حسین کو دکھا کر پوچھا۔ "اس چپل کو پہچانتے ہو نذیر حسین؟"

اس نے بہ غور چپل کا جائزہ لیا اور نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "نہیں جناب! میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"مجھے یقین ہے، جیدا کی ماں خالدہ ضرور اس چپل کے بارے میں وثوق سے بتائے گی۔" میں نے مذکورہ چپل کو ایک تھیلے کے اندر محفوظ کرتے ہوئے کہا۔

جذبہ

چائنہ: بچہ ایک ہی اچھا
یوکے: بچے دو ہی اچھے
انڈیا: بچے تین یا چار
پاکستان: ہے جذبہ جنوں تو ہمت نہ ہار

.....☆☆☆.....

حل

لڑکا: "اگر میں مر گیا تو کیا تم دوسری شادی کرو گی؟"

لڑکی: "نہیں میں اپنی بہن کے ساتھ رہ لوں گی۔"

لڑکی: "اور اگر میں مر گئی تو......؟"

لڑکا: "میں بھی تمہاری بہن کے ساتھ رہ لوں گا۔"

.....☆☆☆.....

دو لڑکیاں بس میں ایک سیٹ کے لیے لڑ رہی تھیں۔ ایک لڑکا کافی دیر سے دیکھ رہا تھا...... تو کہنے لگا۔

"کیوں لڑ رہی ہو، اس کا حل میں بتاتا ہوں تم میں سے جو عمر میں بڑی ہے وہ بیٹھ جائے۔"

"پھر کیا...... دونوں لڑکیاں پورے راستے کھڑی رہیں۔"

مرسلہ: محمد جاوید بلوچ، تحصیل علی پور

برکت علی نے پوچھا۔ ’’اب کیا ارادہ ہے تھانے دار صاحب؟‘‘

’’جنگل میں آگے جا کر چھان بین کرنے کا ارادہ ہے۔‘‘ میں نے جنگل کے اندرونی حصے کی جانب قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔

’’اور میرے لیے کیا حکم ہے جناب؟‘‘ برکت نے مجھ سے پوچھا۔

’’چاچا! تمہارا کام پورا ہو چکا ہے۔‘‘ میں نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ’’واپس جانا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ہمارے ساتھ رہنا چاہو تو بھی تمہاری مرضی ہے......‘‘

’’اگر آپ کو میری ضرورت نہیں تو میں گھر جانا چاہوں گا۔‘‘ وہ بڑی سادگی سے بولا۔

میں نے اسے واپس جانے کی اجازت دے دی اور خود نذیر حسین کے ساتھ جنگل کے اندرونی حصے کی جانب بڑھنے لگا۔ میری نظریں کسی عقاب کے مانند چاروں جانب کا جائزہ لے رہی تھیں تاکہ جیدا کو ڈھونڈنے کے لیے کوئی اور سراغ ہاتھ لگ جائے لیکن مجھے اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔

پھر اچانک بارش شروع ہو گئی۔ یہ ایک نئی افتاد تھی۔ میں نے مڑ کر اپنے عقب میں دیکھا تو چاچا برکت علی کہیں نظر نہ آیا۔ اسے واپسی کی راہ اختیار کیے پندرہ سے بیس منٹ ہو گئے تھے۔ وہ اب تک جنگل سے باہر نکل چکا ہوگا یا نکلنے ہی والا ہوگا۔

میں نے نذیر حسین سے کہا۔ ’’بارش تو لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی ہے۔ آگے جانے کا کوئی فائدہ نہیں...... واپس چلتے ہیں......‘‘

’’میرا بھی یہی خیال ہے تھانے دار صاحب۔‘‘ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ’’اگر بارش اسی رفتار سے جاری رہی تو ہم جنگل میں پھنس بھی سکتے ہیں۔‘‘

اس کی بات میں وزن تھا۔ جنگل کی بارش کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ ویسے پچھلے ایک ڈیڑھ ماہ سے بارشوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ساون گزر چکا تھا اور اب بھادوں اپنی جوانی کی بہار دکھلا رہا تھا۔

ہم نے متفقہ رائے سے واپسی کی راہ لی۔

راستے بھر ہمارے درمیان گمشدہ جیدے کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ نذیر حسین نے مجھ سے پوچھا۔ ’’تھانے دار صاحب! آپ نے جیدا کی تلاش کے سلسلے میں اپنی دو کامیابیوں کا ذکر کیا تھا۔ ایک تو آپ نے اس چپل کی صورت میں دکھا دی۔ آپ کا اندازہ ہے کہ یہ چپل جیدا کی ہو سکتی ہے لیکن......‘‘ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

’’آپ نے ابھی تک دوسری کامیابی کے حوالے سے مجھے کچھ نہیں بتایا؟‘‘

’’نذیر حسین!‘‘ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ’’میں تم سے جو راز بانٹنے جا رہا ہوں اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا......‘‘

’’آپ فکر ہی نہ کریں جناب۔‘‘ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ’’میرے پیٹ کے اندر بہت ہی گہرا کنواں کھدا ہوا ہے۔ آپ اس میں جو بھی ڈالیں گے، کسی کو نظر نہیں آئے گا۔‘‘

’’شاباش نذیر حسین۔‘‘ میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ’’تم بڑے کام کے بندے ہو...... لو، اب کام کی بات سنو......‘‘

وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔ ہم باتیں کرنے کے دوران میں واپسی کا سفر بھی جاری رکھے ہوئے تھے اور بارش نے بھی ایک لمحے کے لیے سانس نہیں لی تھی۔ ہمارے لباس پوری طرح بھیگ چکے تھے۔

نذیر حسین بڑی توجہ سے میرے بولنے کا منتظر تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسے بتانا شروع کیا۔ ’’میں نے دو ایسے مشکوک افراد کا کھوج لگا لیا ہے جن کا تعلق شاہ پور سے نہیں......‘‘

’’دو مشکوک افراد؟‘‘ نذیر حسین نے عجیب سی نظر سے مجھے دیکھا۔

’’ہاں دو اجنبی افراد۔‘‘ میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ’’جس دوپہر کو جیدا غائب ہوا ہے اس سے ایک دن پہلے شام کے وقت ان دونوں افراد کو شوکت علی زمیندار کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں شوکت علی سے بھی پوچھ گچھ کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ ان دونوں بندوں کو نہیں جانتا۔ انہوں نے شوکت علی سے جیدا کا گھر پوچھا تھا...... وہ اس طرح کہ اعجاز دکاندار کی بہن خالدہ کا گھر کون سا ہے...... اور پھر اس کے اگلے روز ہی جیدا شاہ پور سے غائب ہو گیا۔ مجھے پکا شک ہے کہ جیدا کی گمشدگی میں انہی دو مشکوک افراد کا ہاتھ ہے۔‘‘ میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک طویل سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

’’میں نے ان دونوں بندوں کی تلاش کے لیے اپنے تھانے کے عملے کو ہائی الرٹ کر دیا ہے۔ مجھے امید ہے، میں بہت جلد ان بندوں تک پہنچ جاؤں گا۔‘‘

نذیر حسین نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میں نے محسوس کیا، اس دوران میں اس کے چہرے کی رنگت میں نمایاں تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ میرے خاموش ہونے پر اس نے کہا۔ اس کے انداز میں سنجیدگی اور سنسنی خیزی پائی جاتی تھی۔

’’تھانے دار صاحب! آپ کہیں ان دو بندوں کا ذکر تو نہیں کر رہے جن میں سے ایک دراز قد سانولی رنگت کا ہے اور دوسرا گورا ہے۔ اس گورے بندے کے سر کے بال گھونگریالے ہیں......؟‘‘

’’ہاں، ہاں...... وہی۔‘‘ میں نے رک کر حیرت بھری نظر سے نذیر حسین کو دیکھا۔ ’’کیا تم انہیں جانتے ہو......؟‘‘

’’جانتا تو نہیں جناب......‘‘ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ’’مگر میں نے انہیں اسی شام دیکھا ہے جس کا آپ ذکر کر رہے ہیں۔‘‘

’’کہاں دیکھا ہے......؟‘‘ میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

’’اعجاز سے باتیں کرتے ہوئے......‘‘ وہ انکشاف انگیز انداز میں بولا۔

’’اعجاز سے......؟‘‘ میں نے دوبارہ چلتے ہوئے پوچھا۔

’’جی ہاں...... وہ تینوں گاؤں سے باہر کھیتوں میں بہت گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔‘‘ نذیر حسین نے جواب دیا۔ ’’مجھے تو یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ اعجاز کے جاننے والے ہوں......‘‘

میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ نذیر حسین نے میرے ساتھ چلتے ہوئے قیاس آرائی کی۔ ’’تھانے دار صاحب! آپ نے بتایا ہے نا، جیدا کی گمشدگی سے ایک دن پہلے، شام کے وقت ان دونوں بندوں نے شوکت علی زمیندار سے اعجاز کی بہن خالدہ کے گھر کا پتا پوچھا تھا۔ میرا خیال ہے، وہ شوکت علی سے ملنے کے بعد اعجاز کے پاس آئے ہوں گے......‘‘

’’لیکن تم نے تو انہیں اعجاز کے ساتھ گاؤں سے باہر کھیتوں میں دیکھا تھا؟‘‘

’’جی ہاں، میں نے انہیں وہیں دیکھا تھا۔‘‘ نذیر حسین نے جواب دیا۔

’’اور وہ اعجاز کے ساتھ گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔‘‘ میں نے مزید تصدیق کی خاطر پوچھا۔ ’’جس سے تم نے اندازہ لگایا کہ وہ اعجاز کے جاننے والے ہیں؟‘‘

’’جی ہاں، بالکل......‘‘ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ’’میں نے اسی بات سے اندازہ لگایا تھا۔‘‘

’’اللہ کے بندے نذیر حسین!‘‘ میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ’’اگر وہ دونوں مشکوک اجنبی اعجاز کے جاننے والے تھے تو پھر وہ اعجاز اور اس کی بہن خالدہ کے گھر کا پتا کیوں پوچھ رہے تھے......‘‘

’’ہاں...... یہ بات بھی آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔‘‘ وہ گڑبڑا گیا پھر ایک دو بار گردن جھٹکنے کے بعد بولا۔ ’’پتا نہیں کیوں، میرا دل کہتا ہے کہ وہ دونوں بندے اعجاز کے لیے اجنبی نہیں تھے...... آپ ایک کام کیوں نہیں کرتے؟‘‘

’’کون سا کام؟‘‘ میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

’’آپ ان دونوں بندوں کے بارے میں اعجاز حسین سے پوچھیں نا۔‘‘ وہ مشورہ دینے والے انداز میں بولا۔ ’’پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا......‘‘

ہم باتیں کرتے ہوئے جنگل سے باہر نکل آئے۔

’’کہتے تو تم بالکل ٹھیک ہو نذیر حسین!‘‘ میں نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔ ’’لیکن اعجاز حسین فی الحال شاہ پور میں نہیں ہے......‘‘

’’کیوں...... وہ کہاں چلا گیا؟‘‘

’’مجھے پتا چلا ہے، وہ کسی بندے سے ملنے کوٹ مکھن گیا ہوا ہے۔‘‘ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ’’وہاں اس کا کوئی دوست رہتا ہے۔ وہ اس کے پاس گیا ہے۔‘‘

’’اوہ......!‘‘ نذیر حسین نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور بولا۔ ’’پھر تو فی الحال کچھ نہیں ہو سکتا......‘‘

’’کیوں کچھ نہیں ہو سکتا......؟‘‘ میں نے تیز لہجے میں کہا۔

وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ’’نذیر حسین! اگر اعجاز، شاہ پور میں موجود نہیں تو اس کا یہ مطلب کیسے ہو گیا کہ میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاؤں گا اور چپ چاپ اس کی واپسی کا انتظار کروں گا......؟‘‘

’’میرے کہنے کا یہ مقصد نہیں تھا جناب۔‘‘ وہ اپنی پوزیشن صاف کرتے ہوئے بولا۔ ’’میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ اگر اعجاز گاؤں میں موجود نہیں تو پھر ان دو مشکوک بندوں کے بارے میں اس سے پوچھ گچھ نہیں کی جا سکتی......‘‘

’’جب اعجاز کوٹ مکھن سے واپس آئے گا تو میں

.....اسے بھی دیکھ لوں گا۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''فی الحال تو میں گمشدہ جیدے کی ماں خالدہ کے پاس جارہا ہوں......''

''کیا میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟'' نذیر حسین نے پوچھا۔

''یہ مناسب نہیں ہوگا۔'' میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم دونوں خاندانوں کے درمیان پہلے ہی بہت ساری رنجشیں اور افراتفری پھیلی ہوئی ہے۔ وہ میرے ساتھ تمہیں دیکھ کر بھڑک بھی سکتی ہے۔''

''ٹھیک ہے جناب، تو پھر میں اپنے گھر جاتا ہوں۔''

''ہاں......تمہارے لیے یہی مناسب رہے گا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

جب ہم شاہ پور گاؤں میں داخل ہوئے تو ہمارے راستے جدا ہوگئے۔ نذیر حسین اپنے گھر کی طرف چلا گیا اور میں نے خالدہ کے گھر کا رخ کیا۔ بارش اب مکمل طور پر تھم چکی تھی۔ شاید ہمیں جنگل سے نکالنے کے لیے ہی اس کے غیظ وغضب میں اضافہ ہوا تھا۔

میں اس سے پہلے بھی خالدہ کے گھر آچکا تھا۔ اس نے میری دستک پر دروازہ کھولا اور مجھے لے جا کر بیٹھک میں بٹھایا پھر خود بھی میرے سامنے بیٹھتے ہوئے اضطراری لہجے میں بولی۔

''تھانے دار صاحب! میرے جیدے کا کچھ پتا چلا؟''

میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔ ''ہاں...... کچھ پتا چلا تو ہے!''

''کیا پتا چلا ہے؟'' وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوئی۔

وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔ میں نے اپنے ہاتھ میں موجود تھیلے کو کھولا اور بڑے ڈرامائی انداز میں وہ ہوائی چپل نکال کر خالدہ کے سامنے رکھ دی جو مجھے جنگل کے اندرونی حصے سے ملی تھی۔

چپل پر نگاہ پڑتے ہی خالدہ ہیجانی انداز میں چلائی۔ ''یہ......یہ چپل تو......میرے جیدے کی ہے......آپ کو یہ چپل کہاں سے ملی......؟''

میں نے اضطرابی کیفیت میں مبتلا جیدے کی ماں کے سوالات کے جوابات میں وہ تفصیل بیان کردی جو اب تک میری تفتیش کے نتیجے میں سامنے آچکی تھی۔ میری باتیں سن کر خالدہ روہانسی ہوگئی پھر گلوگیر آواز میں پوچھا۔

''تھانے دار صاحب! میرا جیدا مل تو جائے گا نا......؟''

''اللہ کے گھر سے بہتری کی امید رکھنا چاہیے۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں پوری شدومد سے تمہارے بیٹے کو تلاش کررہا ہوں۔ کل صبح میں دوبارہ جنگل کی طرف جاؤں گا۔ آج تو طوفانی بارش نے میرا راستہ روک لیا، کل انشاء اللہ! میں جیدا کا سراغ لگانے میں ضرور کامیاب ہوجاؤں گا۔''

میں مزید دس پندرہ منٹ تک خالدہ کے پاس بیٹھ کر تسلی دلاسے کی باتیں کرتا رہا پھر اس کے گھر سے نکل آیا۔ فی الحال اسے تسلی ہی دے سکتا تھا کیونکہ ابھی تک صورت حال کھل کر میرے سامنے نہیں آئی تھی۔

نذیر حسین کے انکشاف نے میرے ذہن میں سوچ کا ایک نیا در وا کردیا تھا۔ جس شام زمیندار شوکت علی سے دو اجنبی مشکوک افراد نے اعجاز کی بہن خالدہ کے گھر کا پتا پوچھا تھا، اسی شام نذیر حسین نے انہی دو مشکوک بندوں کو اعجاز کے ساتھ، کھیتوں میں گھل مل کر باتیں کرتے دیکھا تھا۔ یہ ایک ایسا کھلا تضاد تھا کہ میری سوچ میں متعدد سوالات پیدا کررہا تھا۔

علاوہ ازیں علی نواز نے مجھے اپنی سابق بیوی خالدہ اور اس کے مبینہ آشنا اشتیاق کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اس ذکر کو اعجاز نے بالکل ہی گول کردیا تھا۔ جب میں نے علی نواز کے چچا نذیر حسین سے اس سلسلے میں استفسار کیا تو اس نے چند ایک معاملات کی پردہ پوشی کرتے ہوئے باقی باتوں کی تصدیق کردی تھی۔ مثلاً یہ کہ جب علی نواز نے خالدہ کو طلاق دے دی اور وہ اپنے میکے آگئی تو اس کے لیے اشتیاق نے رشتہ بھیجا تھا لیکن اعجاز نے اس رشتے سے صاف انکار کردیا تھا۔ اعجاز نے یہ تمام تر معاملات مجھ سے چھپائے تھے جس کی کوئی توجیہہ نہیں کی جاسکتی تھی۔ اعجاز نے خالدہ اور علی نواز کے جھگڑے کے حوالے سے مجھے جو قصہ سنایا تھا اس میں علی نواز کو قصوروار ٹھہرایا گیا تھا اور جیدے کی گمشدگی کے سلسلے میں بھی اس کے شک کا مرکز علی نواز ہی تھا۔ بہرحال، نذیر حسین کی فراہم کردہ تازہ ترین معلومات کے مطابق اعجاز کو بڑی باریک بینی سے چیک کرنا ضروری ہوگیا تھا تاکہ اس حقیقت تک رسائی حاصل کی جاسکے کہ اس نے حقائق کو چھپانے کی کوشش کس مقصد سے کی تھی۔

اپنے اسی تجسس کی تسکین کے لیے میں نے تھانے جانے سے پہلے اعجاز کریانہ فروش کی بیوی فریدہ سے ملاقات کا فیصلہ کرلیا۔ یہ تو مجھے معلوم ہوچکا تھا کہ اعجاز اپنے کسی دوست سے ملنے کوٹ مکھن گیا ہوا تھا لیکن یہ جاننا بھی ضروری تھا کہ ایسا کون سا اہم کام تھا کہ ادھر شاہ پور میں اس کے بھانجے کی گمشدگی نے افراتفری مچار کھی تھی اور وہ ادھر

کوٹ مکھن کی سیر کو نکلا ہوا تھا؟

XXX

کوٹ مکھن، موضع شاہ پور سے صرف دو میل کے فاصلے پر واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے اور میں شوکت علی کے ہمراہ اسی کوٹ مکھن کی جانب رواں دواں تھا۔ ہم دونوں الگ الگ گھوڑوں پر سوار اب تب میں کوٹ مکھن پہنچنے ہی والے تھے۔

خالدہ کے گھر سے اٹھ کر میں سیدھا اعجاز کے گھر پہنچا تھا اور میں نے وہاں اعجاز کی گھروالی فریدہ سے ایک بھرپور ملاقات کی تھی اور اسی ملاقات نے مجھے کوٹ مکھن کا رخ کرنے پر مجبور کردیا تھا۔

فریدہ پہلے تو مجھے دیکھتے ہی گھبرا گئی۔ مجھے ایک پولیس اہلکار کی زبانی معلوم ہوچکا تھا کہ اعجاز، اپنے کسی دوست سے ملنے کوٹ مکھن گیا ہوا ہے لیکن جب میں نے فریدہ سے اعجاز کے بارے میں سوال کیا تو وہ بوکھلا کر آئیں بائیں شائیں کرنے لگی تھی۔

پہلے اس نے کہا کہ اعجاز گھر میں نہیں ہے۔ تھوڑی دیر میں واپس آئے گا۔ میں نے جب اسے پولیس اہلکار سے ہونے والی بات کا حوالہ دیا تو وہ چونک اٹھی اور پٹری بدلتے ہوئے بولی...... ہاں، مجھے یاد نہیں رہا تھا۔ وہ تو کوٹ مکھن گیا ہوا ہے۔ اس کے بعد بھی میں نے جو سوال کیا، اس نے حواس باختہ جواب ہی دیا۔ جب میں نے تھوڑی سی سختی کی اور دو مشکوک افراد کے بارے میں استفسار کیا تو اپنی مکمل معذوری ظاہر کرتے ہوئے وہ بڑی عاجزی سے بولی۔

''تھانے دار جی! مجھے تو اعجاز نے یہی بتایا تھا کہ وہ اپنے دوست فاروق مہر سے ملنے کوٹ مکھن جارہا ہے۔ فاروق سے اس کا رقم کا کوئی لین دین ہے۔ وہ اپنی رقم وصول کرنے وہاں گیا ہے۔ اس کے سوا مجھے کسی بات کا پتا نہیں......!''

میں نے فریدہ سے اعجاز کے کوٹ مکھن والے دوست فاروق مہر کے بارے میں ممکنہ حد تک معلومات حاصل کیں اور اس کے گھر سے اٹھ آیا تھا۔ جب سے نذیر حسین نے مجھے اعجاز اور مشکوک افراد کی ملاقات کے بارے میں بتایا تھا، میرا ذہن ایک خاص انداز میں سوچنے میں مصروف ہوگیا تھا۔ اس معاملے میں ایک نہایت ہی اہم نکتہ تھا اور وہ یہ کہ اگر وہ دونوں مشکوک افراد اعجاز کے واقف کار تھے اور اس کے ساتھ گھل مل کر باتیں کررہے تھے تو پھر انہیں زمیندار شوکت علی سے خالدہ کے گھر کا پتا پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی اور یہی نکتہ مجھے موضوع شاہ پور سے کوٹ مکھن لے آیا تھا۔

ان دونوں مذکورہ مشکوک افراد کو شاہ پور میں مبینہ طور پر تین افراد نے دیکھا تھا۔ نمبر ایک نذیر حسین، نمبر دو اعجاز اور نمبر تین زمیندار شوکت علی نے۔ اعجاز کوٹ مکھن میں تھا اور میں نذیر حسین کو بہ وجوہ اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا لہٰذا زمیندار شوکت علی کو ساتھ لے آیا تھا۔ واقعات کی روشنی میں شاہ پور میں وہ دونوں بندے سب سے پہلے شوکت علی ہی سے ملے تھے۔ میں نے راستے میں ایک مرتبہ پھر شوکت علی سے دو امور کی تصدیق کرلی تھی۔ نمبر ایک، ان بندوں نے شوکت علی سے اعجاز کی بہن خالدہ کے گھر کا پتا پوچھا تھا۔ نمبر دو، انہوں نے اپنے بارے میں شوکت کو بتایا تھا کہ وہ لاہور سے آئے ہیں۔ اعجاز کو پکا شک تھا کہ جیدے کی گمشدگی میں اس کے باپ علی نواز کا ہاتھ تھا جو کہ لاہور میں رہتا تھا۔ اب یہ معما اسی وقت حل ہوسکتا تھا جب اعجاز میرے روبرو ہوتا، اسی لیے میں نے پہلی فرصت میں کوٹ مکھن کا رخ کیا تھا۔

ہم ساڑھے آٹھ، پونے نو بجے کوٹ مکھن میں تھے۔ فریدہ سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں، میں نے اعجاز کے دوست فاروق مہر کا گھر ڈھونڈنے کے لیے مقامی لوگوں سے پوچھ تاچھ کی تو ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ کوٹ مکھن میں فاروق مہر نامی کوئی شخص رہتا ہی نہیں۔ ایک فاروق لوہار سے ملاقات ہوئی اور وہ شاہ پور کے اعجاز کریانہ فروش کو نہیں جانتا تھا۔ جب میں نے کوٹ مکھن کے لوگوں کو اعجاز کی وضع قطع اور حلیے وغیرہ سے آگاہ کیا تو ایک شخص نے بتایا کہ ایسی شکل وشباہت کا ایک آدمی نواز کے گھر آیا ہوا ہے۔ میں معلومات فراہم کرنے والے اس بندے کو ساتھ رکھ کر نواز نامی شخص کے گھر پہنچ گیا۔ یہاں ایک سنسنی خیز انکشاف میرا منتظر تھا۔

میری دستک کے جواب میں تھوڑی تاخیر سے دروازہ کھلا اور جس شخص نے ادھورا دروازہ کھول کر باہر جھانکا، شوکت علی نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔

''تھانے دار صاحب!'' شوکت علی کی سرسراتی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔ ''یہ تو انہی دو بندوں میں سے ایک ہے جنہوں نے مجھ سے خالدہ کے گھر کا پتا پوچھا تھا......''

پولیس کو دروازے پر دیکھ کر اور اپنے بارے میں، میرے ہمراہی کا تبصرہ سن کر وہ بندہ ایسے اچھلا جیسے بجلی کے ننگے تار کو چھولیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس نے میکانکی انداز میں دروازہ بند کرنے کی کوشش کی۔

شوکت علی کے انکشاف نے مجھے ذہنی اور جسمانی طور پر حد سے زیادہ چوکنا کر دیا تھا لہٰذا میں نے اس کی دروازہ بند کرنے والی کوشش کو ناکام بنانے کے لیے دروازے کے بیچ میں پاؤں پھنسا دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دروازے کو زوردار دھکا دیا۔

اس بندے کو میری جانب سے شاید ایسے فوری ردعمل کی توقع نہیں تھی۔ دروازہ اس کے منہ پر لگا اور وہ پشت کے بل دھڑام سے گھر کے صحن میں ہی گرا۔ میں اچھل کر اندر پہنچا تو سامنے اعجاز کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور بندہ بھی تھا۔ شوکت علی نے فوراً سے پیشتر اس بندے کو بھی پہچان لیا۔ وہ دھکا کھا کر گرنے والے کا وہی ساتھی تھا جنہوں نے جیدا کی گمشدگی سے ایک رات پہلے شوکت علی سے خالدہ کے گھر کا پتا پوچھا تھا۔

اعجاز کو ان دو مشکوک افراد کے ساتھ دیکھ کر ساری کہانی میری سمجھ میں آگئی تھی۔ رہی سہی کسر اس وقت جاتی رہی جب ان تینوں نے مجھے دیکھ کر وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی۔

میں بھلا انہیں کیسے نکل جانے دیتا۔ شوکت علی اور میں تو تھے ہی، ہمارے علاوہ چار پانچ اور افراد بھی گلی میں تماشا دیکھنے کے لیے موجود تھے۔ یہ لوگ اپنے گاؤں میں پولیس کی آمد پر بے پناہ تجسس میں مبتلا ہو گئے تھے اور ہمارے ساتھ چلتے ہوئے نواز کے دروازے تک پہنچ گئے تھے۔ ان سب نے پولیس کی مدد کی اور پانچ منٹ کے اندر میں ان تینوں پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا۔

رات گیارہ بجے اعجاز، نواز اور نواز کا ساتھی وحید میرے تھانے کی حوالات میں بند تھے۔ میں نے دو خوف ناک صورتوں والے کانسٹیبلو کو حوالدار کی ''مدد'' اور ''مہمانوں'' کی ''خاطر مدارات'' پر مامور کیا اور خود جا کر اپنے کوارٹر میں اطمینان سے سو گیا۔ یہ اطمینان اس بات کا تھا کہ میں نے جیدے کی گمشدگی کا راز پالیا تھا اور...... یہ راز رونگٹے کھڑے کر دینے والا تھا۔

اگلی صبح میں تھانے پہنچا تو حوالدار نے ان تینوں کو کسی ریکارڈ کی طرح بجنے کے لیے تیار کر دیا تھا۔ میں نے انہیں اپنے کمرے میں بلایا اور سوال و جواب شروع کیے تو انہوں نے اپنے جرائم کا اقرار کر لیا۔ اعجاز کوئی عادی مجرم نہیں تھا۔ وہ گزشتہ رات گرفتاری کے وقت ہی بہت ڈرا سہما نظر آ رہا تھا اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ سب کچھ قبول کرنے کو تیار ہے۔ نواز اور وحید کو میرے تھانے کے عملے نے ''سیٹ'' کر دیا تھا۔

واقعات کے مطابق، اشتیاق کی خالدہ میں حد سے زیادہ بڑھتی ہوئی دلچسپی نے اعجاز کو بہت اذیت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اسی شخص کی حرکتوں کے باعث اعجاز کی بہن خالدہ کو طلاق ہوئی تھی۔ اعجاز کے دل میں علی نواز کے لیے بھی بہت غم و غصہ تھا۔ اشتیاق کا رشتہ جب اعجاز نے بڑی شدت سے مسترد کر دیا تو وہ جیدے سے ملنے کے بہانے گھر کے چکر لگانے لگا تھا۔ اعجاز نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ خالدہ اپنے دل میں اشتیاق کے لیے نرم گوشہ رکھتی تھی۔ جیدے کی ولدیت اور خالدہ کی طلاق کے حوالے سے گاؤں میں اعجاز کی جو ذلت ہوئی تھی وہ اس کے دماغ کے پرخچے اڑا دینے کے لیے کافی تھی۔ وہ جیدے کے لیے اپنے دل میں شدید ترین نفرت رکھتا تھا جو اس بدنامی کی جڑ تھا۔ ان تمام مسائل کو حل کرنے کے لیے اس نے ایک شاطرانہ منصوبہ بنایا اور ایک تیر سے تین شکار کرنے کی کوشش کر ڈالی۔

نواز اور وحید کوٹ مکھن کے جرائم پیشہ تھے۔ اعجاز نے ان کی مدد سے جیدے کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ تیار کیا اور مجھے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ جیدے کی گمشدگی میں علی نواز کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ اس کا منصوبہ تقریباً کامیاب ہو چکا تھا کہ بالکل آخری مراحل میں، میں نے اس کے عزائم کی تکمیل روک دی تھی۔

جیدے کی چپل کی بازیابی اور شناخت کے علاوہ نذیر حسین کے انکشاف نے میرا کام آسان کر دیا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ جیدے کی گمشدگی میں انہی دو مشکوک افراد کا ہاتھ تھا اور بعد ازاں میرا یہ خیال سو فیصد سچ ثابت ہوا۔ جیدے کے وجود کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے اعجاز نے نواز اور وحید کی خدمات حاصل کی تھیں تا کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری......!

اسی روز شام سے پہلے میں نے نواز اور وحید کی نشاندہی پر جنگل کے دور افتادہ حصے میں جا کر معصوم جیدا کی لاش دریافت کر لی۔ ان نامرادوں نے جیدے کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد ایک گڑھے میں دبا دیا تھا۔ یہ تمام ترمذموم کارروائی انہوں نے اعجاز کے ایما پر کی تھی لہٰذا میں نے نواز اور وحید کے ساتھ ہی اعجاز کو بھی فٹ کر دیا۔ اس فتنے کا روح رواں وہی تھا۔

فساد تو فساد ہی ہوتا ہے اور اگر یہ فساد کسی جہالت کا رہین منت ہو تو پھر اس کی خطرناکی اور تباہ کاری کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا......!

(تحریر: حسام بٹ)

پس منظر

تنویر ریاض

دنیا کے بیشتر انقلابات میں جہاں دیگر عوامل کارفرما رہے ہیں وہیں قلم کی طاقت سے بھی انکار ممکن نہیں۔ دوسروں کی داستان لکھنے والے اکثر لاشعوری طور پر خود بھی کسی نہ کسی داستان کا حصہ بن کر زندگی گزارتے ہیں۔ اگرچہ اس کا ادراک بہت آخر میں ہوتا ہے مگر اس وقت تک کہانی کا انجام ترتیب پا جاتا ہے۔

پردیس سے ایک تخلیق کار کی زندگی کے چند اوراق

یہ واقعہ اس سال پیش آیا جب مجھے رومانی ناول ''شیونیتا'' پر گولڈ ہرٹ ایوارڈ ملا۔ اس کی کہانی ایک آسٹرین موسیقار اور مصیبت زدہ برطانوی لڑکی کی محبت کے گرد گھومتی تھی جو ویانا میں زیر علاج تھی۔ مجھے کبھی ایسے ناولوں کا پلاٹ سوچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی گو کہ میری اپنی زندگی میں رومانی تجربات بہت کم ہیں۔ میرے لیے یہ ایوارڈ اور اس کے نتیجے میں ملنے والی توجہ بہت اہم تھی کیونکہ اس سے پہلے میں مختلف موضوعات پر پینتالیس کتابیں لکھ

چکی تھی جن کی تعریف بہت کم لوگوں نے کی اور مجھے قارئین کے بہت ہی کم خطوط موصول ہوئے۔ مجھے اس ایوارڈ کے ملنے کی بالکل بھی توقع نہیں تھی۔ اسی لیے میں اس لنچ میں دیر سے پہنچی جہاں یہ ایوارڈ دیا جانا تھا۔ تقریب کے اختتام پر بہکی بہکی باتیں کررہی تھی۔ میں آج بھی یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ اس شیمپین کی بوتل کا اثر تھا۔ جو انعامی رقم کے ساتھ مجھے دی گئی تھی اور نہ ہی انعام وصول کرتے وقت شاہی خاندان کے فرد سے ہاتھ ملانے کا نشہ تھا بلکہ دوسرے مصنفین کی آنکھوں سے ٹپکتی جلن نے مجھے مدہوش کردیا تھا۔

وجہ چاہے کچھ بھی ہو لیکن میں اس سے انکار نہیں کرسکتی کہ میرا دماغ اس وقت بھی چکرا رہا تھا۔ جب میں کیفے رائل سے باہر نکل رہی تھی۔ اور میرا ذہن یہ سوچنے کے بھی قابل نہ تھا کہ مجھے واٹرلو اسٹیشن جانے کے لیے کس راستے کا انتخاب کرنا چاہیے۔ میں نے پہلی بار اپنا اصول توڑتے ہوئے ٹیکسی پکڑی اور گلڈفورڈ جانے والی ٹرین میں سوار ہونے کے لیے اسٹیشن پہنچ گئی۔ مجھ جیسی درمیانہ عورت کی عمر کے لیے یہ عیاشی بھی بہت زیادہ تھی اور ٹیکسی کا کرایہ مجھے انعام میں ملنے والی رقم سے بھی زیادہ لگ رہا تھا لیکن یہ میری مجبوری تھی۔ میں نے اپنی جیت کا یقین کرنے کے لیے وہ ڈبا کھول کر دیکھا جس میں وہ ایوارڈ رکھا ہوا تھا پھر میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور ان لمحات کو یاد کرنے لگی جب سب لوگ اپنی جگہ پر کھڑے ہوکر تالیاں بجارہے تھے۔

"کیا یہی وہ ایوارڈ ہے؟" ایک آواز نے میری محویت توڑ دی۔

میں نے اپنی آنکھیں کھول کر دیکھا۔ میرے برابر والی نشست پر سفید بالوں والا ایک شخص براجمان ہوچکا تھا۔ اس نے قیمتی سوٹ پہن رکھا تھا اور کافی اسمارٹ دکھائی دے رہا تھا۔ سیاہ قمیص، سلور کلر کی ٹائی اور سیاہ چشمے میں اس کی شخصیت متاثر کن لگ رہی تھی۔

"معاف کرنا میں کچھ سمجھی نہیں۔" میں نے اجنبیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے کہا کہ کیا یہ وہ ایوارڈ ہے جسے تم ایک اسٹار کی طرح گھر لے جاکر رکھ دوگی اور اس کے بعد یہ تمہارے لیے بے حقیقت ہوجائے گا۔"

میں نے کوشش کی کہ اس سے نظریں نہ ملاؤں لیکن میں نے اس کے دانتوں پر چڑھا ہوا سونے کا خول دیکھ لیا تھا۔ میں نے کبھی بھی نمود و نمائش کو پسند نہیں کیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا لیکن میں اسے نظرانداز نہیں کرسکتی تھی، مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ میرے بارے میں کس حد تک جانتا ہے۔ مجھے اس کے حد سے تجاوز کرنے کی پروا تھی اور نہ ہی میں اس کے سوال کے پیچھے چھپے ہوئے مقصد کو جاننا چاہتی تھی۔ لہٰذا میں نے اس کی حوصلہ شکنی کی خاطر کہا۔ "اگر تم میری بات کا برا نہ مناؤ تو مجھے کہنے دو کہ اس سے تمہارا کوئی سروکار نہیں۔"

"اس طرح کی باتیں نہ کرو ڈولی۔" یہ کہہ کر اس نے مجھے مزید اعتراض کرنے کا موقع فراہم کردیا۔ میرا قلمی نام ڈولوریس ہے اور میں اپنے دوستوں کو بھی مجبور کرتی ہوں کہ وہ مجھے اس کے علاوہ کسی دوسرے نام سے نہ بلائیں۔ وہ اپنا سر میری طرف اس طرح جھکائے ہوئے تھا، جیسے چاہتا ہو کہ دوسرے مسافر ہماری گفتگو نہ سن سکیں۔ بعض اوقات ٹرین کے سفر میں برابر بیٹھے ہوئے شخص سے باتیں کرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن اگر کوئی اپنا سر جوڑ کر بیٹھ جائے اور ڈولی کہہ کر بلائے تو اس عورت کے پاس ہنگامی زنجیر کھینچنے کے علاوہ کوئی چارہ باقی نہیں رہتا۔ اس نے یقیناً اندازہ لگالیا ہوگا کہ میں کیا سوچ رہی ہوں لہٰذا وہ مجھے تسلی دینے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"میں کچھ بے تکلف ہوگیا تھا۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ واقعی مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔" میں نے روکھے انداز میں سر ہلایا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ وہ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "لیکن تمہیں اس بارے میں ضرور سوچنا چاہیے۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"تم اگر چاہو......" اس نے معنی خیز انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"میں کوئی چیز خریدنا نہیں چاہتی۔ براہِ کرم مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

"میں کوئی چیز نہیں بیچ رہا۔ میرا اشارہ بیسٹ سیلر کی طرف ہے، تم اس بارے میں ضرور سوچو تمہیں کس کتاب پر انعام ملا ہے۔"

"چے شیونینا!"

"میرا خیال ہے کہ اس ایوارڈ کی بدولت اس کی چند سو کاپیاں اضافی فروخت ہوجائیں گی۔ ممکن ہے کہ یہ تعداد ہزار تک پہنچ جائے اور اس میں سے مصنف کو کیا ملتا ہے۔ اس کے لیے مرغی کی خوراک کی مثال دینا کافی ہوگا۔ میں پوری دنیا میں فروخت کی بات کررہا ہوں جو لاکھوں میں

ہوتی ہے۔"

"کیا واقعی؟" میں اپنا نچلا ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔

"اگر تم مزید جاننا چاہتی ہو تو کل صبح اس لیموزین میں سوار ہوجانا جو تمہاری گلی کے آخری سرے پر کھڑی ہوگی۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارا سفر بالکل محفوظ ہوگا اور اس کے بعد تمہاری زندگی بدل جائے گی۔"

میں اس سے پوچھنے ہی والی تھی کہ اسے میری رہائش گاہ کے بارے میں کس طرح علم ہوا لیکن وہ اچانک ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ کھونٹی پر سے اپنا ہیٹ اتارا اور اسے سر پر جماتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔ میں نے بقیہ سفر بے آرامی سے گزارا سارے راستے اس کے الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہے۔ عالمی پیمانے پر فروخت جو لاکھوں میں ہوتی ہے۔ میں نے اس کامیابی کا خواب کبھی نہیں دیکھا تھا جبکہ مجھے سال کے بہترین رومانی ناول کے مصنف کا اعزاز مل چکا تھا۔ بہ ظاہر وہ شخص احمقانہ باتیں کررہا تھا۔ وہ کون ہوسکتا ہے، کوئی ایجنٹ، پبلشر یا فلم ساز، میرے خیال میں وہ ان میں سے کوئی نہیں تھا۔ میں نے اس پر اور اس کی لیموزین پر لعنت بھیجی اور اس کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

گھر پہنچ کر میں ایک بار پھر اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوگئی۔ گھر کی حالت خاصی خستہ ہوگئی تھی۔ دروازوں کا رنگ اڑ چکا تھا۔ کچن کا نل ٹپک رہا تھا اور اس کی ٹپ ٹپ میرے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اتنی ساری کتابیں لکھنے کے بعد میرے حالات اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتر ہونے چاہیے تھے۔ شاید یہ ایوارڈ میری قسمت بدل دے۔

اس رات مجھے ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ میں علی الصبح بیدار ہوگئی اور سوچنے لگی کہ اگر اس کی کار واقعی مجھے لینے آگئی تو سمجھوں گی کہ وہ سچا تھا اور اس نے میرے ساتھ کوئی مذاق نہیں کیا تھا۔ عام طور پر میں گھر میں جینز اور سوئٹر پہنتی ہوں لیکن اس روز میں نے باہر جانے کے لیے اپنا گرے سوٹ اور سفید بلاؤز زیب تن کیا۔ تیار ہوجانے کے بعد میں نے ایک سے زائد مرتبہ کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا لیکن گلی کے آخری سرے پر مجھے گروسری وین کے علاوہ کوئی گاڑی نظر نہیں آئی۔

نو بجنے میں پانچ منٹ پر میں نے ایک بار پھر باہر کی جانب نظر دوڑائی تو مجھے وہاں ایک سیاہ چمک دار ڈیلر کار کھڑی نظر آئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے اپنے پالش شدہ سیاہ جوتے پہنے اور جسم کے گرد سرخ شال اچھی طرح لپیٹ کر باوقار انداز میں چلتی ہوئی کار تک پہنچی۔ سفید بالوں والے شوفر نے گرے رنگ کی وردی پہن رکھی تھی۔ اس نے مؤدبانہ انداز میں مجھے سیلیوٹ کیا میرے لیے کار کا دروازہ کھول دیا۔

"ہم کہاں جارہے ہیں؟" میں نے کار کی پچھلی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ وہاں پہنچ کر آپ حیران رہ جائیں گی۔"

"گویا تم مجھے بتانا نہیں چاہتے۔"

"اس طرح میں سارا مزا ختم ہوجائے گا۔ آپ آرام سے بیٹھیں۔ اگر ٹی وی نہیں دیکھنا چاہتیں تو اس کا سوئچ آف کردیں۔ اگر مطالعہ کا شوق ہے تو آپ کو کئی میگزین اور اخبارات بھی مل سکتے ہیں۔"

"کیا یہ سفر طویل ہے!"

"جی ہاں۔ ہمیں کم از کم ایک گھنٹا تو لگ ہی جائے گا۔"

میرے ذہن میں فوراً ہی لندن کا خیال آیا اور تھوڑی دیر بعد ہی اس کی تصدیق بھی ہوگئی جب کار اے تھری کی جانب مڑ گئی، میں کار ٹی وی یا میگزین کے بجائے راستہ ذہن نشین کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ لیکن کامیاب نہ ہوسکی۔ ایک گھنٹا گزرنے سے پہلے ہم مغربی لندن میں تھے لیکن یہ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ کون سا علاقہ تھا۔ بالآخر ہماری کار ایک بڑے گیٹ کے باہر رک گئی۔ ڈرائیور کے ہارن دیتے ہی گیٹ خودکار طریقہ سے کھل گیا۔ وہ جائیداد اتنی بڑی تھی کہ گیٹ میں داخل ہونے کے بعد بھی کار چلتی رہی اور پھر سرخ اینٹوں کی بنی ہوئی عمارت کے باہر رک گئی۔ اس پرشکوہ عمارت کو دیکھ کر میں خوف زدہ ہوگئی۔ میں نے کار سے باہر نکلتے ہوئے شوفر سے پوچھا۔

"کیا تم واپس گھر چھوڑنے جاؤ گے؟"

"آپ اس کی فکر نہ کریں۔ تمام انتظامات مکمل ہیں۔"

جیسے ہی میں نے سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ سامنے والا دروازہ فوراً ہی کھل گیا۔ ایک خوب صورت جوان عورت نام لے کر میرا استقبال کررہی تھی۔ اس کے بال سرخی مائل سنہرے تھے۔ اس نے گہرے سبز رنگ کا بلاؤز اور نیلی جینز پہن رکھی تھی۔ اس کا چہرہ جانا پہچانا لگ رہا تھا لیکن مجھے یاد نہیں آیا کہ اس سے پہلے کہاں مل چکی ہوں۔ وہ ان تمام عورتوں سے کہیں زیادہ جوان تھی جن سے میری ملاقات ایوارڈ لنچ کے موقع پر ہوئی تھی۔

"مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ تم نے یہاں آنے کا فیصلہ کیا۔" اس نے کہا۔ "ایش کو پورا یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔ دراصل اس میں کچھ ایسی خداداد صلاحیتیں ہیں جو ہر ایک کو نظر نہیں آتیں۔"

"ایش؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔ "مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں آتی کہ کوئی شخص مجھے ڈگمگانے پر مجبور کرسکتا ہے۔"

"ایش میرا شوہر جس نے تم سے ٹرین میں بڑے میٹھے لہجے میں بات کی تھی۔"

"اس نے مجھ سے کسی کاروباری سودے کی بات کی تھی۔"

"ہاں اور اس کے لیے ہم تمہیں اپنے ساتھ شامل کرنا چاہتے ہیں۔"

وہ مجھے سرخ قالین سے آراستہ راہداری سے گزارتی ہوئی ایک بڑے ہال میں لے گئی جہاں کئی بڑے بڑے صوفے رکھے ہوئے تھے۔ آتش دان میں لکڑیاں دہک رہی تھیں اور کمرے کا درجۂ حرارت غیر معمولی طور پر زیادہ تھا۔

"کافی؟" اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"ضرور۔ تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔"

"مجھے ریوین کہتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا موبائل فون نکالا اور کسی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ "تین کافی۔"

گو کہ میں اخبار نہیں پڑھتی تھی لیکن میں نے ریوین کا نام سن رکھا تھا۔ وہ ماڈل، ایکٹریس، گلوکارہ اور ٹی وی کی مشہور شخصیت تھی۔ اس نے جس شعبہ میں بھی کوشش کی وہیں نام بنایا۔ میں اپنی جھینپ مٹانے کے لیے بولی۔ "مجھے امید نہیں تھی کہ تم سے ملاقات ہوجائے گی۔ میرا خیال تھا کہ کسی اشاعتی ادارے کے لوگوں سے واسطہ پڑے گا۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وہ بولی۔ اچھا ہی ہے کہ کوئی مجھے نہ پہچانے۔ لوگ بڑے عجیب وغریب انداز میں اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ تم نے کسی کو اپنے اس خفیہ سفر کے بارے میں تو نہیں بتایا؟"

"نہیں۔ یہ راز ابھی مجھ تک ہی محدود ہے۔"

"بہت اچھے۔ کیا یہ سچ ہے کہ تم تنہا رہتی ہو؟"

"ہاں۔"

"اور تم نے ہی اتنے سارے دلچسپ رومانی ناول لکھے ہیں؟"

میں دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی لیکن انکساری سے جواب دیا۔ "ہاں۔ کچھ تو لوگوں کو وہ پسند آئے ہیں۔"

"میں نے تمہارے سب ناول پڑھ رکھے ہیں۔" اس کی آواز میں تعریف جھلک رہی تھی۔

میرے لیے یہ ایک حیرت انگیز بات تھی۔ اس کی زندگی بذاتِ خود مصروف تھی پھر اسے فراریت کی ضرورت کیوں پیش آئی جو میری کتابوں سے حاصل ہوتی ہے۔

"تم ایک اسٹار ہو۔ بہترین مصنف۔ تم اس ایوارڈ کی حق دار تھیں۔ اب تمہیں بیسٹ سیلر بھی بننا چاہیے۔"

میں دل ہی دل میں اس سے متفق تھی لیکن تعریف سننے کی عادت نہیں تھی۔ اس لیے اس کی بات مشکل سے ہضم ہوتی۔ میں نے کہا۔ "میں نہیں سمجھتی کہ اس شہرت کو سنبھال سکوں گی۔ اس کے برعکس میں کافی بزدل واقع ہوئی ہوں۔ مجھ سے کئی بار انٹرویو کے لیے کہا گیا لیکن میں نے ہمیشہ منع کردیا۔"

"پھر تمہاری پبلک ریلیشننگ کون کرتا ہے؟"

"کوئی نہیں۔"

"تمہارا کوئی ایجنٹ تو ہونا چاہیے۔"

"مجھے ایسے کسی شخص کی ضرورت نہیں۔ یہ لوگ ہماری آمدنی میں حصے دار بن جاتے ہیں اور میں اسے افورڈ نہیں کرسکتی۔"

"گویا تم اپنے سارے کاروباری معاملات خود ہی دیکھتی ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اسی لمحے ایک عورت ٹرالی میں کافی لیے اندر داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر ریوین نے برا سا منہ بنایا اور بولی۔ "ٹھیک ہے۔ تم جاؤ ہم خود ہی کافی نکال لیں گے۔"

وہ عورت ایک پھیکی مسکراہٹ چہرے پر سجائے واپس چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد ریوین بولی۔

"تم کس طرح کی کافی لینا پسند کرو گی؟"

"بلیک!" میں نے جواب دیا۔

"بالکل میری طرح بلکہ ایش بھی پسند کرتا ہے۔ اس کا اصل نام ایشلے ہے۔ وہ کسی وقت بھی یہاں آسکتا ہے۔ اس کی ٹائمنگ ہمیشہ درست ہوتی ہے۔ وہ کافی اسمارٹ ہے ورنہ اتنی بڑی جائداد کا مالک نہ ہوتا۔"

ریوین نے کافی کی تین پیالیاں بنائیں جبکہ دیگر لوازمات ٹرالی کے نچلے حصہ میں رکھے ہوئے تھے۔ ابھی میں نے اپنی پلیٹ اٹھائی تھی کہ ایک آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"عقل مند لڑکی ہو!"

مجھے کسی نے لڑکی کہہ کر نہیں پکارا تھا لیکن میں عمر میں ایش سے کم از کم دس سال چھوٹی تھی۔ لہٰذا میں نے اسے تھوڑی سی رعایت دینا مناسب سمجھا۔ اب میں نے اسے ٹرین کے سفر کے مقابلے میں زیادہ غور سے دیکھا۔ اس کی عمر ستر برس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے جیکٹ، پتلون اور قیمتی جوتے پہن رکھے تھے۔

اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور اتنی زور سے دبایا کہ میرا ہاتھ بے جان ہوگیا پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ "یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میں نے تمہاری کوئی کتاب پڑھی ہے یا نہیں۔ ویسے مجھے پڑھنے کی عادت نہیں ہے۔ البتہ یہ مجھے بتاتی رہتی ہے کہ تم بہترین رومانی ناول لکھتی ہو۔"

"یہ خود بھی بہت فراخ دل ہے۔" میں نے کہا۔

"تم سال میں اوسطاً کتنا کما لیتی ہو؟" اس نے پوچھا۔

میں اس طرح سوالوں کے جواب دینے کی عادی نہیں تھی۔ اس لیے ٹالنے کے انداز میں کہا۔ "بس گزارہ ہوجاتا ہے۔"

"پھر بھی کتنا کما لیتی ہو؟"

"ایک مصنف کی آمدنی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔" میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ اسے صحیح رقم نہیں بتاؤں گی۔ "میں نے گزشتہ پندرہ برسوں کی کمائی سے یہ گھر بنایا ہے۔"

"کیسا گھر؟" اس نے پوچھا۔ "مجھے غلط نہ سمجھنا ڈولی مگر گلڈفورڈ جیسے علاقے میں ایک چھوٹے سے گھر میں رہنے کو میں زندگی نہیں سمجھتا۔"

ریوین نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ "ایش یہ مناسب نہیں ہے۔"

اس نے ریوین کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی آنکھیں میرے چہرے پر جمائیں اور بولا۔ "تم گھنٹوں مغز ماری کرتی ہو۔ تمہارا کام بہت اچھا ہے۔ تم اس سے کہیں زیادہ کی حق دار ہو۔ میں نے اپنے پہلے دس لاکھ تیس سال کی عمر میں بنا لیے تھے۔ یہ بہت ہی گندا کام تھا جو کوئی بھی نہیں کرنا چاہتا لیکن میں نے کیا۔ گھر گھر سے کچرا جمع کرنا اور اسے ٹھکانے پر پہنچانا۔ آج میرے پاس اس ملک میں کچرا اٹھانے والی گاڑیوں کا سب سے بڑا ٹھیکا ہے۔ لوگ مجھے ایش کچرے والا کہہ کر بلاتے ہیں لیکن مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ میں اس پر فخر محسوس کرتا ہوں۔ میرے پاس لندن، نیویارک اور سان فرانسسکو میں ذاتی مکانات ہیں۔ میں ہر سال پہاڑ کی اونچائی چڑھتا ہوں جب تک میرے گھٹنے جواب نہیں دے جاتے اور اپنی نفسانی خواہشات کی تسکین [illegible] آدھی عمر کی عورت سے شادی کر رکھی ہے۔"

"یہ غیر مہذب انداز ہے۔" ریوین نے احتجاج کیا۔

"یہ حقیقت ہے۔" وہ اپنی جوان بیوی پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ "تم میرے لیے صرف ایک خوب صورت چیز ہی نہیں بلکہ میری محبت بھی ہو۔ تمہارے ذہن میں بہت سے خیالات جمع ہیں۔ تم ڈولی کو اپنی کہانی سناؤ۔" پھر وہ میری طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "اس سے تمہیں آگے بڑھنے کا راستہ ملے گا۔"

وہ میرے مقابل اپنی بیوی کے برابر صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ "ڈولی کو اپنی زندگی کے واقعات کے بارے میں سب کچھ بتادو۔"

"ٹھیک ہے۔ وہ بولی میں نہیں جانتی کہ ڈولوریس کیا سوچے گی۔ وہ مشہور مصنفہ ہے۔"

"اسے آئیڈیاز کی تلاش رہتی ہے۔" ایش نے کہا۔ "اور یہ آئیڈیا تم اسے دو گی۔"

"اس پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ میں تمہیں مختصراً اس کا خاکہ سنانے دیتی ہوں۔" وہ مجھ پر نظریں جماتے ہوئے بولی۔ "وہ چھوٹی سی لڑکی ایسٹ شین میں رہا کرتی تھی۔"

"ہمیں جگہ کا نام تبدیل کردینا چاہیے۔ ایش نے کہا، تم اس کی جگہ رچمنڈ استعمال کرو۔"

"ٹھیک ہے۔ جب وہ تیرہ سال کی ہوئی تو اس کی اٹھان دوسری لڑکیوں کے مقابلے میں زیادہ تھی۔ اس کی ماں نے اسے مقابلہ حسن میں بھیج دیا اور وہ جیت گئی لیکن کسی لڑکی نے اعتراض کردیا کہ اس کی عمر کم ہے۔ مقابلے کے قواعد کے مطابق اس میں سولہ سال سے کم عمر کی لڑکی شرکت نہیں کرسکتی تھی۔ لہٰذا میں نا اہل قرار دے دی گئی۔"

"وہ" ایش نے تصحیح کی۔ "وہ نا اہل قرار دے دی گئی۔ ہم اس کا نام فالکن رکھ لیتے ہیں۔"

"میں اسی جانب آرہی تھی۔" ریوین نے کہا۔

ایش میری طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "تمہارا کیا خیال ہے ڈولی۔ فالکن اچھا نام ہے؟"

"بہت عمدہ" میں نے دونوں میاں بیوی کے درمیان نظر آنے والے کھنچاؤ کو کم کرنے کے لیے کہا۔

"او کے۔" ریوین بولی "اس طرح اس لڑکی فالکن

کو اپنے بڑے ہونے کا انتظار کرنا پڑا۔ اس دوران اس نے خوب صورتی! میک اپ اور فیشن کے بارے میں بہت کچھ سیکھ لیا۔ اس کے بعد وہ ایک اور مقابلہ میں شریک ہوئی۔ گویا کہ اس وقت بھی وہ پندرہ برس کی تھی۔''

''اور اسے ایک ماڈلنگ کنٹریکٹ مل گیا۔'' ایش بولا۔

''تم کہانی کو خراب کر رہے ہو۔'' ریوین بولی۔

''ایسا ہی ہوا تھا۔'' ایش نے کہا۔

''ہاں لیکن میں اسے اپنے انداز میں بیان کر رہی ہوں۔ میں ماڈلنگ کی طرف ہی آ رہی تھی لیکن تم نے درمیان میں بول کر سارا سین ختم کر دیا۔ اب خاموش رہنا۔''

''اس سے پہلے کہ تم آگے بڑھو۔'' میں نے ریوین سے کہا۔ ''میں نہیں جانتی کہ تم یہ سب مجھے کیوں بتا رہی ہو۔ اگر یہ تمہاری زندگی کی کہانی ہے اور تم اسے چھاپنا چاہتی ہو تو بہتر ہوگا کہ پہلے اسے لکھ لو۔''

''اسے میرے بارے میں نہ سمجھا جائے۔ اس میں حقیقت ضرور ہے لیکن اس میں جو رومانس ہے۔ اسے میں نکال دوں گی کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ لوگ اس کے بارے میں جان پائیں۔''

''اور صرف اچھے واقعات ہی سامنے آسکیں۔'' ایش بولا۔

''ایسی صورت میں یہ فکشن کے روپ میں خود نوشت سوانح حیات ہوگی۔ میں سمجھتی ہوں کہ تم خود بھی اسے لکھ سکتی ہو۔''

''یہ لکھ سکتی ہے؟'' ایش نے حیرت سے کہا۔

''اس کے کہنے کا مطلب ہے کہ میں مصنفہ ایش ہوں۔'' ریوین بولی۔ ''میں صرف واقعات بیان کر سکتی ہوں۔''

''اور اسی لیے ہم نے تمہیں زحمت دی ہے۔'' ایش نے مجھ سے کہا۔

''ہم چاہتے ہیں کہ یہ کتاب تم لکھو۔'' ریوین نے کہا۔ ''اسے ایک نئی شکل دے دو۔ میرا خیال ہے کہ تم میرا مطلب سمجھ رہی ہوگی۔''

''یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔ اس طرح اس کے پرستاروں کو اس کی زندگی کے واقعات کا علم ہو سکے گا اور اس کی لاکھوں کاپیاں فروخت ہو سکتی ہیں۔''

''لیکن اگر اسے ریوین نے اپنے انداز میں نہ لکھا تو کوئی یقین نہیں کرے گا کہ یہ اسی کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔''

''تم اسے تھوڑا سا خراب بنا دینا۔ لمبے لمبے جملے اور غیر ضروری الفاظ استعمال کر کے تحریر کو بھدا کیا جا سکتا ہے۔ بس لوگوں کا شوق برقرار رہنا چاہیے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم ایسا کر سکتی ہو۔ تقریباً سبھی مشہور شخصیات اپنی کتابیں لکھنے کے لیے کسی نہ کسی مصنف کی خدمات حاصل کرتی ہیں۔ انہیں گھوسٹ رائٹر کہا جاتا ہے۔''

''میں جانتی ہوں۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''مجھے یہ سن کر بہت مایوسی ہوئی کیونکہ میں گھوسٹ رائٹر نہیں بلکہ طبع زاد کہانیاں لکھتی ہوں اور میں نے کبھی اس طرح کی کوشش نہیں کی۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ایسی کتابوں کا آغاز کس طرح کیا جاتا ہے۔''

''یہ سب کچھ ٹیپ پر موجود ہے۔'' ایش نے کہا۔ تمہیں اسے سن کر کاغذ پر منتقل کرنا ہے۔ جہاں کہیں مناسب سمجھو اس میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے رنگ آمیزی کر سکتی ہو۔ یہ کتاب ریوین کے نام سے شائع ہوگی اور اس کا شمار بیسٹ سیلرز میں ہوگا۔''

''مجھے افسوس ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں ایسا نہیں کر سکتی۔''

''ٹھہرو۔ تم نے ابھی پوری بات نہیں سنی ایش بولا۔'' تم آج یہاں سے دس ہزار پاؤنڈ لے کر جاؤ گی۔ بقیہ نوّے ہزار تمہیں اس وقت ملیں گے جب کتاب کا مسودہ ہمارے حوالے کر دو گی۔ تمام ادائیگی نقد ہوگی۔ اس پر کوئی ٹیکس بھی ادا نہیں کرنا پڑے گا۔ یہ سودا کیسا رہے گا؟''

یہ رقم بہت بڑی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ جو میں عام طور پر کماتی تھی لیکن اس کتاب کو لکھ کر میری نیک نامی متاثر ہو سکتی تھی جو میں نے چھیالیس ناول لکھنے کے بعد کمائی تھی۔

ایش نے شاید میرے دل کی بات پڑھ لی۔ وہ مجھے یقین دلاتے ہوئے بولا۔ ''اس سارے معاملے میں تمہارا نام کہیں نہیں آئے گا۔ ہم تمہیں اس سے بالکل الگ رکھیں گے اور لوگوں کو یہی بتایا جائے کہ اس کتاب کا ایک ایک لفظ ریوین نے خود لکھا ہے اور اسی لیے یہ بیسٹ سیلر ہوگی۔ اس کے مداح ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور جب یہ کتاب لوگوں تک پہنچے گی تو ان کی تعداد میں مزید اضافہ ہوگا۔ وہ یقیناً اس کے ماضی کی اندرونی کہانیوں کے بارے میں جاننا چاہیں گے۔ اس کی ماڈلنگ، فیشن شوز، ٹیلی وژن شوز، موسیقی کے مقابلے اور کن کن اسٹارز سے اس کی ملاقاتیں ہوئیں وغیرہ وغیرہ مجھے یقین ہے کہ اس کتاب میں دلچسپی کا بہت مواد ہوگا۔''

''اور تم سے میری ملاقات کس طرح ہوئی؟ ریوین نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ وہ یقیناً یہ بھی جاننا چاہیں گے کہ میں نے اپنے سے بیالیس سال زیادہ عمر کے شخص میں کیا دیکھا۔''

''سچی محبت۔'' ایش نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں تمہارا دیوانہ ہوں اسی لیے اس کتاب پر سرمایہ کاری کر رہا ہوں۔''

وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے گلے لگتے ہوئے بولی۔ ''میرے ہیرو۔''

میرے لیے یہ ایک انوکھی پیشکش تھی۔ میں سوچنے لگی کہ ان ایک لاکھ پاؤنڈز سے کیا کچھ کر سکتی ہوں شاید ریوین کی سوانح حیات لکھنے سے مجھے تخلیقی طور پر اطمینان نہ ہوتا لیکن اسے لکھنا کچھ مشکل نہ تھا خاص طور پر ایسی صورت میں جبکہ اس نے تمام واقعات اپنے الفاظ میں ریکارڈ کر رکھے ہوں۔

''تم نے ابھی بتایا تھا کہ سب کچھ ٹیپ پر موجود ہے۔''

''خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنے کیسٹ ہوں گے۔ ایش بولا یہ گھنٹوں بیٹھی ریکارڈنگ کرتی رہی ہے اور اس نے اپنی زندگی میں پیش ہونے والا چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی نہیں چھوڑا۔''

یہ سن کر مجھے تھوڑی سی تشویش لاحق ہوئی۔ گویا مجھے تمام واقعات کو کتابی شکل دینے میں خاصی محنت کرنا ہوگی۔

''تم یہ تمام کیسٹ آج ہی اپنے ساتھ لے جا سکتی ہو۔'' ایش نے کہا۔

''میں یہ نہیں کہہ رہی کہ یہ کام کروں گی۔''

''اس میں کیا مسئلہ ہے ڈولی؟ تمہیں ایک معقول کام مل رہا ہے۔''

''لیکن ابھی تو ہم نے معاہدے کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔'' میں نے کہا۔

''ایسا کوئی معاہدہ نہیں ہوگا۔'' ایش نے کہا۔ ''البتہ تمہیں صرف ایک وعدہ کرنا ہوگا کہ اس کتاب کو لکھنے کے علاوہ تمہیں اپنی زبان بھی بند رکھنا ہوگی۔ جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں کہ یہ کتاب ریوین کے نام سے شائع ہوگی۔ اگر کسی نے شک ظاہر کیا تو ہم کہہ دیں گے کہ اس کے پیچھے کوئی گھوسٹ رائٹر نہیں ہے۔ یہ پوری کتاب ریوین نے خود لکھی ہے۔ میرا خیال ہے تم میرا مطلب سمجھ گئی ہوگی۔ ہم ایک معقول رقم کے عوض تمہاری خاموشی خرید رہے ہیں۔''

''اگر میں کسی بات کی وضاحت کے لیے ریوین سے دوبارہ ملنا چاہوں تو کیا ایسا ممکن ہوگا؟''

''سوری۔ یہ نہیں ہو سکتا۔'' ریوین بولی۔ ''میں اگلے چند ماہ آسٹریلیا میں ایک ٹیلی وژن شو کے سلسلے میں مصروف رہوں گی اور اس دوران کوئی مجھ سے نہیں مل سکتا۔

یہاں تک کہ ایش بھی نہیں۔''
''گویا تم چاہتی ہو کہ یہ کتاب صرف انہی ٹیپس کی مدد سے لکھی جائے اور اس سلسلہ میں مزید کسی مشاورت کی ضرورت نہیں۔''
''یہی مناسب رہے گا۔ ایش نے کہا۔'' ''ریوین مشہور شخصیت ہے اور اس کی تمام سرگرمیاں میڈیا کی نظروں میں رہتی ہیں۔ اگر تم نے اس سے ملنے کی کوشش کی تو بات پھیل سکتی ہے۔ تمہیں مواد کی کمی نہیں ہوگی۔ اس بارے میں انٹرنیٹ سے بھی بہت کچھ مل سکتا ہے۔''
''اگر تم میرے لکھے ہوئے مسودہ سے مطمئن نہ ہوئے تو کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔
اس بار ریوین نے جواب دیا۔ ''ایسا نہیں ہوگا۔ ہم نے تمہارا انتخاب اسی لیے کیا ہے۔''
یہ کہہ کر اس نے اپنی بڑی بڑی نیلی آنکھیں مجھ پر جمادیں۔ اسے مجھ پر پورا بھروسا تھا پھر بھی میں نے بات کو مزید واضح کرنے کے لیے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ کچھ غلط باتیں بھی شامل ہوسکتی ہیں۔ اس طرح کام کرنے میں یہ امکان بڑھ جاتا ہے۔''
''جب مسودہ ہمیں ملے گا تو ریوین ان غلطیوں کو درست کرلے گی۔'' ایش بولا۔ ''اب ہمیں تاریخ طے کر لینی چاہیے۔ تم کب تک یہ مسودہ ہمیں دے سکتی ہو؟''
''میرا خیال ہے کہ ہم پہلے ہی اس پر متفق ہوچکے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔
سچی بات تو یہ ہے کہ معقول رقم ملنے کے لالچ میں ہی میں نے یہ کتاب لکھنے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ اگلے چھ ماہ کے لیے میں نے گھر پر بیٹھ کر اپنے کام کی منصوبہ بندی کی میرے پاس اس کتاب کے لیے مواد حاصل کرنے کا واحد ذریعہ وہ ٹیپس تھے جن میں ریوین نے اپنی زندگی کے واقعات ریکارڈ کر رکھے تھے۔ اس نے کافی زیادہ مواد جمع کر رکھا تھا لیکن ان ٹیپس کو سننے کے بعد اندازہ ہوا کہ اس نے متعدد جگہ اپنی باتوں کو دہرایا ہے۔ مجھے ایڈیٹنگ کر کے اسے ایک خاص شکل میں لانا تھا۔ اس کے لیے میں نے پہلے بات کو کئی مرتبہ لکھا۔ مجھے لگا کہ ایش نے جو کچھ بتایا تھا، اس کے مقابلے میں یہ عمل خاصا محنت طلب اور طویل تھا۔ اس نے کہا تھا کہ غیر ضروری جملے اور الفاظ حذف کردو لیکن یہ بات اتنی آسان نہیں تھی۔
کوئی بھی کتاب لکھنا اس وقت بہت مشکل ہوجاتا ہے جب آپ کے پاس کوئی مضبوط پلاٹ نہ ہو۔ اس کی بیان کردہ کہانی بالکل سپاٹ تھی اور اس میں کوئی سین ڈرامائی عنصر شامل نہیں تھا۔ جبکہ رومانی ناول میں محبت کی جیت سے پہلے تضادات، آزمائشیں اور کچھ ناکامیوں کا سامنے آنا ضروری ہے۔ مجھے ایسی تمام ناکامیوں کا سراغ لگا کر انہیں اجاگر کرنا تھا جن سے گزر کر وہ اس مقام تک پہنچی تھی۔ خاص طور پر اس مقابلۂ حسن کے بارے میں تفصیل بیان کرنا ضروری تھا جس میں اسے کم عمر ہونے کی وجہ سے نااہل قرار دے دیا گیا تھا۔ میں جانتی تھی کہ قاری عموماً اس طرح کے واقعات میں دلچسپی لیتے ہیں۔ کتاب کے آخر میں کچھ ایسے واقعات کا بھی اضافہ کیا جن سے قارئین کے دل میں ریوین کے لیے ہمدردی کے جذبات ابھر سکتے تھے۔ مثلاً اس کی کار کو پیش آنے والا حادثہ، خاندان میں ہونے والی موت اور ایسے شخص کی اس کی زندگی میں آمد جو آڑے رہ کر شکار کیا کرتا تھا۔
میرے لیے سب سے بڑی مشکل ایش کے کردار کو بیان کرنے میں آئی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ریوین اور ایک کباڑیے کے تعلق کو کس طرح رومانی شکل دی جائے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کتنا امیر تھا۔ اگر میں اس کی عمر میں سے تیس سال کم کردیتی تو وہ اسے اپنی بے عزتی سمجھتا۔ اگر اس کا پیشہ تبدیل کر کے اسے دماغ کا سرجن یا کار کی دوڑ میں حصہ لینے والا ڈرائیور دکھاتی تو وہ اس پر بھی تیار نہ ہوتا۔ اسے اپنے کام پر فخر تھا لیکن کسی رومانی ناول کے لیے اس طرح کے کردار موزوں نہیں ہوسکتے۔
میں نے جان بوجھ کر ممکنہ حد تک اس کے بارے میں لکھنے سے احتراز کیا۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ کتاب ایک قابل قبول حالت میں آگئی ہے تو میں نے پوری توجہ ایش کے کردار پر مرکوز کردی جو میرے لیے آخری بڑا چیلنج تھا۔
میں نے مایوسی کے عالم میں انٹرنیٹ کا سہارا لیا۔ اس اُمید پر کہ ایش کے بارے میں کوئی کارآمد بات معلوم ہوجائے۔ میں جانتی تھی کہ ایک کامیاب اور مشہور شخصیت ہونے کی وجہ سے اس نے کئی بار اخباری نمائندوں کو انٹرویو دیا ہوگا۔ شاید اسی سے مجھے اس کی شخصیت کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہوجائیں۔ میں نے انٹرنیٹ پر اس کے بارے میں جو کچھ پڑھا وہ خاصا حیران کن تھا۔
1992 میں اس پر قتل کے الزام میں مقدمہ چلا اور وہ بری ہوگیا۔ اس کی پہلی بیوی ایک اداکارہ تھی جس کا اس ڈرامے کے ہدایت کار سے معاشقہ چل رہا تھا جس میں وہ کام کررہی تھی پھر وہ اچانک ہی پُراسرار طور پر غائب

ہوگئی۔ اس کے خاندان والوں نے شبہ ظاہر کیا کہ ایش نے اسے مار ڈالا ہے لیکن اس کی لاش کبھی نہ مل سکی۔ گمشدگی سے پہلے اس نے اپنے محبوب کو خطوط لکھے جس میں اپنے اوپر ہونے والے ذہنی اور جسمانی مظالم کا ذکر کیا گیا تھا۔ اسی بنیاد پر ایش کے خلاف مقدمہ چلایا گیا لیکن وہ اپنے ذہین وکیلوں کی کوششوں سے بری ہوگیا۔

گویا کہ اس واقعہ سے مجھے کتاب کے پلاٹ کو مضبوط بنانے میں مدد ملتی لیکن میں اسے استعمال کرنے کی جرأت نہ کرسکی۔ مجھے یقین تھا کہ ایش اسے ہرگز پسند نہیں کرے گا کہ ریوین کی رومانی داستان میں اس پر کیچڑ اچھالی جائے اور نہ ہی مجھے یہ معلوم تھا کہ ریوین اس بارے میں کتنا جانتی تھی۔

انٹرنیٹ پر اس کے کئی انٹرویوز پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ ایش ایک خطرناک شخص ہے۔ اس نے بڑی کامیابی سے اپنی عظیم الشان سلطنت کو قائم رکھا ہوا تھا اور زیرزمین دنیا کے ان بااثر افراد کا بے جگری سے مقابلہ کرتا رہا جنہوں نے اس کے مقابلے پر آنے یا اس کی جگہ لینے کی کوشش کی۔ اس کا ایک مشہور جملہ تھا۔ ”تم ایش کو تباہ نہیں کرسکتے۔“

میں نے اس کے کیریکٹر کا نام آسٹن رکھا جو انچاس سال کا رنڈوا تھا۔ اس کے کاروبار کو ملتا جلتا نام دیا اور اسے ایک مخیر و قابل اعتبار شخصیت قرار دیا۔ اس کی ملاقات فالکن (ریوین) ایک کنسرٹ میں ہوئی جو فلاحی کاموں کے لیے چندہ جمع کرنے کی غرض سے منعقد ہوا تھا۔ وہ اس کے ساتھ مشرقی افریقا چلا گیا جہاں انہوں نے ایک یتیم خانہ قائم کیا۔ یہ کتاب مقررہ مدت سے ایک ہفتہ پہلے ہی مکمل ہوگئی۔ مجھے اطمینان تھا کہ اس کتاب کے ذریعے ریوین کی زندگی کے تمام گوشے بے نقاب ہوگئے جنہیں پڑھنے والے یقیناً پسند کریں گے۔

مقررہ تاریخ یعنی 9 مارچ کو میں ایک بڑا سا بیگ اٹھائے ہوئے اپنے گھر سے نکلی جس میں کتاب کا مسودہ اور ریوین کے دیے ہوئے مشورے تھے اور گلی کے آخری سرے پر کھڑی ہوئی کار میں سوار ہوگئی۔ گویا کہ میری کئی کتابیں شائع ہوچکی تھیں کسی بھی کتاب کا مسودہ جمع کراتے وقت میں ہمیشہ گھبراہٹ میں مبتلا ہوجاتی تھی اور اس بار جو حالات تھے انہیں دیکھتے ہوئے یہ گھبراہٹ دس گناہ بڑھ گئی تھی۔

پہلے کی طرح اس بار بھی ریوین نے ہی مرکزی دروازہ خود کھولا۔ وہ آسٹریلیا میں ہونے والے ٹیلی وژن شو کے بعد کافی خوش باش اور اسمارٹ نظر آرہی تھی۔ اس نے میرے بیگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”کیا یہ وہی ہے؟“

یہ سن کر مجھے ایش کے وہی الفاظ یاد آگئے جو اس نے ٹرین میں پہلی ملاقات پر کہے تھے۔ میں نے وہ مسودہ اس کے حوالے کردیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک ابھری وہ خوشی سے چہکتے ہوئے بولی۔ ”میں بتا نہیں سکتی کہ کتنی شدت سے اسے پڑھنے کا انتظار کررہی تھی۔

میں نے اس پر واضح کردیا کہ اس مسودہ کو ڈرامائی رنگ دینے کے لیے مجھے بہت کچھ تبدیل کرنا پڑا ہے۔

”تم بالکل پریشان مت ہو۔“ اس نے کہا۔ ”میں جانتی ہوں کہ تم پیشہ ور مصنف ہو اور مجھے یقین ہے کہ تم نے جو کچھ بھی کیا وہ کتاب کی بہتری کے لیے ہی ہوگا۔ کافی آرہی ہے اور ایش بھی چند منٹوں بعد یہاں ہوگا مجھے یقین ہے کہ وہ بھی اس کتاب کو پڑھنا پسند کرے گا۔ حالانکہ اس نے اپنی پوری زندگی میں شاید ہی کبھی کوئی ناول پڑھا ہو۔“

”اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو اس سے کبھی یہ کتاب پڑھنے کے لیے نہ کہتی۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”یہ مردوں کے لیے نہیں لکھی گئی۔“

”لیکن یہ میری زندگی کی کہانی ہے اور وہ اس کا ہیرو ہے۔“

”میں نے اس کے کیریکٹر میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں۔ وہ شاید خود کو نہ پہچان سکے۔“

”وہ کیا تبدیلیاں ہیں؟“ ایش نے اچانک ہی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ وہ کافی کی ٹرالی دھکیلتے ہوئے چلا آرہا تھا۔ ”تم میرے بارے میں کچھ کہہ رہی تھیں؟“

”میں بتا رہی تھی کہ کتاب کی بہتری کی خاطر میں نے تم دونوں کی ملاقات ابتدائی عمر میں ہی دکھائی ہے۔“

”پھر؟“

”پھر یہ کہ تم اس کہانی میں جوان نظر آؤ گے۔“ ریوین نے زیادہ وضاحت سے کہہ دیا۔

وہ غراتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ میں بہت بوڑھا ہوگیا ہوں؟“

”بالکل نہیں۔“ وہ بولی۔ ”میں نے ہمیشہ تم سے یہی کہا ہے کہ مجھے تم جیسے مرد پسند ہیں۔“

”جب تک اس کے بینک اکاؤنٹ میں پیسے ہیں۔“ وہ طنزیہ انداز میں بولا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہنے لگا۔ ”تمہیں بھی نوے ہزار پاؤنڈز دینا ہیں۔“

”ہاں“ ہمارے درمیان یہی طے ہوا تھا۔“ میں نے بے خوفی سے کہا۔

اس نے اپنی آنکھیں اِدھر اُدھر گھمائیں اور نیچے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں یہ ادائیگی کل ہوسکے گی بینک کو اتنی بڑی رقم کے لیے ایک دن پہلے نوٹس دینا ہوتا ہے۔“

”لیکن تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ مسودہ ملتے ہی مجھے ادائیگی کردی جائے گی۔“

اس نے کپ میں کافی انڈیلتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں کل یہ رقم ہر حال میں دے دوں گا۔“

”تم مجھے چیک بھی دے سکتے ہو۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ ”چیک کے ذریعہ بھانڈا پھوٹ سکتا ہے جبکہ میں تمہیں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اس معاملے کو خفیہ رکھنا ہے۔“

مجھے کچھ شبہ ہونے لگا اور سوچنے لگی کہ ایش بآسانی اس معاہدے سے مکر سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میں پہلے ہی دس ہزار پاؤنڈز وصول کرچکی تھی لیکن مجھے اپنی پوری رقم چاہیے تھی۔ یوں لگا جیسے اس نے میرا ذہن پڑھ لیا ہو۔ وہ ریوین سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

”ممکن ہے کہ بینک سے ملنے والا پیغام ابھی بھی آنسرنگ مشین پر ہو۔ میں چاہوں گا کہ ڈولی بھی اسے سن لے تاکہ اسے میری بات پر یقین آجائے۔“

”کون سا پیغام؟“ ریوین نے چونکتے ہوئے کہا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹہلتا ہوا فون کے پاس چلا گیا۔ ”وہی پیغام جس میں بینک والوں نے کہا تھا کہ وہ یہ رقم آج نہیں دے سکتے۔“ یہ کہہ کر اس نے پلے بیک بٹن دبا دیا لیکن کوئی آواز نہیں آئی وہ ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ ”شاید میں نے ہی اسے مٹا دیا۔ بہرحال تمہیں مجھ پر بھروسا کرنا چاہیے۔“

”لیکن میرے پاس تو اس گھر کا پتا یا فون نمبر کچھ بھی نہیں ہے۔“

”بہتر ہے کہ تمہیں یہ سب نہ معلوم ہو۔“

”لیکن تم تو جانتے ہو کہ میں کہاں رہتی ہوں۔“

”ہاں اور میرے ڈرائیور نے بھی تمہارا گھر دیکھ رکھا ہے۔ وہ کل سہ پہر تمہیں یہ رقم پہنچا دے گا۔“

اس وقت میں نے اپنے آپ کو ایک کمزور عورت تصور کیا جو چالاک مرد سے شکست کھا چکی تھی۔ میں وہاں سے فوراً چل دی۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ کبھی یہ رقم وصول کرسکوں گی۔

☆☆☆

تین دن بعد میں نے اخبار میں پڑھا کہ ایشلے پارکر کا انتقال ہوگیا۔ موت کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ اس نے زیادہ مقدار میں خواب آور گولیاں کھالی تھیں جس کے بعد وہ کوما میں چلا گیا اور اسی حالت میں اس کی موت واقع ہوگئی۔ انتقال کے وقت اس کی عمر بہتر برس تھی۔ اب ریوین ہی اس کی چار کروڑ مالیت کی جائداد کی وارث تھی۔ میں ایشلے کی موت کے بارے میں ہونے والی تحقیقات کی کارروائی بڑی دلچسپی سے پڑھ رہی تھی۔ اخبارات میں اس طرح کی کہانیاں بھی شائع ہوئیں کہ ریوین ضرورت سے زیادہ غمزدہ بیوی کا کردار ادا کررہی تھی تاکہ اس شبے کو دور کیا جاسکے کہ کہیں اس نے ہی تو اپنے شوہر کو خواب آور دوا کی زیادہ مقدار نہیں دے دی تاہم تحقیقات کے دوران یہ سوال نہیں اٹھایا گیا۔ وہ جیوری اور سراغ رسانوں کا دل موم کرنے میں کامیاب رہی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ایشلے کو ہمیشہ سے ہی بے خوابی کی شکایت تھی اور وہ سونے کے لیے ایسی دواؤں کا استعمال کرتا تھا جو جان لیوا بھی ہوسکتی تھیں۔

مجھے اپنی بقایا رقم کبھی نہیں ملی۔ اس کے بعد میں نے ریوین کے بارے میں کچھ نہیں سنا۔ اس میں اتنی عقل تھی کہ وہ اس کتاب کو شائع نہ کرے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے ان تمام واقعات کا جائزہ ضرور لیا ہوگا جو میری موجودگی کے دوران پیش آئے تھے۔

جب ایش نے مجھ سے کہا کہ آج مجھے رقم نہیں مل سکتی تو میں اس بارے میں مشتبہ ہوگئی۔ میں کتاب ان کے حوالے کرچکی تھی اور اب وہ میرے کسی کام کی نہ تھی۔ لیکن میں ایش کے لیے بعد میں بھی خطرہ ثابت ہوسکتی تھی اور کسی وقت بھی یہ انکشاف کرکے کسی اخبار یا رسالہ سے بھاری معاوضہ حاصل کرسکتی تھی کہ کتاب کی مصنفہ ریوین نہیں بلکہ میں ہوں۔ لہٰذا سب سے پہلے مجھے راستے سے ہٹانا ضروری تھا۔ میں نے ایک ایسی دوا کے بارے میں سن رکھا تھا جس کے چند قطرے اگر چائے یا کافی میں ملا دیے جائیں تو گھر تک پہنچتے پہنچتے میری موت واقع ہوسکتی تھی۔ اسی لیے میں نے احتیاط کے طور پر اپنی کافی کی پیالی ایش سے بدل ڈالی۔ یہ موقع مجھے اس وقت ملا جب ایش آنسر فون کی طرف گیا تھا۔

ان دونوں میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ میں نے رومانی ناولوں کے علاوہ جاسوسی کہانیاں بھی لکھی تھیں۔

محفلِ شعر و سخن

* نرگس علی..... راولپنڈی
ورق ورق مری چاہت مری وفائیں تھیں
پڑھا ہے میں نے چہرہ کتاب کی صورت

* تیمور احمد..... حافظ آباد
ہمیشہ حلقۂ نامہرباں میں رہتے ہیں
جو حق پہ ہوتے ہیں، وہ امتحاں میں رہتے ہیں
حسد کی آگ سے کس کس کا گھر جلاؤ گے
کہ اہلِ عشق تو سارے جہاں میں رہتے ہیں

* طاہرہ یاسمین..... سرگودھا
کون کہتا ہے اس کی یاد سے بے خبر ہوں میں
میری آنکھوں سے پوچھ میری رات کیسے گزری ہے

* بخت علی خٹک..... خانیوال
پتوں سے بھر رہے تھے ہواؤں کی جھولیاں
گرتے ہوئے شجر بھی سخی انتہا کے تھے

* اشفاق شاہین..... کراچی
فصیل جسم پر تانی ہے کرب کی چادر
ہم اہل درد سے پوچھ کہ زندگی کیا ہے!

* احسان سحر..... میانوالی
الجھا ہوا ایسا کہ کبھی کھل نہیں پایا
سلجھا ہوا ایسا کہ مثالوں کی طرح تھا

* ماہا ایمان..... حافظ آباد
درختوں کی رہ گزر میں چمک چھوڑ جاؤں گی
پہچان اپنی دور تلک چھوڑ جاؤں گی
خاموشیوں کی موت گوارہ نہیں مجھے
شیشہ ہوں ٹوٹ کر بھی کھنک چھوڑ جاؤں گی

* محمد طارق کلیرا..... نور پور تھل
کہیں کوئی غم کوئی سلگتا خیال رکھنا بھی جرم ٹھہرا
عجیب رت ہے کسی کی یادیں سنبھال رکھنا بھی جرم ٹھہرا
اسے یہ کہنا مجھ سے ملنے بھی نہ آئے کہ اس نگر میں
دلوں کو آباد بستیوں کی مثال رکھنا بھی جرم ٹھہرا

* داؤد اشفاق..... اوکاڑہ
انا کی یوں تو ستائش کوئی نہیں کرتا
برا کیا اسے الجھن میں ڈال کر میں نے

* ماہین فاطمہ..... اوکاڑہ
نہ ہو امید تو دوزخ سے کم نہیں دنیا
فریب کتنا ضروری ہے آدمی کے لیے

* ایچ شاہد عمران..... سینٹرل جیل، گوجرانوالہ
خواب دیکھے شبِ زنداں میں سہانے کتنے
رنگ بھرتے ہیں نگاہوں میں نجانے کتنے
رات ہم نے تیری تصویر سے پوچھا اے دوست
تجھ سے بچھڑے ہوئے بیتے ہیں زمانے کتنے

* محمد ندیم..... نامعلوم مقام
فقط باتیں اندھیروں کی فقط قصے اجالوں کے
چراغ آرزو لے کر نہ تم نکلے نہ ہم نکلے

* یاسر علی راجپوت..... گوجرہ، نواں لاہور
ہر اک سمت خاموشی کا کفر چھایا ہے
ہماری ذات کے صحرا میں دے اذاں کوئی

* الطاف حسین..... کراچی
میں بیمارِ محبت ہوں مجھے کیا غرض حکیموں سے
اگر میری شفا چاہو میرا محبوب لے آؤ

* عاصم اقبال جسپال..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
ان کی وفا کا اتنا دعویٰ نہ کیا کر محسن
میں نے روح کو بھی جسم سے بے وفائی کرتے دیکھا ہے

* احمد یار خان..... لسبیلہ، کراچی
تک، میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا، چراغ سحری کا

* ساجد تنویر گجر..... ڈسٹرکٹ جیل، سرگودھا
حالات ہی کچھ ایسے ہیں کہ خاموش ہوں ورنہ
پوشیدہ میرے سینے میں طوفان بہت ہیں

* گلزار خان..... پشاور
نہیں معلوم تھا اس کو ہوا کا رخ بھی بدلے گا
لگائی آگ جس نے شہر میں وہ بھی جھلسے گا
غبارِ مصلحت اوڑھے مرے فنکار بھی چپ ہیں
دریچے بند ہیں گھر سے دھواں پھر کیسے نکلے گا

* مناظر علی گوندل..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
ہزاروں اسبابِ راحت ہوں اسیری پھر اسیری ہے
قفس میں آ ہی جاتا ہے خیالِ آشیاں اکثر

* قیصر اعوان..... ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا
ہم جان سے جائیں گے تو جان جاؤ گے فراز
کہ حاصل کچھ نہیں ہوتا کسی کو آزمانے سے

* ایم زاکم علی خان..... راجن پور
تنہائیوں سے تو بہتر تھا کہ تم زہر ہی دے دیتے محسن
ہمارا کام ہو جاتا، تمہارا نام ہو جاتا

* عبدالغفور خان خٹک..... اٹک
نکلے تھے اس لیے کہ ڈھونڈ لیں گے تجھے
تیری اک تلاش نے عمر بھر کا مسافر بنا دیا

* محمد یونس فریادی..... چھب، ضلع اٹک
جانے کیسے جیتے ہیں لوگ یادوں کے سہارے محسن
میں تو کئی بار مرتا ہوں اک بار یاد آنے پہ

* راجا افتخار علی انی..... چوآسدن شاہ (موہڑہ)
ہے اک سودا! اگر مانو تو دونوں مل کر طے کر لیں
قرارِ زندگی لے لو، جوازِ زندگی دے دو

* محمد اقبال..... کورنگی، کراچی
ترے بدن کی مہک بس گئی ہے سانسوں میں
جدائیوں میں بھی اترا نہ قربتوں کا نشہ

* بخت علی..... اڈا خالق آباد، خانیوال
تم میں ہیرے کی صفت ہے تو اندھیرے میں ملو
دھوپ میں تو کانچ کے ٹکڑے بھی چمک جاتے ہیں

* احمد خان توحیدی..... الطواتی اسٹیل مل، کراچی
اس کی آنکھیں تو سمندر سے بھی گہری ہیں
تیرنا تو آتا تھا مگر ڈوبنا اچھا لگا

* انیلہ رشید سیال..... خیر پور (میرس)
دل میں ہوتا تو کب کا بھلا دیا ہوتا فراز
وہ شخص تو بہت دور تک بسا ہوا تھا مجھ میں

* محمد اکبر..... حیدر آباد
وہ بے وفا تھا تو میں کب تلک وفا کرتا
بھلا نہ دیتا اسے میں تو اور کیا کرتا
ہرا بھی گھر کوئی ہوتا تو کس لیے آخر
تمام رات میں سڑکوں پہ یوں پھرا کرتا

* محمد امجد ریاض..... جی ٹی روڈ، چیچہ وطنی
روز وشب کے میلے میں غفلتوں کے مارے لوگ
شاید یہ سمجھتے ہیں ہم نے جس کو دفنایا ہے بس اسی کو مرنا تھا

* رمضان پاشا..... گلشن اقبال، کراچی
میرے ساتھ جگنو ہے، ہمسفر، مگر اس شرر کی بساط کیا
یہ چراغ کوئی چراغ ہے نہ جلا ہوا نہ بجھا ہوا

* ریاض بٹ..... حسن ابدال
کتنے محتاط ہیں اس شہر کے اہلِ ایمان
چھتریاں تان کے بارش کی دعا کرتے ہیں

* جبران احمد ملک..... گلشن اقبال، کراچی
گلاب زخم جگر کے گئے ہیں پھر کھلنے
تمہاری یاد بہاروں کے ساتھ آئی ہے

* محمد عامر..... شاہ فیصل کالونی، کراچی
خون سے تر ہے پھول کی ہر اک پنکھڑی
رویا ہے کون تھام کے دامن بہار کا

❁ جنید احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
تیرا بہار کا وعدہ بجا سہی لیکن
مجھے بہار کے رنگوں کا اعتبار نہیں

❁ ادریس احمد خان......ناظم آباد، کراچی
تیری صورت سے کسی کی نہیں ملتی صورت
ہم جہاں میں تیری تصویر لیے پھرتے ہیں

❁ محمد قدرت اللہ نیازی......حکیم ٹاؤن، خانیوال
تیرے قریب رہ کر بھی تجھے تلاش کروں
محبتوں میں میری بدحواسیاں نہ گئیں

❁ کمال انور......اورنگی ٹاؤن، کراچی
اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے! کیا رہائی ہے!

❁ زوہیب احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
میں اس پر جان بھی واروں تو یارو!
میرا جان وارنا بھی وار ٹھہرے

❁ فرحان شیخ......پاک کالونی، کراچی
فقط تیرے عشق کی غلامی میں ہیں آج ورنہ
یہ دل اک زمانے تک نواب رہا ہے

❁ سلیم کامریڈ......کھاتاں
انہیں سنائی نہ دے گی شکستِ دل کی صدا
بنے ہوئے ہیں پجاری جو مال و دولت کے

❁ ممتاز حسین ساغر......ننکانہ صاحب
آرزو کا چاند ڈوبا غم کی گہری جھیل میں
درد کی وادی میں صنم ہم تنہا رہ گئے

❁ احمد حسین عرضی خان......قبولہ شریف
زندگی تو نے مجھے قبر سے کم دی ہے زمیں
پاؤں پھیلاؤں تو دیوار میں سر لگتا ہے

❁ نورالایمان......حافظ آباد
کیوں کچھ سوچ کر میں اپنا دل چھوٹا کروں وصی
وہ اتنی ہی کرسکا وفا، جتنی اس کی اوقات تھی

❁ رحیمہ سرور......ساہوواڑی، لاہور
مجھے کسی سے محبت نہیں اے دوست
یہ کیا ہوا کہ دلِ بیقرار بھر آیا

❁ محمد اظہر......ملیر، کراچی
وجودِ قطرہ کو دریا بنائے بیٹھا ہوں
خدا کی یاد میں خود کو سمائے بیٹھا ہوں

❁ محمد راحیل......کورنگی، کراچی
نہ کوئی زائچہ کھینچوں نہ دیکھوں ہاتھ ترا
میں تیرے بارے میں سب کچھ بتا بھی سکتا ہوں

❁ حفیظ الرحمان......کورنگی، کراچی
ایک قطرہ ہی تو ہے تو اصل سے بچھڑا ہوا
جذب ہو دریا میں تو اس بے مکانی سے نکل

❁ امتیاز احمد......ملیر، کراچی
خواب سفر میں گھوموں چاند ستاروں پر
آنکھ کھلے تو خود کو زمیں پر پاؤں میں

❁ مولا بخش......اسلام آباد
محبت ہی نہیں نفرت بھی لوٹاتا ہوں اکثر
میں کب باقی کسی کا اپنے سر احسان رکھتا ہوں

❁ امیر اللہ......کوئٹہ
موت کیسے مجھے مٹائے گی
جب فنا میں بقا لکھی ہے مری

❁ دوست محمد......میانوالی
اس نے بخشا ہے عجب سینہ خراشی کا ہنر
میرے احساس کو زخموں کی قبائیں دے کر

❁ جسیم احمد......لاہور
آج کتابوں سے بچوں کا رشتہ ٹوٹ گیا تو پھر
جسم بڑھیں گے ان کے لیکن سر چھوٹے رہ جائیں گے

❁ غلام علی......ملتان
پھر میرے مقابل اک ظالموں کا لشکر ہے
پیچھے کیا ہٹوں گا میں پیچھے تو سمندر ہے

کوپن برائے شمارہ مئی 2013

مُحفلِ شِعر وسُخن

نام : --

پتا : --

معاشرہ کوئی بھی ہو اپنی بنیادی اور روایتی اقدار کی بنا پر منفرد ہوتا ہے۔ یہ اور بات کہ روایات کی یہ زنجیر کسے قید کرتی ہے اور کون بغاوت پر اتر آتا ہے۔ چاہتوں کے سوتے انسان کو سودائی بنا دیتے ہیں اور دیوانگی میں بھلا کون رسوم و روایات کی پاسداری کرسکا ہے۔ اور پھر چاہتوں کے اسی اختتامی موڑ سے اس خونیں کھیل کا آغاز ہوا جس نے کتنے ہی دلوں میں اندھیرا کر ڈالا۔

شاخسانہ

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

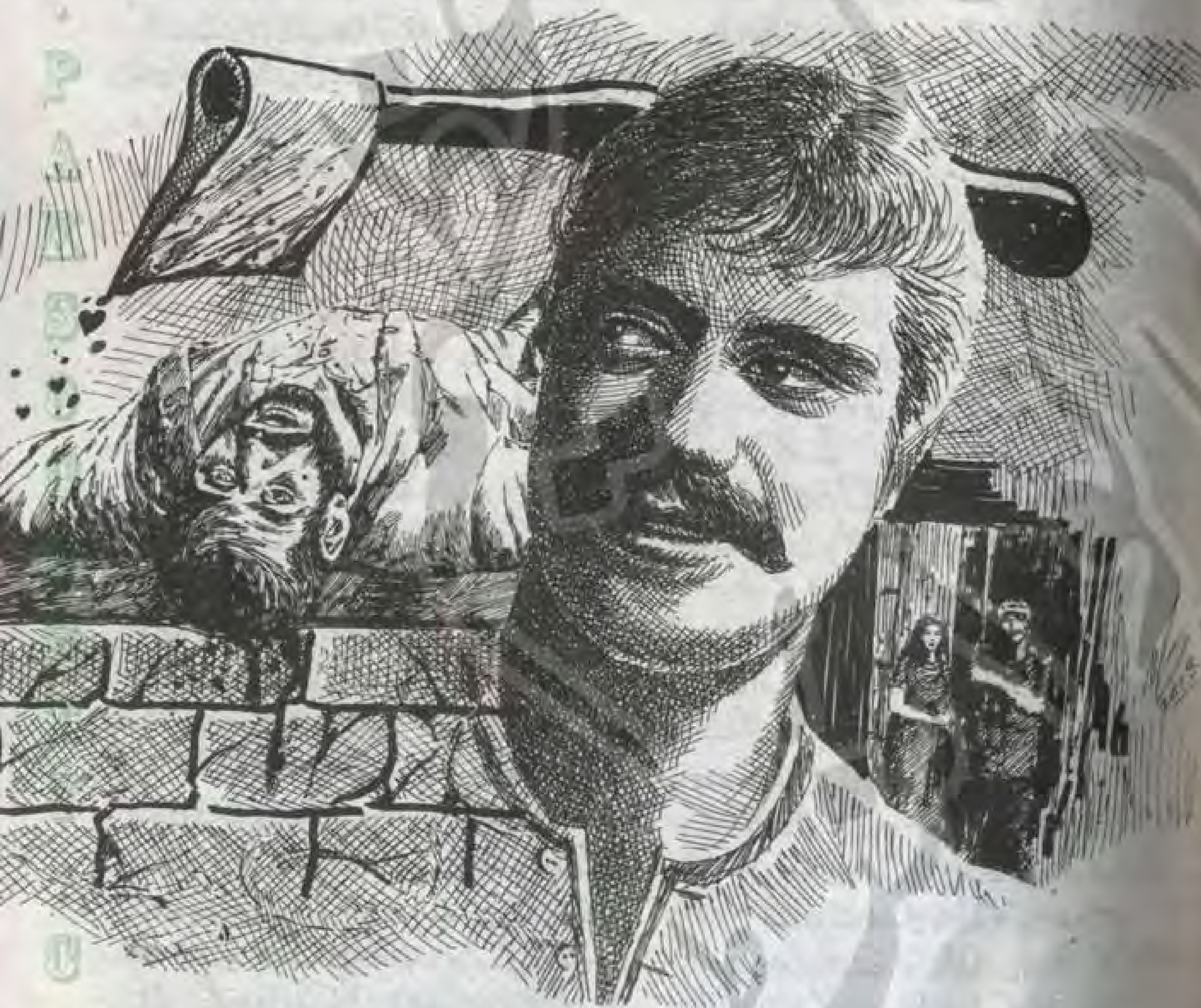

گاؤں کے حبس زدہ ماحول میں بے جا رسومات کا شاخسانہ

گوٹھ گڑھی خیر محمد میں ''راجواڑیں'' فیصلوں کو عدالتی حیثیت حاصل تھی۔ جسے عموماً کچہری یا پنچایت کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ چونکہ اندرون سندھ کے دور دراز علاقوں میں جنھیں ''تر'' یا ''لاڑ'' کا نام دیا جاتا ہے، ایک عرصے سے ان علاقوں میں وڈیروں، سرداروں اور بھوتاروں کا جاگیردارانہ نظام چلا آرہا تھا جن میں مقامی سطح پر ہونے والے تنازعے، زمینوں کا جھگڑا، پانی کا تنا اور بالخصوص ''کاروکاری'' کے مسائل حل کیے جاتے تھے۔ اس

قسم کی کچہریاں ''چوحدہ'' کے مقام پر منعقد کی جاتی تھیں۔

چوحدہ...... کا علاقہ ایسے مقام پر ہوتا ہے جدھر چار پانچ گوٹھوں کی سرحدیں آپس میں منسلک یا ملحقہ ہوتی ہیں اور گوٹھوں کے چند بڑوں کی سرکردگی میں فیصلے ہوتے تھے جنہیں مقامی زبان میں ''راجواڑیں'' فیصلے کہا جاتا تھا۔

ابھی کچھ روز قبل ہی ایسا فیصلہ ہوا تھا۔

مذکورہ گوٹھ گڑھی خیر محمد سے ہی تعلق والے دو فریقوں، ہاری میر محمد اور مٹھل ساری کے بیچ ایک تنازعہ طے ہوا تھا۔

کچھ دن قبل میر محمد کے بڑے جواں سال بیٹے خان محمد کے ہاتھوں ایک قتل ہو گیا تھا۔ مقتول کا نام نبی بخش تھا۔ وہ مٹھل کے مرحوم بھائی کا بیٹا تھا جو اس کے پاس ہی رہتا تھا۔ خان محمد اور نبی بخش کی آپس میں کسی بات پر تلخ کلامی ہو گئی اور نوبت ہاتھا پائی سے کلہاڑی...... اٹھانے تک جا پہنچی تھی۔

میر محمد کے دو جوان بیٹے تھے، بڑا بیٹا خان محمد شادی شدہ تھا، دوسرا سرمد تھا، دو جوان بیٹیاں راڑیں اور شہزادی بھی تھیں جبکہ مٹھل کے تین جوان بیٹے کالو، رحیمو اور لانگو...... اور ایک جواں سال بیٹی کونجاں تھی۔ اس سے پہلے کہ ان دونوں خاندانوں (قبیلوں) کے بیچ یہ جھگڑا آئندہ نسلوں تک بڑھتا اور علاقے میں خوں ریزی پھیلتی، فیصلہ فوری طور پر کچہری کے سپرد کر دیا گیا۔

وڈیرا سائیں آغل شاہ...... نے فوراً ہی دو پیشیوں میں اپنا راجواڑیں فیصلہ صادر کر دیا تھا جس کے تحت اب میر محمد مٹھل کو خون بہا یعنی ''بھونگے'' کی صورت میں اپنی راڑیں اور شہزادی کا ''سنگ'' (رشتہ) ایک لاکھ نقد اور دو عدد بھینسیں دینی تھیں۔ مقتول نبی بخش چونکہ ایک یتیم لڑکا تھا اور اس کی شروع ہی سے کفالت مٹھل کے ذمے تھی اس لیے اپنے مقتول بھتیجے کا بھونگا لینے کا وہی حق دار تھا، راڑیں اور شہزادی کی شادی وہ اپنے دونوں چھوٹے بیٹوں رحیمو اور لانگو سے کرنا چاہتا تھا اسے اور کیا چاہیے تھا کہ دونوں جوان لڑکیوں کے رشتے بلاعوض (بغیر روپے پیسے کے) مل رہے تھے۔ چونکہ یہ پنچایت کا فیصلہ تھا لہٰذا میر محمد وغیرہ کو اس سے سرتابی یا حکم عدولی کی بالکل جرات نہیں ہو سکتی تھی تاہم انہوں نے ''بھونگے'' کی ادائیگی کے سلسلے میں ایک ماہ کی مہلت مانگ لی تھی جو قبول کر لی گئی تھی۔

❊❊❊

دور جھنگ کے درختوں کے پار مغرب میں سورج غروب ہو رہا تھا اور نارنجی افق پر تھکے ماندے پرندوں کی ترتیب وار قطاریں، ایک ہموار رفتار کے ساتھ اپنے آشیانوں کی طرف محو پرواز تھیں۔

فضا میں اوائل دسمبر کی یخ بستگی طاری تھی۔ سرسبز کھیتوں سے ذرا پرے گارے مٹی کی دیواروں والے مکانوں کی بے ترتیب قطاریں پھیلی ہوئی تھیں۔ بیشتر گھروں کے کچے اور بوسیدہ مگر کشادہ صحنوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ ایسے میں ایک کشادہ صحن والے گھر میں اس وقت سوگوار خاموشی طاری تھی۔ ایک کوٹھری نما تنگ سے کمرے میں اس وقت تین افراد رلی بچھی چارپائیوں پر بہ ظاہر خاموش بیٹھے تھے مگر ان کے اندر ہلچل مچی ہوئی تھی۔ دوسرے ساتھ والے کمرے میں تین عورتیں بھی دو چارپائیوں پر سوگوار سے انداز میں بیٹھی تھیں۔ ان میں ایک عمر رسیدہ عورت مائی عجباں تھی دوسری دو جوان لڑکیاں، یہ راڑیں اور شہزادی تھیں۔ تینوں کے چہرے مغموم تھے، البتہ راڑیں اور شہزادی کے معصوم مگر خوب صورت چہروں پر آنسوؤں کی لکیریں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ دونوں میر محمد کی وہ بدنصیب بیٹیاں تھیں جن کے بھائی خان محمد نے اشتعال میں آکر نبی بخش کو کلہاڑی مار کر ہلاک کر ڈالا تھا۔ سو اب اس کی پاداش میں ان دونوں کو بہ طور سزا بھونگے میں مٹھل کے دونوں بیٹوں رحیمو اور لانگو کی بیویاں بننا تھا۔

''بھونگے'' کی صورت میں بیاہ کر پیا دیس سدھارنا ان دونوں معصوم لڑکیوں کے لیے اس لیے بھی تکلیف دہ تھا، وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ بھونگے میں بیوی یا بہو بن کر سسرال میں زندگی گزارنا انتہائی اذیت ناک کام تھا جو کسی سزا سے کم نہ تھا۔ ایسی بدنصیب لڑکیوں کے ساتھ وہاں جو سلوک اور حشر ہوتا تھا اس سے نہ صرف وہ دونوں بلکہ گھر والے بھی پریشان اور دکھی تھے مگر راجواڑیں فیصلے کے آگے سینہ سپر ہونے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔

دفعتاً کمرے کی سوگوار پر سکوت فضا میں مائی عجباں کی آواز گونجی۔ وہ ان دونوں بیٹیوں سے از راہِ تشفی کہہ رہی تھی۔

''اب رونے اور جی جلانے کا کیا فائدہ دھیو......! جو ہونا ہے وہ ہو کر رہتا ہے، کیوں تم دونوں رو رو کر مجھے بھی آزار دیتی ہو، اللہ سائیں سے دعا کرو وہ آگے اچھا کرے۔''

مائی عجباں کی تسلی آمیز گفتگو خود اسے بھی کھوکھلی محسوس ہوئی تھی۔ راڑیں، جو شہزادی سے ایک سال بڑی تھی، رنجور سے لہجے میں ماں سے بولی۔

''امڑ......! ہم کوئی بھیڑ بکریاں تو نہیں ہیں ناں کہ جس کا جی چاہا کسی کے ساتھ ہانک دیا، آخر مردوں کے جھگڑوں میں ہمیں ہی قربانی کی بھینٹ کیوں چڑھایا جاتا ہے۔'' ان کے لہجے میں بغاوت کی بو چھپی تھی۔

''اڑی ماٹھ (چپ) کر...... ساتھ والے کمرے میں تیرا پیو (باپ) اور بھائی بیٹھے ہیں، انہوں نے سن لیا تو......''

مائی عجباں کے لہجے میں خوف تھا مگر اس کی بات مکمل نہ ہو سکی تھی۔ راڑیں نے جھٹ اپنے سر سے اجرک اتار دی اور ماں کی بات کاٹ کر تڑخ کر بولی۔

''کیا ہو جائے گا پھر...... غلط تو میں نہیں کہہ رہی...... قتل ادا خان محمد نے کیا ہم کیوں بھگتیں......؟ یہ انصاف تو نہیں...... چھڑا...... ظلم ہے۔''

ساتھ والے کمرے میں میر محمد چارپائی پر پاؤں لٹکائے اور سر جھکائے پریشان بیٹھا تھا، دونوں بیٹے خان محمد اور سرمد بھی تھے۔ ان کے باہم بشروں سے بھی اسی کی جھلکتی تھی۔

ان تینوں باپ بیٹوں کو سب سے زیادہ فکر اس بات کی کھائے جا رہی تھی کہ بھونگے یا خون بہا میں ایک لاکھ نقد رقم اور دو بھینسیں بھی دینا پڑ رہی تھیں، اگر معاملہ صرف راڑیں اور شہزادی کے سنگ (رشتے) دینے تک محدود ہوتی تو وہ آج یوں سر جوڑے پریشان نہیں بیٹھے ہوتے۔

''بابا......!'' خان محمد بولا۔ ''سائیں وڈے نے ہمارے حق میں کچھ زیادہ ہی سخت فیصلہ کر ڈالا ہے۔ صرف ایک خون پر ہمیں نہ صرف ادی راڑیں اور شہزادی کا سنگ بھی دینا پڑ رہا ہے اور نقد رقم کے علاوہ دو بھینسیں بھی، یہ سراسر ناانصافی ہے ہمارے ساتھ۔'' چھوٹا بیٹا سرمد خاموش بیٹھا تھا۔ جواباً میر محمد شکست خوردہ لہجے میں بڑے بیٹے سے بولا۔

''اڑے پٹ! یہ راجواڑیں فیصلہ ہے، جسے ہمیں ماننا ہی پڑے گا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں...... شکر کرو کہ یہ معاملہ تھانے اور کورٹ تک نہ گیا۔ ورنہ تیکوں (تجھے) پھانسی بھی لگ سکتی تھی۔''

سرمد جو اب تک خاموش تھا، پہلی بار لب کشائی کرتے ہوئے بڑے بھائی کی تائید میں بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''بابا سائیں! ادا خان محمد ٹھیک کہتا ہے، مٹھل کے دونوں بیٹوں کو مفت کا سنگ مل رہا ہے اور اسے کیا چاہیے۔ ہماری ادی راڑیں اور شہزادی کا سنگ دو دو لاکھ روپے سے کیا کم نہ ہوگا۔'' سرمد خاموش ہوا تو خان محمد دوبارہ حوصلہ پا کر باپ سے بولا۔

''بابا! تو سائیں وڈے سے بات تو کر کے دیکھ...... ہم ادی راڑیں اور شہزادی کا سنگ مفت میں دینے کو تیار تھیں پر کم از کم ایک لاکھ روپے کی رقم اور دو بھینسیں دینے سے تو ہمیں معاف رکھا جائے۔''

میر محمد ایک جہاندیدہ شخص تھا، اس نے ایک عمر دور افتادہ گوٹھوں کے ماحول میں گزاری تھی۔ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

''اب کچھ نہیں ہو سکتا...... تیری غلطی کا خمیازہ اب ہم کو بھگتنا ہی پڑے گا اور بس......!''

باپ کی قطعیت پر دونوں بھائیوں کو دوبارہ کچھ کہنے کی جرات نہ ہو سکی اور انہوں نے چپ سادھ لی۔

اس کمرے سے ملحقہ ایک تیسرے کمرے میں خان محمد کی بیوی سہتی اپنے دو چھوٹے بچوں کے ساتھ موجود تھی، جو بڑی چالاک عورت تھی اور اس وقت...... باری باری...... دونوں کمروں میں ہونے والی خفیہ گفتگو سن رہی تھی۔ پہلے اس نے اپنی ساس، سسر، دونوں نندوں کی گفتگو سنی تھی پھر اب وہ باہر والے کمرے سے کان لگائے ہوئے تھی۔ وہ بھی یہی چاہتی تھی کہ اس کی بلا سے بھلے دونوں نندیں بیاہ کر جلد یہاں سے چلی جائیں مگر انہیں بھونگے کا ایک لاکھ اور دو بھینسیں نہ دینی پڑیں کیونکہ وہ جانتی تھی کہ قتل اس کے شوہر سے ہوا ہے لہٰذا یہ سارا ''تاوان زر'' اسی سے ہی بھگتوایا جائے گا۔

❊❊❊

کچی مٹی کی دیواروں والے بوسیدہ صحن میں خوشگوار اور چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ صحن کے وسط میں بچھی ہوئی چارپائی پر ساٹھ سالہ وراں مائی بیٹھی اپنا سفید چونڈہ تھامے روئے جا رہی تھی۔ اس کے قریب بیٹھی جواں سال بھاگی جو اس کی بیٹی تھی، ماں کو سنبھالے ہوئے تھی، مگر خود اس کی سرمگیں آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ اس کی رنگت گندمی تھی اور دراز بالوں کی چوٹی ناگن کی طرح اس کی کمر پر بل کھائے کنڈلی مارے رہتی۔ اس نے مخصوص طرز کا مقامی لباس پہن رکھا تھا۔ سندھی کڑھائی (بیل بوٹے) والے گلے کی قمیص جس پر ترتیب وار چھوٹے چھوٹے سکوں کی طرح کے گول شیشے ٹنکے ہوئے تھے۔ ایک ست لڑا اس کی صراحی دار گردن میں جھول رہا تھا۔ اس نے سر پر اجرک کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔

''پتا نہیں میرا لعل غلامو کہاں ہوگا......؟ مولا سائیں میرے پٹ کے سر کی خیر کرنا، اسے سلامت رکھنا۔'' وہ بوڑھی عورت دہائیاں دیتے ہوئے اشکبار لہجے میں بولی۔

''امڑ......! چپ ہو جا...... اللہ سائیں بہتر کرے گا۔ ادا غلامو بالکل خیریت سے ہوگا۔'' بھاگی نے ماں کو کھوکھلی تسلی دینا چاہی۔ درحقیقت اسے خود بھی اپنے بڑے بھائی غلامو کی واپسی کی امید نہ تھی۔

''کیسے چپ ہو جاؤں میں...... دھیے!...... غلامو میرا

ھک (ایک) ہی پٹ تھا...... سہارا تھا وہ ہمارا...... آج اسے گئے ہوئے چوتھا دن ہے......" ماں کو کسی طور بھی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ ہوتی بھی کیسے...... غلاموں کوئی دودھ پیتا بچہ تو نہ تھا۔ پورا چوبیس پچیس سالہ گبرو نوجوان تھا۔ پہلے تو وہ یہی سمجھے تھے کہ وہ دوستوں کے ساتھ سہون شریف حضرت لعل شہباز قلندرؒ کے میلے پر گیا ہوگا۔ وہ تھا بھی ایسا بے پروا، بتائے بغیر گھر سے نکل جاتا تھا، یہ دونوں ماں بیٹی وڈیرے کی حویلی بھی گئی تھیں مگر انہیں یہی دلاسا دے کر وہاں سے چلتا کر دیا تھا کہ "لعل سائیںؒ" کے سالانہ عرس پر گیا ہوگا کیونکہ گوٹھ کے من چلے نوجوانوں میں یہ وبا عام تھی کہ وہ گھر بتائے بغیر ہی میلوں میں نکل پڑتے تھے اور ان کے گھر والے بھی عادی ہو گئے تھے۔

بھاگی نے سر پر اینڈوا...... دھرا اور پر مٹکا رکھ کر پانی بھرنے گھر سے باہر نکل آئی۔ ابھی وہ کھیتوں کے درمیانی راستے پر تھی کہ اچانک ایک بانکا سجیلا نوجوان اس کے سامنے آ گیا، کوئی اور موقع ہوتا تو اس جوان کو دیکھ کر بھاگی کا چہرہ گلنار ہو جاتا تھا مگر اس سمے وہ خود پریشان تھی، وہ نوجوان سرمد تھا اور خود بھی اس وقت پریشان ہی نظر آ رہا تھا۔ بھاگی کو اس کی پریشانی کا بہ خوبی علم تھا، بلکہ...... پورے گوٹھ کو ہی علم تھا۔

تاہم سرمد نے تفکر سے پوچھا۔

"کیا بات ہے بھاگی......؟ تو آج بڑی پریشان سی نظر آ رہی ہے، ورنہ تو مجھے دیکھتے ہی کھل پڑتی تھی گلاب کی طرح۔" سرمد نے ہولے سے پوچھا۔

"سرمد!...... ادا غلامو...... نجانے کدھر چلا گیا ہے، سب لعل سائیںؒ کے میلے سے واپس لوٹ آئے ہیں مگر اس کی کوئی خبر نہیں، پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے۔ ماں بہت پریشان ہے۔" بھاگی نے مغموم لہجے میں اپنی پریشانی بتائی تو سرمد اپنی پریشانی بھول کر بھاگی کے بھائی غلامو کی گمشدگی کے بارے میں فکر مند نظر آنے لگا، چند ثانیے کچھ سوچنے کے بعد تشفی آمیز لہجے میں بھاگی سے بولا۔

"تو فکر نہ کر...... میں تھانے جا کر اطلاع کرتا ہوں۔"

بھاگی یہ سن کر خوش ہو گئی اور بڑی رسانیت آمیز محبت بھری نگاہوں سے سرمد کا چہرہ تکنے لگی۔

پیڑوں تلے پروان چڑھنے والی محبتوں کی بہاروں میں اور چلچلاتی دھوپ کی گرم دوپہروں میں جوانی کی حلاوتوں کی امر بیل کی طرح اپنے خوش آئند خوابوں میں...... دونوں نے اپنی محبت کو پروان چڑھایا تھا اور ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد سرمد بولا۔

"تو ایسا کر گھر پہنچ...... میں بھی آ کر ماسی سے ملتا ہوں اور پھر اس کو ساتھ تھانے لے جا کر غلامو کی گمشدگی کی رپٹ (رپورٹ) درج کرواتا ہوں۔"

سرمد کی بات پر بھاگی کو قدرے اطمینان ہوا۔

❀❀❀

سرمد نے اپنا کہا نبھایا تھا، وہ اسی دن بھاگی کی ماں کے ساتھ متعلقہ تھانے جا پہنچا۔ تھانے کی پیلی عمارت خاصی بوسیدہ تھی۔ انسپکٹر بچل جانوری اپنے کمرے میں موجود تھا۔ وہ ایک پختہ العمر شخص تھا اور دیانت دار فرض شناس آفیسر بھی۔ ان دونوں کی داد فریاد سننے کے بعد اس نے اپنے سامنے کرسی پر مضطرب الحال بیٹھی غلامو کی بوڑھی ماں سے سوال کیا۔

"اماں جی......! کیا تم اپنے بیٹے غلامو کے دوستوں سے واقف ہو......؟ میرا مطلب ہے ایسے دوست جو تمہارے بیٹے غلامو کے ساتھ زیادہ اٹھتے بیٹھتے اور قریب رہتے ہوں؟"

"ہاں!" غلامو کی بوڑھی ماں نے غمزدہ لہجے پر قابو پاتے ہوئے کہا اور بتانے لگی۔

"مٹھل کے بیٹوں رحیمو اور لانقو سے اس کی بنتی تھی۔ وہ دونوں میرے پٹ غلامو کے گہرے سنگی (دوست) تھے۔" وہ اتنا بتا کر خاموش ہوئی تو جانے کیوں اس کے قریب بیٹھا سرمد ذرا چونکا تھا۔ انسپکٹر محمد بچل چند لمحے پرسوچ خاموشی کے بعد سرمد کی طرف کھوجتی نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

"تم کون ہو؟"

"سائیں! میرا نام سرمد ہے۔" سرمد نے کہا۔

"کس کے بیٹے ہو؟" انسپکٹر بچل بہ غور سرمد کے چہرے پر اپنی تیز نظریں مرکوز کرتے ہوئے بولا۔

"ہاری میر محمد کا بیٹا ہوں...... سائیں!"

"او......" انسپکٹر نے اس کی بات پر بھویں اچکائیں پھر گہرے لہجے میں مستفسر ہوا۔ "تو خان محمد کا بھائی تو نہیں جس نے مٹھل کے بھتیجے نبی بخش کا قتل کیا تھا؟"

"ج...... جی...... جی...... سائیں!...... پر...... اس کا وڈیرے سائیں کی اوطاق میں راجواڑیں میں فیصلہ ہو چکا ہے۔" اس نے جلدی سے اس طرح بتایا جیسے اسے ڈر ہو کہ کہیں یہ خرانٹ پولیس افسر اسے کسی دوسرے ہی چکر میں نہ الجھا دے۔

"ہاں......! مجھے معلوم ہے۔" انسپکٹر نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ "تم بھی غلامو کے دوست تھے؟" انسپکٹر نے عجب سرسراتے ہوئے لہجے میں سرمد کی طرف دیکھ کر پوچھا تو سرمد جانے کیوں اس سوال پر ذرا گھبرا سا گیا اور بہ مشکل بولا۔

"جی ہاں سائیں! پر مجھ سے زیادہ اس کی گہری دوستی...... رحیمو اور لانقو سے تھی۔"

انسپکٹر محمد بچل کو...... سرمد کے لہجے میں چھپا خوف صاف محسوس ہوا تھا۔ پھر اس نے غلامو کی ماں سے چند مزید سوالات کیے اور پھر غلامو کی ماں کو تسلی دیتے ہوئے وہ انہیں رخصت کرنے لگا تو آخر میں اس نے سرمد کو مخاطب کر کے کہا۔

"سرمد!"

"جی سائیں!" سرمد پلٹا، وہ اب خاصا گھبرایا ہوا سا نظر آ رہا تھا۔

"تم میرے پاس آتے رہنا...... مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔" انسپکٹر نے اسرار بھرے لہجے میں اس کی طرف تکتے ہوئے کہا۔

"جی سائیں! حاضر سائیں۔ میں حاضری بھرتا رہوں گا۔" سرمد نے بہ مشکل کہا۔

❀❀❀

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ وہ تینوں کوٹھری نما کمرے میں دور لی بچھی چارپائیوں پر سرگوشیوں کے سے انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔ یہ تینوں مٹھل کے بیٹے کالو، رحیمو اور لانقو تھے۔

"تم دونوں نے اپنا کام ہوشیاری سے کیا ہے ناں......"

کمرے کی محدود اور دم بہ خود سی فضا میں کالو نے اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں سے دھیمی آواز میں پوچھا تو سب سے چھوٹا بھائی لانقو پرجوش لہجے میں بولا۔

"ہاؤ ادا......! ہم نے اپنا کام ایسا نچل طریقے سے کیا ہے کہ کسی کو بھی ذرہ برابر شک نہیں ہو سکا ہے۔"

"پر ادا کالو! ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔" یہ منجھلا بھائی رحیمو تھا۔

"کیسا مسئلہ......؟" کالو نے پوچھا۔

"نبی بخش...... بیمار پڑ گیا ہے۔"

"ہاں...... ہاں...... مجھے پتا ہے...... پر حکیم سے تو تم نے اس کی دوا لے لی تھی ناں؟"

"اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا ہے اس کو۔" رحیمو نے بتایا اور آگے بولا۔ "ظاہر ہے میں نبی بخش کو تو حکیم جی کے پاس نہیں لے جا سکتا تھا۔ بس!...... بیماری کی کیفیت بتا کر دوائی اس کی لے آیا تھا لیکن اب حکیم جی کہہ رہے تھے کہ مریض کو ان کے مطب لے کر آنا پڑے گا۔ وہ اس کی نبض وغیرہ دیکھنا چاہتا ہے۔"

رحیمو نے اپنی صراحت مکمل کی تو کالو جھٹ سے تفکر آمیز لہجے میں بولا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے...... اس طرح تو نبی بخش کے پہچان لیے جانے کا خطرہ ہے۔"

"اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ ہے...... ادا!" لانقو نے پر تفکر لہجے میں بھائی سے کہا۔

"نبی بخش کی طبیعت دن بہ دن بگڑتی جا رہی ہے۔"

اس کی بات پر کالو کے چہرے پر تشویش کے آثار نمایاں ہو گئے۔ پھر ایک گہری ہنکاری لیتے ہوئے بولا۔

"ایسا کرو...... تم دونوں نبی بخش کو بیل گاڑی میں بٹھا کر بڑی ہوشیاری کے ساتھ حکیم جی کے مطب لے جانا...... مگر خیال رہے...... ایسے وقت جانا جب ان کے مطب میں لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہو اور اس کا چہرہ بھی ڈھانپے رکھنا۔"

"ہاؤ...... ادا......! ایسا ہی ہوگا۔ میں نبی بخش کا چہرہ اجرک سے ڈھانپنے کی کوشش کروں گا اور اسے اپنا دوست ہی ظاہر کروں گا، ویسے بھی نبی بخش کی ڈاڑھی مونچھوں کے بال بہت بڑھ گئے ہیں۔ شاید وہ مشکل سے ہی پہچانا جائے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" بڑا بھائی کالو قدرے خوش ہو کر بولا۔ پھر چند ثانیے گہری اور پرسوچ خاموشی میں مستغرق رہنے کے بعد خود کلامیہ والے انداز میں دانت پیس کر بولا۔

"ایک بار...... میر محمد کے گھر والوں سے "بھونگا" مل جائے پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ نہ ہی ہمیں کوئی مشکل ہوگی۔" وہ خاموش ہوا تو لانقو نے بڑے بھائی سے قدرے متفکر لہجے میں پوچھا۔

"ادا وڈا......! بھونگا ملنے کے بعد کیا ہوگا......؟ کیا نبی بخش اسی طرح گمنامی کی زندگی بسر کرتا رہے گا؟"

چھوٹے بھائی کی بات پر کالو کے سانولے چہرے پر ایک لمحے کو عیارانہ رنگ جما پھر بولا۔

"تھوڑا عرصہ نبی بخش کو روپوشی بھگتنی ہی پڑے گی پھر خود ہی آہستہ آہستہ جب معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ اس کی تم فکر نہ کرو...... تم دونوں سر پہ سہرا سجانے کی تیاری کرو، سنا ہے...... میر محمد کی بیٹیاں راڑیں اور شہزادی بڑی کھوب

صورت ہیں۔" آخر میں معنی خیز لہجے میں اپنے دونوں بھائیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ تو رحیمو اور لانگو کے چہروں پر مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہاں...... دونوں چھوکریوں کے ساتھ ملنے والی بھونگے کی رقم نقد ایک لاکھ میری اور دو بھینسیں، بابا سائیں کی ہوں گی۔" کالو نے گرسنہ لہجے میں جیسے یاد دلایا تو رحیمو اور لانگو معنی خیز انداز میں اپنے سر کو دھیرے دھیرے اثباتی جنبش دینے لگے۔

••••

دور دراز کے گوٹھوں میں سرمئی شام کے سائے ذرا جلد ہی پھیلنے لگتے ہیں۔ رحیمو اور لانگو، نبی بخش کو ایک موٹی سی رلی اڑھا کر سہارا دیے بیل گاڑی میں بٹھا کر حکیم جی کے مطب کی طرف چل دیے۔

نبی بخش کو کوئی بیماری نہ تھی۔ وہ تو زخمی تھا اور ان زخموں کی وجہ سے اسے بخار رہنے لگا تھا۔ زخم اگرچہ کافی حد تک بھر چکے تھے۔ حکیم جی کے مطب کی طرف لے جاتے ہوئے رحیمو اور لانگو کو یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں کوئی نبی بخش کو پہچان نہ لے۔

حکیم جی کی تو انہیں اتنی پروا نہ تھی کیونکہ انہوں نے پہلے کبھی نبی بخش کو دیکھا ہی نہ تھا، کسی طرح نبی بخش کو بیل گاڑی میں سوار کروا کر حکیم جی کے مطب پہنچے۔ حکیم جی کا نام مشکل ہی تھا مگر گوٹھ کے لوگ باگ اپنی سہولت سے انہیں حکیم جی یا حکیم چاچا ہی کہتے تھے۔

پندرہ بیس منٹ تک حکیم جی نے نیم بے ہوش نبی بخش کا معائنہ کیا۔ اس وقت مطب میں لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ مطب کیا تھا، گھر میں ہی ایک بیٹھک کی طرز کے کمرے کو مطب کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔

ادھر اوطاق سے جب رحیمو اور لانگو نبی بخش کو رلی اوڑھے مطب کے باہر بیل گاڑی میں سوار کرانے لگے تو اتفاق سے اس وقت خان محمد اپنے بچے کی دوا لینے مطب کی طرف ہی آ رہا تھا۔ اسے اچانک پیٹ میں درد اٹھا تھا۔ وہ رحیمو اور لانگو کو دیکھ کر ذرا ٹھٹکا۔ پھر اس کی نظر مریض پر پڑی۔ وہ رلی اوڑھے ہوئے تھا۔ اس لیے خان محمد اسے پہچاننے سے قاصر ہی رہا۔ مگر اس نے رلی پوش مریض پر سے نظریں نہیں ہٹائی تھیں۔ خان محمد دیوار کی آڑ میں ہو گیا تھا۔ رحیمو اور لانگو اسے نہیں دیکھ سکے تھے۔ مگر دفعتاً وہ لانگو اور رحیمو کے انداز و اطوار پر چونک گیا تھا جو چوروں کے سے تھے اور پھر اچانک ایک موقع پر نجانے کس طرح مریض کے چہرے سے رلی سرک گئی۔ ایسا بیل گاڑی کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھنے کی وجہ سے ہوا تھا۔ خان محمد کا فاصلہ بیل گاڑی سے بہ مشکل پانچ چھ گز ہی رہا ہوگا۔ رلی چہرے سے ہٹتے ہی خان محمد نے فوراً نبی بخش کو پہچان لیا تھا۔

پہلے تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا مگر وہ اس چہرے کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا اور دل و دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں...... جوشِ غیظ سے اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں اس قدر تیز ہونے لگیں جیسے ابھی سینے کا پنجر چیخ جائے گا۔ یہ بات ہی ایسی تھی کہ وہ اپنے بچے کی بیماری بھول کر وہیں دبکا رہا۔ پھر بیل گاڑی خاصی دور ہونے لگی تو خان محمد بھی تنگ و تاریک بل کھاتی گلی کی کچی دیوار کے ساتھ ساتھ نہایت ہوشیاری سے آگے بڑھنے لگا۔

وہ اب بیل گاڑی کا تعاقب کر رہا تھا۔ وہ اچھی طرح تسلی کرنا چاہتا تھا کہ آیا یہ لوگ اپنے گھر کے سوا کسی دوسری جگہ تو نہیں جا رہے تھے۔ حکیم جی کے مطب سے مٹھل ہاری کا گھر زیادہ دور نہ تھا۔ وہ بیل گاڑی اس کے گھر کے سامنے ہی رکی تھی۔ خان محمد اچھی طرح اطمینان کر کے جب لوٹا تو رات کی تاریکی چہار اطراف ڈیرا جمانے لگی تھی۔ لوٹتے سے اس کے دل و دماغ میں ہنوز زبردست پکڑ دھکڑ مچی ہوئی تھی۔

اس رلی پوش مریض کا چہرہ ہنوز اس کی نظروں کے سامنے گردش کر رہا تھا مگر خان محمد کو اس بات پر حیرت بھی ہو رہی تھی کہ آخر نبی بخش...... زندہ کس طرح بچ گیا تھا......؟

بہر طور...... اسے اب نبی بخش کو زندہ دیکھ کر عجیب طرح کی خوشی کا احساس ہونے لگا تھا کیونکہ یہ حقیقت انہیں مٹھل کو "بھونگا" دینے سے پہلے ہی کھل چکی تھی اور اب اصولاً...... ان پر بھونگا اور تاوان زر دینے کے راجواڑیں فیصلے کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔

••••

"اڑے تو...... ہوش میں تو ہے خانو......! یہ کیا کہہ رہا ہے تو......؟"

میر محمد اپنے بیٹے کی بات سن کر خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات تلے بولا۔

"میں درست کہہ رہا ہوں بابا سائیں!" خانو پر زور لہجے میں بولا۔ "میں نے خود اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے نبی بخش کو ہی دیکھا ہے۔ رحیمو اور لانگو اسے حکیم جی کے دواخانے لائے تھے۔ مجھے تو خود حیرت ہو رہی ہے کہ نبی بخش زندہ تھا اور ہمیں پتا ہی نہ چل سکا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ بچ کیسے گیا۔ میں نے تو سمجھا تھا کہ میری کلہاڑی کا ایک ہی وار......"

"اڑے بس کر...... چنگا ہوا وہ بچ گیا۔"

اس کا باپ میر محمد یکدم اس کی بات کاٹ کر بولا۔ وہ ایک گھاگ آدمی تھا۔ اس کی تجربہ کار نظروں نے پس پردہ کہانی کو فوراً بھانپ لیا تھا کہ نبی بخش زخمی ضرور ہوا تھا مگر ہلاک نہیں ہوا تھا مگر مٹھل اور اس کے بیٹوں نے نبی بخش کو مردہ ظاہر کیا تھا تاکہ اس کے بیٹے خان محمد پر زیادہ سنگین جرم عائد ہو سکے۔ تاہم اس نے بیٹے سے پوچھا۔ "یہ بتا تو نے جب نبی بخش پر غصے میں آ کر کلہاڑی کا وار کیا تھا تو اپنے سامنے اسے مرتے دیکھا تھا؟"

"نہیں۔" خانو بولا۔ "وہ زخمی ہو کر گرا تھا۔ پھر کچھ لوگوں نے مجھے پکڑ لیا تھا۔ زخمی نبی بخش کو فوراً شہر کے اسپتال لے جایا گیا تھا۔ اس کے تین چچیرے بھائی لانگو وغیرہ نے بعد میں خبر پھیلا دی کہ نبی بخش مر گیا ہے۔"

"تو پھر وہ کفن میں لپٹی لاش اور قبر میں دفنایا جانے والا مردہ کس کا تھا؟" ہاری میر محمد کچھ سوچتے ہوئے بولا تو خانو بولا۔

"بابا سائیں! بات ظاہر ہو چکی ہے۔ اب ہمیں جلدی سے وڈیرے سائیں کو ساری حقیقت بتا دینی چاہیے۔"

••••

اگلے دن علی الصباح میر محمد بیٹے بیٹوں کے ساتھ سویرے سے پہلے خفیہ طور گوٹھ کے چند معتبر لوگوں سے ملا اور انہیں لیے وڈیرے سائیں آغل شاہ کی اوطاق پہنچا اور اسے ساری حقیقت سنا ڈالی۔ وڈیرا اور اس کے آدمی فوراً حرکت میں آ گئے اور یہ سب لوگ مٹھل کے گھر پہنچے اور یوں مردہ نبی بخش کو زندہ برآمد کر لیا گیا۔ یہ سب اتنا اچانک اور تیزی سے ہوا تھا کہ مٹھل اور اس کے تینوں بیٹے گنگ رہ گئے، اس سارے گھن چکر میں وہ لوگ ایک اہم بات فراموش کر بیٹھے تھے کہ اگر نبی بخش زندہ تھا تو پھر مٹھل اور اس کے تینوں بیٹوں نے کچھ دن پہلے نبی بخش کی جگہ کس کی کفنائی ہوئی لاش قبر میں دفن کی تھی......؟ لیکن ظاہر ہے یہ اتنی معمولی بات نہ تھی جو زیادہ دیر ذہن سے محو رہتی۔ سرمد ہی کے ذہن میں اچانک یہ خیال ابھرا تھا اور جس کا بلا تردد اظہار اس نے اپنے باپ اور بھائیوں کے علاوہ جرگے کے سرپنچ وڈیرے آغل شاہ کے گوش گزار کر دیا۔

بہر طور نبی بخش کی وہ جعلی قبر کھولی گئی تو سب نے اپنے دانتوں تلے انگلیاں داب لیں۔ وہاں واقعی ایک گلی سڑی لاش برآمد ہوئی۔ یہ معاملہ اب سنسنی خیز حد تک اندوہناک اور پراسرار ہو گیا تھا۔

لاش برآمد ہونے پر لوگ انگشت بدنداں تھے کہ جب نبی بخش زندہ تھا تو پھر یہ کس بدنصیب کی لاش تھی؟ انسپکٹر بچل جانوری...... جو پہلے ہی سے اس معاملے میں دلچسپی کی وجہ سے اس پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا۔ اسے بھی مطلع کیا گیا اس کے وڈیرے آغل شاہ سے اچھے تعلقات تھے۔ تب اس کے ذہن میں فوراً ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے کوندا۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ تھوڑے دن پہلے گمشدہ غلامو نامی نوجوان کی بوڑھی ماں اور سرمد اس کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوانے تھانے آئے تھے۔ اس نے ایک سوال پر اسے بتایا تھا کہ اس کے بیٹے غلامو کی سب سے زیادہ گہری دوستی مٹھل کے بیٹوں کالو، رحیمو اور لانگو سے تھی۔ بس پھر کیا تھا۔ اس نے لاش کی شناخت کے لیے فوری طور پر غلامو کی بوڑھی ماں اور اس کی بہن بھاگی کو بلا لیا۔ اگرچہ غلامو کو کچھ اور لوگ بھی پہچانتے تھے مگر لاش کی حالت اس قدر ناقابل شناخت ہو رہی تھی کہ حتمی طور پر یہ فیصلہ بھاگی اور اس کی ماں پر ہی چھوڑا گیا تھا۔ دونوں ماں بیٹی روتی پیٹتی وہاں پہنچی تھیں اور حسب توقع پہلی ہی نظر میں غلامو کی لاش پہچان لی۔ بھاگی کی ماں تو بے چاری جوان اکلوتے بیٹے کی لاش دیکھتے ہی غم سے غش کھا کر گر پڑی جبکہ بھاگی کی حالت بھی غیر ہونے لگی۔

پورے گوٹھ میں کہرام مچ گیا اور بے نام سی سنسنی پھیل گئی۔

مٹھل اور اس کے تینوں بیٹوں کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ ان سے جرم اگلوانے کے لیے وڈیرے سائیں آغل شاہ نے انسپکٹر بچل کی خدمات مستعار لی تھیں۔ جس کا خاطر خواہ نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے فوراً ہی حوالاتی تشدد سے مجبور ہو کر باجماعت یہ اعتراف کر ڈالا کہ جب نبی بخش کی بات پر اشتعال میں آ کر خان محمد نے اس پر کلہاڑی کا وار کیا تو نبی بخش شدید زخمی ہو کر بے ہوش ہو گیا۔ بعد میں خون میں نہائے ہوئے نبی بخش کو اس کے چچا زاد بھائی کالو، رحیمو اور لانگو اپنے گھر اٹھا لائے۔ سب ہی سمجھ رہے تھے کہ نبی بخش مر چکا ہے مگر وہ بے ہوش تھا۔ جسے بعد میں ایک سوچے سمجھے خفیہ منصوبے کے تحت راتوں رات شہر لے جا کر اسے طبی امداد دے کر بچا لیا گیا مگر چونکہ یہ لوگ خان محمد کو اس غلطی یا جرم کا زیادہ سے زیادہ مزہ چکھانا چاہتے تھے اس لیے پورے گوٹھ میں اسے مردہ ہی ظاہر کیا گیا لیکن چونکہ گوٹھ

والوں کے سامنے نبی بخش کی لاش کو ظاہر کرنا بھی ضروری تھا اس لیے کالو، رحیمو اور لانقو نے نبی بخش کی لاش کو دکھاوے کی خاطر غلامو کو قتل کر کے گوٹھ والوں کی نظروں کے سامنے قبر کھود کر اس کی لاش کو دفن کر دیا۔ تینوں بھائیوں اور باپ کے سر پر اب بھونگے اور زرتاوان حاصل کرنے کا لالچ سوار ہو گیا تھا۔

٭٭٭

چونکہ یہ معاملہ پہلے ہی سے راجواڑیں طور پر نمٹایا جا رہا تھا لہٰذا اب اس معاملے کی سنسنی خیز ''کایا کلپ'' پر پہلا فیصلہ معطل کر کے نیا فیصلہ سنا دیا گیا۔

اب نہ صرف ہاری میر محمد پر عائد بھونگے کو معاف کر دیا گیا تھا بلکہ دھوکا دینے اور ایک بے گناہ کے قتل کے سنگین جرم کی پاداش میں اب الٹا مشھل کو بدنصیب غلامو کی ماں کو نقد دو لاکھ روپے ادا کرنا تھے اور اپنی جوان بیٹی کونجاں کا سنگ (رشتہ) میر محمد کے چھوٹے بیٹے سرمد کو دینا پڑ گیا۔

اس فیصلے پر چند روز بعد غمزدہ بھاگی اور سرمد کی ملاقات ہوئی تو اس نے شکوہ کناں ہو کر سرمد سے کہا۔

''سرمد! یہ تو الٹا فیصلہ ہو گیا۔ تیری اب کونجاں سے شادی ہو جائے گی اور تو مجھے بھول جائے گا۔'' سرمد مسکرا کر بولا۔

''بھاگی! تو تو میری زندگی ہے۔ میری پہلی اور آخری محبت۔ مشھل کی دھی کونجاں سے میں شادی ضرور کروں گا مگر اس کی حیثیت ایک نوکرانی سے بڑھ کر نہیں ہوگی۔ پھر کچھ ہی روز بعد میں تجھ سے بیاہ کر لوں گا۔ تو بھی کونجاں سے جی بھر کر اپنے بھائی غلامو کا انتقام لینا۔ آخر کو تیرے بھائی غلامو کے قاتلوں کی وہ بیٹی ہوگی۔''

سرمد کی غایت جان کر بھاگی کا پژمردہ چہرہ یکدم کھل اٹھا اور اس کی آنکھوں میں بھی اب انتقام کے شعلے رقص کرنے لگے تھے۔ پھر چند ثانیے بعد سرمد نے اسے مزید قائل کرنے کی خاطر تسلی دی اور معنی خیز لہجے میں بھاگی کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولا۔

''جھلّی! کیا سوچ رہی ہے۔ بے فکر رہ...... سہاگ رات میں صرف اور صرف تیرے ساتھ ہی مناؤں گا۔ کونجاں تو محض میرے پاؤں کی جوتی ہوگی۔''

یہ سن کر بھاگی کا چہرہ شرم...... اور خوشی سے سرخ ہو گیا۔

یہ اس معاشرے کا دردناک المیہ تھا کہ انتقام اچھے بھلے انسان کو زہریلا بنا ڈالتا ہے۔ جس سے کئی مسائل جنم لیتے ہیں۔

٭٭٭

ماحول میں رات کی تیرگی گھلنے لگی تھی۔ گارے مٹی کے لیپ والی اس کچی کوٹھری میں لالٹین روشن تھی جس کی یرقان زدہ روشنی میں دیوار پر بنے دودم بہ خود سائے لرزاں تھے۔ یہ نبی بخش کا کمرا تھا۔

وہ ایک رلی بچھی چارپائی پر پاؤں لٹکائے پریشان سا بیٹھا تھا اور اس کے سامنے دوسری چارپائی پر کونجاں بھی غمناک چہرے کے ساتھ سر جھکائے بیٹھی تھی۔

''نبی بخش! اب کیا ہو گیا؟''

دفعتاً کوٹھری کی محدود اور ساکت فضا میں کونجاں کی لرزیدہ سی آواز ابھری۔

نبی بخش نے کونجاں کی طرف دیکھا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اس کا خوب صورت اور معصوم چہرہ پیلا پڑتا دکھائی دیا مگر اس سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔

درحقیقت وہ دونوں اس وقت موجودہ صورت حال کے ایک دم پلٹ جانے پر فکرمند تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ نبی بخش کے چاچا مشھل یعنی کونجاں کے باپ اور بیٹوں پر اب ''بھونگے'' کی افتاد آن پڑی تھی۔

جس کا راجواڑیں فیصلہ یہ ہی طے پایا تھا کہ اب کونجاں کو میر محمد کے بیٹے سرمد کی بیوی بننا تھا۔ جوان دونوں میں سے کسی کو بھی قبول نہ تھا کیونکہ کونجاں نبی بخش کی بچپن کی پسند تھی۔ دونوں بچپن سے ہی ساتھ کھیل کود کر جوان ہوئے تھے اور ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے تھے۔ یہی نہیں بلکہ مستقبل قریب میں تو دونوں کی شادی بھی ہونے والی تھی۔

نبی بخش کو جواباً بہ دستور خاموش پا کر کونجاں سے رہا نہ گیا اور اس نے پہلے سے بھی زیادہ متوحش لہجے میں نبی بخش کی طرف دیکھ کر کہا۔

''دیکھ نبی بخش! میں مر جاؤں گی مگر تیرے سوا کسی سے شادی نہیں کروں گی۔''

''کونجاں......! ذرا صبر کر، میری حالت تجھ سے مختلف نہیں ہے۔'' نبی بخش نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ وہ بھی خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔ ''لیکن کونجاں! اگر ہم اسی طرح روتے دھوتے رہے تو پھر کچھ بھی نہیں بچے گا۔ تو میری منگ ہے...... بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں تجھ سے دستبردار ہو جاؤں؟''

''مگر نبی بخش! ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا کونجاں! تو فکر نہ کر۔'' دفعتاً

نبی بخش نے خلا میں گھورتے ہوئے پراسرار لہجے میں جواب دیا اور جانے کیوں اس لہجے پر کونجاں قدرے چونک کر نبی بخش کا چہرہ تکنے لگی۔

٭٭٭

دھوپ نکل آئی تھی مگر سردی بھی کم نہ تھی۔ تھانے کے وسیع احاطے میں اس وقت انسپکٹر بچل جانوری ایک کرسی پر بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ ایک مخنی سا اے ایس آئی ارشد لاشاری بھی اس کے قریب ہی دوسری کرسی پر براجمان تھا۔ انسپکٹر محمد بچل اخبار کے مطالعے میں غرق تھا کہ اچانک ایک بدحال سا شخص ہانپتا دوڑتا اس کے قریب آیا، اس کے ہمراہ دو سپاہی بھی تھے۔

''س...... سائیں......! انسپکٹر سائیں قہر تھی ویو (غضب ہو گیا)'' اس نے قریب پہنچ کر ہراساں لہجے میں کہا۔ انسپکٹر کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔ بچل نے قدرے چونک کر اخبار سے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''انسپکٹر سائیں......! وہ...... وہ...... مشھل ہاڑی کے پٹ لانقو کو قتل کر دیا گیا ہے۔''

اس اطلاع پر انسپکٹر محمد بچل جانوری...... قدرے ٹھٹکا اور بہ غور یہ خبر لانے والے مضطرب الحال شخص کا بہ غور جائزہ لیا جو میلی سی شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا۔ سر پر میلی چیکٹ ٹوپی دھری تھی۔ عمر تیس پینتیس کے آس پاس ہوگی۔ رنگت خاکستری مائل سانولی تھی اور جسم عسرت حالی کی غمازی کرتا تھا۔

''مجھے تفصیل بتاؤ...... اور ہاں...... اپنا نام بھی......''

بہ غور جائزہ لینے کے بعد انسپکٹر جانوری نے کڑک دار لہجے میں کہا۔

اس کے قریب بیٹھا اے ایس آئی ارشد لاشاری بھی ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔

''سائیں...... میرا نام دھڑیں بخش ہے۔'' دو سپاہیوں کے ساتھ آنے والے نووارد نے کہا۔ ''انسپکٹر سائیں!...... میں نے خود اپنی آنکھوں سے خانو کو لانقو کے سر پر کلہاڑیاں مارتے دیکھا ہے، اس ظالم نے بے چارے کا قیمہ کر ڈالا۔'' یہ بتاتے ہوئے دھڑیں بخش کا لہجہ گلوگیر ہو گیا۔ وہ کوئی کمزور دل اور حساس آدمی تھا۔ انسپکٹر جانوری کے چہرے پر ایک لمحے کو پرشکن تاثرات ابھرے تھے۔ اپنے قریب بیٹھے ارشد کی طرف دیکھا پھر ایک دم کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ارشد نے بھی اپنی کرسی چھوڑ دی۔

''یہ خانو کون ہے؟ دھڑیں بخش! مجھے اس کا پورا نام بتاؤ...... اور یہ بھی کہ یہ واردات تم نے کہاں ہوتے دیکھی ہے؟'' انسپکٹر بچل جانوری نے گمبھیر لہجے میں اس سے پوچھا۔

''سائیں! ادھر...... بابا کوڑیل شاہ کی چکی سے ذرا پرے...... سریں (سرسوں) کے کھیتوں کے بیچ۔'' حواس باختہ ہو کے اس نے ادھورا جواب دیا تو انسپکٹر بچل اسے گھورتے ہوئے کڑک دار لہجے میں بولا۔

''میں نے خانو کا پورا نام پوچھا ہے...... وہ کس کا بیٹا ہے......؟ کون ہے؟''

''جی...... خان محمد نام ہے اس کا سائیں......!'' وہ ہاری میر محمد کا وڈا پٹ (بڑا بیٹا) ہے سائیں۔''

اس نے بتایا تو انسپکٹر ایک لمحے کو اس کی بات پر چونکا۔ اسے یاد آنے لگا کہ یہ ہاری میر محمد یقیناً وہی شخص تھا جس کا مشھل کے ساتھ پرانا تنازعہ چلا آ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ابھرا۔

''یہ لانقو کہیں مشھل ہاری کا بیٹا تو نہیں؟''

''ہاؤ سائیں...... ہاؤ......'' دھڑیں بخش نامی اس شخص نے فوراً اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔

انسپکٹر نے چند سپاہیوں کو ساتھ لیا اور پولیس موبائل میں سوار ہو کر جائے وقوعہ پر پہنچا۔ دھڑیں بخش بھی ساتھ تھا۔ وہاں دیگر لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا۔ وہاں موجود بیشتر لوگوں کا یہی خیال تھا کہ لانقو کو ''کارو'' (بدکار) کر کے قتل کیا گیا ہے۔ پولیس گاڑی کو دیکھتے ہی مجمع کائی کی طرح چھٹتا چلا گیا۔ گاڑی رکتے ہی انسپکٹر بچل اپنے چہرے پر فرض دار چُستی لیے نیچے اترا اور سیدھا لاش کی طرف بڑھا اور بہ غور اس کا جائزہ لینے لگا۔

اگرچہ لانقو کے سر پر کلہاڑی سے وار کیا گیا تھا مگر ایک ہی بھرپور ضرب نے شدت اختیار کر لی تھی مگر لاش کا چہرہ قابل شناخت نظر آ رہا تھا۔ انسپکٹر نے کھڑے کھڑے اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا کہ مقتول کی بے خبری میں ہی اچانک اس کے سر کے پچھلے حصے پر وار کیا گیا تھا۔ مزید براں ایک ہی بچے تلے وار نے مقتول کو آناً فاناً موت سے ہمکنار کر ڈالا تھا۔ اس ایک وار کے سوا مقتول کے جسم پر سردست کسی ''ضرب شدید'' وغیرہ کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ تب ہی اچانک انسپکٹر محمد بچل کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ اسے یاد آیا کہ اس اندوہناک وقوعہ کی اطلاع دینے والے دھڑیں بخش نامی شخص نے بتایا تھا کہ خانو نے لانقو کو کلہاڑیوں کے پے در پے وار کر کے اس کا قیمہ بنا ڈالا تھا جبکہ مقتول پر ایک ہی وار کیا گیا تھا۔

''دھڑیں بخش......! تمہارے علاوہ اور کس نے خانو

کو یہ قتل کرتے ہوئے دیکھا تھا؟''
انسپکٹر محمد بچل جانوری نے کسی خیال کے تحت اس سے پوچھا۔
''مم...... میں اکیلا تھا سائیں! اس وقت اور کوئی نہ تھا۔'' اس نے بتایا۔
''تم تو کہہ رہے تھے کہ خانو نے لانگو کا قیمہ بنا ڈالا ہے مگر لاش کا جائزہ لینے کے بعد تو ظاہر ہوتا ہے کہ اس پر کلہاڑی کا ایک ہی وار کیا گیا ہے اور وہی جان لیوا ثابت ہوا۔'' بالآخر انسپکٹر نے کہا تو ایک لمحے کے لیے دھڑیں بخش ٹھٹکا اور کچھ گھبرایا ہوا سا نظر آنے لگا۔ پھر فوراً بات بناتے ہوئے بولا۔
''سس...... سائیں! خانو مجھے اس وقت بری طرح طیش میں نظر آرہا تھا جب اس نے ایک وار کیا تو میں نے لانگو کو گرتے دیکھا تو یہی سمجھا کہ خانو اس پر مزید وار بھی کرے گا۔ میں نے تو سائیں! خوف زدہ ہو کر سرپٹ آپ کے پاس تھانے کی طرف دوڑ لگادی۔''
انسپکٹر کو اس کی یہ بات ہضم نہ ہوسکی۔ بہرطور...... اس نے ضابطے کی کارروائی نمٹائی اور مقتول کی لاش کو پوسٹ مارٹم وغیرہ کے لیے اپنی کسٹڈی میں کرتے ہوئے دو سپاہیوں کو ارشد لاشاری کے ساتھ مقتول کے وارثوں کی طرف بھیج دیا اور خود خانو کو گرفتار کرنے اس کے گھر جا پہنچا۔ اسے حیرت ہوئی کہ مبینہ قاتل خانو (خان محمد) گھر پر ہی موجود کھانا کھا رہا تھا۔ بہرطور...... سرِدست کارروائی نمٹانی تھی، انسپکٹر نے اس کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں پہنادیں۔
''سس...... سائیں...... ! مم...... میرا بچڑا...... بے قصور ہے......''
خانو کے باپ میر محمد نے گڑگڑاتے ہوئے انسپکٹر بچل سے کہا۔ مگر وہ شاید ان واویلوں کا عادی تھا لہٰذا انسپکٹر خانو کو ہتھکڑی ڈالے تھانے پہنچا اور اسے لاک اپ کردیا۔
حسب توقع خانو نے اپنے جرم سے انکار کر ڈالا۔ انسپکٹر بچل نے مقتول کے وارثوں کو تھانے بلایا اور ان کے بیانات قلم بند کیے۔ پھر اگلے روز وڈیرے آغل شاہ اور راجواڑیں کمیٹی کے چند معتبر آدمیوں نے یہ سارا معاملہ باضابطہ طور پر پولیس کے حوالے کردیا۔ اس بارے میں ان سب کا یہی متفقہ کہنا تھا کہ یہ خونی واقعہ بھی دونوں فریقوں یعنی ہاری میر محمد اور مٹھل ہاری کے بیچ پرانے تنازعہ کا شاخسانہ تھا۔ اب انسپکٹر محمد بچل پوری طرح یہ کیس حل کرنے میں چاق وچوبند ہوگیا تھا۔
سب سے پہلے اس نے نئے سرے سے اور ذرا ماضی کے حوالے سے دونوں فریقوں یعنی ہاری میر محمد اور مٹھل ہاری کے مابین پرانے تنازعے کو کھنگالنا شروع کردیا اور اپنے ذہن میں ان کی ترتیب وار چین بنا کر بہ غور حالات کا تجزیہ کرنے لگا یعنی آج سے کچھ عرصہ پہلے میر محمد کے بڑے بیٹے خان محمد اور مٹھل کے بھتیجے نبی بخش کے بیچ کسی بات پر جھگڑا ہوا تھا اور اشتعال میں آکر خان محمد نے نبی بخش پر کلہاڑی سے وار کردیا جس کے نتیجے میں نبی بخش زخمی ہوگیا اور مٹھل کے بیٹوں نے اپنے چچازاد نبی بخش کو مرا ہوا ظاہر کیا تاکہ خان محمد پر سنگین جرم عائد ہوسکے مگر جلد ہی یہ عقدہ کھلا کہ نبی بخش مرا نہیں تھا اور اس کی جگہ مٹھل ہاری کے بیٹوں، کالو، رحیمو اور لانگو نے اپنے ایک غریب اور سادہ لوح دوست غلامو کو قربانی کا بکرا بنا کر قتل کرکے اس کی لاش کو نبی بخش ظاہر کرتے ہوئے دفنا دیا تھا۔ بعد میں جبکہ اس جرم سے بھی پردہ اٹھ گیا اور یوں ''راجواڑیں'' فیصلے کے مطابق الٹا اب مٹھل کے بیٹوں پر دوہرا بھونگا عائد کردیا گیا یعنی مٹھل ہاری کی اکلوتی بیٹی کونجاں کا سنگ (رشتہ) سرمد کے ساتھ دولاکھ کی چٹی (خوں بہا) غلامو کی بدنصیب ماں کو دینا قرار پایا پھر اس کے کچھ دنوں بعد یعنی ابھی بھونگے کی ادائیگی میں چند دن باقی تھے کہ اچانک مٹھل کے بیٹے لانگو کو قتل کردیا گیا۔ یہ قتل دھڑیں بخش نامی ایک شخص نے اپنی آنکھوں سے خان محمد کو کرتے دیکھا تھا۔
مگر اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ آخر میر محمد کے بیٹے خان محمد کو کیا ضرورت تھی کہ وہ لانگو کا قتل کرتا جبکہ راجواڑیں میں یہ فیصلہ صادر کیا جاچکا تھا کہ لانگو کے گھر والوں نے نہ صرف غلامو کی بدنصیب ماں کو بلکہ ہاری میر محمد کو بھی بھونگ دینا تھا۔ بھلا ایسی صورت میں خان محمد کو لانگو کو قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اور حقیقت بھی یہ تھی کہ خود اس کا دماغ یہ بات ماننے کو تیار نہ تھا۔
تو پھر آخر لانگو کا قتل کس نے کیا تھا؟ جبکہ دھڑیں بخش نامی گواہ نے بھی خان محمد کو لانگو کا قتل کرتے دیکھا تھا۔ بچل نے تمام حالات کی باریک جزئیات کو ترتیب وار ایک لڑی میں پرونے کے بعد اس بات پر غور کیا۔
اگر ذرا دیر کو یہ تسلیم کرلیا جاتا کہ عینی گواہ دھڑیں بخش جھوٹ بول رہا تھا تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اسے جھوٹ بولنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ وہ تو خود ایک عام سا، بے ضرر غریب آدمی تھا۔
''سائیں انسپکٹر صاحب! جب معاملہ سنگ داری

(بیٹی یا بہن کا رشتہ دینا) کا ہو اور...... اور وہ بھی ''بھونگے'' کی صورت میں تو ایسے میں یہ لوگ کسی اپنے کو بھی ''پیارا'' کرڈالتے ہیں۔''

یہ اے ایس آئی ارشد لاشاری کے الفاظ تھے۔ جب انسپکٹر بچل نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے اس سوال کے بارے میں اس سے رائے چاہی تو اس نے بلا تصدیق و تامل اس پر ایک بے رحمانہ تبصرہ کرڈالا تھا۔

''یہ بھلا کیسے ہوسکتا ہے، تمہارا مطلب ہے لانگو کو اس کے بھائیوں نے ہی قتل کرڈالا تھا۔ یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ ارشد! ذرا کھل کر بات کرو۔'' انسپکٹر بچل جانوری نے الجھے ہوئے لہجے میں اس کی طرف دیکھ کر کہا تو ارشد اپنے چہرے پر پختہ کارانہ جوش کی تمتماہٹ طاری کرتے ہوئے بولا۔

''سائیں! سیدھی سی بات ہے...... لانگو کو قتل کرنے کے بعد ان لوگوں نے یہی سمجھا ہوگا کہ اب چونکہ اس کے قتل کا الزام میر محمد یا اس کے بیٹوں کے سر جائے گا اور یوں حساب برابر ہوجائے گا۔ اس طرح انہیں بھونگا بھی نہیں بھرنا پڑے گا...... خاص طور پر کونجاں کا......''

''میرے حلق سے یہ بات نہیں اتر رہی ہے ارشد......! تم پھر دھڑیں بخش کے بارے میں کیا کہو گے، جو عینی گواہ ہے؟''

''وہ جھوٹ بھی بول سکتا ہے سائیں!'' اے ایس آئی ارشد لاشاری نے بلا خوف تردید کہا۔ تو انسپکٹر بچل جانوری اس کی بات پر غور کرتے ہوئے سوچنے لگا تو کسی حد تک یہ بات اسے باوزن محسوس ہونے لگی، یہ بڑی عجیب بات ہے کہ اس کا اس بات کی طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا کہ دھڑیں بخش جھوٹا بھی ہوسکتا ہے مگر...... پھر بھی جانے کیا بات تھی کہ انسپکٹر بچل کے حلق سے یہ بات نہیں اتر رہی تھی کہ لانگو کو خان محمد کے بجائے اس کے بھائیوں نے ہی اپنی جوان بہن کونجاں پر ''قربان'' کیا ہوگا تاکہ اس کا سنگ (رشتہ) مخالف دھڑ (فریق) کو نہ دینا پڑے بلکہ الٹا خان محمد پر ہی قتل کا الزام تھوپ کر ''سر دھان'' (خون بہا) وصول کرلیا جائے۔ جانے کیوں انسپکٹر بچل جانوری کو یہ کیس اتنا پیچیدہ نہ ہوتے ہوئے بھی لاینحل سا ہی محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بے اختیار الجھ کر اپنی پیشانی مسلنے لگا جیسے ماتھے کی شکنوں کا جال سلجھانے کی سعی کررہا ہو...... تب اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال برق کی سی سرعت کے ساتھ کوندا...... اس نے فوراً اے ایس آئی ارشد کو مخاطب کرکے کہا۔

''ارشد! تم ایک کام کرو۔''

''حاضر سائیں! حکم کرو......'' وہ مستعدی سے مؤدبانہ انداز میں بولا۔

''تم ایسا کرو...... دھڑیں بخش پر کڑی نگاہ رکھو اور اس کے معمولات، نیز وہ کن لوگوں سے ملتا جلتا ہے اور اس کی زیادہ گہری آؤ جاؤ کن افراد سے ہے؟''

''حاضر سائیں...... میں ابھی سادہ وردی میں اس کام میں مصروف ہوجاتا ہوں۔'' ارشد نے کہا۔

⁂⁂⁂

مگر دو روز گزرنے کے باوجود...... اے ایس آئی ارشد لاشاری کو دھڑیں بخش کے متعلق کوئی خاص بات معلوم نہ ہوسکی سوائے اس کے کہ اس نے ایک دن دھڑیں بخش کو نبی بخش کے ساتھ پھکو موالی کے چھپر نما ہوٹل میں ایک ساتھ دیکھا تھا۔ پہلے تو انسپکٹر بچل نے سرسری انداز میں یہ سنا مگر پھر دوسرے ہی لمحے اسے جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو اور وہ ارشد لاشاری سے پرجوش لہجے میں بولا۔

''یہ نبی بخش...... کہیں وہی تو نہیں جو مٹھل کا بھتیجا ہے اور ایک عرصے سے اسی کی زیر کفالت ہے؟''

''ہاؤ سائیں......! میں اسی نبی بخش کی بات کررہا ہوں۔'' ارشد نے جواباً کہا۔

''ارشد! تم اس وقت چند سپاہیوں کو بھیج کر ذرا دھڑیں بخش کو میرے سامنے پیش کرو۔'' ارشد نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور تھوڑی دیر بعد دھڑیں بخش اس کے سامنے تھا۔

انسپکٹر محمد بچل اپنے تئیں فوراً ہی اس گتھی کو اپنے ذہن رسا میں تقریباً سلجھا چکا تھا اور اسی ترتیب کے ساتھ مرحلہ وار آگے بڑھنا چاہتا تھا۔

اس نے ارشد لاشاری کو چند ضروری ہدایات دینے کے بعد دھڑیں بخش کو اس کے حوالے کردیا۔ ارشد نے تھوڑی ہی دیر میں دھڑیں بخش کو ایک خاص مگر سیلن زدہ کمرے میں لے جاکر اس سے مخصوص قسم کی پوچھ گچھ کی تو سارا دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوگیا۔

انسپکٹر بچل، اے ایس آئی ارشد اور چند سپاہیوں کے ہمراہ مٹھل ہاری کے گھر پہنچا۔ نبی بخش اس وقت گھر پر ہی موجود تھا، اسے فوراً ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں۔

نتیجتاً مٹھل اور اس کے سب گھر والے رونے پیٹنے اور داد فریاد کرنے لگے۔ مٹھل اپنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے انسپکٹر سے گڑگڑا کر بولا۔

''سائیں! یہ کیا ظلم ہے...... بچھڑا (بیٹا) بھی میرا قتل ہوا اور...... گرفتاری بھی میرے ہی سگے بھتیجے کی...... اس نے بھلا

کون سا ایسا جرم کرڈالا۔'' انسپکٹر نے گھور کر مٹھل ہاری کی طرف دیکھا اور کڑک دار لہجے میں چونکا دینے والا انکشاف کیا۔

''اسے لانگو کے قتل کے جرم میں گرفتار کیا جارہا ہے۔''

اس کی بات پر تمام اہل خانہ کو جیسے یکدم سانپ سونگھ گیا۔ سب سے زیادہ بری حالت پاس کھڑی آنسو بہاتی سسکتی کونجاں کی ہورہی تھی۔ انسپکٹر بچل نے نہ صرف ایک پرتشکیک نظر کونجاں پر ڈالی اور پھر مٹھل ہاری کی طرف دیکھ کر سنسنی خیز لہجے میں بولا۔

''تم کو بھی ہمارے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔'' یہ کہتے ہی وہ سب تھانے آگئے۔

نبی بخش کی حالت نہایت دگرگوں تھی۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہورہا تھا۔ انسپکٹر محمد بچل نے اسے لاک اپ کرنے کے بعد مضطرب الحال مٹھل کو اپنے کمرے میں بلالیا۔ اس وقت کمرے میں ان کے علاوہ دو ہی سپاہی تھے۔ اے ایس آئی ارشد بھی موجود تھا۔ مٹھل اپنے دونوں لرزیدہ ہاتھ جوڑے ایک کونے میں کھڑا تھا۔ انسپکٹر محمد بچل اس کی طرف چبھتی ہوئی نظروں سے گھورتے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھا اور اس کے قریب آکر بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میرے سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔''

''حاضر سائیں!...... پوچھو......'' مٹھل لرزتی کانپتی آواز میں بولا۔

''کیا تم اپنی بیٹی کونجاں کی شادی اپنے یتیم بھتیجے نبی بخش سے کرنے کا ارادہ رکھتے تھے؟''

مٹھل پہلے تو اس عجیب سوال پر ذرا گڑبڑا سا گیا مگر پھر دوسرے ہی لمحے اس نے اثبات میں اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''ہا...... ہاؤ...... سائیں! میں...... میں نے تو بچپن سے ہی ان دونوں کی بات پکی کر رکھی تھی مگر......''

''مگر کیا......؟ دیکھو، رکو نہیں، بولتے رہو......'' انسپکٹر نے ڈپٹا۔

''آپ کو تو پتا ہی ہوگا سائیں...... کہ ہمارا ہاری میر محمد سے ایک پرانا جھگڑا چل رہا تھا۔'' مٹھل نے پھر بتانا شروع کیا۔

''اب راجواڑیں فیصلے کے مطابق ہمارے کو ''بھونگے'' کی صورت میں اپڑیں کونجاں کا سنگ (رشتہ) میر محمد کے بیٹے سرمد کو دینا پڑ رہا ہے۔''

''یہیں سے تو ساری خرابی کی ابتدا ہوئی تھی۔''

انسپکٹر نے فوراً کہا۔ تب پھر وہ مٹھل کو وہ ساری حقیقت بتانے لگا جو اسے نبی بخش کے بارے میں دھڑیں بخش سے مخصوص طرز کی پوچھ گچھ کے بعد معلوم ہوئی تھی، بولا۔

''مٹھل! میری پوری بات غور سے سنو...... تمہاری بیٹی کونجاں اور نبی بخش بچپن سے ہی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ جب تمہارے اپنے بیٹوں کی غلطی سے الٹا بھونگا بھرنے کی نوبت آئی اور راجواڑیں فیصلے کے مطابق جب کونجاں کا سنگ (رشتہ) میر محمد کے بیٹے سرمد کو دینا پڑا تو یہ بات کونجاں اور سب سے زیادہ نبی بخش کے لیے تکلیف دہ تھی۔ درحقیقت تمہارے اپنے ہی بھتیجے نبی بخش نے حساب برابر کرنے کے لیے تمہارے ہی بیٹے لانگو کا قتل کرڈالا تاکہ یہ جرم میر محمد کے کھاتے میں ڈال کر ''بھونگا'' بخشوا لیتا۔ اس کے لیے نبی بخش نے ایک غریب آدمی کو جس نے اپنی بیمار بیوی کا شہر سے علاج کروانا تھا۔ روپوں کا لالچ دے کر اپنے اس خونی منصوبے میں شریک کیا۔ اس کا نام دھڑیں بخش تھا۔ اسے لانگو کے قتل کا جھوٹا عینی گواہ بنا کر یہ قتل میر محمد کے بیٹے خانو کے سر تھوپنے کی کوشش کی۔''

''پر وہ بدبخت...... سرمد کو بھی تو قتل کرسکتا تھا جس کی شادی کونجاں سے ہونے والی تھی......؟'' مٹھل نے پوچھا۔

''یہی تو اس کے منصوبے کا وہ نازک پہلو تھا...... کہ اگر وہ سرمد کو قتل کرتا تو سیدھا سیدھا شبہ نبی بخش پر ہی کیا جاتا جبکہ اس کے برعکس لانگو کے قتل پر کسی کو بھی اس پر شبہ تک نہ ہوتا اور ایسا ہوا بھی۔ یہ تو دھڑیں بخش کی ایک بے وقوفی کے باعث عقدہ کھلا کہ اسے جھوٹا گواہ بنا کر قاتل کا شبہ ہٹانے کی کوشش کی گئی تھی۔''

''سائیں! دھڑیں بخش سے کیا غلطی ہوئی تھی؟''

''اس نے جب تھانے آکر مجھے جو اطلاع دی تھی وہ وقوعہ پر بالکل مختلف ثابت ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ خانو نے کلہاڑیاں مار کر لانگو کا قیمہ بنا ڈالا ہے جبکہ جائے وقوعہ کا جائزہ لینے کے بعد مجھے پتا چلا کہ لانگو پر صرف ایک ہی شدید کلہاڑی کا وار کیا گیا تھا جو اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوا تھا۔ تب مجھے دھڑیں بخش پر شبہ ہوا مگر میں نے اس پر ظاہر نہیں کیا اور چھوڑ دیا۔ بعد میں میرے ایک آدمی نے سادہ وردی میں اس پر نگاہ رکھی تو اسے نبی بخش کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے دیکھا گیا...... پھر اس سارے گورکھ دھندے کی وجہ میری سمجھ آگئی۔''

انسپکٹر نے اپنی بات ختم کی اور مٹھل اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

✪

ناصر ملک

مسافر

قسط نمبر: 14

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان مسافر... زندگی مسافت... اور اعمال زادِ سفر ہوتے ہیں... کسی کو انسانیت کے لبادے سے نکل کر پتھر کی صورت ڈھل جانے میں صدیاں نہیں لگتیں... اور کہیں آنکھوں میں اشک نہ ہونے کے باوجود ہر ادا، ہر چہرہ اشکبار ہونے کا احساس دلاتا ہے... وہ بھی ایک خانماں خراب، بے سپر اور آبلہ پائی کے عذاب میں مبتلا مسافر تھا... جو دنیا کے چلن سے آگاہ تھا، جسے ہتھیاروں کے اوچھے ہتھکنڈوں کا ادراک تھا مگر پھر بھی مائل بہ تغیر تھا کیونکہ وہ جانتا تھا... جب بند آنکھوں سے آنسو رواں ہوں اور ہونٹ ساکت ہوں تو ایسے میں ان ساکت ہونٹوں کے درمیان دل کی لرزش مچلا کرتی ہے... خاموش فضاؤں میں طوفان چھپے ہوتے ہیں... دریا کی روانی کتنی کہانیوں کو بہا لے جاتی ہے... ایسے میں مسافت طویل... بہت طویل ہوجاتی ہے مگر مسافر ہر موڑ پر ایک نئی داستان رقم کرکے آگے بڑھتا جاتا ہے... کبھی کردار اس کے تعاقب میں ہوتے ہیں اور کبھی وہ خود اپنی تلاش میں کہیں گم ہوجاتا ہے... کبھی مل جانے کی خوشی، کبھی احساس زیاں... سوختہ جذبات میں تلاطم برپا کردینے والے واقعات اور معاشرتی سردرویّوں پر مشتمل حیرت انگیز انکشافات کا طویل سلسلہ۔

گل وگلزار سے راہ پرخار تک ایک مسافر بے نوا کی روداد حیات

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

زندگی کے سفر پر ہم سب مسافر راہ کی کٹھنائیوں سے بے خبر رواں دواں رہتے ہیں۔ داستان سفر شروع کرنے سے پہلے اپنا تعارف ضروری ہے۔ میرا نام شہریار ہے پیار سے شہرا کہتے ہیں۔ میرا گھرانا عالی نسب غریب خاندان تھا جو چار افراد، میں، والد امام دین عرف سوہنا خان، والدہ رضیہ بی بی عرف رجو اور چھوٹی بہن پروین پر مشتمل تھا اور جنوبی پنجاب کے قصبے نور پور میں مقیم تھا جب میری عمر پانچ برس تھی ایک روز میرے والدین کو بے دردی سے قتل کردیا گیا جس کے بعد میرے چچا چراغ دین اور چچی نے ہمیں اپنا لیا اور اپنے تین بچوں ہی کی طرح ہماری تربیت کی۔ گاؤں ہی میں پھوپی کبریٰ رہتی تھی جنھوں نے بچپن ہی میں اپنی بیٹی غزالہ سے میرا رشتہ طے کردیا تھا۔ چچا نے مجھے تعلیم دلائی، میں نے ملتان سے گریجویشن کیا اور اسی دوران ایک سیاسی پارٹی کے اسٹوڈنٹ ونگ میں ایک اہم عہدے پر فائز رہا اور ہتھیاروں کے استعمال ودیگر علوم میں مہارت حاصل کی۔ پھر اس کے بعد میں نور پور واپس آگیا۔ گاؤں کے دوستوں میں امیر نواز بھی شامل تھا جو کہ گاؤں کے نمبردار حیات خان کا بیٹا تھا۔ میں ان کے حسابات کی منشی گیری اور دیگر چھوٹے موٹے کام بھی کردیا کرتا تھا۔ میرا دوسرا دوست اللہ بخش لوہار کا بیٹا خالد عرف کھالا تھا جو تعلیم یافتہ تو نہ تھا لیکن حیات خان کی ویگن چلاتا تھا، اسی نے مجھے ڈرائیونگ سکھائی تھی جبکہ تیسرے دوست ڈاکٹر منصور علی شاہ عرف شاہ جی تھے جو گاؤں کے سرکاری اسپتال میں ڈاکٹر کی حیثیت سے تعینات تھے۔ وہ ایک سلجھے ہوئے مخلص، لیکن نڈر مگر کچھ قنوطی انسان تھے۔ میں ان سے عملی تربیت بھی حاصل کر رہا تھا۔ خالد عرف کھالا سردار حیدر خان جو کہ ایک سیاسی لیڈر تھا اور حیات خان کا سرپرست بھی تھا، کی بیٹی اسما کے یکطرفہ عشق میں مبتلا ہوگیا، میں نے اسے سمجھایا لیکن وہ اپنی روش پر قائم رہا۔ گاؤں کے بڑوں میں نمبردار حیات خان کے

علاوہ اس کا کزن وریام خان اور اس کا بھائی سردار بخت خان بھی تھا جو سب سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ وریام خان کی بیٹی کی شادی کے موقع پر سردار حیدر خان کی بیٹی اسما کی طبیعت خراب ہوئی تو ہرکارہ ڈاکٹر شاہ جی کو بلانے کے لیے دوڑایا گیا لیکن اس نے آنے سے انکار کردیا جس پر وریام خان سخت چراغ پا ہوا اور اس کی حاکمانہ انا کو سخت ٹھیس پہنچی۔ چونکہ وہ ایک منتقم مزاج شخص تھا اس لیے اس نے انتقامی کارروائی کے ذریعے شاہ جی کو پھانسنے کی کوشش کی مگر میں نے اور کھالا نے اسے ناکام بنادیا۔ ان تمام واقعات کے تناظر میں وریام خان نے شاہ جی سے میری حمایت پر مجھے سرزنش کی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ میں شاہ جی کی صحبت چھوڑ دوں۔ گاؤں کے ماسٹر جی کی بیٹی جس کے پیر میں لنگ تھا اور وہ شاہ جی کے زیرعلاج رہی تھی، ان کے عشق میں مبتلا ہوگئی۔ شاہ جی کے خلاف ہونے والی سازش سے آگاہ کرنے کے لیے حیدر خان کی بیٹی صدف نے ایک رقعہ کھالے کی بہن خالدہ کے ہاتھ بھیجا تھا۔ اسی باعث خالدہ نے جو کہ ابھی جوانی کی خطرناک عمر سے گزر رہی تھی، غلط تاثر لے لیا اور ایک دن بہانے سے اپنے گھر بلا کر مجھ سے اظہارِ الفت کرنا چاہا اور مجھ سے لپٹنا چاہتی تھی کہ میں پیچھے کی جانب گرا تو پیچھے رکھے صندوق کی نوک میری ریڑھ کی ہڈی میں چبھی اور میرا سارا جسم مفلوج ہوگیا۔ اسی دوران کھالا بھی وہاں پہنچ گیا۔ تو اس نے مجھے خنجر کے ذریعے مارنا چاہا اسے حقیقت کا احساس ہوا تو وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ گاؤں میں، سب کھالے پر لعن طعن کررہے تھے میں نے اسے معاف کردیا۔ اسی دوران میں گاؤں میں موجود سائیں جیت کے مزار پر مشکوک لوگوں کی آمد اور سرگرمیوں کے بارے میں سردار بخت خان نے ہم لوگوں کو مطلع کیا۔ سائیں کا بیٹا دل جیت شاہ اس آستانے پر بیٹھا کرتا تھا۔ بخت خان نے ہی مجھے معقول معاوضے پر اپنی بیٹی ملکہ کو پڑھانے پر مامور کرلیا۔ یہ معاملات جاری تھے کہ کھالے نے بتایا کہ اسما نے اسے شہر میں ایک مشہور پارک میں بلایا ہے۔ میں پریشان تو ہوا لیکن اس کے ساتھ جانے پر رضامند ہوگیا۔ اسما سے ملاقات کے دوران لمبے بالوں والا ہیرو ٹائپ نوجوان وہاں آگیا اور ان دونوں کے درمیان کسی بات پر لڑائی شروع ہوگئی۔ معاملہ خون خرابے تک پہنچ گیا۔ اسی دوران کھالے کے ہاتھوں اس نوجوان موبی کا قتل ہوگیا۔ کھالا تو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا لیکن میں پولیس کے ہاتھ لگ گیا اور تھانے پہنچا دیا گیا جہاں میری ملاقات مخصوص لب ولہجہ رکھنے والے امیر شاہ عرف میرو شاہ سے ہوئی جس نے مجھے حوصلہ دیا کہ اس کی میڈم مجھے چھڑوا لے گی اور ہوا بھی یہی۔ میڈم شکیلہ نے مجھے چھڑوا لیا اور میں اس کے ٹھکانے پر پہنچ گیا میڈم شکیلہ توقع کے برعکس نہایت خوبصورت اور نوجوان لڑکی تھی لیکن اس کا اثر ورسوخ بہت تھا۔ میں نے اسے اپنی تمام روداد سے آگاہ کیا۔ اس نے مجھے بھرپور مدد کی یقین دہانی کرائی۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ شامل ہونے کی پیشکش کی جسے میں نے قبول کرلیا۔ یہاں سے فارغ ہوکر نورپور پہنچا تو ایک سانحہ میرا منتظر تھا۔ چاچی نے روتے ہوئے بتایا کہ پروین غائب ہے۔ ایسے میں دیوانے نے مجھے دلاسا دیا اور امیر نواز پر شک کا اظہار کیا کیونکہ وہ بھی غائب تھا۔ میں میڈم شکیلہ کے پاس پہنچا اور اپنی پریشانی سے آگاہ کیا۔ میڈم نے مجھ سے کہا کہ اس سلسلے میں دل جیت بتا سکتا ہے اور یہ مجھ پر منحصر ہے کہ میں اس سے کس طرح اگلواتا ہوں۔ میرو شاہ نے مجھے ہتھیار فراہم کیے اور میں زمانہ طالب علمی کی ٹریننگ آزمانے کے لیے دل جیت کے ٹھکانے پر پہنچ گیا اور اسے دردناک موت سے ہمکنار کیا۔ دل جیت کے انکشاف کے مطابق پروین حیدر خان کے قبضے میں تھی۔ میری کارکردگی سے میڈم بہت خوش تھی اور مجھ پر غیرمعمولی طور پر مہربان بھی۔ لیکن اس تمام عرصے میں، میں اپنے والدین کے قتل کو نہیں بھولا تھا۔ میڈم کے اڈے پر میں نے ایک کمرے میں اسما کو بے ہوش پڑے دیکھا جو سردار حیدر خان کی بیٹی تھی۔ پھر میڈم نے مجھے تفصیل سے آگاہ کیا اور مختلف محاذوں پر اپنے آدمیوں کو ہدایات دینے لگی کہ اسے اطلاع ملی کہ اڈے پر حملہ ہوگیا ہے۔ میں اس سے ملنے پہنچا تو وہ کمپیوٹر روم میں تھی اور مختلف اسکرینز پر مناظر کو دیکھ رہی تھی کہ ایک منظر میں حملہ آور پر ہماری نظر پڑی۔ میں اسے دیکھ کر شدت سے چونک اٹھا۔ اسکرین پر نظر آنے والا میرا جگری دوست کھالا تھا جو استاد ببلو کے گینگ کے ساتھ میڈم کے ٹھکانے میں داخل ہوا تھا لیکن میڈم نے خاص حکمت عملی کے تحت بازی پلٹ دی اور کھالا اس کی قید میں آگیا۔ میڈم نے حیدر خان کی بیٹی اسما کو اغوا کرالیا تھا اور اس کے عوض پروین کا مطالبہ کیا۔ اسما نے مجھے پہچان لیا اور مجھے غیرت دلانے کی کوشش کی لیکن میں مجبور تھا۔ اسی دوران میرے ایما پر میڈم نے کھالے کی مجھ سے ملاقات کرادی لیکن کھالا اسما کو قید میں دیکھ کر آپے سے باہر ہوگیا۔ ایک زبردست مقابلے کے بعد میں نے اسے دھول چاٹنے پر مجبور کردیا۔ آخرکار طے یہ ہوا کہ ہم براہِ راست حیدر خان کے ڈیرے پر پروین کے حصول کے لیے دھاوا بولیں گے۔ ہماری ٹیم کا سربراہ پیا نامی ایک تجربے کار شخص تھا۔ راستے میں ہمیں زخمی حالت میں وحید ملا۔ وحید کے ذریعے معلومات کے مطابق دلجیت کے آستانے پر ان دونوں بہن بھائیوں کو بے ہوشی کی حالت میں اغوا کرکے ڈیرے پر لایا گیا تھا لیکن قید کے دوران وحید کو تشدد کرکے مردہ جان کر پھینک دیا گیا جبکہ کسی نامعلوم فرد نے ہماری آمد سے قبل ڈیرے پر پہنچ کر وہاں موجود افراد کو ہلاک کرکے پروین، عاشی اور ایک مرد جو غالباً امیر نواز تھا، اپنے ساتھ لے گیا لہٰذا ہم یہاں سے خالی ہاتھ واپس آئے۔ میڈم نے مشورہ دیا کہ مجھے اپنے رشتے داروں کو نورپور سے نکال لانا چاہیے، ہم سے پہلے ہی ہمارے گھر پر نامعلوم افراد ہمارے گھر کو جلانے پہنچ چکے تھے۔ ایک خونی کارروائی کے دوران ہم نے ان پر غلبہ حاصل کیا۔ میں اپنی بہنوں کو لے کر اپنی گاڑی تک پہنچا اور پیا کا انتظار کرنے لگا مگر وہ چاچا اور چاچی کو لانے میں ناکام رہا۔ لیکن موجو کو لے آیا تھا۔ ہم اس جزوی کامیابی کے بعد واپس پہنچے جہاں ملتان کی حدود میں ہمارے لیے رہائش کا بندوبست کیا گیا تھا۔ کھالا بہروپ بدل کر نورپور سے یہ معلومات لے کر آیا کہ میرے گھر میں خون خرابے کی ذمے داری مجھ پر ڈال دی گئی تھی جائیداد کی خاطر، بخت خان پھوپی اور غزالہ کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ یہاں پیا نے میری تربیت کی اور ایک خونی مقابلے میں میڈم نے امتحان لیا۔ اسی دوران چند نامعلوم حملہ آوروں نے فارم ہاؤس پر حملہ کردیا۔ ایک خونریز مقابلے کے بعد ہم انہیں ہلاک کرنے میں کامیاب ہوئے۔ واپسی کے سفر میں ہم جب گاڑی میں بیٹھے تو عقب سے ہم پر ہتھیار تان لیے گئے۔ میڈم نے نہایت ڈرامائی انداز میں ان لوگوں کو قابو کرلیا۔ یہاں سے فارغ ہوکر ہم ٹھکانے پر پہنچے کھالا میرا ساتھ چھوڑ گیا۔ میڈم شکیلہ نے مجھے اسما کو اس کے خریدار حیدر خان کے سرپرست میاں دلبر حسین کے سپرد کرکے رقم وصول کرنے کی ذمے داری دی۔ ایک شخص کو میرے ساتھ کردیا۔ ہم اسما کو لے کر جب دلبر حسین کے کرگے رنگو قسائی کے اڈے پر پہنچے تو اسے دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا وہ میرے ماں باپ کا قاتل تھا لیکن میں نے انتقام کو دوسرے وقت کے لیے چھوڑ دیا اور کئی رکاوٹوں کو عبور کرتے ہوئے رقم لے کر میڈم کے پاس پہنچ گیا۔ میڈم بہت خوش کہ اس نے رنگو قسائی کے سلسلے میں میری مدد کا وعدہ کیا وہاں سے بس میں گھر جارہا تھا کہ اچانک مجھے اغوا کرلیا گیا۔ مجھے اغوا کرنے والا ہمارے ہاتھوں مارے جانے والے موبی کا دوست زورآور تھا۔ بعدازاں معلوم ہوا کہ وہ حیدر خان سے میرا سودا کرچکا تھا، کئی خونریز معرکوں اور آنکھ مچولی کے بعد میں اس کی قید

سے رہا ہونے میں کامیاب ہوگیا اس دوران حیدر خان نے استاد ببلو کے ساتھ مجھے کریدنے کی کوشش بھی کی۔ رہائی کے بعد ڈرامائی طور پر میری ملاقات عاشی کے عاشق شاہد سے ہوگئی اور میں اس کی مدد پر آمادہ ہوگیا۔ جب گھر پہنچا تو شاہ نے مجھے کاغذات کا ایک پلندہ دیا جو میں اپنے گھر سے اٹھا لایا تھا۔ جو درحقیقت چاچا کی جائیداد کی فروخت کے کاغذات تھے۔ خریدنے والے کا نام پڑھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ نام میرے والد کی زمین ہتھیانے والے کے بیٹے کا تھا یعنی کہ میرے گھرانے کی تباہی کی کہانی دہرائی گئی تھی۔ بہرحال میں نے شکریہ ادا کرکے وہ کاغذات سنبھالے اور میرو سے رابطہ کیا۔ میڈم نے ایک میٹنگ رکھی تھی جہاں اس کے تمام قابلِ اعتماد لوگ شریک تھے۔ میرا تعارف کرایا گیا اور چند ذمے داریاں سونپی گئیں۔ میٹنگ کے بعد میڈم کے ساتھ کچھ رنگین وسنگین لمحات گزرے پھر اسے ایک گمنام کال موصول ہوئی جس کے بعد اس نے روانگی کی تیاری شروع کردی میں نے ضد کرکے میڈم کے ساتھ جانے کا فیصلہ کیا۔ ہم ایک مکان میں پہنچے۔ جہاں ایک بوڑھا بندھا ہوا تھا۔ اس کا رویہ میڈم کے ساتھ نفرت انگیز تھا جو میرے لیے باعث حیرت تھا۔ میڈم نے اس سے ایک خاتون اور لڑکی کا پوچھا وہیں ایک خونریز معرکہ ہوا اور پیرو ماچھی غنڈے کا کردار سامنے آیا۔ اس کے بعد ہمارا ٹاکرا پولیس سے ہوگیا۔ اس سے گلوخلاصی کے بعد کچھ فرصت کے لمحات پر آئے تھے کہ میڈم کی چیخ سنائی دی۔ وہاں پیرو ماچھی کا غنڈا امداد بخش میڈم پر ایک ڈنڈے سے وار کررہا تھا۔ اس پر بہ مشکل قابو پاکر میڈم کی طرف متوجہ ہوا۔ میڈم کی حالت کافی خراب تھی۔ راستے میں ایک مقامی ڈسپنسری میں میڈم کو دکھایا وہاں ڈاکٹر عالیہ اور اس کے شوہر صدیق سے ملاقات ہوئی جنہوں نے طبی امداد کے ساتھ ہماری مہمان نوازی بھی کی۔ میڈم کو ہمدرد پاکر عالیہ نے اسے ایک مظلوم لڑکی کینیڈا پلٹ نگینہ کی کہانی سنائی جو اپنے چچا وڈیرا انور روز بھٹی اور رفاقت بھٹی کے ظلم کا شکار تھی پناہ کی درخواست پر تو میڈم نے ساتھ دیا اور نگینہ کو اپنے بنگلے پر لے آئی۔ پھر ہم میڈم کی ماں اور بھائی سیمو کی تلاش پر روانہ ہوئے۔ ہم دریا پار کرنے کے لیے گاڑی کو کشتی پر سوار کرارہے تھے کہ پیرو ماچھی نے ہمیں للکارا جو دریا پار سے واپس آچکا تھا اور ملاح دینا کے کیبن میں سو گیا تھا۔ میڈم نے اپنے روایتی انداز میں اسے زچ کیا اور ایک خونی لڑائی میں ہم اس پر قابو پانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق میڈم کے عزیزوں کو سردار یارن خان نے اغوا کرایا تھا۔ میرے لیے یہ انکشاف ہی تھا کہ یارن خان میڈم کا عاشق تھا کیونکہ میں اسے ایک تارک الدنیا شخص سمجھتا تھا۔ میڈم نے مجھے نورپور جاکر یارن خان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ذمے داری سونپی، میاں جی نے پھیری لگا کر سامان بیچنے والے پٹھان گلاب خان کا گیٹ اپ دیا اور میں اس سوانگ میں نورپور پہنچا۔ کھالا مجھے پہچان گیا۔ وہیں میری ملاقات غزالہ سے ہوئی۔ جو مجھے پہچان نہ سکی۔ ایک رات میں یارن خان کی حویلی میں داخل ہوا۔ وہاں خوفناک بل ٹیریر کتوں سے میرا سامنا ہوا لیکن میں ان پر بہ مشکل تمام قابو پانے میں کامیاب رہا اور اس کوشش میں زخمی ہوگیا وہیں ایک بندے سے میری مڈبھیڑ ہوئی اور مقابلے کے بعد اس نے مجھے زیر کرکے چاقو سے فیصلہ کن ضرب لگانا چاہی تو ایک نسوانی چیخ سنائی دی جسے میں لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میرے دل کی ہوک لبوں پر لفظ بن کر تھرتھرائی۔

”اسما!“

یہ سمجھ نہ آئی کہ آواز کس طرف سے آئی تھی۔ چونکہ پرویز بھی میری طرح کہیں دور سے آتی ہوئی نسوانی چیخوں کی طرف متوجہ تھا، اس لیے میرے بڑبڑانے پر چونکا۔

میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔ اس کا خنجر کسی بھی پل میرے سینے میں پیوست ہونے والا تھا۔ مجھے فی الفور اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کرنا تھا۔ میں نے اپنے دُکھتے ہوئے جسم کی توانائیوں کو مجتمع کیا اور دونوں پیر جوڑ کر ہوا میں بلند کیے۔ ایک ہی وقت میں میرے پاؤں پرویز کے چہرے کی طرف بڑھے، اس کا ہاتھ بجلی کی تیزی سے نیچے آیا۔ ہم دونوں کے منہ سے سسکیاں نکلیں۔ میری ران میں تیز خنجر کی اچٹتی ہوئی نوک چبھی، اس کے منہ یا ناک پر میرے پاؤں بھاری گرز کی طرح لگے۔ اس کا سر دیوار سے ٹکرایا جبکہ میں ران پر سختی سے ایک ہاتھ رکھ کر، دوسرا ہاتھ دیوار پر جما کر کھڑا ہوگیا۔

خانزادی اسما کی آواز سن کر میرے رگ وپے میں بجلی بھر گئی۔ میں نے چشم زدن میں اُٹھنے کی کوشش میں مصروف پرویز کے خنجر والے ہاتھ پر ٹھوکر ماری۔ اس کے ہاتھ سے خنجر نکل گیا۔ میں ہوا میں اُچھلا، گھوما اور ایک زوردار کک اس کی کنپٹی پر ماری۔ وہ پہلو کے بل گرا۔ تب معلوم ہوا کہ میرے جڑے ہوئے پیروں کی زوردار ضرب سے اس کے منہ اور ناک سے خون بہہ نکلا تھا۔ میں ایک بار پھر اُچھلا اور گھٹنوں کے بل اس پر گرا۔ وہ میرے نیچے دب گیا۔ میں نے چند سیکنڈز میں کہنی کی خطرناک ضربوں سے اُسے پچھاڑ دیا۔ وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگانے کے انداز میں بیٹھ کر جھولنے لگا۔

میں نے لپک کر اس کا خنجر اُٹھایا۔ چاہا کہ بل ٹیریر کتوں کی طرح اُس کا نرخرہ بھی کاٹ دوں مگر فوراً خیال آیا کہ مجھے تہ خانے میں داخل ہونے کے لیے اسے ڈھال بنانا تھا اور اس سے خفیہ راستہ کھلوانا تھا۔ اس نے بڑے وثوق سے کہا تھا کہ میں تہ خانے کا راستہ نہیں کھول پاؤں گا۔ اس کا دعویٰ آزمانے کے بجائے مان لینے میں ہی بہتری تھی۔

میں خنجر مضبوطی سے تھامے اس کے عین مقابل گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اُسے گھورنے لگا۔ وہ بے ہوش تو نہیں ہوا تھا مگر پوری طرح اپنے حواس میں بھی نہیں تھا۔ ایسے ہی وقت میری نگاہ دیوار کی جڑ پر پڑی تو چونک گیا۔ بالشت بھر اونچی اور کوئی ڈیڑھ فٹ لمبی جالی دار گرل دکھائی دی۔ میں نے اس پر نظریں جمائیں۔ میری دانست میں

اُس گرل کی یہاں تنصیب کا کوئی جواز نہیں تھا۔ اطراف میں دیکھا۔ اس جیسی کئی جالیاں دکھائی دیں۔ یقیناً یہ حویلی کے تہ خانے کی وینٹی لیٹر تھیں۔ میں نے دل ہی دل میں بلڈنگ انجینئر کی ذہانت کو سراہا کہ اس نے جالیوں کی تنصیب اس انداز سے کی تھی کہ جب تک دیوار کی جڑ میں بیٹھا نہ جاتا، دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ اسما کی مدھم سی آواز انہی جالیوں میں سے گزر کر میرے کانوں تک پہنچی تھی۔ وہ زیرِ زمین تہ خانے میں قید تھی۔ یہ عقدہ حل ہوا تو میرے حلق سے لمبی سانس برآمد ہوئی۔

پرویز کی ہمت جواب دے گئی تھی اور وہ پہلو کے بل گر گیا تھا۔ میں دیوار کے قریب آیا۔ جھک کر ایک جالی سے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ تیرہ انچ چوڑی دیوار کے عین وسط میں فٹ کی گئی جالی کے پار کچھ دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ کان لگائے۔ اسما کی آواز دوبارہ سنائی نہیں دی۔ وہ چیختے چیختے نڈھال، مایوس یا بے ہوش ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے ذہن پر زور دیا۔ کہیں میں نے آواز کو پہچاننے میں غلطی تو نہیں کی تھی؟...... از خود یقین سا ہوا کہ نہیں...... وہ یقینی طور پر خانزادی اسما ہی تھی، حیدر خان کی بیٹی جسے میں دوآبہ کے ویران علاقے میں رنگو قسائی کے حوالے کر آیا تھا۔

سردی، نقاہت اور دکھن مجھ پر سوار ہونے لگی تھیں۔ ایک بار جی میں آیا کہ میں پرویز کا ٹنٹا نکال دوں اور حویلی سے نکل جاؤں۔ پھر خیال آیا کہ آج موقع ہے، کل یارن خان چوکنا ہوگا اور مجھے وار کرنے کا موقع نہیں دے گا۔ حویلی میں داخل ہوتے ہی گولیوں سے اُڑا دے گا۔ اس لیے مجھے جو بھی کرنا تھا، آج ہی کرنا تھا۔ تبھی میں نے زوردار تھپڑ پرویز کے جبڑے پر جڑا۔ پھر دوسرا، تیسرا...... تھوڑی دیر بعد وہ ہوش میں آ گیا اور سر جھٹک کر اپنے اوسان بحال کرنے لگا۔ میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچا اور کھڑا کر دیا۔ وہ اپنے پیروں پر بہ دقت کھڑا ہوا۔ میں اس کے عقب میں آیا۔ پہلے کی طرح زخمی بازو اس کی بغل تلے سے نکال کر چھاتی پر رکھا، دوسرے ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر اس کی شہ رگ پر رکھا اور دبی آواز میں غرایا۔ ”بلا چوں چراں مجھے تہ خانے میں لے چلو۔ یاد رکھنا جہاں بھی خرمستی کرو گے، وہیں ذبح کر کے پھینک دوں گا۔“

وہ اڑیل گھوڑا بہ مشکل قابو میں آیا تھا۔ جان گیا تھا کہ اس کا واسطہ عام چور اُچکے سے نہیں پڑا تھا بلکہ رات کی تاریکی میں حویلی میں قدم رکھنے والا سیر پر سوا سیر تھا۔ تبھی اس نے شکست تسلیم کر لی اور بغیر کچھ کہے ڈگمگاتے قدموں سے چل پڑا۔

ہماری رفتار خاصی سست تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہم مین گیٹ کے قریب پہنچ گئے۔ میری آنکھیں اردگرد بھٹک رہی تھیں۔ کسی چھپے ہوئے دشمن کا امکان ذہن میں تھا مگر حویلی پہلے کی طرح سکوت کی چادر اوڑھ چکی تھی۔ بیرونی گیٹ کے پار سڑک پر کوئی موجود نہیں تھا۔ اعلان سن کر دوڑے چلے آنے والے یارن خان کا حکم سن کر لوٹ گئے تھے۔ حویلی کا بڑا دروازہ بہ دستور کھلا ہوا تھا۔ دادو مہانے کو فرش پر اسی انداز میں لیٹے دیکھا تو میں رُک گیا۔ ناچار پرویز بھی رک گیا۔ میں نے اس کی بے پناہ پھرتی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی بغل سے ہاتھ نکالا، پیر اور ہاتھ کی مدد سے، جھکے بغیر، دادو مہانے کی ڈبل بیرل گن اُٹھائی اور کندھے پر ڈال لی۔ ہاتھ دوبارہ پرویز کی چھاتی پر رکھ لیا اور اردگرد دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تہ خانے میں خان کیا کر رہا ہے؟“

وہ خاموش رہا۔ میں نے اپنا سوال دہرایا تو وہ بولا۔ ”علم نہیں۔“

”وہاں موجود دوسرے لوگ کیا کر رہے ہیں؟“ میرا لہجہ بے حد سفاک ہو گیا۔

”ہم سب خان کے باڈی گارڈز ہیں۔ وہ سوتا ہے، ہم جاگتے ہیں۔“ اس کی آواز قدرے بھرائی ہوئی تھی۔ ”تم کون ہو؟ کیا یارن خان کے دشمن ہو؟“

اس کا سوال احمقانہ تھا۔ اگر میں خان کا دشمن نہیں تھا تو اتنی مارا ماری کیوں کر رہا تھا۔ میں اُسے دھکیلتا ہوا اسٹور روم کی طرف بڑھا۔

وہ بولا۔ ”تم تہ خانے سے زندہ باہر نہیں نکل سکو گے۔ اس لیے وہاں جانے کا خیال دل سے نکال دو اور فوری طور پر یہاں سے جان بچا کر نکل جاؤ۔“

”یہ مشورہ تم پہلے بھی دے چکے ہو۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”تہ خانے میں باڈی گارڈز کے علاوہ کتنے لوگ ہیں؟“

”میں نے ایک لڑکی کو دیکھا ہے۔“ اس کے قدموں کی ڈگمگاہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ اُسے سنبھال کر چلنا میرے لیے بتدریج مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ اسٹور روم میں پہنچنے سے پیشتر ہی بے ہوش ہو کر گر جائے گا۔ اس کی ناک سے خون بہت زیادہ بہہ گیا تھا۔ میری حالت اس سے کسی طرح بھی بہتر نہیں تھی مگر مجھ پر عجیب سا جنون سوار تھا جو مجھے آگے کی طرف دھکیل رہا تھا۔

سوئے ہوئے ملازمین والا کمرا بہ دستور بند تھا۔ وہ چونکہ عام گھریلو نوکر تھے اس لیے انہوں نے ڈر کے مارے رضائیوں سے نکلنے کی کوشش ہی نہیں کی ہوگی۔ وہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے سر پر آنے والے خطرے کو ٹال چکے تھے۔

میں پرویز کو دھکیلتا ہوا اسٹور میں داخل ہوا۔ یہاں پہلے بھی آیا تھا۔ کوئی تبدیلی نہ دیکھ کر مجھے پرویز کا پراعتماد جواب یاد آ گیا۔ وہ رفتہ رفتہ اپنے حواس کھو رہا تھا۔ نقاہت کے مارے گردن اِدھر اُدھر ڈھلک رہی تھی۔ میں نے گردن پر خنجر کا معمولی سا دباؤ بڑھایا، کہا۔ ”تہ خانے کا دروازہ کھولو۔ جلدی کرو۔“

وہ کاٹھ کباڑ سے گزر کر کمرے کے عین وسط میں رُکا۔ میز کے اوپر پڑی ہوئی پرانی میز کے پائے کو تھام کر خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ ”مجھے چکر آ رہے ہیں۔“

میں نے درشتی سے کہا۔ ”اوئے حرامزادے! چکر آ رہے ہیں یا مجھے چکر دینے کی کوشش کر رہے ہو۔ دروازہ کھولو ورنہ تمہاری گردن کاٹ کر پھینک دوں گا۔“

اس پر میری دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ اچانک اس نے اپنا وزن مجھ پر ڈال دیا۔ میں چونکہ ہوشیار تھا، اس لیے اس کے بے جان وجود کو سنبھال گیا۔ اس کی گردن کندھے پر ڈھلک گئی اور نہایت کم بلند آواز میں بڑبڑانے لگا۔ کیا کہہ رہا تھا، یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اپنا بازو نکالا، اُسے گھما کر میز کے سہارے کھڑا کرنے کی کوشش کی مگر وہ ریت کی طرح فرش کی طرف سرک گیا۔ میں نے بروقت اس کی گردن پر سے خنجر ہٹا لیا ورنہ وہ جس طرح لڑھکا تھا، اس کی گردن یقینی طور پر کٹ جاتی۔

اس کی اَدھ کھلی آنکھیں دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ میں نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور بولا۔ ”اِدھر...... وہ بورڈ......“

اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور ہونٹ نیم وا ہو گئے۔ وہ چند لمحوں کے لیے سنبھلا اور پھر بے ہوش ہو گیا تھا۔ میں نے خنجر کی نوک اس کے بازو میں چبھوئی۔ پھر ران میں دو تین چرکے لگائے مگر اس کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی۔ مجبوراً اُسے وہیں چھوڑا اور اُچھل کر عقبی دیوار میں نصب بجلی کے سوئچ بورڈ کی طرف گیا جس پر اس کی اَدھ کھلی آنکھیں مرتکز ہوئی تھیں۔ وہ عام نوعیت کا بجلی کا سوئچ بورڈ تھا۔ میں نے اس پر لگے ہوئے پانچوں بٹنوں کو یکے بعد دیگرے دبا کر دیکھا۔ کچھ نہ ہوا۔ پھر لکڑی اور فارمیکا کے بنے ہوئے بورڈ کو پکڑ کر ہلایا جلایا مگر مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔

میں نے غیر معمولی تیز رفتاری سے اسٹور کی تمام دیواروں کو ٹھونک بجا کر دیکھا۔ کہیں کوئی درز، دراڑ یا چور سوئچ دکھائی نہیں دیا۔ وہ کم بخت مجھے بے ہوش ہوتے ہوئے بھی ڈاج دے گیا تھا۔ مجھے سخت غصہ آیا اور جی چاہا کہ اس کے سینے میں خنجر کا پورا پھل اُتار دوں مگر خود پر قابو پاتے ہوئے اسے جگانے کے بارے میں سوچنے لگا۔ باہر سے کسی کے آنے کا راستہ روکنے کے لیے میں نے اسٹور کے اکلوتے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی اور فرش پر آڑے ترچھے پڑے ہوئے پرویز کے پاس پیروں کے بل بیٹھ گیا۔ جونہی پنڈلی کے اعصاب کھنچے، درد کی تیز لہر پورے بدن میں پھر گئی۔ منہ سے ہلکی سی ’آہ‘ نکل گئی۔

اس بارہ بائی چودہ کے مختصر کمرے کی چاروں دیواریں سپاٹ تھیں جنہیں میں نے تھپتھپا کر دیکھا تھا۔ کوئی دیوار کھوکھلی نہیں تھی۔ سبھی اینٹوں کی بنی ہوئی پلستر شدہ دیواریں تھیں۔ فرش پر بکھرے ہوئے بے ترتیب سامان کے عین درمیان میں راستہ سا بنا ہوا تھا جس میں پرویز پڑا تھا۔ یہ راستہ سیدھا بورڈ تک جاتا تھا۔ میں نے ذہن دوڑایا۔ سوچا، بورڈ تک سامان کے بیچوں بیچ گزرگاہ بنانا بے مقصد نہیں تھا۔ پرویز نے درست کہا تھا۔ بورڈ ہی کلید تھی جس کا میکنزم میری فہم سے بالاتر ثابت ہوا تھا۔ میں اُٹھ کر دوبارہ سوئچ بورڈ سے زور آزمائی کرنے لگا۔ جونہی میں نے دونوں ہاتھوں سے بورڈ کو پکڑ کر نیچے کی طرف کھینچا، وہ ’ٹک‘ کی آواز کے ساتھ دیوار پر آدھا انچ نیچے کھسک آیا۔ میں نے تینوں اطراف گردن گھمائی مگر کوئی تغیر دیکھنے میں نہیں آیا۔ میں نے کئی مرتبہ بورڈ کو اوپر نیچے کیا مگر کام نہ بنا۔

میڈم کی حویلی میں ’سی ٹو‘ میں داخلے کا طلسماتی نظام آنکھوں میں لہرا گیا۔ وہ اس سے کہیں مشکل تھا مگر کھولنے والی میرے آگے آگے چل رہی تھی اور جادوئی دروازوں کو کھولتی جاتی تھی۔ یہاں ’کھل جا سم سم‘ کا منتر پھونکنے والا گہری بے ہوشی میں مبتلا تھا۔ ناکام ہونے کے بعد اُسے ہوش میں لانا ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی ہر ممکنہ کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

ایسے ہی وقت میں جب میں جھنجلا کر پرویز کے پیٹ میں گہرا چرکا لگانے چلا تھا، میری نظر فرش کے ایک حصے پر جا پڑی۔ حویلی کے دوسرے کمروں کی طرح یہ فرش بھی رگڑے ہوئے پتھروں سے بنا ہوا تھا اور اس میں ایک

خاص ترتیب سے شیشے کی سلاخیں ڈالی گئی تھیں۔ بورڈ کے نیچے فرش پر سلاخ کے بجائے درز تھی جس پر میری نگاہ اتفاق سے جا اٹکی تھی۔ درز کا بہ غور جائزہ لینے پر عقدہ کھلا کہ تہ خانے کا دروازہ کسی دیوار میں نہیں تھا بلکہ فرش میں تھا۔ کمرے میں پڑے ہوئے کاٹھ کباڑ کی بے ترتیبی میں بھی مہین سی ترتیب موجود تھی جس کا احساس ہوتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ فرش کا دایاں حصہ بائیں جانب کھسکتا تھا۔

میں نے ایک دوجے میں پھنسا کر رکھی ہوئی کرسیوں کو بائیں جانب کھینچا۔ کرسیاں نہیں کھسکیں، فرش معمولی آواز پیدا کیے بغیر بائیں جانب کھسک گیا۔ یہ دیکھ کر میری آنکھیں چمک اُٹھیں کہ دائیں دیوار کے ساتھ دو مربع فٹ چوڑا خلا نمودار ہو گیا تھا جس میں سے لوہے کے پائپ کی بنی ہوئی سیڑھی نیچے جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ 'سی ٹو' کے برعکس یہ الیکٹرانک میکنزم نہیں تھا بلکہ سوئچ بورڈ محض سادہ سے سوئچ لیور کی طرح کام کرتا تھا اور گیٹ کو مقفل اور غیر مقفل کرتا تھا۔

اگر مجھے پرویز نے سوئچ بورڈ کا کلیو نہ دیا ہوتا تو یقینی طور پر میں تہ خانے کا دہانہ کھولنے میں کامیاب نہ ہو سکتا۔ خلا میں جھانک کر دیکھا۔ لوہے کے پتلے پائپ کی سیڑھی کے نچلے پائے عمودی حالت میں ایک ہشت پہلوی کمرے کے فرش میں نصب تھے۔ اس ہشت پہلوی کمرے میں بھی کاٹھ کباڑ اور ٹوٹا پھوٹا فرنیچر رکھا گیا تھا۔ میں نے محتاط انداز میں جھک کر دیکھا۔ نہ تو کوئی دروازہ دکھائی دیا اور نہ ہی کوئی شخص...... میں نے مزید وقت سوچنے سمجھنے میں ضائع نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور پلک جھپکتے میں خلا میں اُتر گیا۔ چند لمحوں بعد میں عجیب شکل کے تہ خانے کے وسط میں ٹوٹی ہوئی کرسیوں اور میزوں میں گھرا کھڑا تھا۔

ایڑیوں کے بل گھوم کر چاروں طرف دیکھا۔ دیوار کے ساتھ دو کرسیاں رکھی تھیں جن پر آف وائٹ کلر کی اونی چادریں پڑی تھیں۔ ان کی حالت سے پتا چلتا تھا کہ ان میں لپٹ کر بیٹھے ہوئے ابھی ابھی میں یہاں سے اُٹھے ہوں۔ ایک کرسی کے پہلو میں سیاہ رنگ کی چھوٹی کے کے رائفل کھڑی کی گئی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ پرویز اور بالکونی میں میرا نشانہ بننے والا شخص یہاں سے اُٹھ کر میری خیر خبر لینے اوپر گئے تھے۔ میں بام منزل تک پہنچ گیا تھا۔ منزل دو چار ہاتھ آ گے تھی۔ میں نے دادو مہانے کی ڈبل بیرل گن ایک گرد آلود میز پر رکھی اور کے کے گن اُٹھالی۔ اپنے کم وزن اور مختصر جسامت کے باعث مجھے یہ رشین ساختہ گن بہت پسند آئی۔ اس کی میگزین چیک کی تو دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ وہ گولیوں سے فل تھی۔

میں نے خنجر احتیاط سے لباس میں چھپالیا اور گن تانے ایک ایک دیوار کو ٹٹولنے لگا۔ کمرے کی آٹھوں دیواریں سپاٹ تھیں۔ کوئی الماری یا کھڑکی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی فریم آویزاں تھا۔ اسٹور میں سوئچ بورڈ تھا، یہاں وہ بھی دکھائی نہیں دیا۔ دیواروں کے ہر اتصال پر فرش سے لے کر چھت تک جھری موجود تھی جو ظاہر کرتی تھی کہ ان میں سے کوئی ایک دیوار اپنی جگہ سے ہٹ کر دروازہ بناتی تھی۔ میں اس دیوار کو تلاش کر ہی رہا تھا کہ اچانک 'سرڑ' کی تیز آواز کمرے میں میرے دائیں ہاتھ ابھری۔ گردن گھما کر دیکھا تو آنکھوں میں حیرانی بھر گئی۔ پوری کی پوری دیوار ٹرین کی بوگی کی طرح فرش پر پھسل رہی تھی اور نہایت 'سلو موشن' میں میرے سامنے دروازہ بنا رہی تھی۔ میرے اعصاب میں برق بھر گئی۔ جس طرف دیوار کھسک رہی تھی، میں نے اس طرف چھلانگ لگائی اور کباڑ کے پیچھے چھپ گیا۔ اتفاق سے ٹی وی ٹرالی اور پہلو کے بل کھڑی کی گئی بھاری بھرکم میز کے بیچ سے کھلتے ہوئے دروازے کا منظر دکھائی دیتا تھا جس پر میری نگاہیں ثبت تھیں۔

ایک ایک لمحہ میرے اعصاب پر گراں گزر رہا تھا۔ دو فٹ کا خلا بننے میں کم و بیش پانچ منٹ لگے مگر یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ پیدا ہونے والے خلا میں کسی آدمی کے بجائے اسی رنگ کی دیوار دکھائی دی۔ میں نے کچھ دیر اور انتظار کیا مگر کوئی شخص برآمد نہیں ہوا۔ دس منٹ کے بعد مزید تابِ انتظار نہ رہی تو میں دبے پاؤں چلتا ہوا پہلو کی طرف سے خلا کے سامنے پہنچ گیا۔ جھانک کر دیکھا۔ وہ چار ضرب چھ کا باکس نما کمرا تھا جس کی سبھی دیواریں سپاٹ تھیں۔ عیاں ہوتا تھا کہ جس طرح یہ دروازہ کھلا تھا، اسی طرح باکس کی کسی اور دیوار میں بھی سرکنے کا خودکار نظام نصب کیا گیا تھا۔

میں نے بے اختیار باکس میں داخل ہونا چاہا مگر عین وقت پر ایک خیال برق کوندے کی طرح ذہن میں لپکا اور میرے قدم تھم گئے۔ میں تیزی سے پلٹا اور میز کے پیچھے دبک گیا۔ باکس کی دیوار ہٹانے والا سامنے نہیں تھا۔ کھولنے والے نے کہیں دور بیٹھ کر اسے آپریٹ کیا تھا۔ اگر میں باکس میں داخل ہو جاتا تو بعید نہ تھا کہ وہ سلو موشن کے بجائے چشم زدن میں اس دروازہ نما خلا کو پُر کر دیتا۔ میں آگے کا رہتا نہ پیچھے کا اور چوہے کی طرح کڑکی میں پھنس جاتا۔

میری متذبذب نظریں باکس پر جمی ہوئی تھیں۔ اچانک ایک خیال آیا اور میں نے شکستہ پائیوں والی ایک تپائی اُٹھائی۔ میز کے اوپر سے جھک کر فرش پر رکھی اور دھکیل کر باکس کے اندر پہنچا دی۔ چوبی تپائی باکس کے وسط تک پھسل کر تھم گئی۔ دو تین سیکنڈوں کے بعد میرے اندیشے کی توثیق ہو گئی کیونکہ 'کتاک' کی آواز ابھری اور خلا آن واحد میں پُر ہو گیا۔

مجھے جھرجھری آئی۔ قسمت نے یاوری کرتے ہوئے مجھے اس قبر نما باکس میں پھنسنے سے بچا لیا تھا۔ چند لمحے گزرے تھے جب اسی انداز میں دوسری دیوار سرکنے لگی۔ مجھے آنے والے کی نظروں سے چھپنے کے لیے جگہ بدلنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ جونہی دروازہ بنا، عام قامت کا گن بردار دکھائی دیا۔ وہ کئی سیکنڈ تک خلا کے پار کھڑا چوکس انداز میں ہشت پہلوی کمرے میں نگاہ دوڑاتا رہا۔ اس کا رنگ گہرا سانولا، سر جھالردار گنجا اور چہرہ زخموں کے نشانات سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے سرخ رنگ کی شرٹ اور سیاہ پینٹ پہن رکھی تھی جو اس پر ذرہ بھر جچ نہیں رہی تھی۔ اپنے ڈیل ڈول سے چھٹا ہوا بدمعاش معلوم ہوتا تھا۔

میں نے اسے دیکھتے ہی خطرناک شخص قرار دیا اور میرے اعصاب تن گئے۔ وہ کمرے میں داخل ہوا۔ چند ساعتیں سر اُٹھا کر چھت کے خلا کو گھورتا رہا پھر سیدھا اُس دیوار کی طرف بڑھا جس کے پار کال کوٹھری واقع تھی۔ اس کی پشت میری جانب تھی۔ میں نے اُسے مارنے کا فیصلہ کیا، اس کی کھوپڑی کا نشانہ لیا اور ٹرائیگر دبا دیا۔ بند کمرے میں فائر کی کان پھاڑ دینے والی آواز کان میں لمبی بازگشت اور خوفناک گونج چھوڑ گئی۔ گنجا شخص حلق سے کوئی آواز نکالے بغیر دیوار سے ٹکرایا۔ اس نے دیوار پر ہاتھ جمانے کی کوشش کی مگر نامراد لہرایا اور زمین پر گر کر جھٹکے لینے لگا۔ میرے ذہن میں چسپاں اعداد و شمار کے چارٹ کے مطابق اب یارن خان اور خانزادی اسما کے علاوہ تہ خانے میں دو آدمی بچے تھے جن پر قابو پانا ناگزیر تھا۔

میرے اندازے کے مطابق کے کے گن کی گولی کی کان پھاڑ آواز تہ خانے کے گوشے گوشے تک پہنچی تھی۔ دوڑتے قدموں کی آوازیں سنتے ہی میں ایک مرتبہ پھر مورچہ بند ہو گیا۔

خلا کے پار قدموں کی چاپ تھم گئی اور ایک باریک مگر تیز آواز میرے کانوں پڑی۔ "اوئے پرویز! فیقے!...... اوئے تم چپ کیوں ہو؟ یہ فائر کی آواز کیسی تھی؟"

پوچھنے والا سامنے آئے بغیر تفتیش کرنے لگا تھا۔ جواب نہ پا کر اس نے محتاط انداز میں جھانکا۔ اسے نہ میں اور نہ فرش پر آخری جھٹکے لیتا فیقا ہی دکھائی دیا۔ مجبوراً اسے سامنے آنا پڑا۔ وہ ڈھیلے ڈھالے لباس میں تھا اور میری خوش بختی کہ اس کے ہاتھ میں گن یا پستول نہیں تھا۔ جونہی اس کی نظریں فرش پر خون میں لت پت فیقے پر پڑیں، وہ بری طرح چونک گیا۔ بے اختیار پیروں کے بل بیٹھا اور بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔ "اوئے فیقے! اوئے...... تمہیں کس نے گولی ماری ہے؟ بتاؤ مجھے......"

فیقا جواب دینے کی طاقت کھو چکا تھا۔ پوچھنے والے کو جواب میں تکلیف رساں خرخراہٹ سنائی دی تو وہ بری طرح گھبرا گیا۔ اُٹھ کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اردگرد دیکھتا ہوا حلق کے بل چیخا۔ "اوئے پرویز! کہاں مر گیا ہے تُو؟"

پرویز کی طرف سے جواب نہ پا کر وہ پھر چلایا۔ "علی شیر! تم سب لوگ کدھر گئے ہو؟ ادھر آؤ، فیقے کو کسی نے گولی ماردی ہے۔"

"کیوں چیخ رہے ہو؟ کیا ہوا؟" اس کے عقب میں ایک بھاری آواز گونجی۔ چند لمحوں بعد ایک ناٹے قد اور بڑی توند والے شخص نے کمرے میں قدم رکھا۔ اس کی نظر فیقے پر پڑی تو وہ تیزی سے جھکا۔ میرے لیے یہ سنہرا موقع تھا۔ میں نے اُٹھنے، ناٹے قد والے شخص کے سر کا نشانہ لینے اور فائر کرنے میں محض دو سیکنڈ کا وقت صرف کیا ہوگا۔ میرا نشانہ کارگر رہا، آٹھ دیواروں والا کمرا فائر کی خوفناک آواز اور میرے شکار کی دلدوز چیخ سے تھرا اُٹھا۔ فیقے کے برابر میں لہو کا بازار گرم ہو گیا۔ میں نے زنانہ آواز والے شخص کو جو دہشت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا، ہاتھ سر پر رکھنے کا حکم دیا۔ وہ میرے ہاتھوں مرنے والوں کی تڑپتی ہوئی لاشیں دیکھ چکا تھا، سمجھ چکا تھا کہ وہ موت کے دہانے پر کھڑا تھا، تبھی بلا چوں چرا اں ہاتھ سر پر رکھ کر بولا۔ "کک...... کیا تت...... تم نے پرویز کو بھی قتل کر دیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "وہ مرا نہیں، اسٹور میں بے ہوش پڑا ہے۔ اگر تم میرے ساتھ تعاون کرو گے تو تم بھی زندہ رہو گے ورنہ ان کتوں کی طرح حرام موت مارے جاؤ گے۔"

میں نے فرش کو لہو سے تر کرتے ہوئے سورماؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سخت لہجے میں اُسے دھمکایا تا کہ وہ کسی بھی قسم کی چالاکی کا خیال دل سے نکال دے۔ چونکہ میرے لہجے میں موت کی سی سنگینی پنہاں تھی اس لیے وہ مارے خوف کے ہکلانے لگا، بولا۔ "تم کون ہو؟ مم...... میں کیا تعاون کر سکتا ہوں؟"

میں میز پر سے ہوتا ہوا اس کے عین سامنے پہنچ گیا۔ سینے پر گن کی نال لگا کر غرایا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''بب...... برکت...... برکت مسیح۔''

ایسے میں بے اختیار میری نظر اُس کے کھلے گریبان پر پڑی۔ سنہرے رنگ کی چین میں ننھی سی صلیب جھول رہی تھی۔ ''تہ خانے میں تمہارے علاوہ کتنے آدمی ہیں؟''

گن کو دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیلنے کو آگئیں۔ تھوک نگل کر بولا۔ ''کک...... وہ...... وہ علی شش...... شیر...... پپ...... پتا نہیں وہ کدھر گیا۔''

میں نے گن کو جھٹکا دیا۔ وہ ڈگمگا کر ایک قدم پیچھے ہٹا، بولا۔ ''شش...... شاید خان جی کے علاوہ کوئی بھی نہیں ہے یہاں......''

اس نے مجھے مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ میں نے پھر تیزی سے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ اگر بالکونی میں گرنے والے کا نام علی شیر تھا تو میدان صاف تھا۔ اگر وہ کوئی اور تھا تو یقینی طور پر علی شیر کہیں چھپا ہوا تھا اور مجھ پر کامیاب حملہ کرنے کے لیے موقعے کی تاک میں تھا۔ ایسے میں مجھے بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔

''خان کہاں ہے؟'' میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''وہ...... وہ اپنے کک...... کمرے میں ہیں۔'' اس کی آواز لرزنے لگی۔

میں مستعدی سے گھوم کر اُس کے عقب میں آگیا۔ کمر سے گن کی نال لگا کر بولا۔ ''چلو اندر......''

اس نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چوکس انداز میں قدم اُٹھاتا ہوا ہشت پہلوی کمرے سے نکل کر متصل چار فٹ چوڑی اور آٹھ دس فٹ لمبی گیلری میں قدم رنجہ ہوا۔ تنگ شکل کی اس گیلری میں ایک دروازہ کھلتا تھا جس کے سامنے رُکے بغیر ہم گیلری کے اختتام پر پہنچ گئے۔ میں نے اُسے روکا اور پوچھا۔ ''خان کا کمرا کون سا ہے؟''

اس نے دائیں ہاتھ اشارہ کیا۔ میں اُسے دھکیلتا ہوا یارن خان کے کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ میرے کہنے پر اُس نے دروازہ دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ وہ آہستگی سے بولا۔ ''مم...... مجھے یہیں رہنے دو۔''

میرے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ سلگ اُٹھی۔ میں سمجھ گیا کہ کتا اپنے مالک کا سامنا کرنے سے گھبرا رہا تھا۔ مگر میں اُسے چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا اس لیے لگاتار دھکیلتا ہوا کمرے میں گھس گیا۔ میری توقع کے برعکس کمرا خالی تھا۔

میں نے دانت کچکچائے۔ ''اوئے کسی حرامی کی اولاد! یہاں تو کوئی نہیں۔ جلدی بکو تمہارا باپ یارن خان کہاں ہے ورنہ تمہارا جسم چھلنی کر دوں گا۔''

اس کی گھگی بندھ گئی۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''پپ...... پتا نہیں۔ میں نے شام کو خان جی کو ادھر آتے دیکھا تھا۔ اب پتا نہیں وہ کہاں چلے گئے۔''

دل کو لگا کہ اُس نے سچ کہا تھا۔ میں نے اُسے دیوار کے ساتھ کھڑا کیا اور اس کا رُخ پھیر دیا پھر اُسے نشانے پر رکھتے ہوئے اِس بے حد آراستہ کمرے کا جائزہ لیا۔ بیڈ کے نیچے، نفیس ملبوسات سے لبالب بھری وارڈ روب اور باتھ روم میں، الغرض ہر ممکنہ جگہ پر یارن خان کو دیکھا مگر وہ دکھائی نہیں دیا۔ یہاں مزید رُکنا فضول تھا اس لیے میں اُسے دھکیلتا ہوا گیلری کے دوسرے سرے پر واقع کمرے کی طرف بڑھا۔ اس کا دروازہ مقفل تھا۔ میں نے کہا۔ ''اسے کھولو...... جلدی کرو۔''

وہ بولا۔ ''میرے پاس اس کی چابی نہیں ہے۔''

میں غرایا۔ ''یہاں دو کمرے ہیں۔ ایک میں یارن خان سوتا ہے۔ دوسرا مقفل ہے جس کی چابی تمہارے پاس نہیں ہے۔ بتاؤ، تم لوگ کہاں سوتے ہو؟''

''میرا کمرا اُس طرف ہے۔'' اس نے جلدی سے ہشت پہلوی کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ''پرویز اوپر سوتا ہے۔ رفیق میرے ساتھ ہوتا ہے جبکہ باقی لوگ دوسری گیلری میں ہوتے ہیں۔''

''چلو! مجھے اپنی کمین گاہ دکھاؤ۔'' میں نے گن کی نال اس کی ریڑھ کی ہڈی میں چبھوئی۔ وہ چپ چاپ مڑ گیا۔ گیلری میں داخل ہوتے ہی مجھے ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آگیا جسے میں نے گزرتے ہوئے بلاوجہ نظر انداز کیا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ فرنیچر سے بے نیاز چھوٹے سے کمرے میں قالین پر ایک بڑا گدا اور دو لحاف پڑے تھے۔ ایک دیوار پر چھوٹا سا کنٹرول پینل نصب تھا جس پر تین لیور، دو بلب اور ایک بڑی سی ناب لگی ہوئی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''یہ کنٹرول پینل ہے۔'' اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ''بیسمنٹ کے دروازوں کو یہاں سے کھولا اور بند کیا جاتا ہے۔''

''اچھا...... اسٹور والا دروازہ بند کر دو۔'' میں نے پینل پر نظریں جمائیں اور کہا۔ اس نے ایک لیور دبایا۔ 'کٹاک' کی آواز سنائی دی۔ دروازہ بند ہو گیا تھا۔ میں نے

پوچھا۔ ''باکس کا گیٹ تم نے کھولا تھا؟''

وہ سہمے انداز میں بولا۔ ''ہاں! میری ڈیوٹی یہاں پر ہوتی ہے۔ کیا اس میں تمہارا کوئی ساتھی پھنسا ہوا ہے؟''

''نہیں......'' میں نے مختصراً جواب دیا۔

''تو پھر یہ ریڈ بلب کیوں جل رہا ہے؟'' وہ پریشان ہو کر بڑبڑایا۔

''کیا مطلب؟'' میں مستفسر ہوا۔

''کوئی اس کمرے میں داخل ہو جائے، تب ریڈ بلب جلتا ہے۔ اس کے روشن ہوتے ہی میں نے چھوٹے کمرے کا دروازہ بند کیا تھا۔'' اس کا خوف اور حیرت سے بُرا حال تھا۔ ''اگر تمہارا کوئی ساتھی ادھر نہیں گیا تو پھر وہاں کون قید ہے؟ علی شیر وہاں ہے؟''

میں نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ میری چھٹی حس نے مجھے اس چوہے دان میں داخل ہونے سے روک دیا تھا اور میں نے اپنی جگہ پر ٹوٹی ہوئی تپائی ادھر دھکیل دی تھی۔

میں نے اسے کمرے سے نکالا اور بند دروازے کی طرف لے گیا۔ مجھے توقع تھی کہ اس میں یارن خان چھپا ہوا تھا۔ دروازے کے قریب اُسے روک کر میں نے قفل کا جائزہ لیا۔ عام نوعیت کا گھومنے والا تالا تھا جسے میں نے گولی مار کر توڑ دیا۔ لاک ہینڈل ٹوٹ گیا اور دروازہ کھل گیا۔ سرسری نظر دیکھنے سے یہ کمرا یارن خان کے آراستہ بیڈ روم کا مکمل عکس معلوم ہوا۔

جونہی میں نے اندر قدم رکھا، مجھے کمرے کے وسط میں عقبی دیوار کے ساتھ پڑے ہوئے جہازی سائز کے بیڈ پر مخملیں کمبل میں سر منہ لپیٹ کر پڑا ہوا وجود دکھائی دیا۔ وہ خوف سے دبکا تھا یا موقعے کی تاک میں تھا کیونکہ فائر کی خوفناک آواز سننے کے بعد بھی اس کی آنکھ نہ کھل پائی تھی، یہ ماننے کی بات نہیں تھی۔ کمرے کے پہلو میں باتھ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے برکت مسیح کو دیوار کے ساتھ کھڑا کیا اور پہلو کے بل چلتا ہوا تیزی سے باتھ روم تک گیا۔ جھانک کر دیکھا، خالی تھا۔ میں نے بہ یک وقت برکت مسیح اور کمبل میں لپٹے ہوئے شخص کو نشانے پر رکھتے ہوئے بیڈ کے نیچے جھانکا، پردوں کو ہلایا جلایا مگر کچھ نہ ملا۔ مجھ سے غلطی ہو گئی تھی جس کا احساس مجھے بعد میں ہوا تھا۔ کمبل میں لپٹا ہوا شخص اگر مسلح ہوتا تو وہ کمبل کے اندر رہ کر مجھ پر آسانی سے فائر کر سکتا تھا۔

میں نے برکت مسیح کو مخاطب کیا۔ ''یہ کمبل کھینچ لو۔ ہری اَپ!''

برکت مسیح اپنی مسکین سی شکل کی بدولت بے ضرر لگتا تھا۔ اسے دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ اس نے کبھی مار دھاڑ والے کاموں میں حصہ نہیں لیا تھا کیونکہ گن کو خود پر اُٹھا دیکھ کر اس کی آنکھیں دہشت سے بھری ہوئی تھیں۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے کمبل کا کونا تھاما اور اپنی جانب کھینچ لیا۔ طلوع ہونے والا منظر ہوش ربا تھا۔ میری آنکھیں پہلے خیرہ ہوئیں، پھر ایک دم شرم سے جھک گئیں۔ مگر میں دانستہ بیڈ کی طرف براہِ راست دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ بیڈ پر کوئی جواں سال عورت برہنہ بدن گٹھری بنی پڑی تھی۔ اس کا آدھا بدن سیاہ بالوں میں چھپا ہوا تھا۔ چونکہ اس نے اپنا سر سینے میں اور دونوں ہاتھ ٹانگوں کے بیچ ڈال رکھے تھے اس لیے چہرہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ نہ صرف زندہ تھی بلکہ پورے ہوش و حواس میں تھی مگر شرم سے دہری ہو گئی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''اے لڑکی! تم کون ہو؟''

وہ کچھ نہ بولی۔ بری طرح کانپتی رہی۔ میں نے کن انکھیوں سے اُسے دیکھا۔ وہم دور ہو گیا۔ اس کے پاس کوئی گن نہیں تھی۔ کہا۔ ''برکت مسیح! اس پر کمبل ڈال دو۔''

برکت نے فوراً تعمیل کی۔ چند ہی لمحوں میں میری آنکھیں سلگنے لگی تھیں۔ یہ احساس بڑا اشتعال انگیز تھا کہ سردار یارن خان نے حویلی کے نیچے اتنا بڑا تہ خانہ محض اپنی سفلی ہوس کی آبیاری کے لیے بنا رکھا تھا۔ اپنی تنہائی کو مکمل اور محفوظ بنانے کے لیے کئی خوں خوار پہرے دار بھی تعینات کر رکھے تھے جو اپنی کاہلی کے باعث مجھے اس کے عیش کدے تک پہنچنے سے نہ روک سکے تھے۔

یارن خان گدھے کے سینگوں کی طرح غائب ہو گیا تھا۔ میں گھبرا سا گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ یہیں کہیں چھپا ہوا تھا جسے فوری طور پر کھوج نکالنا بے حد ضروری تھا ورنہ وہ میرے خون کی بو سونگھتا ہوا کسی بھی لمحے قیامت بن کر مجھ پر ٹوٹ پڑے گا۔

میں نے برکت مسیح کو ڈرانے کے لیے اپنے لہجے کو مزید خونخوار اور درشت بناتے ہوئے کہا۔ ''جلدی بولو! خان کہاں ہے ورنہ تمہاری چھٹی کروا کر اپنے طریقے سے اسے تلاش کروں گا۔''

وہ فرش پر بیٹھ گیا۔ سر کو دائیں بائیں نفی میں ہلاتے ہوئے دیوانہ وار گلے میں جھولتی ہوئی صلیب کو تھام کر ملتجیانہ لہجے میں بولا۔ ''قسم یسوع کی...... مجھے علم نہیں ہے۔ وہ اپنے کمرے میں ہی تھے جب باہر شور شرابا ہوا۔ میں نے

انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔"

"ابے کتے کے پلے! پھر اُسے آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی...... تم آپریشن پیٹل پر بیٹھتے ہو۔ تمہیں اس راستے یا خفیہ ڈربے کا علم ہے جس میں وہ چھپا بیٹھا ہے۔ میرے ساتھ ڈرامے بازی نہ کرو، سیدھی طرح بول پڑو ورنہ......"

"دشش...... شاید ایسا راستہ ہو۔ کوئی خفیہ جگہ بھی ہو مم...... مگر میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے اس کا علم نہیں ہے۔" اس کی آواز کپکپانے لگی اور آنکھیں تصدیق کرنے لگیں کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ "مم...... میرا خیال ہے کہ خان جی یہاں سے نکل گئے ہیں۔ ان کے کمرے میں کسی سرنگ کا دہانہ ہوگا۔ قسم یسوع کی......"

اس کی بات میرے دل کو لگی۔ اس تہ خانے کو دیکھ لینے کے بعد یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ اس نے آخری بچاؤ کے لیے یہاں ایسی بھی کوئی سرنگ بنوا رکھی ہو جس کا ماسوائے اس کے، کسی کو پتا نہ ہو۔ یہ خیال بڑا تکلیف دہ تھا کہ وہ میری آنکھوں میں دھول جھونک کر تہ خانے سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ میری چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا۔ وہ نکلنے کے بعد مجھ پر قابو پانے اور اپنے قیمتی کارندوں کا بدلہ لینے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہوگا۔ اسے جتنی مہلت میسر آئے گی، اس کا وار اتنا زیادہ کاری ہوگا۔ میں نے خفیہ راستے کی تلاش میں کمرے کی دیواروں پر نگاہ ڈالی۔ بیڈ کے اوپر چھت اور عقبی دیوار کے سنگم پر ڈیڑھ مکسر فٹ کی بیم نظر آئی۔ اس پر جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ مجھے یاد آ گیا کہ میں نے پرویز سے زور آزمائی کے دوران اسما کی چیخ کی آواز سنی تھی۔ پھر دیوار کی جڑ میں عجیب ساخت کی جالیاں دیکھی تھیں۔ یہ اسی نوعیت کی آہنی جالیاں تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق میں اسی کمرے میں پہنچ گیا تھا جہاں سے اسما کی آواز گونجی تھی۔

میں نے کمبل میں لپٹی ہوئی عورت کو گن کی نال سے چھو کر متوجہ کیا اور پوچھا۔ "اے لڑکی! کیا تم حیدر خان کی بیٹی اسما ہو؟"

کمبل میں حرکت پیدا ہوئی۔ پھر اس کی کمزور سی آواز سنائی دی۔ "نہیں...... میں اسما نہیں ہوں۔ میرا کسی حیدر خان سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔"

میں نے اس کی آواز پہچان لی۔ وہ شرم کے مارے چہرے کے ساتھ ساتھ اپنے نام ونسب کو بھی چھپا رہی تھی۔

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور برکت مسیح کے سر پر پہنچ گیا۔ اس کی کنپٹی پر گن کی نال رکھی اور فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "دیکھو برکت مسیح! مجھے تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے اور تمہیں مار کر مجھے کوئی فائدہ بھی نہیں ہوگا۔ اس لیے زندگی کا چانس دیتا ہوں۔ تم اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو جو کچھ جانتے ہو، سچ سچ بتا دو ورنہ تمہاری کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔"

"مم...... مجھے مت مارو۔ تم جو پوچھو گے، بتا دوں گا۔" اس کی حالت غیر ہو گئی۔ "میں نے پہلے بھی کوئی جھوٹ نہیں بولا۔"

"یہاں پر یارن خان کا قریبی آدمی کون ہے؟" میں نے پوچھا۔ "میرا مطلب ہے کہ کون زیادہ وقت خان کے ساتھ گزارتا ہے۔"

"مم...... میں!" اس نے تھوک نگلا اور چھاتی پر ہاتھ رکھ کر رحم طلب نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"پھر تمہیں علم ہوگا کہ یارن خان نے بیٹ خیرپور سے ایک عورت اور بچے کو پیرو ماچھی کے ذریعے اُٹھوایا تھا۔" میں غرایا۔ "بتاؤ! خان نے انہیں کہاں رکھا ہوا ہے؟"

اس کی آنکھوں سے ایسا تاثر مترشح ہوا جیسے وہ سمجھ گیا ہو کہ اس ساری مارا ماری کا محرک کیا ہے، بولا۔ "اوہ...... اچھا! یہ تو میں جانتا ہوں۔ ان دونوں کو پرویز اور فیقا پتن سے وصول کر کے لائے تھے۔ خان کے حکم پر پرویز نے انہیں سائیں نورن آغا کے پاس پہنچا دیا تھا۔"

میری حیرت کا ٹھکانا نہ رہا۔ "نورن آغا؟ کیا تم سائیں جگ جیت کے دربار کے گدی نشین کی بات کر رہے ہو؟"

اس نے تھوک نگلا۔ "ہاں! مجھے یقین ہے کہ وہ ابھی تک سائیں آغا کے پاس ہی ہیں۔ کہاں؟ میں نہیں جانتا۔"

"خان نے انہیں کیوں اغوا کرایا ہے؟"

"اس بڈھوی کی بیٹی ملتان میں رہتی ہے۔ خان جی کا اس سے کوئی معاملہ چل رہا ہے۔"

"کیا؟" میں نے دریافت کیا۔

"خان جی نے دو تین مرتبہ میرے سامنے فون پر اس سے بات کی تھی۔ اسے لاہور میں بلایا تھا مگر میرا خیال ہے کہ اُس نے آنے سے انکار کر دیا تھا۔"

"تم جانتے ہو کہ خان نے اُسے کیوں بلایا تھا؟"

"نہیں! شاید خان جی کا اس پر دل آیا ہوا ہے۔"

"تو اس پر ہاتھ ڈالتا۔" میں نے پھنکار کر کہا۔ "ان معصوموں کو اُٹھانا کہاں کی مردانگی ہے؟"

"خان جی کہتے ہیں کہ وہ چکنی مچھلی ہے۔ آسانی سے ہاتھ آنے والی نہیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا اور خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ "نہیں برکت مسیح! کوئی اتنی معمولی بات پر اتنا بڑا جرم نہیں کرتا۔"

"یہ خان جی کے لیے معمولی بات نہیں ہے کہ وہ کسی کو بلائیں اور وہ آنے سے انکار کر دے۔" وہ بولا۔

"خان اس وقت کہاں ہوگا؟"

اس نے بے بسی سے کندھے اُچکائے۔ "خداوند جانتے ہیں؛ مجھے نہیں علم۔ میرا یقین کرو۔"

"یہ کیسے خان کے ہاتھ لگ گئی؟" میرا اشارہ اسما کی طرف تھا۔

"اسے خان نے لاہور کے ایک بڑے سیاست دان کے خفیہ اڈے سے اپنے آدمیوں کو بھیج کر نکلوایا تھا، بڑی مشکل سے۔ سنا تھا کہ بڑی مارا ماری ہوئی تھی۔"

"مگر کیوں؟"

اس نے جواباً مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ احمق انسان! تہ خانہ دیکھ چکے ہو، خان جی کی موجودگی کی خبر پا چکے ہو اور اس سیمیں بدن حسینہ کو برہنہ حالت میں بھی دیکھ چکے ہو...... پھر بھی پوچھتے ہو کہ کیوں؟...... منہ سے کچھ نہ بولا۔

میں نے طویل سانس حلق میں اُتاری اور پوچھا۔ "کیا اس کے باپ کو علم ہے کہ یہ یہاں ہے؟"

"سردار حیدر خان کو اس کا علم نہیں ہے۔" اس نے باوثوق انداز میں نفی میں سر ہلایا۔

"یہاں سے نکلنے کا کوئی اور راستہ بھی ہے؟" میں نے روانی میں پوچھا۔

"ہے تو سہی، جس سے خان جی نکلے ہیں مگر مجھے نہیں معلوم۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

"آخری سوال...... یارن خان کیا کرتا ہے؟ میرا پوچھنے کا مطلب ہے کہ زمینداری کے علاوہ۔"

اس نے اُلجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ بادشاہ ہیں۔ ان کی زبان ہلتی ہے اور دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جاتی ہے۔"

"پہیلیاں نہ بجھواؤ کھل کر بات کرو۔" میں نے درشت رویہ اختیار کیا۔

"وہ...... بہت تیز دماغ رکھتے ہیں۔ بادشاہ گر ہیں۔ بڑی سیاسی پارٹیاں ان کی خدمات حاصل کرتی ہیں۔ چاہیں تو کسی کو ہیرو بنا دیں، چاہیں تو زیرو۔" اس کی آواز بتدریج مدھم ہونے لگی۔ "وہ اسلحے کا کاروبار بھی کرتے ہیں، ممنوعہ ڈرگز کا بھی...... اور بہت سے ایسے کام جن کا مجھے علم نہیں ہے۔"

میں نے اُس سے یارن خان کے بارے چند مجھی نوعیت کے سوال کیے۔ وہ سب کچھ بتانے کے بعد رحم طلب نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "دیکھ لو، میں نے تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ جو تم نے پوچھا، ٹھیک ٹھیک جواب دیا۔ اب تم اپنا وعدہ پورا کرو۔"

میرا کام ختم ہو گیا تھا اور مجھے یہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہیے تھا۔ باہر کیسے حالات میرے منتظر تھے، اندازہ نہیں تھا۔ میں نے لمحہ بھر کے لیے سوچا کہ اسما کا کیا کروں؟ اسے اپنے ساتھ لے جاؤں...... یا جنسی درندے یارن خان کے رحم و کرم پر چھوڑ جاؤں؟...... پہلی سوچ دل کو لگی اور میں نے اُسے اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ بلند آواز میں اسے مخاطب کیا۔ "اے لڑکی! تمہارا لباس کہاں ہے؟"

اس کی مدھم سی آواز سنائی دی۔ "پپ...... پتا نہیں......"

"کمبل میں لپٹے رہ کر اُٹھو اور کپڑے پہنو۔ جلدی کرو۔"

میری توقع کے برعکس وہ کرب آمیز انداز میں چیخی۔ "نہیں...... مجھے کہیں نہیں جانا۔ میں اِدھر ہی ٹھیک ہوں۔ اگر مجھ پر کوئی احسان کرنا چاہتے ہو تو مجھے گولی مار دو۔"

تاسف اور دکھ سے میرا دل بھر گیا۔ میں نے کہا۔ "ڈرو نہیں، میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں گا۔"

"کہا ناں! مجھے کہیں نہیں جانا۔ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔"

اس کی آواز میں ہسٹریائی تاثر شامل ہو گیا۔

ایسے ہی وقت میں وینٹی لیشن والی جالیوں کے راستے گزر کر آتی ہوئی تیز آواز کانوں پڑی۔ "تم لوگوں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ پولیس کی بھاری نفری نے حویلی کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا ہے۔ اگر تم لوگ زندگی چاہتے ہو تو فی الفور ہتھیار پھینک کر، ہاتھ سروں پر رکھے حویلی کے مین گیٹ سے باہر آ جاؤ۔ تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو۔"

میرا دماغ جھنجھنا اُٹھا۔ کم بخت یارن خان واقعتاً حویلی سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اس نے اپنا رسوخ استعمال کرتے ہوئے پولیس کو بلوا لیا تھا۔ یارن خان اور پولیس والوں کو علم نہیں تھا کہ حویلی میں کشت و خون کا بازار گرم کرنے والا اکیلا تھا یا ایک سے زیادہ۔ انہوں نے اپنے طور پر اندازہ لگایا ہوگا کہ کئی حملہ آور حویلی میں موجود تھے۔ میں چوہے دان میں پھنس گیا تھا۔ میں نے دانت پیسے

اور چاہا کہ برکت مسیح کی چھاتی میں گولی اُتار دوں، وہ جلدی سے ہاتھ اُٹھا کر بولا۔ ”نہیں نہیں! مجھے مت مارو۔ میں تمہیں پولیس کے گھیرے سے نکال سکتا ہوں۔ مجھے مت مارو۔“

میں ٹرائیگر دباتے دباتے رُک گیا۔ غیر معمولی عجلت میں بولا۔ ”او کے! اگر تم مجھے دھوکا دو گے تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ چلو! اِسے اُٹھاؤ۔“

میں نے اسما کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر میں نے ہاتھ اُٹھا کر روک دیا اور جلدی سے وارڈ روب کی طرف بڑھا۔ وارڈ روب میں دو تین لباس دکھائی دیے۔ ایک ہینگر کھینچ لیا اور تیزی سے پلٹا۔ دیکھا کہ برکت مسیح نے اسما کو کمبل میں سے نکال کر کاندھے پر ڈال لیا تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں مار رہی تھی اور اس کی گرفت سے نکلنا چاہ رہی تھی۔

چھپی ہوئی چیز پراسرار ہوتی ہے۔ اسرار چشم طلب کو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔ کھل کر جب آدھا چھپا رہتا ہے، آدھا دکھتا ہے تو دل کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔ حادثاتی طور پر، خودستائشی کے جذبے سے معمور ہو کر از خود اپنے ہی خول سے باہر آتا ہے تو بے توقیر ہو جاتا ہے۔ لباس کا خول انسان کو پراسرار بناتا ہے۔ میں نے لمحہ بھر کے لیے غیر اختیاری طور پر دیکھا پھر آنکھیں پھیر لیں اور درشت لہجے میں کہا۔ ”میرے لیے پریشانی کا سبب نہ بنو اسما...... میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور تمہیں یہاں سے نکالنا چاہتا ہوں۔ اگر تمہاری مرضی ہوگی تو اپنے گھر چلی جانا۔ اگر گھر نہ جانا چاہو تو جہاں بھی کہو گی پہنچا دوں گا۔“

اس نے سر اُٹھایا۔ مجھے وحشت زدہ نظروں سے دیکھا اور چیخی۔ ”میرا کوئی خیر خواہ نہیں ہے۔ چھوڑ دو مجھے۔“

میں نے قدم بڑھایا۔ اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے اور غرا کر کہا۔ ”اپنی زبان بند رکھو اور موقع کی نزاکت کو سمجھنے کی کوشش کرو ورنہ اپنے ساتھ ہمیں بھی لے ڈوبو گی۔“

ایسے میں ہماری نظریں ایک پل کو ٹکرائیں۔ اس کی آنکھوں میں جاگزیں وحشت نہایت دلدوز تھی۔ ڈر نے اس کی قوتِ فیصلہ ختم کر دی اور کمزور سی مزاحمت بھی دم توڑ گئی۔ یا شاید اس نے تغیر یافتہ حالات کے خوف کے مارے مفاہمت کر لی تھی۔

مجھے اُس پر بے تحاشا ترس آیا۔ اس کا گلاب چہرہ کملایا ہوا تھا۔ تاب و تمکنت سب رخصت ہو چکی تھیں اور وہ سہمی ہوئی ہرنی کی طرح مجھے دیکھ رہی تھی۔ شکاری ایک سے ہوتے ہیں۔ کوئی بڑا کوئی چھوٹا مگر کوئی پانی نہیں پلاتا۔ اس کی نظروں میں، میں بھی شکاری تھا۔ میں اسے برہنہ حالت میں باہر نہیں لے جانا چاہتا تھا مگر وقت کی کمی کے باعث میں نے یہ تردد آنے والے وقت پر ڈالا اور برکت کو چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ میرے آگے آگے چلتا ہوا کمرے سے نکل کر گیلری میں آیا۔ چند لمحوں بعد ہم ہشت پہلوی کمرے میں تھے۔

برکت نے حسرت کناں نظروں سے اپنے مردہ ساتھیوں کو دیکھا اور خون آلود فرش پر احتیاط سے پاؤں رکھتے ہوئے، لاشوں کو پھلانگ کر ایک دیوار کے سامنے جا رُکا، بولا۔ ”دائیں جانب والی کرسی پر بیٹھ کر کرسی کو پیچھے دھکیلو۔“

میں اس پر آنکھیں بند کر کے اعتماد نہیں کر سکتا تھا کیونکہ یارن خان کے اس طلسم کدے میں کوئی بھی واقعہ رونما ہو سکتا تھا۔ میں کرسی سمیت کسی اندھی گپھا میں گر سکتا تھا۔ مگر اس کی بات ماننے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ تبھی میں نے اُسے نشانے پر رکھتے ہوئے عمل کیا۔ میرے وزن سے کرسی غیر روایتی انداز میں ایک انچ تک نیچے دَب گئی۔ اگر میں محتاط نہ ہوتا تو مجھے کرسی کی یہ حرکت بالکل محسوس نہ ہوتی۔ جونہی میں نے پیروں کی مدد سے کرسی کو پیچھے دھکیلا، میرے کانوں میں ’کٹک‘ کی ہلکی سی آواز گونجی۔ برکت مسیح نے اسما کو کاندھے سے اُتار کر کھڑا کیا اور دونوں ہاتھوں کو دیوار پر رکھ کر پوری قوت سے دھکیلا۔ مجھے حیرانی ہوئی جب پوری دیوار دروازے کی طرح اندر کی طرف کھلتی گئی۔ ہر دیوار کے کھلنے کا انداز جداگانہ تھا۔ یہ تہ خانہ انجینئر کی دانشمندی اور انسانی نفسیات پر دسترس کا بلاشبہ بہترین اظہار تھا۔

اسما دیوار کے ساتھ لگ کر، آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کر کھڑی تھی اور واضح طور پر کانپ رہی تھی۔ برکت کے ہاتھ کے اشارے پر میں فوری طور پر لاشیں پھلانگتا ہوا ان کے قریب آیا۔ جب ہم تینوں نے خلا عبور کر لیا تو برکت مسیح نے دیوار کو دھکیل کر ’کٹاک‘ کی آواز کے ساتھ اپنی جگہ پر فٹ کر دیا۔ سرنگ میں یک لخت اندھیرا چھا گیا۔

برکت کی زنانہ آواز گونجی۔ ”جلدی چلو...... یہ سرنگ ہمیں یہاں سے کافی دور لے جائے گی۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے جوتے اُتار دیے۔ مجھے بھی جوتے اُتارنے کا اشارہ کیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ چاہتا تھا کہ ہم کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر یہ سرنگ نما راستہ طے کریں۔ موہوم سا خوف دل کو لاحق تھا کہ وہ مجھے کسی پنجرے میں پھنسا نہ دے مگر زندہ رہنے کے لیے اتنا خطرہ مول لینے میں ہرج نہیں تھا۔ میں نے جوتے اُتار دیے اور سفر کا آغاز کر دیا۔ اس تنگ سی سرنگ میں نہ صرف اندھیرا تھا بلکہ بہت زیادہ سردی، حبس اور سیلن بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے

ہاتھ لہرایا۔ اسما کا بازو میری گرفت میں آ گیا۔ اس نے مزاحمت نہیں کی۔

میں نے آگے چلتے ہوئے برکت کو مخاطب کرتے ہوئے نہایت مدھم آواز میں پوچھا۔ ”برکت مسیح! یہ سرنگ کتنی لمبی ہے؟“

اس نے سرگوشی کی۔ ”مجھے علم نہیں کیونکہ پہلی مرتبہ اس میں داخل ہوا ہوں۔ کوئی آدھ میل لمبی تو ہوگی ہی۔“

”کیا یارن خان اسی سرنگ سے نکلا تھا؟“

”نہیں۔ وہ کسی اور سرنگ سے گئے ہوں گے۔ ادھر آتے تو میری نظروں میں ضرور آتے۔“ اس نے کہا۔ مجھے اس پر ایک ذرا بھروسا ہوا کیونکہ سرنگ کے اندھیرے کا فائدہ اُٹھانے کی اس نے کوشش نہیں کی تھی۔ ہم بھاگنے کے سے انداز میں چل رہے تھے۔ سرنگ میں کوئی موڑ نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق ہم خان کی حویلی کی چہار دیواری عبور کر چکے تھے۔

اچانک اسما رُک گئی۔ مجھے بھی ناچار رکنا پڑا۔ سپاٹ لہجے میں بولی۔ ”کپڑے مجھے دے دو۔ یہیں پہن لیتی ہوں۔“

میں نے اس کی بات ماننے میں کوئی ہرج نہ سمجھتے ہوئے برکت کو آواز دے کر روک لیا۔ وہ بولا۔ ”جلدی نکلو۔ یہ نہ ہو کہ خان جی پولیس کو اس سرنگ کے بارے میں یا اس کے دہانے کے بارے میں بتا دیں۔ میری تو خیر ہے تم مارے جاؤ گے۔“

میں نے کہا۔ ”چند لمحوں سے فرق نہیں پڑتا۔“ میں نے کہا اور ہینگر اسما کو تھما دیا، کہا۔ ”اسما! جلدی سے پہن لو۔“

چند لمحوں تک سرنگ میں کپڑوں کے سرسرانے کی آواز گونجتی رہی۔ پھر اسما کی آواز سنائی دی۔ ”چلو......“

سفر ایک مرتبہ پھر جاری ہو گیا۔ اب ہم تینوں ایک قطار میں چل رہے تھے۔ اسما میرے اور برکت کے درمیان تھی۔ سرنگ میں حبس بتدریج بڑھتا جاتا تھا جس کی وجہ سے میرا سر درد کرنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے اَب تب میں قے آ جائے گی۔ کان لگانے کے باوجود کوئی آواز سنائی نہیں دی تو لگا کہ یہ سرنگ ساؤنڈ پروف تھی یا ہم دور آ گئے تھے۔ کوئی پانچ سات منٹ متواتر چلنے کے بعد برکت مسیح رُک گیا۔ اسما اُس سے ٹکرائی، میں اسما سے۔ میں نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

وہ بولا۔ ”ہم سرنگ کے دہانے پر پہنچنے والے ہیں۔ میں ایک بار پھر تمہیں تمہارا وعدہ یاد دلاتا ہوں۔ سرنگ سے نکلتے ہی تم دونوں اپنی راہ پکڑو گے، میں اپنی۔ تم مجھے گولی نہیں مارو گے۔ کیا تم اس وعدے پر قائم ہو؟“

اس کی آواز میں خوف اور بداعتمادی کا عنصر غالب تھا۔ میں نے کہا۔ ”برکت! تم نے میری ڈیمانڈ پوری کی ہے۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ اپنے وعدے پر قائم ہوں کہ تمہیں نہیں ماروں گا۔“

اس نے بڑبڑاتے ہوئے ’خداوندا! میری مدد کر......‘ کہا اور خاموش ہو گیا۔ چند گھڑیاں خاموشی میں گزر گئیں۔ میں نے پریشانی سے پوچھا۔ ”کیا کر رہے ہو برکت مسیح؟“

”ڈھکن کھولنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ وہ بولا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ شاید اندھیرے میں کچھ ٹٹول رہا تھا۔ اُسے مطلوبہ ناب یا لیور نہیں مل رہا تھا۔ دیر ہو رہی تھی۔ لمحہ لمحہ میرے اعصاب پر گراں گزر رہا تھا۔ مجھ پر جھنجلاہٹ سوار ہونے لگی۔ ایسے ہی وقت میں اس کی آواز خاصے فاصلے سے ابھری۔ ”آگے آ جاؤ...... اِدھر! میرے پیچھے پیچھے۔ اِدھر موڑ بھی ہے، خیال رکھنا۔“

میں نے اسما کو بائیں آگے کی طرف پھیلا کر چلنے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم موڑ مڑ کر نسبتاً تنگ جگہ پر پہنچ گئے۔ ہم سے چند قدموں کی دوری پر برکت کی آواز ابھری۔ ”چلتے آؤ۔ اِدھر چھوٹی سی سیڑھی ہے۔ سیڑھی چڑھ کر اوپر آ جانا اور سرنگ سے نکلنے کے بعد ڈھکن رکھ دینا۔“

جونہی میں نے اسما کے بعد سیڑھی پر پاؤں رکھا، اچانک اندھیرے کا تسلط ٹوٹ گیا مگر ہاتھ کو ہاتھ پھر بھی سجھائی نہیں دیتا تھا۔ پانچ سات زینوں والی سیڑھی کا اختتام ایک گول ڈھکن دار دہانے پر ہوا جسے برکت مسیح نے ٹٹول کر کھولا تھا۔ جونہی میں اسما کو لیے باہر نکلا، مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ پھیپھڑے ایک دم پھول گئے۔ میں نے چند زور زور کی سانسیں لیں۔ یوں لگا جیسے موت کی گپھا سے نکال کر میں زندگی کے شاداب راستے پر اچانک گامزن ہو گیا تھا۔ سرنگ کے گھٹا ٹوپ اندھیرے سے نکلنے پر دھندلی چاندنی بھی آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی تھی۔

سرنگ کا دہانہ ایک چھوٹی سی گھنی اور خاردار جھنگی میں کھلا تھا۔ ایسی کئی جھنگیاں نور پور کے قریب سے گزرتی ہوئی نہر پر موجود تھیں۔ میں نے برکت کی ہدایت کے مطابق بھاری ڈھکن کو کھسکا کر دہانے پر رکھ دیا۔

ایسے ہی وقت میں حویلی کی جانب سے پکی رائفل کے فائر کی تیز اور گونج دار آواز کانوں میں پڑی۔ پولیس اپنے پیشہ ورانہ انداز میں مائیکروفون پر ’وارننگ‘ دینے کے بعد مایوس ہو گئی تھی اور اپنی دی ہوئی دھمکی پر عمل پیرا ہو گئی تھی۔

میں نے اردگرد دیکھا اور اسما کا ہاتھ پکڑے جھنگی سے

باہر آ گیا۔ پیروں میں کئی کانٹے اور سوکھی ٹہنیاں چبھیں۔ اتفاق سے اسما محفوظ رہی تھی کیونکہ اس کے حلق سے کوئی سسکی نہیں نکلی تھی۔ جھنگی کے باہر کہیں برکت مسیح دکھائی نہیں دیا تو میں نے تیز سرگوشی میں پکارا۔ ''برکت مسیح! تم کہاں ہو؟''

اس نے جواب نہیں دیا۔ میں نے دو تین مرتبہ آواز دی مگر جواب ندارد۔ سمجھ میں آیا کہ اس نے موقعے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے، مجھ پر اعتماد نہ کرتے ہوئے بھاگ نکلنے یا چھپ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ چونکہ میں نے اُسے نہ مارنے کا تہیہ کیا ہوا تھا، اس لیے میرے لبوں پر بے معانی مسکراہٹ ابھری اور میں نے اسما کا بازو پکڑ لیا۔

وہ سہمے سہمے لہجے میں بولی۔ ''اب کیا ہوگا؟''

شاید برکت کے غائب ہونے پر اس کے دماغ میں یہ خوف بیٹھ گیا تھا کہ اس کے بغیر ہم آگے نہیں جا سکیں گے۔

میں نے کہا۔ ''اسے جانا ہی تھا، سو چلا گیا۔ چلو! ہمیں جلد از جلد کسی محفوظ جگہ پر پہنچنا ہے۔''

وہ بولی۔ ''تم کون ہو اور مجھے وہاں سے کیوں نکال کر لائے ہو؟'' وہ اپنا بازو چھڑائے بغیر بولی۔

''بتا دوں گا...... سب کچھ بتا دوں گا۔ تھوڑا صبر کرو۔'' میں نے کہا۔ میں اس دوران ماحول کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ ہم نور پور کی مغربی جانب سے گزرتی ہوئی نہر کی پٹڑی کے بالکل قریب کھڑے تھے۔ اگر اسما میرے ساتھ نہ ہوتی تو میں ایک لمبا چکر کاٹ کر سائیں جگ جیت شاہ کے مزار کی طرف بڑھ جاتا اور پولیس کے جاتے ہی سائیں نورن آغا پر دھاوا بول دیتا۔ اب وہ میرے ساتھ تھی۔ اسے کسی محفوظ جگہ پر پہنچانا ضروری تھا ورنہ بعید نہ تھا کہ اُسے نور پور کے کتے اُدھیڑ دیتے یا وہ پھر سردار یارن خان کے ہتھے چڑھ جاتی۔ میں شش و پنج میں پڑ گیا۔

میں نے کہا۔ ''اسما! کیا تم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تم کہاں جاؤ گی؟''

اچانک فضا لگاتار فائرنگ کی خوف ناک آواز سے لرز اُٹھی۔ لگتا تھا کہ پولیس نے اپنا سارا زور نظر نہ آنے والے خطرناک ڈاکوؤں کو مار ڈالنے پر صرف کر دیا تھا۔ اسما نے شاید میری بات سنی ہی نہیں تھی کیونکہ اس نے اپنے دونوں کانوں پر سختی سے ہاتھ جما رکھے تھے۔

اس علاقے کا چپا چپا میرا اچھی طرح دیکھا بھالا تھا۔ ذہن پر زور دیا تو مجھے سوجھ گیا کہ نہر کی پٹڑی پر چلتے ہوئے فرلانگ سے بھی کم فاصلے پر نوری چوک والی پکی سڑک کو عبور کر کے ار دو چار ایکڑ کے فاصلے پر بنے ہوئے نور پور کے قدیمی قبرستان میں پہنچ سکتے تھے جہاں ہمارے چھپنے کی کافی جگہیں موجود تھیں۔ دو تین بوڑھے برگد، خانزادوں کے دو کشادہ مقبرے اور کئی گھنی جھنگیاں ہمیں بہ آسانی پولیس کی نظروں سے چھپا سکتی تھیں۔ میں نے ادھر کا قصد کیا۔ اسما تیز نہیں چل سکتی تھی مگر میرے ساتھ گھسٹتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ اس کی سانسیں بھی پھول گئی تھیں۔ جونہی میں نے دونوں اطراف، احتیاط سے دیکھ بھال کر سڑک عبور کی، حویلی سے گونجنے والی فائرنگ تھم گئی۔ پولیس والے مایوس ہو گئے تھے، سرکاری ایمونیشن کا خاتمہ بالخیر ہو گیا تھا یا برکت مسیح نے واپس پہنچ کر مطلع کر دیا تھا کہ میدان خالی ہو چکا تھا۔

اسما پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بولی۔ ''یہ کون سا علاقہ ہے؟''

میں چونکا۔ اس کے بے ساختہ سوال نے عقدہ کھولا کہ اسے علم ہی نہیں تھا کہ یارن خان نے اسے اپنی نور پور والی حویلی میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ ''یہ تمہارا اپنا علاقہ ہے۔''

وہ ٹھٹک گئی، بولی۔ ''کیا مطلب؟ کیا میں......''

میں نے بات کاٹی۔ ''رُکے بغیر چلتی رہو۔ کسی محفوظ جگہ پر پہنچ کر بتاتا ہوں۔''

وہ خاموشی سے چل پڑی۔ تھوڑی دیر بعد ہم کانٹے دار جھاڑیوں اور قبروں سے بچ بچا کر گزرتے ہوئے سردار حیات خان کے خاندانی مقبرے میں پہنچ گئے۔ باہر یخ بستہ ہوا بدن چیرتی تھی۔ اندر کا ماحول قدرے گرم تھا۔ سکھ کی سانس آئی۔ یہ چودہ فٹ کا مربعی کمرا تھا جس میں اوپر کے ہاتھ تین جبکہ دروازے کی جانب دو پختہ قبریں تھیں۔ قبروں پر سنگ مرمر لگا ہوا تھا۔ اس گنبد والے مقبرے کی مغربی جانب والی کھڑکی سے چاندنی چھن کر اندر آ رہی تھی جس کی وجہ سے ہم نہ صرف قبروں کو بلکہ ایک دوسرے کے ہیولائے ہوئے جسموں کو بھی دیکھ سکتے تھے۔ ہم ایک جگہ بیٹھ گئے۔ میں بولا۔ ''ہم اطمینان سے کچھ وقت یہاں گزار سکتے ہیں، باتیں کر سکتے ہیں۔''

وہ خوف اور سردی سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''اس قبرگستان میں باہر کی چیزیں نہیں ہوتیں؟''

قبرستان کو مقامی لوگ 'قبرگستان' کہتے تھے۔ باہر کی چیزوں سے اسما کی مراد جن بھوت تھے۔

میں نے کہا۔ ''نہیں۔''

میرا جی تو چاہا کہ اُسے بتاؤں کہ اس قبرستان میں میرا، دیوانے اور کھالے کا بچپن اور لڑکپن 'لکن میٹی' اور 'چھپن چھپائی' کھیلتے گزرا ہے...... یہاں ہم رات گئے تک بیٹھ کر

باتیں کیا کرتے تھے اور ایک ایک درخت پر چڑھ کر نور پور کا فضائی نظارہ کیا کرتے تھے۔ لوگوں کا عام خیال تھا کہ اس قبرستان میں نادیدہ مخلوقات اور چھلل پیریاں رہتی ہیں۔ لوگوں کا خوف بلا جواز اور سنی سنائی باتوں کا تخلیق یافتہ تھا۔

زمین نے اپنی تمام تر خنکی میرے ننگے پیروں میں اُتار دی تھی۔ شکر تھا کہ کوئی بڑا کانٹا یا کانچ کا ٹکڑا پیروں تلے نہیں آیا تھا ورنہ بہت گڑبڑ ہو جاتی۔ البتہ میری پنڈلی اور بازو میں تیز درد ہو رہا تھا۔ کس کر باندھی ہوئی میز پوش کی پٹیوں کی وجہ سے بازو اور پیر کے دوران خون میں بھی گڑبڑ پیدا ہو چکی تھی۔ حویلی میں گزرنے والے قیامت آگیں لمحات میں مجھے اپنے زخموں اور زیادہ کس کر بندھی ہوئی پٹی کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ اطمینان کی چند گھڑیاں نصیب ہوئیں تو میں نے جھک کر پنڈلی کی پٹی کھول دی۔ یک لخت پاؤں سن بھر کا ہو گیا اور کتے کے دانتوں کے زخموں سے ٹیسیں اُٹھنے لگیں۔

میری سسکی سن کر اسما بولی۔ ''کیا یہاں گولی لگی ہے؟''

اس کی آواز جذبات سے عاری تھی۔

''نہیں! خان کے راکھویں (پالتو) کتوں نے کاٹا ہے۔'' میں نے بتایا۔ چاند کی ناکافی روشنی میں زخموں کو دیکھنے کی کوشش عبث تھی۔ اس لیے میں نے محض ہاتھوں سے ٹٹول کر خون کے بہاؤ کا اندازہ کیا۔ تسلی ہوئی کہ جمے ہوئے خون نے تازہ خون کا راستہ مسدود کر دیا تھا۔ حوصلہ ہوا تو میں نے بازو کی پٹی بھی کھول دی۔

اسما بہ غور مگر نیم دلی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ چبھتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''تم مجھے کیوں ادھر لائے ہو؟''

میں نے سر اُٹھایا۔ اُسے دیکھا۔ چاند کی مدھم روشنی اس کے نچلے دھڑ پر پڑ رہی تھی۔ اس نے پھول دار فیروزی کرتہ اور میچنگ شلوار پہنی تھی۔ دوپٹا نہیں تھا۔ اندھیرے میں اس کے خدوخال اور رنگت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے ہمدردانہ انداز میں جواب دیا۔ ''اسما! مجھے تم سے کچھ لینا دینا نہیں۔ میں اپنے آدمیوں کی تلاش میں حویلی گیا تھا۔ وہ نہیں ملے، تم نظر آ گئیں۔ سوچا تمہیں اس خبیث کی قید سے آزاد کرانے کا ثواب حاصل کر لوں۔ بھلا یا برا؟ مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہے۔''

اسے میرا بے پروا جواب عجیب لگا۔ الجھ کر مستفسر ہوئی۔ ''تم یہ کیوں نہیں بتاتے ہو کہ تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟...... نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں نے تمہاری آواز پہلے بھی کہیں سن رکھی ہے۔''

میں ہنگامی حالت سے برسرِ پیکار ہونے کے سبب بھول گیا تھا کہ میں مسلسل اپنے اصل لب و لہجے میں بولتا چلا آ رہا تھا۔ میرا گیٹ اَپ اور تھا، میرا لہجہ اور۔ میں نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے، تم نے مجھے کہیں بولتے سنا ہو۔ ویسے بھی دنیا میں ان گنت لوگوں کی آوازیں ملتی جلتی ہیں۔''

وہ بولی۔ ''نہیں...... میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ تم شکل سے پٹھان لگتے ہو جبکہ ٹھیٹھ سرائیکی بولتے ہو۔ تبھی مجھے عجیب سے لگتے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''میں پٹھان نہیں ہوں۔ شاید ڈاڑھی اور آنکھوں کی رنگت کی وجہ سے پٹھان لگتا ہوں۔ بہرحال میری چھوڑو، اپنی کہو...... تمہیں کہاں پہنچاؤں...... گھر؟''

وہ بولتے بولتے رک گئی۔ سر جھک گیا۔ بڑبڑائی۔ ''گھر......'' پھر تھوڑے توقف کے بعد میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے سوال پوچھنے لگی۔ ''میں نے پوچھا تھا کہ یہ کون سا علاقہ ہے؟''

میں نے کہا۔ ''تمہیں جس حویلی میں یارن خان نے قید کر رکھا تھا، وہ نور پور کی مشہور حویلی تھی۔ اس حویلی کے سامنے سرکاری اسپتال واقع ہے۔ شاید تم نے دیکھا ہو؟'' میں نے ارادتاً اسے یاد نہیں دلایا کہ وہ اس اسپتال میں ڈاکٹر شاہ جی کے پاس بیماری کی حالت میں لائی گئی تھی۔ ''اور جہاں ہم بیٹھے ہیں، یہ نور پور کا قدیمی قبرستان ہے۔ یہ خانزادوں کا چھوٹا مقبرہ ہے۔ بڑا اس کے عقب میں راستے کی سیدھ پر واقع ہے۔ بعید نہیں کہ یہ قبریں تمہارے باپ داداؤں کی ہوں۔''

اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ بے چین ہو گئی، بولی۔ ''نور پور؟ اوہ...... یہ تو واقعی میرا اپنا علاقہ ہے۔ قریب میں میرا گھر ہے۔ بلوچ نگر میں۔''

''میں جانتا ہوں۔ تم سردار حیدر خان کی بیٹی ہو۔''

''تم کیسے جانتے ہو؟''

''حیدر خان کو کون نہیں جانتا۔ اسمبلی کا ممبر ہے۔ بہت بڑا زمیندار ہے۔'' میرے لہجے میں از خود زہر گھل گیا مگر میں نے اپنے اندر کا زہر اندر ہی روک لیا۔

''تم مجھے میرے گھر پہنچا دو۔ میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔'' وہ اچانک منت آمیز لہجے میں بولی۔ ''دیکھو! میں بابا سے کہہ کر تمہیں نہ صرف پولیس سے بچا لوں گی بلکہ منہ مانگا انعام بھی دلواؤں گی۔ پلیز!''

میرے لبوں پر نفرت آمیز مسکراہٹ ناچی۔ میں نے کہا۔ ''مجھے کوئی انعام شنام نہیں چاہیے۔ فکر نہ کرو، تمہیں

بلوچ نگر پہنچانے کا بندوبست کیے دیتا ہوں۔ مگر کیا یہ ممکن نہیں کہ میں تمہیں سردار وریام خان کی حویلی کے دروازے پر چھوڑ دوں۔ وہ تمہیں گاڑی میں بٹھا کر بلوچ نگر پہنچا دے گا یا کارڈلیس فون پر تمہارے باپ کو بلوا لے گا۔"

اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ "نن...... نہیں...... مجھے کسی پر اعتبار نہیں رہا۔ سب دھوکے باز ہیں۔ سب بھوکے کتے ہیں۔ تم مجھے بلوچ نگر پہنچا دو۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔"

میرے ہونٹ بھنچے۔ بات لبوں پر آئی، ان سب سے بڑا اور خونخوار کتا تو تمہارا باپ ہے...... میں نے دل کی بات بہ وقت لبوں پر روک لی، کہا۔ "نہیں اَسما! میرا کام ادھورا ہے۔ پولیس کے نکلتے ہی مجھے نور پور جانا ہے۔ بلوچ نگر جاؤں گا تو دیکھ لیے جانے کا خطرہ حد سے بڑھ جائے گا۔ پولیس مجھے تلاش کرتی پھرتی ہے۔ تمہیں نور پور میں کسی شخص پر تو بھروسا ہوگا ناں؟"

اس نے سر اٹھایا۔ بولی تو پتا چلا کہ اس کا گلا رندھا ہوا تھا۔ نہ جانے کب سے رونا چاہ رہی تھی۔ رونے کا موقع نہیں پا رہی تھی۔ کچھ کہتے کہتے سسک پڑی اور گھٹنوں پر چہرہ رکھ کر زار و قطار رونے لگی۔ میں نے اسے غبارِ دل نکالنے کا بھرپور موقع دیا۔

کچھ دیر بعد از خود سنبھل گئی، بولی۔ "نہیں...... سب کتے ہیں۔ ماں کا ماس کھاتے ہیں۔ بہن کو بھنبھوڑتے ہیں۔ بیٹی کے چیتھڑے اُڑاتے ہیں۔ سب بھوکے بھیڑیے ہیں۔ یارن خان رشتے میں میرا چاچا لگتا ہے۔ چاچا باپ جیسا ہوتا ہے مگر وہ ناہر (بھیڑیا) ہے جس نے انسانوں کی کھال اوڑھ رکھی ہے۔ اور...... اور اسی نور پور میں ایک بھولی اور معصوم صورت والا کتا بھی رہتا تھا۔ میں نے غلطی سے اُسے بھی انسان سمجھ لیا تھا مگر...... نہیں...... وہ بھی کتا نکلا۔ تم سے ہو سکے تو مجھے اسپتال میں ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پر چھوڑ آؤ۔"

میں سمجھ گیا تھا کہ اس نے مجھے ہی 'بھولی اور معصوم صورت والا کتا' قرار دیا تھا مگر میں نے اس کے ہسٹریائی بیان سے صرفِ نظر کیا اور اس کے بولنے کا انتظار کیا۔ وہ چند لمحوں کے توقف کے بعد پاگلوں کے سے انداز میں دونوں ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے بولی۔ "مگر نہیں...... شاید وہ بھی...... ویسا نہ ہو جیسا دِکھتا ہے، تم مجھے بلوچ نگر پہنچا دو۔ مگر نہیں...... بابا مجھے دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔ وہ صبر کریں گے تو بھائی مار ڈالے گا۔ اگر کسی وجہ سے مجھے زندہ رکھنے کا فیصلہ کر بھی لیا گیا تو مجھے اگلا سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے کسی کے پلے باندھ دیا جائے گا...... ہائے میں کیا کروں؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا۔ میں کہاں جاؤں؟...... بلوچ نگر والے منہ چھپا کر مجھ پر تھوکیں گے۔ خاموش آنکھوں کے تیروں سے میرا کلیجا چھلنی کریں گے۔ ہائے! میں کیا تھی؛ مجھے قسمت نے کتنا گھٹیا اور سستا کر دیا۔"

اس کی ہمت جواب دے گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے اُس کے گھٹنوں پر پڑے سر کو چھوا۔ زلفوں میں انگلیاں پھیریں۔ پیار سے سمجھایا۔ "دیکھو اسما! تمہیں آخر اپنے گھر جانا ہے۔ آج نہیں تو کل، پرسوں...... اپنے بابا اور بھائی کا سامنا تمہیں کرنا ہے۔ پھر آج ہی کیوں نہ یہ مرحلہ عبور کر لیا جائے۔ ہمت کرو تم گھر سے بھاگی ہوئی نہیں ہو، اغوا کی گئی ہو، یہ بات سارا علاقہ جانتا ہے۔"

اس نے سختی سے سر کو اِدھر اُدھر پٹخا، بولی۔ "ہاں! تم ٹھیک کہتے ہو مگر میں تو کہیں کی نہیں رہی ناں۔ پر جو بھی ہوگا، دیکھا جائے گا۔ میں اپنی ماں کے لیے موجھی (اُداس) ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے بابا اور بھائی کو دیکھے صدیاں گزر گئی ہوں۔ بس تم مجھے میرے گھر پہنچا دو۔"

میں نے کہا۔ "او کے! فکر نہ کرو، رو رو کر خود کو ہلکان نہ کرو اور اگر ممکن ہو تو مجھے اپنے بارے میں بتاؤ کہ تمہیں کس نے اغوا کیا تھا اور اس حال تک کیسے پہنچیں؟"

اس کے بولنے سے پہلے نور پور کی جانب سے گاڑیوں کے انجنوں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے اُسے بولنے سے روک دیا۔ تھوڑی دیر بعد گاڑیاں فراٹے بھرتی ہوئی نور پور کی حدود سے نکل گئیں۔ قبرستان سڑک سے ذرا ہٹ کر واقع تھا اس لیے میں نے مقبرے سے نکل کر سڑک کی جانب دیکھنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ میں جانتا تھا کہ سوائے کسی اونچے درخت پر چڑھ کر دیکھنے کے، کسی طرح بھی سڑک اور گاڑیاں نظر نہیں آئیں گی۔ میرے اندازے کے مطابق گزرنے والی گاڑیوں کی تعداد تین تھی مگر یہ طے نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یہ پولیس کی گاڑیاں تھیں یا غیر سرکاری۔

نور پور کی فضا شانت ہو گئی۔ روایتی سکوت ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تو اَسما بولی۔ "میں کچھ نہیں بولوں گی، جب تک تم اپنے بارے میں نہیں بتاؤ گے۔ بولو! جس عورت اور بچے کو اس بڈھے کتے نے اغوا کرایا ہے، تمہارا اُن سے کیا تعلق ہے؟"

اس کا تجسس دیکھ کر میں عجیب مخمصے میں پڑ گیا۔ سچ بولتا تو میڈم شکیلہ کے ساتھ ساتھ میرے کردار پر پڑا ہوا دبیز پردہ فاش ہو جاتا۔ جھوٹ بولتا تو اسے مطمئن نہ کر پاتا۔ اگر

میں اپنی زبان پر قابو رکھتا تو وہ مجھے پہچان نہیں سکتی تھی کیونکہ وہ تہ خانے کے عیش کدے کی روشنی میں پہچاننے میں ناکام رہی تھی۔ اس مقبرے کے کمزور اندھیرے میں کیسے پہچان سکتی تھی۔ مجھے احتیاط سے کام لینا تھا کیونکہ وہ مجھ پر کسی حد تک اعتماد کرنے لگی تھی جبکہ 'شہریار' سے شدید نفرت کرتی تھی اور اسے بھولی صورت والا کتا قرار دیتی تھی۔

اس سے زیادہ انتظار نہیں ہو پایا، بولی۔ "سچ بولنے کے لیے سوچنا نہیں پڑتا۔ جھوٹ بولنے کے لیے دماغ میں کڑیاں جوڑنی پڑتی ہیں۔ میں مصیبت میں ہوں۔ عورت ذات ہوں۔ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ پھر بھی تم سچ بولنے سے ڈرتے ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ تمہیں کیا بتاؤں؟ میں کوئی اچھا آدمی نہیں ہوں۔ کریمنل لائف گزارتا ہوں۔ چھوٹی موٹی وارداتیں کرتا ہوں۔" میں نے اپنے انداز میں بے ساختگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ "تمہیں ایک دو مرتبہ ملتان میں دیکھا تھا۔ تب میں یونیورسٹی میں پڑھا کرتا تھا۔ تم پہلی نظر میں مجھے اچھی لگی تھیں اس لیے تمہاری کھوج میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ تم سے محبت کرنے لگا تھا مگر جب پتا چلا تھا کہ تم بہت بڑے آدمی کی بیٹی ہو تو ڈر کر پیچھے ہٹ گیا کیونکہ غریب آدمی دیکھنے کے جرم میں پکڑا جاتا ہے۔ چاہنے کے جرم میں مارا جاتا ہے۔ اس علاقے میں اکثر آتا جاتا رہتا ہوں۔ اس لیے گلی کوچوں سے آگاہ ہوں۔ تمہارے باپ کے رعب اور دبدبے کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا تبھی تمہیں دیکھ کر منہ پھیر لیتا تھا اور اپنی محبت کو تھپکیاں دے کر سلا دیتا تھا۔"

وہ مزاحم ہوئی۔ "ہونہہ...... محبت! یہ بکواس ہے۔ مگر میں نے یہ تو نہیں پوچھا تھا؟"

"ہاں! تم نے یہ پوچھا تھا کہ جن لوگوں کو یارن خان نے اپنی قید میں رکھا ہوا ہے، وہ کون ہیں؟ بتاتا ہوں۔ وہ میرے کچھ نہیں لگتے۔ میرے ایک بھائی بند کے سگے ہیں۔ ایک ماں ہے، دوسرا بھائی۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا اور مایوسی آمیز لہجے میں بولی۔ "نہیں...... یہ کہانی جھوٹ پر مبنی ہے۔ سادہ سی بات ہے کہ کوئی اپنے کولیگ کے لیے اتنا تردد نہیں کرتا۔"

مجھے ایک ذرا شرمندگی ہوئی، کہا۔ "وہ میرے کام آتا ہے اور میں اس کے۔ میں جس دنیا میں سانسیں لیتا ہوں، اس میں میوچل سسٹم کے تحت لین دین ہوتا ہے۔"

وہ مطمئن ہوئی یا نہیں، کندھے جھٹک کر بولی۔ "ہوتا ہوگا...... تمہارا نام کیا ہے؟"

مجھے اس سوال کی توقع تھی تبھی جلدی سے بولا۔ "میرا نام ظفر ہے، ظفر اقبال۔ میرے پاس وقت کم ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم جلد از جلد اپنے بارے میں بتاؤ تاکہ میں تعین کر لوں کہ مجھے تمہارے لیے کیا کرنا ہے اور کیسے تمہیں بلوچ نگر پہنچانا ہے۔"

وہ چند لمحوں تک لب بستہ مجھے تکتی رہی پھر لمبی سانس لے کر بولی۔ "ظفر! تم بہت اچھے ہو۔ تمہیں کچا ماس ترغیب نہیں دیتا کیونکہ تم دوسروں کی طرح بھوکے نہیں ہو۔ میری کہانی مختصر سی ہے۔ مجھے ایک کتے نے اس لیے اغوا کیا کہ اُسے شبہ تھا کہ میرے بابا نے اس کی بہن کو اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھانے کے لیے قید کر رکھا تھا۔ تم اُس کتے کو دیکھو تو کبھی میری بات کا اعتبار ہی نہ کرو۔ دیکھنے میں بڑا معصوم ہے۔ اس کا نام شہریار ہے مگر لوگ اسے 'شہرا' کہہ کر پکارتے ہیں۔ ادھر نور پور میں ہی اس کا گھر ہے۔ مجھے یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ اس نے درست کہا تھا مگر اس کی بہن بابا کے ہاتھوں سے نکل گئی تھی۔"

میں نے بے اختیار اس کی بات کاٹی۔ "جب اُس نے انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے تمہیں اغوا کیا یا کرایا تو تم اُسے کتا کس طرح کہہ سکتی ہو؟"

"کیا اُس کا انتقام مجھے بے عزت کر کے پورا ہو سکتا تھا؟ میں نے اُس کا کیا بگاڑا تھا؟ اگر وہ مرد تھا، غیرت مند انسان تھا تو میرے بابا کا گریبان پکڑتا۔ اُسے گلیوں میں گھسیٹتا۔ بھلے خون میں نہلا دیتا۔ میں اُسے کتا نہ کہتی۔" اس کے ہونٹوں سے نکلنے والے الفاظ تازیانے کے طرح میرے دل و دماغ پر پڑ رہے تھے۔ "ظفر! وہ بزدل کتا تھا۔ اس میں اور تم میں یہی فرق ہے کہ وہ کتا تھا، تم انسان ہو۔ اگر تم چاہو تو مجھے چند ٹکوں کے عوض کسی بڑے کتے کے ہاتھ بیچ سکتے ہو، جیسا کہ اُس نے کیا مگر تم مجھے گندا ہاتھ لگائے بغیر میرے گھر پہنچانے کے لیے فکرمند ہو۔ وہ ایسا نہیں تھا۔"

وہ روہانسی ہو گئی۔ کافی دیر سر جھکائے بیٹھی رہی، پھر ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بولی۔ "اس نے اپنی مالکن کو خوش کرنے کے لیے مجھے آزاد کرانے کے بجائے ایک اور گندے کتے کے ہاتھ بیچ دیا۔ یوں میں بے ہوشی کی حالت میں ملتان سے لاہور کے کسی نواحی قصبے میں پہنچا دی گئی جہاں ہر شام کو ایک بدصورت نوکرانی مجھے نہلا دھلا کر، عروسی لباس پہنا کر دلہن بناتی اور رات کے اندھیرے میں میاں دلبر اپنی مونچھوں کو بل دیتا ہوا شیطان کی طرح آن وارد

ہوتا۔ وہ شیطان، وہ مردود، کتا...... میرے باپ کی دوستی کی مالا جپتا تھا، قہقہے لگاتا تھا اور رات بھر مجھے باؤلے کتے کی طرح جھنجھوڑتا رہتا تھا۔"

اس کی آواز لرزنے لگی۔ ستم رسیدگی لبوں پر جم کر لفظوں کی راہ مسدود کرنے لگی۔ بے بسی نے اُسے نڈھال کر دیا تھا۔ توقف کے بعد اپنی ہمت یکجا کر کے بولی۔ "ظفر! سن رہے ہو ناں؟ میں مرنا چاہتی تھی مگر اس کمینے نے مجھے اس طرح بے بس کر رکھا تھا کہ میں زندہ رہنے پر مجبور تھی۔ مجھے اپنی سانسوں پر بھی اختیار نہیں تھا۔ پھر ایک رات اس محل نما کوٹھی پر بری بری شکلوں اور غنڈوں جیسے حلیوں والے ان گنت کتوں نے دھاوا بول دیا۔ اس رات میاں دلبر اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ اُن غنڈوں نے کوٹھی میں موجود بدشکل نوکرانی اور تین پہرے داروں کو گولیوں سے بھون کر رکھ دیا۔ میں وہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھتی رہی جس میں چار لاشیں تڑپ تڑپ کر خون کے چھینٹے فرش پر مار رہی تھیں۔ ہائے! کتنا وحشت ناک منظر تھا۔ کاش مجھے قسمت نے یہ سب کچھ نہ دکھایا ہوتا۔"

وہ بتاتے بتاتے جھرجھری لے کر تھم گئی۔ چند لمحوں تک آنکھیں بند کیے نفی میں سر ہلاتی رہی، پھر حوصلہ کر کے بولی۔ "وہ غنڈے مجھے ایک بڑی ویگن میں ڈال کر لاہور شہر میں لے گئے۔ میں ایک قید سے نکل کر دوسری قید میں پہنچ گئی۔ پھر ایک شام میری نس میں کوئی دوا انجیکٹ کی گئی۔ میں دنیا و مافیہا سے غافل ہو گئی۔ آنکھ کھلی تو اس بڈھے کتے کے کمرے میں تھی۔ اب تک یہی سمجھتی رہی ہوں کہ میں لاہور یا اس کے مضافات کے کسی آسیبی کمرے میں پڑی ہوں۔ آج پتا چلا کہ مجھے میرے ہی علاقے میں رکھ کر بے آبرو کیا جاتا رہا ہے۔ جگہوں کی تبدیلی میرے ماس کے لیے اہم نہ رہی۔ پہلے کتے نے میری مزاحمت کی دیواریں پاش پاش کر دی تھیں۔ دوسرا ہوس کا مارا ہوا بڈھا کتا تمام دن اور رات مجھے ننگا رکھتا تھا۔ لباس نہیں پہننے دیتا تھا۔ مجھے تو یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ میں کسی تہ خانے میں ہوں۔ زندہ رہتے ہوئے زیرِ زمین تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ قبر میں مردے پر عذاب اُترتا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ قبر اس تہ خانے سے کم ڈراؤنی ہوتی ہے۔ نہ دن کا پتا چلتا تھا، نہ رات کا۔ بے غیرت کہیں کا...... کبھی مجھے ہوس بھری نظروں سے دیکھتا رہتا، کبھی بھوکے درندوں کی طرح روندنے لگتا۔ جسم تو جسم رہا، ان دونوں کتوں نے تو میری روح بھی چھید چھید کر لہولہان کر دی ہے۔ ظفر! سچ کہتی ہوں، مجھے زندہ نہیں رہنا۔ میں نے کوئی بہت بڑا جرم کیا تھا جس کی مجھے اتنی بھیانک سزا ملی ہے۔ کاش! میں یوں بے عزت نہ ہوئی ہوتی اور مر گئی ہوتی۔ کسی ٹرک کے نیچے آ کر کچلی گئی ہوتی......"

اس پر جنونی کیفیت طاری ہونے لگی تو میں نے جلدی سے اس کی بانہیں پکڑیں اور جھنجھوڑ دیا، کہا۔ "دیکھو اَسما! جو ہو گیا، سو ہو گیا۔ وقت کبھی ریورس نہیں ہوتا۔ تم پڑھی لکھی ہو۔ امید ہے کہ سمجھانے سے سمجھ جاؤ گی۔ میں کہتا ہوں کہ انسان کی عزت کوئی صحن میں لگے بیری کے درخت جیسی نہیں ہوتی کہ کوئی آیا اور کاٹ کر لے گیا۔ نہ ہی یہ لباس اور بدن کے سہارے سانسیں لیتی ہے۔ عزت کا تعلق تو نیت اور روح سے ہوتا ہے۔ تم نے کوئی جرم نہیں کیا اور یقیناً تمہارا منہ کالا نہیں ہوا۔ ہاں! میاں دلبر اور یارن خان نے اپنے چہرے ضرور کالے کیے ہیں۔ ان کی عزت ان کے اپنے ہاتھوں لٹی ہے نہ کہ تمہاری۔ کیونکہ جس بُرے عمل میں تمہاری مرضی شامل نہیں ہے، وہ تمہارے کھاتے میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ تمہارے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ تم نے ظلم نہیں کیا اور خدا ہمیشہ مظلوم کا ساتھ دیتا ہے، کسی ظالم کا نہیں۔"

اس نے سر اُٹھایا اور عجیب نظروں سے گھورنے لگی، بولی۔ "تم پڑھے لکھے ہو؟"

میں نے بغلوں میں ہاتھ دابے اور ٹھنڈی آہ بھری۔ "ہاں! تبھی ایسی باتیں کر رہا ہوں جو عام آدمی نہیں کرتا۔ میرا مشورہ مانو، فضول خدشات سے دامن چھڑاؤ اور اپنے گھر چلی جاؤ۔ اس اعتماد کے ساتھ کہ تم پر کوئی انگلی نہیں اُٹھائے گا۔ جب تک تم کسی کو نہیں بتاؤ گی کہ میاں دلبر اور یارن خان نے تمہارے ساتھ کیا کیا، تب تک کوئی تمہیں برا نہیں کہے گا۔ رُوح پر لگے چرکے بدن پر دکھائی نہیں دیتے۔ تمہارے باپ کا اس علاقے میں بڑا نام اور دبدبہ ہے۔ سادہ لوح دیہاتی لوگ اس بات پر یقین کریں گے جو تم کہو گی۔ اسی کہانی کو صدقِ دل سے مانیں گے جو تم اپنی زبان سے بیان کرو گی۔ او کے؟"

وہ اضطراب اور دکھ کے خطرناک مرحلے سے گزر چکی تھی اس لیے حقیقت کو تسلیم کر کے حالات سے مفاہمت کی راہ پر چل پڑی اور تفہیمی انداز میں سر ہلا کر بولی۔ "ٹھیک ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔ کہیں اور نہیں رہ سکتی سوائے اپنے گھر کے۔ گھر والے جو بھی سلوک کریں گے مجھے بھگتنا ہو گا۔ چلو! مجھے بلوچ نگر پہنچا دو۔ میں نے تمہاری بات مانی۔ تم میری مانو۔ میرے ساتھ چلو۔ میں پورے یقین

سے کہتی ہوں کہ کوئی تمہارا بال بیکا نہیں کر سکے گا۔"

رات بہت سرد تھی۔ مجھے سردی لگنے لگی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اَب تب میں بخار ہونے والا ہو۔ مجھے اپنی بے بسی اور کسمپرسی کی وہ رات یاد آ گئی جو میں نے حیدر خان کی بیلے والی حویلی سے نکل کر مین روڈ تک گزاری تھی۔ بدن کو جھرجھری سی آ گئی۔ اسما کو بھی سردی لگنے لگی تھی کیونکہ اس نے نہ صرف اپنے گھٹنے اکٹھے کر لیے تھے بلکہ دونوں ہاتھ بھی بغلوں میں دبا رکھے تھے۔

میں نے یاد دلایا۔ "میرا کام ادھورا ہے۔ اُسے نمٹائے بغیر واپس جا سکتا ہوں اور نہ تمہیں بلوچ نگر پہنچا سکتا ہوں۔ تم سوچ کر بتاؤ، میں تمہیں نور پور کے کس گھر میں پہنچا کر اپنی راہ لوں؟"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ چند منٹ سوچتی رہی پھر فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ "ادھر...... نور پور میں...... ایک آدمی رہتا ہے۔ خالد عرف کھالا۔ یارن خان کی حویلی کے پاس ہی اس کا چھوٹا سا گھر واقع ہے۔ بس تم مجھے اس تک پہنچا دو۔"

مجھے جھٹکا لگا۔ حیرت کی بات تھی کہ اس کے نزدیک بھرے نور پور میں وہی ایک قابلِ اعتبار شخص تھا۔ بے ساختہ دریافت کیا۔ "کیا تم بخشو لوہار کے پتر کی بات کر رہی ہو؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر متردد انداز میں بولی۔ "وہ ملتان میں تھا۔ نہ جانے گھر آ گیا ہے یا نہیں۔"

میں نے اس کی بات مان لی اور کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں اس کے گھر جاتا ہوں۔ اُسے کہتا ہوں کہ وہ کسی سواری کا انتظام کر لائے۔ تب تک تم ادھر ہی چھپی رہو۔"

وہ گھبرا گئی، جلدی سے بولی "نہیں...... مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ وہ اس وقت مجھے بلوچ نگر نہیں پہنچا سکے گا اس لیے میں باقی رات اس کے گھر گزار لوں گی۔"

میں اسے ساتھ لے کر نور پور نہیں جانا چاہتا تھا کیونکہ مجھے علم تھا کہ اس وقت پورا نور پور جاگ رہا ہو گا۔ لوگ خانزادوں کے ڈیروں پر مجتمع ہوں گے اور قیاس کے گھوڑوں کو ایڑ لگا رہے ہوں گے۔ اگرچہ پولیس واپس جا چکی تھی مگر اس واقعے پر تبصروں کا بازار ابھی پورے جوبن پر ہو گا۔ میں نے اسے اپنے خدشات سے آگاہ کیا۔ وہ میری پریشانیوں کو سمجھ گئی، بولی۔ "مگر مجھے یہاں ڈر لگے گا۔ یہ قبرستان ہے۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "ابھی تم مرنے کی خواہش کا اظہار کر رہی تھیں۔ اب تم موت سے ڈرنے لگی ہو۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر......"

"تھوڑی دیر کی بات ہے۔ مانتا ہوں کہ تم خوب صورت ہو، جوان ہو مگر اس مُردوں کے شہر میں کسی میں اتنا دَم نہیں کہ قبر سے نکل کر تمہیں دیکھنے آئے۔" اس پر میرے مذاق کا ذرہ بھر اَثر نہ ہوا، سمجھایا۔ "دیکھو! میں اسے لے کر چند ہی منٹوں میں یہاں پہنچ جاؤں گا۔ یہاں ایسا ویسا کچھ بھی نہیں ہے یعنی کوئی جن بھوت نہیں ہے۔ یہ لوگوں کی من گھڑت باتیں ہیں۔" میرے لہجے میں تیقن پنہاں تھا۔ اس کا کندھا تھپتھپایا اور کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی جلدی سے کھڑی ہو گئی، بولی۔ "میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ تم نے...... تم نے مجھے زندہ درگور ہونے سے بچایا ہے۔"

مجھے شرارت سوجھی۔ "اس کی قیمت مجھے مل گئی ہے۔ اس لیے زیادہ احسان مند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

وہ چونکی۔ "کیا مطلب؟ کیسی قیمت؟"

میں نے اُس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لیا اور کہا۔ "جس انسان سے زندگی میں کبھی محبت کی ہو، اسے حادثاتی طور پر پورے کا پورا دیکھ لیا جائے تو ریاضت سے چوگنی قیمت ادا ہو جاتی ہے۔"

میرا مقصد محض اُس کا ذہن بدلنا تھا۔ وہ میرا مطلب سمجھ کر ٹھٹکی، شرمسار ہوئی پھر میرے ہاتھوں کو سختی سے تھام کر بولی۔ "اوہ! مجھے یہ خیال ہی نہیں رہا تھا۔ میں تو تمہارا سامنا کرنے کے قابل بھی نہیں رہی۔ اف مائی گاڈ!" اس کا لہجہ بڑا درد بھرا تھا۔ میرے کچھ کہنے سے قبل ہی اس نے میرے دونوں ہاتھ اپنے چہرے سے ہٹا دیے اور ایک مجنونانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی۔ "مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تم کیا ہو؟ مجھے تو بس یہ یاد رہے گا کہ میری باقی زندگی تمہاری رہین ہے۔"

وہ پوری قوت سے مجھے بھینچ کر ممنونانہ جذبات کا اظہار کر رہی تھی۔ مجھے اس کی حالتِ زار پر ترس آیا۔ اگر وہ جان جاتی کہ میں ظفر نہیں، شہریار ہوں، وہی جو اس کی دانست میں کتا تھا، تو اس کی حالت کیا ہوتی۔ نازوں پلی، پھولوں بڑھی خانزادی اس وقت کتنی عام لگ رہی تھی۔ اس کا شاہانہ رکھ رکھاؤ، ناز و نخرہ ہوا ہو گیا تھا۔ بناوٹ کی تہیں اُتر جائیں تو انسان بڑا خوب صورت دکھائی دینے لگتا ہے۔

میں نے بڑی آہستگی سے اُسے خود سے علیحدہ کیا اور لمبی سانس پھیپھڑوں میں اُتار کر کہا۔ "اسما! تم عام نہیں ہو، خاص ہو۔ خاص لوگوں کا رویہ عامیانہ نہیں ہوتا۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا کہ تم مجھے فرشتہ کہو۔"

اس نے بڑے غور سے مجھے سنا۔ دیکھا بھی۔ پھر نفی میں سر ہلا کر بولی۔ "نہیں! تم بہت عظیم ہو۔ مگر مجھے تمہاری آواز

کیوں شناسا لگتی ہے۔ پُر تم نے بتایا ہے کہ تم نے مجھے ملتان میں دیکھا تھا۔ شاید میں نے بھی تمہیں وہیں دیکھا ہو۔“

اس کا بیان خود کلامی میں بدل گیا تو میں مقبرے سے نکل آیا۔ مگر مجھے دن چڑھنے اور اپنے مطلوبہ مغویوں کا ٹھکانا بدل دیے جانے کا خوف لاحق تھا۔ بھی تیز تیز قدموں سے پگڈنڈیاں عبور کرتا ہوا شیرے قسائی کے گھر کے پچھواڑے پہنچ گیا۔ میں نے دانستہ اس راستے کا انتخاب کیا تھا کیونکہ اس پر درختوں کی تعداد قدرے زیادہ تھی تاکہ میں دور سے دیکھا نہ جاسکوں۔ یہ میری خوش بختی تھی کہ میری مڈبھیڑ کتوں سے نہیں ہوئی تھی ورنہ وہ بھونک بھونک کر آسمان سر پر اُٹھا دیتے اور نور پور کے نیم خوابیدہ لوگوں کو خبردار کر دیتے۔

شیرے قسائی کے پچھواڑے کی زمین امان اللہ قریشی کی ملکیت تھی۔ اس نے یہاں کماد کاشت کر رکھا تھا۔ مشرقی آخری کھیت میں گڑ بنانے کا بیلنا اور کڑاہ وغیرہ لگا رکھا تھا۔ وہ ہر سیزن پر کافی سارا گڑ بنوایا کرتا تھا۔ بھی لوگ اپنی اپنی ضرورت کے مطابق اس سے گڑ خرید لیا کرتے تھے۔ گاؤں کے سبھی گھروں میں گڑ کا استعمال عمومی طور پر بہت زیادہ تھا۔ میں کماد کی خشک کھوری پر چلتا ہوا بیلنے کے قریب پہنچا۔ کان لگائے۔ اندازہ ہوا کہ گاؤں جاگ رہا تھا۔ لوگوں کی ملی جلی آوازیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح فضا میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ طے تھا کہ اگر مجھ پر کسی کی نظر پڑ جاتی تو پھر میری خیر نہیں تھی۔

شیرے قسائی کے پچھواڑے کی نکڑ سے جھانک کر دیکھا۔ حیات خان کے دارے کی بتیاں روشن تھیں۔ میرے سامنے پکی سڑک تھی جس کے پار دکانوں کی قطار تھی۔ بخشو لوہار کا سنسان چھپر دکھائی دے رہا تھا۔ میں نظر بچا کر کھالے کے دروازے تک پہنچ سکتا تھا مگر دستک دینے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کیونکہ دستک کی آواز سے آس پاس کے تمام لوگ چونک جاتے اور مجھے کھالے کے دروازے پر کھڑا دیکھ کر قیامت بپا کر دیتے۔ دیوار پھاندنے کے لیے بھی مجھے دروازے کی طرف ہی جانا تھا۔ اگر میں چھپر کے ذریعے دکان پر چڑھنے کی کوشش کرتا تو چھپر کے زمیں بوس ہونے کا خدشہ تھا۔

تھوڑی دیر انتظار کے بعد میں نے موقع دیکھ کر کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کیا اور دوڑتا ہوا سڑک عبور کر کے چھپر کے نیچے پہنچ گیا۔ یہاں سے حیات خان کے دارے کے اندر جھانکا جاسکتا تھا۔ دارے کے مہمان خانے کی ٹیوب لائٹس روشن تھیں۔ یقیناً یارن خان کی حویلی پر ہونے والا ڈاکوؤں کا حملہ اور پولیس کی اندھا دھند فائرنگ زیرِ بحث ہوگی۔ برآمدے اور لان میں کوئی نہیں تھا۔ موقع اچھا تھا۔ میں کھالے کی ویگن اور دیوار کے بیچ بلی کی پھرتی سے چلتا دروازے کے قریب پہنچا۔ دستک دینے میں احتمال تھا اس لیے میں چکنی مٹی کی بنی ہوئی نسبتاً کم بلند دیوار پھاند گیا۔ گھر حسبِ توقع خالی تھا جبکہ کھالے کے کمرے میں نیچی لو پر لالٹین جل رہی تھی جس کی پیلی روشنی دیسی طرز کے چوبی دروازے کی درزوں سے جھلک رہی تھی۔

میں دبے پاؤں چلتا ہوا دروازے پر آیا۔ ایک بڑی درز سے جھانک کر دیکھا۔ کمرے میں کھالا اکیلا نہیں تھا۔ کوئی اور، شاید بلو یا غفوراں عرف پھوری، یا پھر رشیدہ بھی برابر کی چارپائی پر لحاف میں دبکا ہوا تھا۔ میں نے انگلی سے دروازہ بجایا۔ دو تین مرتبہ مدھم دستک دی۔ کھالا بیدار ہو کر دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔

میں نے سرگوشی کی۔ ”کھالے! میں شیرا ہوں۔ دروازہ کھولو۔“

میری آواز اس کے کانوں تک پہنچ گئی۔ وہ چھلانگ لگا کر بستر سے نکلا اور جھٹ سے دروازہ کھول کر متفکر انداز میں بولا۔ ”شیرے تم؟ اس وقت...... خیر تو ہے؟“

میں نے اُسے بازو سے پکڑا اور دکان میں لے گیا۔ نہایت کم بلند آواز میں بتانے لگا۔ ”خیر ہے بھی، اور نہیں بھی۔ تم نے مجھے خانزادی کا طعنہ دیا تھا۔ آج اُس تک میرا ہاتھ پہنچ گیا ہے اور میں یارن خان کی حویلی سے اُسے نکال لایا ہوں۔ وہ بہت بری حالت میں ہے۔“

”کک...... کیا...... تو ہوش میں تو ہے ناں؟“ وہ بوکھلا گیا۔ ”تم نے تو کہا تھا کہ وہ میاں دلبر حسین کے پاس ہے۔ اب یارن خان کا نام لے رہے ہو۔ یہ کیا قصہ ہے؟“

”یہ لمبی کہانی ہے۔ بعد میں سناؤں گا۔ فی الحال تم اپنی بی بی جی کو سنبھالو اور اسے اُس کی حویلی پہنچاؤ۔ راستے میں تمام باتیں پوچھ لینا۔“ میں نے اُسے ہلکے سے ڈانٹا۔ ”میں اسے قبرستان میں، خانزادوں کے خاندانی مقبرے میں جنوں بھوتوں سے ڈرتا چھوڑ آیا ہوں۔ اپنی ویگن نکالو اور اُسے فی الفور اس کے گھر پہنچاؤ۔“

”اور تم؟“ اس کی شکل مارے حیرت اور گھبراہٹ کے بگڑ گئی تھی۔

”میں سائیں نورن آغا کی خبر لینے جاؤں گا۔ یار کھالے! میں بڑی مشکلوں میں گھر گیا ہوں، دعا کرنا۔ یہ اپنا نور پور بڑا پُراسرار ہو گیا ہے۔ کبھی مل بیٹھے تو بتاؤں گا۔“

"کیوں؟ یہاں ایسا کیا ہے؟" وہ آنکھیں پھاڑے ہونق بنا پوچھنے لگا، پھر از خود جواب لیے بغیر بولا۔ "چھوڑو اس بات کو، یہ بتاؤ کہ وہ مقبرے میں اکیلی بیٹھی ہے...... یا اُس کے پاس کوئی ہے؟"

"وہ اکیلی ہے یار!" میں اکتا کر بولا۔

"کیا اسے ڈر نہیں لگتا؟"

میں نے کہا۔ "پہلے میں اس کے ساتھ تھا۔ اب اکیلی ہے، ظاہر ہے ڈر کے مارے کانپ رہی ہوگی۔ تبھی کہتا ہوں کہ تم فوراً ویگن لے کر ادھر جاؤ۔ سوال جواب اس سے کر لینا۔ تم گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے۔ تمہیں یہ تک خبر نہیں ہوئی کہ نور پور پر یہ رات کتنی بھاری ثابت ہوئی ہے۔ کئی بندے مارے گئے ہیں۔ یک طرفہ روایتی پولیس مقابلہ بھی ہوا ہے۔ یارن خان اس وقت اپنے بال نوچ رہا ہوگا یا آگ بگولہ پھرتا ہوگا اپنے شیطانی محل کی راہداریوں میں۔ پولیس مردے اُٹھا کر لے گئی ہوگی۔ وہ خون آلود فرش دھلوا رہا ہوگا۔"

وہ سر کھجا کر بولا۔ "انسان کا بچہ بن یار! یہ خوفناک فلم چلا کر میرا دل نہ دہلاؤ میں نے فائرنگ کی آواز سنی تھی اور تم پر انا للہ بھی پڑھ لیا تھا مگر تم نیا رچھڑ (پھڈا) بنائے آن کھڑے ہو۔ خیر! یہ بتاؤ کہ پولیس یہاں کیا کرنے آئی تھی؟ کیا وہ تمہاری تلاش میں تھی؟"

میں نے اُسے مختصراً خود پر بیتنے والی شب کے واقعات سنائے اور فوراً چل پڑنے پر مصر ہوا۔

وہ بولا۔ "یار شہرے! تم بہت اونچا اُڑنے لگے ہو۔ یقین نہیں آتا کہ تم نے یہ سب کچھ کر لیا...... ہیں؟"

"یہ باتیں پھر کسی وقت کریں گے۔ تم اپنی سیٹ پر بیٹھو۔"

"پاگل ہو گئے ہو کیا؟ میری ویگن اسٹارٹ ہوتی ہے تو پورے گاؤں کو پتا چلتا ہے۔ یارن خان ویگن کو میرے اور خانزادی سمیت آگ لگا دے گا۔ پھر...... پھر کیا، کیا جائے؟" وہ خود کلامی کرتا ہوا، کنپٹی کھجاتا ہوا سوچ میں پڑ گیا۔ "زیادہ سفر تو نہیں ہے۔ کیوں نہ میں اسے سائیکل پر چھوڑ آؤں؟" اس نے سوچتے ہوئے انداز میں کہا، پھر خود ہی اپنی بات کو مناسب قرار دیتے ہوئے بولا۔ "ہاں! سائیکل پر جانا مناسب رہے گا۔ تم ادھر سے نکل کر قبرستان پہنچو۔ میں اُبے کی سائیکل نکال لاتا ہوں۔"

"میں اب وہاں نہیں جاؤں گا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"کیوں؟ کیا کوئی خطرہ ہے؟" وہ ٹھٹکا۔

"نہیں۔ مجھ سے زیادہ چلا نہیں جاتا۔" میں نے اپنی پنڈلی کی طرف اشارہ کیا، کہا۔ "تم بلو کا برقعہ بھی ساتھ لے جانا تاکہ اسما کو دیکھ کر کوئی پہچان نہ سکے۔"

اس نے مجھے گھورا۔ "اتنی سردی میں آدھی رات کو کون سڑک پر کھڑا ہو کر ہمیں دیکھے گا اور پہچاننے کی کوشش کرے گا؟ میرا خیال ہے کہ تم نے اپنی اوقات سے زیادہ پھرتیاں دکھائی ہیں اس لیے تمہارے دماغ نے کام کرنا بند کر دیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "نہیں کھالے! پولیس والے علاقے میں چکراتے پھر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یارن خان کے بچے کھچے کارندے بھی میری تلاش میں نکلے ہوں۔ وہ تمہیں اور اسما کو دیکھ کر پکڑ لیں گے اور سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ زیادہ عقل مند نہ بنو اور جیسا کہہ رہا ہوں، ویسا کرو۔ کھیس کی بکل مار لو اور اسما کے لیے بلو کے برقعے کے بجائے ماسی کا ٹوپی والا برقعہ لے جاؤ۔ اسے پہن کر اسما بوڑھی معلوم ہوگی۔"

ایسے وقت میں حیات خان کے وارے کے باہر لوگوں کی آوازیں ابھریں۔ کھالے نے اُٹھ کر دروازے کی درزوں سے جھانکا، طنزاً بولا۔ "نور پور کے بجی تیس مار خان فاتحانہ انداز میں ڈنڈے لہراتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو جا رہے ہیں۔"

میری برہمی کو دیکھ کر وہ جلدی سے اپنے کمرے میں گیا۔ تھوڑی دیر بعد پلٹا تو اس کے ہاتھ میں نہ صرف برقعہ تھا بلکہ اس نے میری ہدایت کے مطابق سوتی کھیس کی بکل مار رکھی تھی۔ میرے مطالبے کے بغیر اس نے مجھے پانی کا بھرا ہوا گلاس اور پیراسیٹامول کی دو گولیاں تھمائیں، متفکر لہجے میں گویا ہوا۔ "یہ لو شیر مار کہ گولیاں کھا لو۔ درد میں کچھ اُفاقہ ہو جائے گا۔ دُھنی (پیٹ کے وسطی حصے) میں لگنے والے ٹیکے بڑا درد کرتے ہیں۔"

میں نے گولیاں پھانکیں، پانی پیا اور کھڑا ہو گیا۔ اس نے دروازہ کھول کر سائیکل نکالی، ارد گرد دیکھ کر مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ "شہرے! کوئی خطرے وطرے کی بات تو نہیں ناں؟"

میں نے شکوہ بار لہجے میں کہا۔ "کھالے! کیا تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں رہا؟ اگر تم ڈر رہے ہو تو پلٹ جاؤ۔ میں جانوں اور میرا کام جانے۔ ہاں یار! ایک بات کا دھیان رکھنا۔ تمہاری بی بی جی نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں نے اُسے اپنا نام ظفر اقبال بتایا ہے۔ یاد رکھنا، اسے مت بتانا کہ میں شہر یار ہوں۔ پوچھے تو کوئی ہیٹھی پھینکی مار دینا (اول فول بک دینا)۔"

وہ لات گھما کر سائیکل پر بیٹھتے ہوئے تشکیک آمیز انداز میں مجھے گھورنے لگا۔ بولا۔ "کیا تم نے کوئی گل کھلایا ہے؟"

"نہیں تو......" میں جلدی سے بولا۔

"تو پھر تمہیں اپنا آپ چھپانے کی ضرورت کیوں پڑی؟" اس کا انداز اچھا نہیں تھا۔

"ویسے ہی یار! تم تو بال کی کھال کھینچنا شروع کر دیتے ہو۔ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ اس لیے میں نہیں چاہتا کہ......"

"کہ وہ تمہیں اچھا سمجھنے لگے۔ فکر نہ کرو۔ وہ تم پر صبح دوپہر شام ڈاکٹری نسخے کے مطابق لعنتیں بھیجے گی۔ او کے یار جی! تم اپنی راہ لو، میں اپنی۔ زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔" اس نے ارد گرد دیکھا اور داہنے پاؤں کا زور پیڈل پر ڈال کر سائیکل کو 'ایڑ' لگا دی۔

میں چھپر تلے لکڑی کے موٹے ڈھم (ستون) سے چمٹ کر کھڑا تھا تاکہ اچانک نمودار ہونے والے کسی شخص کی فوری نگاہ مجھ پر نہ پڑے۔ کھالے کی سائیکل کا ہر عضو ویگن کی طرح مختلف آوازیں نکالتا تھا مگر بخشو لوہار کی ٹھونکا ٹھانکی کی بدولت اسے قابلِ اعتماد سواری قرار دیا جا سکتا تھا۔ کھالا گھبراہٹ میں نکلا تھا کیونکہ اسے پوری طرح معاملے کی سنگینی کو سمجھنے کا وقت نہیں ملا تھا۔ اگر میری سنائی ہوئی کہانی میں 'بی بی جی' کا کلائمکس شامل نہ ہوتا تو وہ کھری کھری سنا کر رضائی میں سر منہ لپیٹ لیتا اور ہرگز اتنی سردی میں قبرستان کا رُخ نہ کرتا۔

مجھے اندازہ تھا کہ اسما کو سامنے پا کر اس کا دل پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا اور تب اس پر کھلے گا کہ میں نے اُسے اسما کے قرب کا کتنا بڑا اور کھلا موقع فراہم کیا تھا۔ وہ نہ صرف میرا ممنون ہوگا بلکہ اس کا قلبی شکوہ بھی آپوں آپ تحلیل ہو جائے گا۔ وہ باتوں باتوں میں اسما کی بربادی کا تمام تر ملبا مجھ پر ڈالتا اور سمجھتا تھا کہ میں نے میڈم کو مالی منفعت دیتے ہوئے اسما کے ساتھ سخت زیادتی کا ارتکاب کیا تھا۔ وہ حق بجانب نہیں تھا مگر میرے موقف کو تسلیم کرنے کا روادار بھی نہیں تھا۔

مجھے سوچنے کے لیے چند منٹوں کے لیے گوشۂ عافیت کی تلاش تھی۔ ویگن پر نگاہ پڑی تو یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ ویگن میں گھس گیا اور فرش پر ایک سیٹ کی ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ گن جھولی میں رکھ کر آئندہ کا لائحہ عمل ترتیب دینے لگا۔ مجھے بغیر کسی ٹھوس وجہ کے یقین ہو چلا تھا کہ میڈم شکیلہ کی اماں اور چھوٹا بھائی سیمو نور پور میں ہی کہیں موجود تھے۔ اگر وہ نورن آغا کی حراست میں تھے تو لامحالہ طور پر انہیں مزار کے احاطے میں ہونا چاہیے تھا۔ یہ بھی بعید از امکاں نہ تھا کہ نورن آغا نے انہیں کسی اور خفیہ ٹھکانے پر پہنچا دیا ہو۔ یارن خان کو اگر برکت مسیح نے خبردار کر دیا کہ اس کی حویلی پر حملہ انہی دونوں مغویوں کی وجہ سے کیا گیا ہے تو اس کا فوری ردعمل یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ پہلی فرصت میں ان کا ٹھکانا بدل دیتا۔ یعنی ہر دو صورتوں میں میرے پاس مہلت کم تھی۔ جو بھی کرنا تھا، اللہ کی آس پر فی الفور کر گزرنا چاہیے تھا۔ مجھے شکرے کی طرح سو دوزیاں کو پسِ پشت ڈال کر اپنے شکار پر جھپٹنا تھا۔

پیر سردی کے مارے شل ہوئے جاتے تھے۔ اپنی برہنہ پائی کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ یاد آیا کہ کھالے نے دکان کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ میں اس امید کے سہارے ویگن سے نکل کر دکان میں گھس گیا کہ مجھے بخشو لوہار کا 'ایمرجنسی جوتا' مل جائے گا جسے وہ کبھی کبھار پہنا کرتا تھا۔ میری امید بر آئی اور ٹائر کی بنی ہوئی مخصوص ساخت کی چپل مل گئی۔ پہن کر باہر نکلا اور چیتے کی سی سرعت سے دبے پاؤں دوڑتا ہوا شیرے قسائی کے تحقیقی کھیت میں کھوری پر پہنچ گیا۔ بیلنے کے قریب سے گزر کر کماد کی اوٹ لیتا ہوا مولا داد کے گھر کی طرف بڑھا۔ تھوڑی دیر میں میں ماسٹر ولی محمد والی گلی عبور کر گیا۔ گلی سنسان تھی۔ اسی گلی کی سیدھ میں چاچے چراغ کا جلا ہوا گھر واقع تھا۔

مولا داد کے گھر اور مولوی کے حجرے کے عقب سے گزر کر، لمبا چکر کاٹ کر میں سائیں جگ جیت شاہ کے مزار کے پچھواڑے والے جنگل میں پہنچ گیا۔ یہیں میں نے رات کو اپنا لباس اور سامان چھپایا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں سائیں نورن آغا کی رہائش گاہ کے پچھواڑے کھڑا چپل اُتار رہا تھا۔ اسی دیوار کے ذریعے میں دو مرتبہ پہلے بھی اس گھر کی چھت پر چڑھا تھا۔ ایک مرتبہ دن چڑھے دل جیت کو بیدار ہوتے دیکھ کر لوٹ آیا تھا۔ دوسری مرتبہ اُسے مکھن کے بال کی طرح نکال کر اپنے ڈیرے پر لے گیا تھا جہاں وہ میرے ہاتھوں اپنے اعمال کی پاداش میں بدترین انجام کا شکار ہوا تھا۔ آج پھر مجھے یہی مسافت درپیش تھی۔

تھوڑی سی کوشش سے میں چھت پر کمروں کی درمیانی منڈیر پر پہنچ گیا۔ تین اطراف کمروں اور ایک طرف ہال کے درمیان صحن اور یوشکل کا برآمدہ نظر آ رہا تھا۔ شمالی گوشے میں سیڑھیوں کے نیچے سائیں دل جیت کا کمرا تھا جس میں اس وقت اس کے گدی نشین سائیں نورن آغا کو محوِ استراحت ہونا چاہیے تھا کیونکہ سائیں دل جیت کے بعد یہ

بیڈ روم اسی کے زیرِ تصرف تھا۔ کھالے کی بہم پہنچائی ہوئی معلومات کے مطابق باقی کمروں میں سائیں دل جیت کی دو بیوائیں اور اولاد مقیم تھی۔ چونکہ نورن آغا کی یہاں رہائش خانزادوں کے مفاد میں جاتی تھی، اس لیے وہ غیر محرم ہونے کے باوجود سائیں دل جیت کے پس ماندگان کے ساتھ ایک ہی چھت تلے رہائش پذیر تھا۔

میں نے گن کو فائر پوزیشن میں تھاما اور ذہن سے خوف و وسوسے جھٹک کر محتاط انداز میں سیڑھیاں اُتر گیا۔ سائیں دل جیت کا بیڈ روم غیر متوقع طور پر غیر مقفل تھا۔ اندر نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ سرخ پھولدار بیڈ شیٹ والا جہازی سائز کا آرام دہ بیڈ خالی پڑا تھا۔ مجھے حیرت اور مایوسی کا سامنا کرنا پڑا اور اعصاب میں یک لخت تھکن عود کر آئی۔

ہونٹ کاٹتا ہوا پلٹا۔ دوسرے کمروں میں جھانکنا فضول تھا۔ وقت کا زیاں تھا۔ چونکہ وہ نورن آغا اپنے کمرے میں نہیں تھا، ہال میں تھا یا مزار میں، اس لیے میں نے چھت کے راستے باہر جانے کے بجائے مین گیٹ کا رُخ کیا۔ میری توقع کے عین مطابق گیٹ کھلا تھا۔ گیٹ کھلنے سے کوئی آواز پیدا نہ ہو، اس خیال سے میں نے گیٹ کو نہایت آہستگی سے کھولا اور مزار کے احاطے میں داخل ہو گیا۔ دائیں جانب ہال اور حجرے کی کھڑکیوں پر نظر ڈالی۔ نورن آغا ادھر نہیں تھا کیونکہ کھڑکیاں غیر روشن تھیں۔ میری دانست میں اُسے سائیں جگ جیت کے مقبرے میں ہونا چاہیے تھا۔ دبے پاؤں چلتا ہوا مزار کی طرف بڑھا۔

میں نے ایک ذرا پلٹ کر پارکنگ پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ سائیں دل جیت کی سیاہ رنگ کے بونٹ والی سرخ ٹویوٹا کرولا اپنی مخصوص جگہ پر کھڑی دکھائی دی۔ اس کے علاوہ پارکنگ میں کوئی اور گاڑی موجود نہیں تھی۔ مجھے ایک طرح سے اطمینان ہوا کہ یہاں نورن آغا کے علاوہ کوئی نہیں تھا جو میری راہ میں مزاحم ہوتا۔ مزار سے ملحقہ ملنگوں والے بڑے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ بتی بجھی ہوئی تھی۔ میں دبے پاؤں چوبی بلیوں والے بڑے سے دروازے تک گیا۔ دھکیل کر دیکھا۔ اندر سے کنڈی چڑھی ہوئی تھی۔ مزار کے عجیب الوضع ملنگ بابے زندگی کا بیشتر حصہ ایک نقطے پر ٹھہر کر دونوں جہانوں کی سیر کرنے میں گزار دیتے تھے۔ انہی کے دم قدم سے مزار کی فضا سارا دن 'حق سائیں جگ جیت' اور 'سچا سخی دل جیت شاہ' کے نعروں سے گونجتی تھی۔

مزار کو خالی پا کر میرا ذہن جھنجھنا اُٹھا۔ مایوسی کی کسیلی لہر رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ نورن آغا یہاں بھی نہیں تھا تو کہاں گیا تھا؟ اُس کم بخت کو زمین نگل گئی، آسمان اُٹھا لے گیا......

میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا مگر کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے یارن خان کی حویلی کا تہ خانہ گھوم گیا۔ میں نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ اس حویلی کے نیچے اتنا پُراسرار اور خفیہ تہ خانہ ہوگا جس کا میکنزم عام ذہن کی دسترس سے بالاتر تھا۔ اگر میں پرویز پر قابو نہ پا لیتا اور وہ مجھے تہ خانے میں داخلے کے راستے کی نشاندہی نہ کرتا تو میں ساری عمر چکرا تا رہتا۔ اسی طرح برکت مسیح نے مجھے محفوظ سرنگ کے راستے سے گزار کر پولیس کے گھیرے سے نکال دیا تھا۔ مجھے یقین سا ہو گیا کہ مزار کے احاطے میں بھی کوئی ایسی خفیہ پناہ گاہ موجود تھی جہاں تک عام انسانی ذہن کی رسائی ممکن نہیں تھی۔ اسی خیال سے تقویت پا کر میں مزار کی دیواروں کو، قبر اور چوبی کھڑکیوں کو ٹھونک بجا کر دیکھنے لگا مگر دس پندرہ منٹ کی محنت کا انجام نہایت مایوس کن ناکامی پر ہوا۔

شدید نوع کے احساسِ ناکامی نے بدن میں ایک دم نقاہت بھر دی اور میں چند زور زور کی سانسیں لے کر اونچی ریلنگ دار قبر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ سردی اور کتوں کے کاٹے کا اثر ہونے لگا۔ سر چکرانے لگا۔ میں نے شام کا کھانا کھایا تھا جو بھاگ دوڑ میں ہضم ہو گیا تھا۔ شکم خالی ہونے کی وجہ سے کمزوری بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ تاہم مجھے اپنی حالتِ زار کی زیادہ پروا نہیں تھی اور میرا ذہن اِس نکتے پر اٹکا ہوا تھا کہ مجھے نورن آغا کو کیسے اور کہاں تلاش کرنا چاہیے؟ بیڈ روم سے نکلنے کے بعد وہ یہاں نہیں آیا تھا، ہال اور حجرے میں نہیں گیا تھا، پھر کہاں گیا تھا؟

ذہن میں ایک خیال ابھرا۔ کہیں وہ یارن خان کے ہاں نہ پہنچ گیا ہو تاکہ حویلی کی اچانک بدل جانے والی صورتِ حال کا جائزہ لے سکے۔ اس صورت میں اُسے کسی بھی وقت لوٹنا تھا۔ میں تھوڑا اوپر کی جانب کھسک گیا جہاں بیٹھنے سے مزار کے کھلے دروازے سے احاطے کا مین گیٹ دکھائی دینے لگا۔ اَب جو بھی باہر سے مزار کے احاطے میں داخل ہوتا، فوراً میری نگاہ میں آ جاتا۔

میرے پاس گھڑی نہیں تھی۔ مزار کی دیواروں پر نگاہ دوڑائی۔ مبادا کہ وال کلاک نصب ہو مگر دیواروں پر سائیں جگ جیت کے قلمی پورٹریٹ، شیشہ لگی الماری میں اس کے ذاتی استعمال کی 'متبرک' اشیا اور دیواروں پر چسپاں رنگ برنگ آرائشی ٹائلیں دکھائی دے رہی تھیں۔ گھڑی نہیں تھی۔

چاند کی ماند پڑتی چاندنی کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ تین سے اوپر کا وقت تھا۔ اگر یہ رات یونہی نامراد گزر جاتی تو مجھے اگلی رات کے آنے تک کہیں چھپ کر وقت گزارنا تھا جو نہایت تکلیف دہ کام تھا۔ میرا پٹھانوں والا روپ اب مجھے فائدہ نہیں دے سکتا تھا کیونکہ لمبے تڑنگے جنگجو پرویز، یارن خان کے دستِ راست برکت مسیح اور اسٹینچو قسم کے گن مین دادو مہانے نے مجھے اس حلیے میں دیکھ لیا تھا۔ وہ مجھے دن کے اجالے میں بہ آسانی پہچان سکتے تھے۔

میں بے دھیانی میں اپنی زخمی پنڈلی پر ہاتھ پھیر رہا تھا جب اچانک میری تمام تر حِسّیں بیدار ہو گئیں۔ میرے کانوں میں 'کٹک' کی مخصوص مگر نہایت کمزور آواز پڑی تھی۔ میں نے بے ساختہ سانس روک لی۔ چند لمحوں بعد میرے بدن کو خفیف سا جھٹکا لگا۔ یوں جیسے کم شدت والا زلزلہ آیا ہو۔ میں نے قبر کی ٹیک چھوڑ دی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر قبر کو دیکھنے لگا۔ میری چھٹی حس نے خبردار کیا تھا کہ قبر میں کوئی گڑبڑ تھی۔ ناکافی روشنی کے باعث دیر تو لگی مگر مجھے قبر میں پیدا ہونے والی نہایت خفیف سی حرکت کا اندازہ ہو گیا۔ پوری کی پوری قبر پیروں کی جانب نہایت آہستگی سے سرک رہی تھی۔ میرے اعصاب میں برق بھر گئی اور میں اچھل کر قبر کی پائینتی کی جانب جا کھڑا ہوا۔ میری گن کا رُخ قبر کے سرہانے کی جانب تھا کیونکہ میں فی الفور اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ قبر کے نیچے راستہ تھا جس سے کوئی برآمد ہونے والا تھا اور دہانہ یقینی طور پر قبر کے سرِ بالیں واقع تھا۔

میرا قیاس درست ثابت ہوا۔ چند لمحوں بعد جب قبر ڈیڑھ فٹ کے قریب سرک کر ٹھہر گئی تو ریلنگ پر سے ایک سر نمودار ہوا۔ جونہی وہ مجھے دیکھے بغیر قبر کے پہلو میں آیا، میں نے للکارا۔ ''خبردار! ایک قدم بھی بڑھایا تو گولی مار دوں گا۔''

وہ یوں اچھلا جیسے اس کے پیروں میں اچانک کوئی سانپ پھنکارا ہو۔ بجلی کی سی تیزی سے پلٹا مگر گن پر نگاہ پڑتے ہی چابی والے کھلونے کی طرح ساکت ہو گیا۔ وہ نورن آغا تھا جسے میں نے پلک جھپکنے کی سی دیر میں مخصوص وضع قطع کے سبب پہچان لیا تھا۔ میں پھنکارا۔ ''نورن آغا! اپنے ہاتھ اوپر اُٹھا لو ورنہ......''

اس نے میرے حکم کی فوراً تعمیل کی اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟''

اس نے مجھے نہیں پہچانا تھا کیونکہ میں نسبتاً تاریک گوشے میں کھڑا تھا۔ میں نے کہا۔ ''آغا! میں موت کا دوسرا نام ہوں۔ جلدی بتاؤ، یارن خان کا مال کہاں ہے؟''

''کک...... کون سا مال...... میرا خان جی سے کیا تعلق ہے؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟'' مارے گھبراہٹ اور دہشت کے اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

''تت...... تم نے حویلی پر حملہ کیا تھا؟''

''ہاں! اور اب میں تمہارے سر پر پہنچ گیا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ یارن خان نے دو بندے تمہاری تحویل میں دے رکھے ہیں۔ اول فول مت بکو، سیدھی طرح بتاؤ کہ وہ کہاں ہیں؟''

''مم...... مجھے کچھ معلوم نہیں۔ خدا کی قسم!'' وہ گھگھیایا۔ میں اس کی دماغی کیفیت کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ اس کے سامنے درندوں بھرا جنگل تھا، عقب میں جلا کر خاکستر کرنے والی آگ...... میری گولی سے بچتا تو یارن خان کے ہاتھوں بدترین موت کا شکار ہو جاتا، گڑگڑایا۔ ''نن...... نہیں...... میں تو درویش سا بندہ......''

میں نے قدم بڑھایا اور گن کی نال اس کی گدی پر رکھ دی۔ خونخوار لہجے میں ایک ناقابلِ اشاعت گالی دے کر بولا۔ ''آغا! میں تمہاری درویشی کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ مجھے چکر نہ دو بلکہ سیدھی طرح بتاؤ کہ اس قبر کے نیچے کیا ہے؟''

اس کی آنکھیں پھٹنے کو آ گئیں۔ ہکلا کر بولا۔ ''دس...... بڑے سائیں جی دفن ہیں یہاں۔''

''تم سائیں کی مالش کرنے گئے تھے نیچے؟'' میں نے طنزاً کہا۔ ساتھ ہی قبر کی طرف دیکھا۔ میری توجہ ہٹنے کے بعد وہ بغیر کوئی آواز پیدا کیے اوپر کی جانب کھسک گئی تھی جس سے تہ خانے کا دہانہ بند ہو گیا تھا۔ میں نے گن پر دباؤ بڑھایا اور غرا کر کہا۔ ''چلو! تہ خانے کا دروازہ کھولو۔''

چونکہ اندھیرا تھا، اس لیے میں اس کے سرخ و سپید چہرے پر موت کے ہولناک سایوں کا رقص دیکھنے سے محروم تھا مگر اس کی آواز سے مترشح غیر معمولی ارتعاش سے اس کی زبوں حالی کا اندازہ کر سکتا تھا۔ وہ لرزیدہ بولا۔ ''تم وہاں کیا کرو گے جا کر۔ وہاں کک...... کچھ نہیں۔ صرف چلہ کشی کا حجرہ ہے۔''

میں نے اُسے ایک سماعت شکن گالی سے نوازا اور دانت پیس کر اپنا حکم دہرایا۔ وہ زانی تھا۔ ایسا شخص دلیر نہیں ہوتا، بزدل ہوتا ہے۔ اس نے فوراً ہی سپر ڈال دی اور سر جھکا کر قبر کی طرف بڑھا۔ بڑی سی سبز چادر کے نیچے ہاتھ ڈال کر کوئی لیور کھینچا۔ 'کٹاک' کی آواز سنائی دی۔ پھر قبر کے تکیے کی جانب کھڑا ہو کر دونوں ہاتھوں سے پائینتی کی طرف دھکیلنے لگا۔ میں جلدی سے اُس کے عقب میں پہنچا۔ اس کے پیروں کی طرف دیکھا۔ قبر کے ہٹتے ہی کوئی ڈیڑھ سوا فٹ کا گڑھا نمودار ہو گیا تھا جس میں ایک آدمی کے پہلو

کے بل اُترنے کی گنجائش تھی۔ میں نے اُسے نیچے اُترنے کا حکم دیا۔ اس نے قبر میں اُترنے میں غیر معمولی سرعت اور ہوشیاری کا مظاہرہ کیا تو میں بُری طرح چونک گیا۔ ڈرا کہ وہ کوئی چال نہ چل دے۔ تبھی میں نے آنِ واحد میں گن ہوا میں بلند کی اور چشم زدن میں اس کے سر پر دے ماری۔ وہ 'اوغ' کی دردناک آواز نکال کر خلا کے عقبی کنارے سے ٹکرایا اور نیچے ڈھے گیا اور میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ نیچے گھٹاٹوپ اندھیرا تھا مگر میں نے اُترنے میں دیر نہیں کی۔ جونہی عمودی سیڑھیاں اُترا، میرے پاؤں چھ سات فٹ نیچے فرش پر پڑے نورن آغا کے جسم پر پڑے۔ وہ ضرب کی تاب سے بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔

آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کچھ دیکھنے کی کوشش کی مگر تاریکی میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے تیزی سے ہاتھ مارے اور نورن آغا کے لباس کی تلاشی لی۔ میری توقع کے عین مطابق اور اس کے چغے کے پہلو والی جیب سے ایک پنسل ٹارچ برآمد ہو گئی۔ میں نے ٹٹول کر اس کا بٹن تلاش کیا۔ اندھیرے کا تسلط ایک ننھے سے ڈیڑھ والٹ کے بلب نے توڑ کر رکھ دیا اور چاروں شانے چت لیٹا نورن آغا نظر آنے لگا۔

میں نے اس کا سرسری معائنہ کیا۔ باوجود کہ گن کی ضرب شدید نہیں تھی، وہ واقعتاً بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس کے اتنا غفیل ہونے میں سر کی چوٹ سے قبل اچانک طاری ہونے والی میری دہشت اور موت کے ڈر کا مرکزی کردار تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں قبر کو آگے کھسکانے کا میکنزم تلاش کرنے کی کوشش کی مگر دیوار پر کوئی سوئچ بورڈ یا لیور نہیں ملا۔ سمجھ گیا کہ اس میں کوئی برقی نظام کام نہیں کرتا بلکہ اُسے کھولنے اور بند کرنے کے لیے ہاتھوں کی مدد سے دھکیلا جاتا تھا۔ اس میں کوئی ننھا سا لاک لگا ہوا تھا جو کھلتے وقت 'کٹاک' کی آواز پیدا کرتا تھا۔ باہر والا لاک سبز چادر کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ اندر والا لاک لیور ڈھونڈنے کے باوجود نہیں ملا تو میں نے قبر کو کھلا چھوڑ کر آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا اور پلٹ کر اس سرنگ کا جائزہ لیا۔ جہاں میں کھڑا تھا، وہاں سرنگ کی بلندی چھ سات فٹ تھی۔ جنوبی جانب تین چار فٹ کے بعد فرش بلند ہو جاتا تھا جس کی وجہ سے سرنگ کی اونچائی کم ہو کر محض تین چار فٹ رہ جاتی تھی۔ سبھی دیواریں بے رنگ مگر پلستر شدہ تھیں۔ میں نے آغا کے بدن کو کھینچ کر تنگ راہداری میں ڈالا۔ کنپٹی پر زور سے گن کا کندا مارا۔ اس نے عالمِ بے ہوشی میں ایک زوردار جھٹکا لیا۔ 'ہائے اماں' کی صدائے بے اختیار بلند کی، سر کو دائیں بائیں پٹخا پھر ایک طرف گردن ڈال دی۔ اب میں اس کی طرف سے بے فکر اور مطمئن ہو کر اپنا کام سرانجام دے سکتا تھا۔

میں گھٹنوں کے بل چلتا ہوا سرنگ میں آگے بڑھا۔ دس بارہ فٹ کے بعد سرنگ میں نیچے کی جانب سیڑھیاں جاتی ہوئی دکھائی دیں۔ سیڑھیاں اُترتے ہی میں نے سکھ کا سانس لیا کیونکہ اب مجھے چوپائیوں کی طرح چلنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ پندرہ فٹ طویل گیلری نما سرنگ کا اختتام ایک نہایت کھلے اور سرد کمرے میں ہوا۔ اس زیرِ زمین کمرے کی اونچائی محض آٹھ فٹ یا دو چار انچ کم رہی ہو گی۔ یہاں سردی ازحد زیادہ جبکہ سیلن اور گھٹن کا معمولی سا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی کمرے میں گھمائی۔ یہ آٹھ ضرب پندرہ فٹ کا کمرا اتمام تر ضروری سہولیات سے مزین تھا۔ میں نے دائیں ہاتھ پر سوئچ بورڈ دیکھ لیا جس پر قطار میں سات آٹھ بٹن لگے ہوئے تھے۔ باری باری بٹن دباتا گیا۔ کمرا یکبارگی روشن ہو گیا۔ میری آنکھیں چند لمحوں کو چندھیائیں پھر روشنی کی عادی ہو گئیں۔ میرے عقب میں گیلری میں سیڑھیوں کے عین اوپر ایک دودھیا بلب جل اُٹھا۔ تنگ راہداری میں بے ہوش پڑا ہوا نورن آغا نظر آنے لگا۔ یہ کمرا بھی چھوٹا سا عجائب کدہ معلوم ہوتا تھا۔ داہنی دیوار میں نصب شدہ چوبی دروازہ باتھ روم کی نشاندہی کر رہا تھا جبکہ اُلٹے ہاتھ والی دیوار کے ساتھ فرش سے چھت تک مختلف سائزوں کے گتے کے کارٹن اوپر نیچے ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ اسی دیوار کی اوپر والی نکڑ میں ایک گول سوراخ تھا جس میں بے آواز ایگزاسٹ فین چل رہا تھا۔ اس کے مقابل میں داہنی دیوار پر بھی ایک ایگزاسٹ نصب تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ایک پنکھا ہوا کمرے میں کھینچ رہا تھا جبکہ دوسرا اندر کی ہوا کو باہر کہیں پھینک رہا تھا۔ یقینی طور پر ان پنکھوں کے اوپر لوہے یا پلاسٹک کے پائپ نصب ہوں گے۔

داہنی نکڑ میں ایک چھوٹی سی چوبی میز پڑی تھی جس پر ایک ٹیپ پلیئر دھرا تھا۔ ٹیپ پلیئر سے رنگ برنگی باریک تاریں نکل کر دیوار کے ایک گول سوراخ میں داخل ہو رہی تھیں۔

میرے سامنے لوہے کے پائیوں والی تین چارپائیاں پڑی تھیں جن میں سے ایک پر کوئی لحاف میں دبکا پڑا تھا۔ دوسرا بستر خالی تھا جبکہ آخری چارپائی کا بستر مخصوص دیہاتی انداز میں ادوائن پر گول لپٹا پڑا تھا۔ میں نے بہ عجلت لحاف کھینچا۔ یہ دیکھ کر میرا دل بلّیوں اچھلنے لگا کہ اس بستر میں ایک بوڑھی عورت اپنی چھاتی سے میلے چیکٹ سانولے سے بچے کو چمٹائے پڑی تھی۔ اپنے حلیے سے دونوں بھکاری معلوم ہوتے تھے۔ بوڑھی عورت، جو یقینی طور پر میڈم شکیلہ کی اماں تھی، جاگ رہی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے مردنی کا خوف ناک تاثر مترشح تھا۔ ایک لمحے کو یوں محسوس ہوا کہ وہ مر چکی ہے مگر پھر سانسوں کی تال پر اوپر نیچے ہوتی پسلیوں کی حرکت دکھائی دی تو میں نے اطمینان کی سانس لی۔

''اماں! تم میڈم کی ماں ہو ناں؟ اور یہ سیمو ہے ناں؟'' میں نے ہیجانی انداز میں پوچھا۔

اس کی پتلیوں نے حرکت کی۔ مجھے عجیب بے تاثر آنکھوں سے دیکھتی رہی پھر ناتواں آواز میں بولی۔ ''کے آدھیں؟''

(کیا کہتے ہو؟)

میں نے اپنا سوال دہرایا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا اور سراسیمگی میں بولی۔ ''نہیں...... میں کسی میڈم ویڈم کو نہیں جانتی۔''

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا تم چندو ماہی کی اماں ہو؟''

اس کی آنکھوں میں بے یقینی مچلی۔ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے استخوانی وجود سے چمٹا ہوا بچہ بھی اُٹھ بیٹھا اور آنکھیں ملنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''اماں! جلدی سے اُٹھو۔ اپنے بیٹے کو بھی اُٹھاؤ۔ ہمیں فوراً یہاں سے نکلنا ہے۔ میں چندو ماہی کے کہنے پر تمہیں اس قید خانے سے نکالنے کے لیے آیا ہوں۔''

میں نے بوڑھی کے پنجر جیسے وجود کو دیکھ کر اندازہ لگایا تھا کہ وہ شاید اُٹھنے کے قابل ہی نہیں رہی تھی مگر جونہی اس کے کانوں میں میری بات پڑی، وہ غیر معمولی پھرتی سے چارپائی سے اُتری۔ سیمو بھی حیران آنکھوں سے مجھے اور اپنی ماں کو دیکھتا ہوا چارپائی سے اُتر آیا۔

اماں بولی۔ ''چل پتر! متاں دیر تھی ونجے۔''

(چل بیٹا! مبادا کہ دیر ہو جائے)

میں نے دیکھا کہ ان دونوں کے جسموں پر باریک اور عمومی گھریلو نوعیت کے غریبانہ لباس تھے۔ دونوں کے پاؤں ننگے تھے جبکہ باہر سردی زوروں پر تھی۔ میں نے کھیس یا چادر کی تلاش میں نظر دوڑائی۔ کمرے میں سرہانے، گدے اور رضائیاں تھیں، چادر نہیں تھی۔ مایوسی ہوئی۔ میں نے کندھے اُچکائے، جی ہی جی میں 'اللہ مالک ہے' کا نعرہ لگایا اور تہ خانے سے نکلنے کا ارادہ کیا۔ ایسے میں ٹیپ پلیئر پر نظر پڑ گئی۔ چونکہ میں نے سوئچ بورڈ کے سبھی بٹن آن کر دیے تھے، اس لیے ٹیپ پلیئر کا ننھا سا سرخ بلب بھی روشن ہو گیا تھا۔ میں نے والیم کی ناب گھما کر آواز کم کی اور 'پلے' کا بٹن دبا دیا۔ ٹیپ پلیئر میں موجود کیسٹ چل پڑا اور 'زوں زوں' کی عجیب آوازیں ٹیپ کے اسپیکر سے برآمد ہونے لگیں۔ یوں لگا جیسے زوروں کی آندھی چل رہی ہو۔ پھر آوازیں بدل گئیں اور ایک بھیانک قہقہہ اسپیکر سے ابل پڑا۔ چند لمحوں میں ہی اس ٹیپ پلیئر کی یہاں موجودگی کا سبب معلوم ہو گیا۔ چاچے چراغ کے مکان کے پچھواڑے کے گھنے جنگل میں ایندھن کاٹنے کے بہانے قدم رکھنے والے یہی آوازیں سنتے تھے اور ڈر کے مارے دوڑ جاتے تھے۔ وہ گاؤں میں جا کر جنگل سے سنائی دینے والی آوازوں کا وہ خوفناک حصار کھینچتے کہ سننے والے کانوں کو ہاتھ لگا کر دل ہی دل میں تہیہ کر لیتے کہ وہ زندگی بھر اس جنگل کا رُخ نہیں کریں گے۔

یہ تہ خانہ اس جنگل کے عین نیچے بنایا گیا تھا۔ چنداں حیرت ہوئی کہ سائیں دل جیت شاہ نے کس طرح مجھ سمیت تمام گاؤں والوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اتنا بڑا تہ خانہ تعمیر کرا لیا تھا۔ نجانے درویش سائیں جگ جیت شاہ کی دفن شدہ میت اس نے کہاں نکال پھینکی تھی؟ اس تہ خانے کو کھودنے کے دوران نکلنے والی مٹی کہاں پھینکی تھی؟

میں حیرانی سے تہ خانے کے بے رنگ در و دیوار دیکھتا رہا پھر کندھے اُچکا کر سرنگ میں داخل ہو گیا۔

اماں سیمو کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیوں پر ٹھہر گئی تھی۔ میں بھانپ گیا کہ وہ راہداری میں لم لیٹ پڑے نورن آغا کو دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ میں پہلو بچا کر آگے نکلا اور انہیں اپنے پیچھے راہداری میں آنے کا اشارہ کیا۔ گھٹنوں کے بل آگے بڑھا۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے میری تقلید کی۔ راہداری عبور کر کے میں نے نورن آغا کو کھینچ کر فرش پر لڑھکا دیا۔ اس کی نبض اور دھڑکن چیک کی۔ کنپٹی دیکھی۔ گن کی دونوں ضربات سے اس کی جلد دو جگہوں سے پھٹ گئی تھی اور خون نکل کر بالوں میں جم گیا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر میں نے اندازہ کیا کہ وہ کم و بیش چار پانچ گھنٹوں سے پہلے ہوش میں آنے والا نہیں تھا۔ ہمیں کسی محفوظ جگہ پر پہنچنے کے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ سیڑھیوں پر لگے ہوئے بلب کی روشنی میں مجھے چھت میں لگا ہوا ننھا سا آہنی کنڈا نظر آیا۔ اُسے کھینچ کر دیکھا تو پتا چلا کہ وہ قبر نما ڈھکن کا قفل تھا۔ کونے میں ایک ننھا سا سوئچ بورڈ بھی آویزاں تھا جس پر صرف ایک بٹن نصب تھا۔ میں نے اُسے آن کیا، کچھ نہ ہوا، پھر آف کیا تو سرنگ

کے پار جلنے والی سبھی بتیاں گل ہو گئیں۔ میں نے اُسے دوبارہ آن کیا مگر کوئی بتی روشن نہ ہوئی۔

اندھیرے اور جگہ کی تنگی کے سبب میں نے دونوں ماں بیٹے کو بڑی مشکل سے خلا سے گزار کر مقبرے کے فرش پر پہنچایا۔ آخر میں خود باہر نکلا۔ قبر کی پائنتی کی جانب کھڑے ہو کر قبر کو دھکا لگایا۔ وہ سر کی جانب کھسک گئی اور 'کٹاک' کی آواز کے ساتھ مقفل ہو گئی۔ اماں ششدر کھڑی قبر کو گھور رہی تھی۔ قبر میں اترنے والا ابھی باہر نہیں نکلتا۔ اس کے لیے یہ تصور بڑا خوفناک تھا کہ وہ چند لمحے پہلے قبر سے نکلی تھی۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائی جس کی مجھے سمجھ نہ آئی۔ میں نے دروازے کے باہر صحن میں جھانک کر دیکھا۔ میدان صاف تھا۔ آج کی شب میری خوش بختی عروج پر تھی اور میری انگلی تھام کر چل رہی تھی۔

دونوں کو ساتھ لیے پرسکون چلتے ہوئے مزار کے احاطے سے نکل آیا اور جنوبی سمت بڑھا۔ یہاں سے کچھ ہی فاصلے پر میرا ڈیرا واقع تھا جہاں میں نے تقریباً آدھی رات گزاری تھی۔ کوئی لائحہ عمل نہ ہونے کی بدولت سر دست میرا ارادہ ڈیرے پر جانے کا تھا۔

آدھا سفر طے کر لیا تو ایک خیال کوندے کی طرح ذہن میں لپکا اور میں بے اختیار تھم گیا۔ اماں اور سیمو کو ایک کھال کے بنے پر درختوں کے بیچ بٹھایا اور دوڑنے کے سے انداز میں چلتا ہوا مزار کی طرف بڑھا۔ چند لمحوں بعد میں مزار کے پچھواڑے جنگل میں تھا۔ میں نے اپنے چھپا کر رکھے ہوئے سامان سے اپنا لباس نکالا اور واپسی کا قصد کیا۔ اماں کے پاس پہنچ کر اپنے خون آلود چست لباس کے اوپر کھلا لباس اور کوٹ پہن لیا۔ چادر اوڑھ لی۔ خون آشام رات کے تمام نقوش چھپ گئے۔ سردی کا احساس بھی کم ہو گیا۔ گن کو لباس میں چھپا لیا اور پگڈنڈی پر چل پڑا۔ اماں اور سیمو میرے پیچھے آ رہے تھے۔

میں نے از راہِ ہمدردی کہا۔ ''اماں! دیکھ کر چلنا۔ پیروں میں کوئی کانٹا نہ چبھ جائے۔''

''ناں پتر! رب سوہنے اساں جئے غریباں کوں کاٹھ دی تلیاں لا ڈتین۔ کنڈے کے آکھدِن ساکوں!'' اماں کی آواز میں بلا کی کسمپرسی شامل تھی۔

(نہیں بیٹا! رب سوہنا ہم جیسے غریبوں کو لکڑی کی تلیاں لگا دیتا ہے۔ کانٹے کیا کہتے ہیں!)

اس نے ایک آہ بھری اور کہا۔ ''ساری عمر انہی کانٹوں پر ننگے پیروں چلتی رہی ہوں۔ کام کاج کرتی رہی ہوں۔''

وہ درست کہہ رہی تھی۔ میں نے اُس کا گھر اور رہن سہن دیکھا تھا۔ وہاں رہ کر زندگی کی ناؤ کھینے والی عمر رسیدہ عورت کا بدن کانٹوں کا عادی ہو جاتا ہے۔

ان دونوں کی بازیابی پر میرا دل فرطِ مسرت سے معمور ہو گیا تھا۔ میں نے ایک انہونے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ پلٹ کر جنگل میں چھپا کر رکھا ہوا لباس میں نے اس لیے نکال کر پہنا تھا کہ میرا خون آلود چست لباس میرے لیے پریشانی کا باعث نہ بنے۔ اس لباس میں میری رقم بھی موجود تھی۔ میں نے فوراً ارادہ کیا کہ میں اپنے ڈیرے پر رکنے کے بجائے سیدھا چلتا رہوں گا۔ پانچ چھ کلومیٹر کا فاصلہ نصف گھنٹے میں طے کر کے میں طلوعِ فجر سے پہلے بڑی سڑک پر پہنچ سکتا تھا جہاں سے مجھے ملتان کے لیے بس یا ویگن مل سکتی تھی۔ علی الصباح نکلنے والی گاڑیوں میں سیٹ بہ آسانی مل جایا کرتی تھی۔ میں طویل سفر پیادہ کر سکتا تھا جبکہ اماں اور سیمو ناتواں تھے۔ تبھی میں نے پوچھا۔ ''اماں! کیا تم تین چار میل پیدل چل لو گی؟''

وہ دیکھنے میں ہڈیوں کا پنجر لگتی تھی؛ اَب تب میں گرتی محسوس ہوتی تھی مگر کمال اعتماد سے بولی۔ ''کیوں نہیں پتر! میں بھی چل لوں گی اور میرا پتر سیمو بھی۔''

اماں کا حوصلہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا۔ اپنے ڈیرے کے سامنے پہنچ کر ایک ذرا رُکا۔ حسرت کناں نظروں سے دیکھا پھر ہوا میں ہاتھ لہراتے ہوئے دل میں کہا، ''الوداع! میرے نور پور...... الوداع! قسمت نے ساتھ دیا تو پھر کبھی آؤں گا، تمہیں دن کے اجالے میں کھلے عام دیکھنے کے لیے۔ آج مجبور ہوں مگر کسی مجبوری کو ہمیشگی نہیں ملتی۔''

چشمِ تصور میں غزالہ کا سراپا لہرایا، ایک دل پرور آواز روح سے کھیلی۔ ''تیڈا رب راکھا میڈے شہر یارا! سوہنا رب تیکوں اپنی امان وِچ رکھے......''

(تمہارا اللہ نگہبان ہو میرے شہریار! سوہنا رب تمہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے)

مجھے کھال کے نکے پر پڑا ہوا ایک ڈنڈا مل گیا۔ اُسے اُٹھا کر ہاتھ میں پکڑ لیا تاکہ کتوں کے متوقع حملوں سے بچا جا سکے۔

آسمان پر چاند کا راج آخری سانسیں لے رہا تھا۔ کسی بھی وقت داغِ مفارقت دے سکتا تھا مگر فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔ جب تک وہ اوجھل ہوتا، صبح کا اجالا پھیلنا شروع ہو جاتا۔ سیمو نے ایک دو مرتبہ سردی کا واویلا کیا مگر اماں نے روایتی انداز میں ڈانٹ کر خاموش کرا دیا۔ چونکہ میرا بازو

اور ٹانگ دکھتی تھی، سر میں درد بھی تھا، اس لیے میں اسے اُٹھا کر چلنے کی ہمت نہ کر پایا۔ اندازے کے مطابق ہم آدھے گھنٹے سے کچھ ہی زیادہ وقت میں مین روڈ پر پہنچ گئے۔ ٹریفک رواں دواں تھی۔ اماں کا حوصلہ قابلِ داد تھا۔ سیمو تھک گیا تھا تبھی سڑک کے کنارے پر تھک کر پہلو کے بل پڑے ہوئے سنگِ میل پر بیٹھ گیا۔ میں نے سمجھایا۔ ''اماں! ہم بس یا ویگن میں خاموشی سے سفر کریں گے۔ باتیں نہیں کریں گے۔ ٹھیک ہے ناں؟''

اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ رواں دواں ٹریفک کی ہیڈ لائٹس میں اُمید کی قندیلیں جلتی بجھتی رہیں پھر ایک بس ہمارے قریب آن رکی۔ کنڈیکٹر نے گیٹ کا شیشہ کھول کر سر باہر نکالا اور چیخ کر پوچھا۔ ''توں ملتان ویسیں جوان؟''

(جوان! ملتان جاؤ گے؟)

میں نے جلدی سے کہا۔ ''ہاں!''

اس نے دروازہ کھولا۔ میں نے اماں اور سیمو کو بس پر چڑھایا۔ بس کا پچھلا آدھا حصہ خالی تھا۔ میں نے ایک تین والی سیٹ کا انتخاب کیا۔ سیمو اور اماں کو کھڑکی والی جانب بٹھایا اور خود گیلری والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور کرایہ کی ادائیگی کر دی۔ بس مظفر گڑھ سے نکل آئی تھی جب میرے کانوں میں سڑک کے کنارے واقع کسی مسجد کے اسپیکر سے پھوٹنے والی اذانِ فجر کی آواز پڑی۔ چھ بجے کے قریب بس نے ہمیں لاری اڈے پر اُتار دیا۔ میں نے دونوں ماں بیٹے کو ایک شیڈ کے نیچے کھڑا کیا اور پی سی او میں گھس گیا۔ باری باری میڈم شکیلہ، میرو شاہ اور پیا جی کے نمبر ڈائل کیے مگر تینوں 'پاورڈ آف' ملے۔ مجھے ایک ذرا پریشانی ہوئی پھر میں نے خود کو یہ تاویل پیش کر کے مطمئن کر لیا کہ اس وقت وہ سو رہے ہوں گے۔

میری جسمانی حالت اگرچہ بہتر نہیں تھی مگر ذہنی طور پر میں بہت آسودہ اور خوش باش تھا۔ میں نے معرکہ مارا تھا۔ وہ کام کر دکھایا تھا جس کی فردِ واحد سے سرانجام پانے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ یقین تھا کہ میڈم میرے ساتھ اماں اور سیمو کو زندہ و تندرست حالت میں دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جائے گی۔ رکشے میں بیٹھ کر میڈم کی کوٹھی کی طرف جاتے ہوئے میں انہی فرحت انگیز سوچوں کے جھولے میں جھول رہا تھا۔

رکشا کو کوٹھی سے چند قدموں کی دوری پر روک کر طے شدہ کرایہ ادا کیا اور دونوں کو ہانکنے کے سے انداز میں چلاتا ہوا کوٹھی کے مین گیٹ پر آیا۔ سورج طلوع ہوا ہی چاہتا تھا۔

ظاہر خان نے مجھے دیکھتے ہی ننھی سی کھڑکی سے سر نکالا۔ ''اوئے! چڑی مار کا بچہ! تم کون لوگ اے جو فجر ویلے ای ادھر آ گیا اے؟''

اس کے لہجے سے سخت بیزاری جھلک رہی تھی۔ میں نے قریب ہو کر سرگوشی کی۔ ''ظاہر خان! میں شہر یار ہوں۔''

وہ ایک جھٹکا لے کر پیچھے ہٹا، بہ غور دیکھ کر بولا۔ ''اے! تو جھوٹ بولتا اے مولوی...... تم کدھر کا شہر یار اے؟ چل دُم دکھا ورنہ پکڑ کر تھانے پہنچا دوں گا۔''

اس نے اپنی ٹوٹی پھوٹی اُردو میں رعب جمایا۔ میں نے پانچ منٹ کی مشاقانہ محنت سے اسے یقین دلایا کہ میں شہر یار ہوں۔ اس نے احمقانہ انداز میں ٹٹول کر میری ڈاڑھی کے نقلی ہونے کا یقین کیا پھر مجھ سے کئی نشانیاں پوچھیں۔ میرے درست جوابات پر حیران نظروں سے گھورتے ہوئے گیٹ کا بغلی دروازہ کھول دیا اور اندر آنے کی اجازت دے دی۔ اس نے میری جامہ تلاشی لی اور لباس میں چھپی ہوئی گن اپنی تحویل میں لے لی۔

''خو! یہ اپنا بندوق تو نہیں لگتا۔ یہ ایک دم ڈنڈا مال اے۔ کدھر سے مارا اے؟''

ایک لمحے کو میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ میں نے نور پور سے نکلتے ہوئے سوچا تھا کہ سڑک کے قریب پہنچ کر گن کو فصلوں میں کہیں پھینک دوں گا۔ جب سڑک پر پہنچا تو گن سے گلو خلاصی کا خیال دل سے محو ہو گیا۔ حالتِ سفر میں گن کی وجہ سے میں کسی بڑی مصیبت میں پھنس سکتا تھا۔ میں نے بتایا۔ ''یہ ادھر سڑک پر پڑی تھی۔ سوچا ظاہر خان کے کام آئے گی، اُٹھا لیا۔ تمہیں اچھی لگی ہے تو تم رکھ لو۔''

اس نے خشمگیں نظروں سے مجھے دیکھا اور سیمو اور اماں کے بارے میں استفسار کیا۔ میں نے اُسے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ یہ میرے گھر والے ہیں۔ وہ ناک پر ہاتھ رکھ کر استہزائیہ انداز میں بولا۔ ''اوئے چڑی مار کا بچہ! تم گھر والوں کو ادھر لانے سے پہلے نہلا دھلا تو لیتا۔ قسم سے بڑا بدبو آتا ہے۔''

اس نے درست کہا تھا۔ سیمو اور اماں کی حالت بڑی ناگفتہ بہ تھی۔ انہیں نہائے دھوئے نجانے کتنے دن گزر چکے تھے جس کی وجہ سے ان کے جسموں سے ناگوار بو کے بھبھوکے اٹھ رہے تھے۔ چونکہ میں فتح کے نشے میں چور تھا اس لیے میں نے ان کی زبوں حالی پر دھیان نہیں دیا تھا۔ دیتا بھی تو کیا کرتا، ان کا حلیہ بہتر کرنے کا وقت اور موقع مجھے میسر نہیں تھا۔ ظاہر خان مجھے ساتھ لیے گیسٹ ہاؤس تک

آیا۔ اس نے نیم خوابیدہ گن مین کو متوجہ کر کے دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا اور خود پلٹ گیا۔

میں نے گن مین کی مدد سے گیلری کے آخری کمرے میں دونوں ماں بیٹے کے سونے کا بندوبست کیا۔ گن مین نے باورچی کو جگا کر ہمارے لیے ناشتے کا کہا جبکہ میں نے اپنے گیسٹ ہاؤس کی وارڈروب کھول لی۔ میرا اُتارا ہوا سوٹ ہینگر پر ٹنگا ہوا تھا۔ اسے لانڈری کا چکر لگوا دیا گیا تھا۔ میں ناشتے سے پہلے اپنے میک اَپ سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ باتھ روم میں جا کر میں نے بڑی احتیاط سے ڈاڑھی اُتاری۔ باریک اور نہ دکھائی دینے والی جھلی پر خصوصی گم لگی ہوئی تھی جس کی وجہ سے ڈاڑھی اتارنے کا مرحلہ خاصا اذیت ناک تھا۔ مونچھوں میں گم سے لگے ہوئے لمبے اضافی بال نیم گرم پانی کی مدد سے اُتارے۔ آنکھوں سے لینز نکال کر محفوظ کر لیے۔ زخموں کا معائنہ کیا۔ کتوں کے کاٹنے سے بننے والے ننھے ننھے گڑھوں میں جما ہوا خون بھرا ہوا تھا جسے میں نے کریدنا مناسب نہ سمجھا۔ بھرپور شاور لینے کے بعد جب میں باتھ روم سے نکلا تو بازو اور پنڈلی میں شدید درد ہو رہا تھا جبکہ جسم نسبتاً ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ زخموں کی نوعیت کو دیکھنے کے بعد مجھے ٹریٹ منٹ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ گن مین کو بھیج کر بالائی منزل سے فرسٹ ایڈ کٹ منگوائی۔ اس کی معاونت سے زخموں کی بینڈیج کی۔ دو چار گولیاں پھانکیں اور بیڈ پر دراز ہو گیا۔ باورچی کو میں نے ہدایت کی کہ جونہی میڈم جاگیں، انہیں میری آمد کی اطلاع دی جائے۔ سیمو اور اماں کا خصوصی طور پر خیال رکھنے کی تاکید بھی کر دی۔ ملتان سے نکلنے کے بعد مجھے اچھی اور گہری نیند نصیب نہیں ہوئی تھی۔

چونکہ خونیں تگ و دو کا انجام فتح تھا، اس لیے تھکن عذابِ جاں نہ تھی بلکہ فرحت افزا تھی۔ میڈم نے مغویوں کا کھوج لگانے کا کام سونپا تھا جو درحقیقت کارِ بے کار تھا۔ میرے ہاتھ میں ایسی اُلجھی ہوئی ڈور تھمائی گئی تھی جس کے کسی سرے پر کامیابی کا سہرا نہیں سجا تھا مگر میں نے نہ صرف کھوج نکالا بلکہ انہیں بہ سلامتی اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ میڈم شکیلہ نے میرے علاوہ اپنے تجربہ کار گینگ کو میرو شاہ کی سربراہی میں اماں اور سیمو کی بازیابی پر روانہ کیا تھا۔ چونکہ میں نے انہیں نور پور میں نہیں دیکھا تھا، اس لیے میں یہ سمجھنے میں حق بجانب تھا کہ وہ ابھی تک ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہوں گے۔ ان کے موبائل فون بند تھے ورنہ میں تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر گیسٹ ہاؤس کے فون پر ان سے رابطہ کرتا اور ان کی کارگزاری پر استفسار کرتا۔

خانزادی اسما بونس میں ہاتھ لگی تھی۔ میں جب بھی اُس کے بارے میں سوچتا تو دل میں ایک ٹیس اُٹھتی تھی۔ میرا ضمیر بالواسطہ طور پر اس پر بیتنے والے غیر فطری واقعات کی ذمے داری مجھ پر ڈالتا اور ملول کر دیتا تھا۔ اس کا دھندلا چہرہ چشمِ تصور پر طلوع ہو گیا۔ وہ بالترتیب میڈم شکیلہ، میاں دلبر اور یارن خان کے عقوبت خانوں کی یاترا سے قبل اتنی پژمردہ، مضمحل اور شکست خوردہ نہیں تھی۔ اس کا چہرہ گل گوں تھا۔ اس کے حسن کو جس بے دردی سے پامال کیا گیا تھا، انسانیت سوز تھا۔ دکھ ہوا۔ دماغ نے بہلاوا دیا۔ ”غم نہ کرو، اسما اکیلی نہیں جس کی ذات کی غلام گردشوں میں ناپاک قدم رکھے گئے ہیں۔ چونکہ وہ امیر زادی تھی، اس لیے واویلا زیادہ ہوا ورنہ غریب زادیوں کی عصمت دری کے واقعات حیطۂ شمار سے باہر ہیں۔“

مجھے بخشو لوہار کی ضعف کے مارے چیختی چلاتی سائیکل پر سوار ہو کر اسما کی طرف جانے والے کھالے کا خیال آیا تو لبوں پر مسکراہٹ آن ٹھہری۔ بند آنکھوں کے پردوں پر کھالے کا سنولایا ہوا چہرہ فرطِ مسرت و جذبات سے سرخ ہوتا نظر آیا۔ خوشی میں وہم کا ننھا سا کانٹا چبھ گیا۔ کھالا شوق و جوش میں اسما کو لے کر بلوچ نگر پہنچا ہو گا تو حیدر خان نے اس کا سواگت کس انداز میں کیا ہو گا؟ کہیں بیٹی کو اجڑے حالوں دیکھ کر برہم ہونے والے خانزادے کے تمام تر غصے کا شکار ہی نہ ہو گیا ہو؟...... اگر اس کے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی تو وہ پھر مجھ پر آگ بگولا ہو کر چڑھ دوڑے گا۔ عافیت کی ایک ہی صورت باقی تھی کہ اسما فوری طور پر اپنے بابا کو خود پر بیتنے والے جملہ واقعات سے آگاہ کر دے اور کھالے کی پوزیشن خان کی نظروں میں بہتر ہو جائے۔ اسی ذہنی ادھیڑ بن نے اپنی تمام تر شوریدہ سری نیند کی دیوی کی دہلیز پر ڈھیر کر دی اور میں دنیا و مافیہا سے غافل ہو گیا۔

کوئی دو بجے کا عمل تھا جب میری آنکھ کھلی۔ میں نے دو چار بھرپور انگڑائیاں لیں، منہ ہاتھ دھویا اور کچن کا رُخ کیا۔ کک نے میرے استفسار پر بتایا کہ میڈم کو میرے آنے کی اطلاع دے دی گئی ہے جبکہ دونوں مہمانوں کو میڈم کے حکم پر کمی مجھ کے سپرد کر دیا تھا۔ میں یہ جان کر شدید متحیر ہوا اور میڈم کی بے اعتنائی غیر فطری لگی کہ میڈم نے ایک نظر سیمو اور اماں کو دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ وہ گراؤنڈ فلور پر آئی تھی، نہ اس نے ان دونوں کو اوپر بلایا تھا۔ کجا اُن کے لیے ہلکان ہو رہی تھی اور کسی خطرے کو خاطر میں لائے بغیر ویران بیلے میں جا پہنچی تھی۔ کجا انہیں قریب پا کر بھی ایک نظر دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔

میں تگڑے لنچ سے فارغ ہونے کے بعد میڈم کے بلاوے کے انتظار میں ٹی وی آن کر کے بیٹھ گیا۔ نصف گھنٹے بعد روم انٹر کام پر زرینا نے میڈم کا پیغام دیا۔ میں چند لمحوں بعد اس کے آراستہ کمرے میں تھا۔ وہ بیڈ پر گاؤ تکیے کی ٹیک لگائے نیم دراز تھی۔ اس نے سر کی خفیف جنبش سے میرے سلام کا جواب دیا اور صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا تو وہ بہ غور مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے کہا۔ ”میڈم! کیا بات ہے؟ آپ پریشان دکھائی دے رہی ہیں۔“

اس نے جواب دینے کے بجائے میٹرس پر پڑا ہوا موبائل فون اُٹھا لیا اور کوئی نمبر ملانے لگی۔ میں اس کے غیر متوقع رویے کو دیکھ کر اُلجھ گیا۔

اس نے کریم کلر کا نفیس سوٹ زیبِ تن کر رکھا تھا۔ وول کی جھالر والا کوٹ اس پر جچ رہا تھا۔ چمک دار زلفیں شانوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ ہلکے پھلکے میک اَپ نے اس کی وجاہت کو مہمیز کر دیا تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت دکھائی دے رہی تھی مگر اس کے چہرے پر طاری سنجیدگی اور تفکر و تردد کی پرچھائیاں دیکھ کر مجھے شدید گھٹن کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ میری موجودگی سے بے نیاز ہو کر فون کانوں سے لگائے بول رہی تھی۔ ”فضول باتیں نہ کرو، رپورٹ دو۔“

مجھے گڑبڑ کا احساس ہوا۔ وہ پیش کی جانے والی رپورٹ کو کامل متانت سے سنتی رہی پھر قدرے طنزیہ لہجے میں بولی۔ ”نہیں شاہ جی! تم مان ہی لو کہ تم بوڑھے ہو گئے ہو۔ تمہارے دماغ کو زنگ چاٹ چکا ہے۔ تمہاری ساری گفتگو میں کارآمد بات یہ ہے کہ ہمارا مطلوبہ مال نور پور میں ہے۔ کہاں؟ کس کے پاس؟ یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ ہے ناں؟“

میں سمجھ گیا کہ وہ میرو شاہ اور پیاجی کی کارکردگی سے ناخوش تھی۔ ان کے لتّے لے رہی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ ”کیا ہمارے کام میں اتنی مہلت ملتی ہے، جتنی تاخیر تم لوگوں نے کر دی ہے؟ ہرگز نہیں۔ یہ آر یا پار والا دھندا ہے۔ وہ چھوٹا سا گاؤں، جس میں بہ مشکل سو کے قریب گھر ہیں، وہاں سے میری تیز طرار ٹیم اپنا مال ڈھونڈ نکالنے میں ناکام رہی ہے۔ شاہ جی! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یارن خان کیا چاہتا ہے؟ کیا میں شکست تسلیم کرتے ہوئے اس کے آگے سر جھکا دوں، اپنا بنا بنایا سیٹ اَپ اس کے حوالے کر دوں اور بے نشانوں سی زندگی گزاروں؟“ تھوڑے وقفے کے بعد بولی۔ ”نہیں! تم ملتان آ جاؤ۔ تمام ساتھیوں کو لے آؤ۔ شہر یار اکیلا انہیں یارن خان کے پنجوں سے نکال لایا ہے۔“

اس نے منہ بنا کر فون بند کر دیا۔ پھر دوسرا نمبر ڈائل کیا۔ نخوت سے بولی۔ ”سراج الدین! گولی چلا کر کسی کو زمین چٹانا بڑی بات نہیں ہوتی۔ بڑی بات یہ ہے کہ سینے کی طرف آتی ہوئی گولی کو جھکائی دے کر خطا کر دیا جائے۔ پھر کیا ہوا کہ تم لوگ ابھی تک ایک چھوٹے سے مشن میں اُلجھے ہوئے ہو؟“

وہ پیاجی کی کلاس لے رہی تھی۔ دور بیٹھ کر کان کھینچ کر واپسی کا حکم دے رہی تھی۔ فون بند کرنے کے بعد میری طرف متوجہ ہوئی، بولی۔ ”شہر یار! تمہارے پاس بتانے کے لیے کیا کچھ ہے؟“

میں نے پیاجی سے میک اَپ کرانے سے لے کر سیمو اور اماں کو گیسٹ ہاؤس کے آخری کمرے میں پہنچانے تک کی جملہ روداد بلا کم و کاست پیش کی۔ وہ انہماک سے سنتی رہی۔ اس دوران اس کے لبوں سے ایک کلمۂ تعریف تک نہ نکلا۔ مجھے تند نظروں سے گھورتے ہوئے بولی۔ ”تمہیں یاد ہے کہ میں نے تمہیں کیا مشن سونپا تھا؟“

”آپ نے مجھے نور پور میں اماں اور سیمو کا سراغ نکالنے بھیجا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

”پھر؟“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

”میں نے اپنا کام مکمل کر دیا۔“ مجھے اس کا رویہ پسند نہیں آ رہا تھا۔

”یعنی؟“

”یعنی میں نے نہ صرف ان دونوں کو نہ صرف ڈھونڈ لیا بلکہ انہیں یارن خان کے عقوبت خانے سے بہ حفاظت نکال بھی کر لیا۔“ میرے لہجے میں تفاخر کی نمایاں آمیزش تھی۔

”کیا میں نے تمہیں یہ کہا تھا کہ تم یارن خان پر چڑھ دوڑو اور خون کی ندیاں بہا دو؟“ اس نے کاٹ دار انداز میں پوچھا۔

میرے حلق سے طویل سانس خارج ہوئی۔ میں سمجھ گیا کہ میں نے حکم کی تعمیل سے تجاوز کیا تھا جو اُسے ناگوار گزر رہا تھا۔ میں خاموش رہا تو وہ درشت لہجے میں بولی۔ ”شہر یار! میں نے غنڈوں اور چور اُچکوں کا گروپ بنایا ہے، منتشر مزاج کے لوگوں کو ایک چھت تلے جمع کیا ہے۔ میں نے ایک منظم اور مربوط فرم بنائی ہے جس کا ہر فرد ایک معمول اور نظام کے مطابق کام کرتا ہے۔ تم نے حد سے تجاوز کیا، ایک طرح سے میری فرم کے قوانین سے بغاوت کی، جسے میں سخت ناپسند

کرتی ہوں اور اس روپے کو اوور ایکٹنگ قرار دیتی ہوں۔"

اس کا انداز بڑا تضحیک آمیز اور آمرانہ تھا۔ پہلی مرتبہ مجھے اپنے آپ کو اس کی ماتحتی میں دینے کا فیصلہ بُرا لگا۔ میں نے اس کے لیے اپنی جان جوکھوں میں ڈالی تھی، شب بھر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی تھیں اور وہ ستائشی جذبات سے نوازنے کے بجائے میری انسلٹ کررہی تھی۔ مجھے اپنی فرم کے اصول وضوابط بتارہی تھی۔ شدید ذہنی اذیت نے میری زبان گنگ کردی۔ چند لمحوں تک اُسے دیکھتا رہا، پھر کھڑا ہوگیا، بولا۔ "یس میڈم! آپ نے بالکل درست کہا ہے۔ مجھے حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں اپنی غلطی پر نادم ہوں اور معافی چاہتا ہوں۔"

دُکھ سے میرا لہجہ بھرا گیا اور میں نے اس سے نظریں ہٹاتے ہوئے دروازے کا رُخ کیا۔

وہ دہاڑی۔ "تم کہاں جارہے ہو؟ تم شاید بھول گئے ہو کہ بغیر اجازت جانا یہاں کے آداب کے منافی ہے۔"

میں پلٹے بغیر ایک ذرا رُکا، بولا۔ "میں نہیں بھولا۔ آپ بھول گئی ہیں کہ میں ایک دیہاتی آدمی ہوں۔ میں فارمیلٹیز پر اتنا دھیان نہیں دیتا جتنا کام کی انجام دہی پر۔ آپ بھول گئی ہیں کہ آپ نے یہ کہہ کر کہ میں آپ کا دوست ہوں، نوکر نہیں، مجھے اوقات سے باہر کیا تھا۔ اسی ہوا میں اڑتا ہوا یارن خان کی حویلی میں داخل ہوا تھا۔ میں نے احتیاط برتی تھی کہ میرے ہاتھوں کسی کی جان تلف نہ ہو مگر مجبوراً مارا ماری کرنا پڑی۔ میں نہ کرتا تو خان کے باڈی گارڈز مجھے پچھاڑ دیتے۔ خان پر ہاتھ ڈالنا ناگزیر ہوگیا تھا۔ جب مجھے پتا چل گیا کہ میرے مطلوبہ کہاں مقید تھے تو کیا میں آپ کے پاس رپورٹ دینے کے لیے بھاگ آتا؟ اس دوران بپھرا ہوا یارن خان ان دونوں کا ٹنٹا نکال دیتا یا انہیں کہیں اور لے جاکر پھینک دیتا۔ ایسا ہی ہوتا ناں؟ پھر کیا میں سر اُٹھا کر آپ کو رپورٹ دیتا اور کہتا کہ جو کام میرے ذمے لگایا گیا تھا، میں نے کر دکھایا، حکم سے تجاوز نہیں کیا۔ میڈم! آپ ٹھیک کہتی ہیں کیونکہ آپ مالکن ہیں، اس فرم کی مختیارِکل ہیں جس کا میں معمولی سا نوکر ہوں، کسی کا دوست نہیں ہوں، اس لیے جو کہتا ہوں، وہ غلط ہوتا ہے۔ جو کرتا ہوں، وہ غلط ہوتا ہے۔"

میری آواز جذبات سے مغلوب تھی۔ سانس لے کر دوبارہ گویا ہوا۔ "میڈم! مجھے کسی بھی زخم نے اتنا مضطرب نہیں کیا جتنا آپ کی زبان سے ملنے والے زخم نے کیا ہے۔ میں جارہا ہوں۔ جب آپ کا موڈ ٹھیک ہوجائے گا، تب بلائیے گا، میں آجاؤں گا۔"

میرا رویہ نامعقول تھا مگر اس وقت مجھے احساس نہیں تھا کیونکہ تضحیک نے میرے حواس مختل کردیے تھے۔ میں تو توقع لے کر میڈم کے کمرے میں آیا تھا کہ وہ میرے کارنامے پر خوشی سے پھولے نہیں سمائے گی، وہ الٹا ناراض تھی اور میری دانست میں اُس کی خفگی بے محل تھی۔ میں نے دروازہ کھول کر نکلنا چاہا تو میڈم کی تحکمانہ آواز سنائی دی۔ "شہر یار! کم بیک......"

میں تھما، آزردگی سے بولا۔ "نہیں پلیز! مجھے جانے دیں۔"

وہ بیڈ سے اُتر کر ننگے پاؤں قالین پر چلتی ہوئی میرے عقب میں پہنچ گئی۔ شانے سے پکڑ کر اپنی جانب موڑتے ہوئے بولی۔ "جذبات انسان کو اندھا کردیتے ہیں۔ ہر معاملے کو جذباتی نظر سے دیکھو گے تو دھوکے پر دھوکا کھاؤ گے۔ تم نے ایک نہیں، دو بھیانک غلطیاں کی ہیں۔ سنو! تمہیں یارن خان کے قریب ہرگز نہیں جانا چاہیے تھا کیونکہ تم نہیں جانتے کہ وہ کتنا موذی اور خطرناک ناگ ہے۔ ڈستا ہے تو پانی تک پہنچنے نہیں دیتا۔ مجھے علم تھا کہ اس کی حویلی کے نیچے ایک طلسماتی دنیا آباد ہے۔ میں نے اُس میکرم سے متاثر ہوکر ٹی سیریز تعمیر کرائی تھی۔ تم لاعلم تھے، اوپر سے خالی ہاتھ بھی۔ تم نے جو کامیابی حاصل کی ہے، یہ بہت بڑی ہے مگر ذرا یہ سوچو، کیا یہ اتفاقیہ کامیابی نہیں؟ کیا تم نے دانستہ طور پر احمقانہ قدم اُٹھا کر موت کے منہ میں ہاتھ نہیں ڈالا؟......ذرا بتاؤ تو......اگر تم مارے جاتے تو میرا کتنا بڑا نقصان ہوتا؟"

اس کی جلتی ہوئی آنکھوں میں یخ بستہ جھیل کھل گئی۔ میں حیرت سے اُس پل بھر میں بدل جانے والی حسینہ کو دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ "یارن خان اگر عام آدمی ہوتا یا دوسرے خانزادوں کی طرح بارکنگ ڈاگ ہوتا تو کب کا میرے ہاتھوں کچلا گیا ہوتا۔"

اس نے شانے پر سے ہاتھ اُٹھایا، میرا ہاتھ تھاما اور کھینچ کر صوفے تک لے گئی۔ ایک ادا سے مسکرائی، پھر صوفے پر دھکیل کر بولی۔ "دوسری غلطی تم نے یہ کی کہ زندگی کی قیمت پر ہاتھ لگنے والی اُسما کو تم نے کھالے کے ساتھ روانہ کردیا۔ کیا تمہیں یاد نہیں تھا کہ میں نے اسما کو کتنی بڑی قیمت وصول کرکے میاں دلبر حسین کے حوالے کیا تھا؟ تم نے ہی وہ رقم رنگو قسائی سے وصول کی تھی۔ بھول گئے تھے کیا؟......زندہ ہاتھی لاکھ کا ہوتا ہے۔ مرا سوا لاکھ کا۔ تم اگر اسما کو میرے

پاس لے آتے تو وہ یقیناً پہلے سے دگنی قیمت دے جاتی۔ حیدر خان کو تم اتنا نہیں جانتے، جتنا میں جانتی ہوں۔ وہ اپنی بدنامی کے گواہ خالد عرف کھالے کو فوراً یا بدیر گولی مروادے گا۔ کیا سمجھے؟"

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے اس رُخ سے تو سوچا ہی نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "میڈم! مجھے یقین ہے کہ وہ ایسا نہیں کرے گا۔ رہی بات اُسما کو یہاں لانے کی تو میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی۔ میرا ضمیر تب بھی میرے عمل کو قبول نہیں کررہا تھا جب میں اسے بے ہوشی کی حالت میں رنگو قسائی کے حوالے کرنے گیا تھا مگر آپ کے حکم کی تعمیل ضروری تھی۔ میں نے کئی مرتبہ سوچا، اپنے طور پر کہ میاں دلبر حسین کے تعاقب میں جاؤں اور اسما کو اس کی دلدل سے نکال لاؤں۔ پھر جب وہ مجھے نظر آئی تو مجھے اپنے ضمیر پر پڑی ہوئی بھاری بھرکم سل ہٹانے کا موقع مل گیا۔"

"مالی نقصان تو کیا ناں؟" وہ اپنی بات سے ہٹنے پر تیار نہیں تھی۔

"آپ کے پاس دولت کی کمی نہیں ہے۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔

"اگر ہر امیر آدمی یہی سوچ لے تو دنیا امن اور شانتی کا گہوارہ بن جائے اور ساری بھاگ دوڑ ہی ختم ہوجائے۔" اس کے لہجے میں طنز تھا۔ "تمہاری ناتجربہ کاری کو مدنظر رکھتے ہوئے میں تمہاری اس غلطی کو نظرانداز کرتی ہوں۔ آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ سمجھے؟"

میں نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا، کہا۔ "نہیں میڈم! آپ کو جب بھی تکلیف میں دیکھوں گا، ایسے ہی الٹے سیدھے کام کروں گا۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونکی، مجھے گھور کر بولی۔ "یعنی ہر مرتبہ ایسا ہی کروگے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے گال تمتما اُٹھے۔ آنکھیں شعلہ بار ہوگئیں۔ برہمی سے بولی۔ "او یو کریزی مین! کیوں اپنی غلطی پر ڈٹ گئے ہو۔ ایسی حماقت پھر کبھی نہ کرنا۔ کنویں میں گرے ہوئے آدمی کو نکالنے کے لیے کنویں میں اندھا دھند چھلانگ لگانے والا دُہرا نقصان کر بیٹھتا ہے، فائدہ نہیں۔ تم مجھے بہت پیارے ہو اور میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔ کیا تمہیں اتنی سی بات کی بھی سمجھ نہیں آتی؟"

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ اب سمجھا تھا کہ وہ کیوں اتنی برانگیختہ تھی کہ اسے میری کامیابی پر ذرہ بھر خوشی نہیں ہوئی تھی۔ یہ عقدہ کھلتے ہی مجھے اس کا تمتمایا ہوا چہرہ بڑا بھلا لگا۔ میں نے کہا۔ "کیا آپ جذباتی انداز میں نہیں سوچ رہی ہیں؟"

وہ ایک دم تھم سی گئی۔ صوفے پر سر ڈال کر، آنکھیں موند کر ہونٹ کاٹنے لگی۔ سوچنے لگی۔ اس کے گالوں کی باریک باریک شریانیں چمکنے لگیں۔

میں نے اس کا ہاتھ تھاما، تھوڑا دبا کر متوجہ کیا اور کہا۔ "میڈم! آپ کی فرم کے امور میں جذبات کا عمل دخل یقیناً قابلِ برداشت نہیں ہوگا۔ پھر آپ نے مجھے کامیابی پر مبارک باد دینے کے بجائے اس نقصان کے بارے میں سوچنا شروع کردیا جو ہوا ہی نہیں۔"

اس نے ایک جھٹکے سے سر اُٹھایا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "شہر یار! اماں، سیمو اور بابا تینوں میرے نزدیک دنیا کے سب سے قیمتی انسان ہیں۔ انہیں مصیبت میں دیکھ کر میں باؤلی ہوگئی تھی کیونکہ میرا ان سے رشتہ ہے، تعلق ہے مگر تمہارا نہیں ہے۔ تمہیں اموشنل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ دیکھو! وہ دونوں تو آگ میں گر گئے تھے۔ تم انہیں آگ سے نکالنے کے لیے گئے تھے۔ اپنے ہاتھ پاؤں بچا کر نکالتے، احمقوں کی طرح چھلانگ تو نہ لگادیتے۔ میں مانتی ہوں کہ تم نے میری خاطر یہ قدم اُٹھایا۔ تم شاید کبھی نہیں مانو گے کہ تم مجھے اتنے ہی پیارے ہو جتنا کہ سیمو اور اماں مجھے پیارے ہیں۔ ہاں! جب مجھے پتا چلا کہ تم ان دونوں کو نکال لائے ہو تو مجھے ذرہ بھر خوشی نہیں ہوئی بلکہ میں یہ تصور کرکے کانپ اُٹھی کہ اگر تمہیں کچھ ہوجاتا تو......نہیں شہر یار! میں سچ کہتی ہوں کہ تم نے میرا دل دکھایا ہے۔"

اس کی آنکھیں اس کے بیان کی تصدیق میں نم ہوگئیں۔ میں مارے استعجاب و مسرت کے اُسے ایک ٹک دیکھے گیا۔ وہ میری جانب کھسک کر میرے پہلو سے لگ گئی، بولی۔ "جب میرو شاہ میری حکم عدولی کرتا ہے، اول فول بکتا ہے، تب میں دیکھتی ہوں کہ تمہاری آنکھوں سے حیرانی جھلکنے لگتی ہے۔ تم شاید سوچتے ہوگے کہ میں اس سے دبتی ہوں۔ نہیں! ایسا نہیں ہے۔ میں اس کا احترام کرتی ہوں کیونکہ مجھے اتنی بڑی سلطنت کی رانی بنانے والا وہی مضحکہ خیز حال حلیے والا میرو شاہ ہے۔ میں اس میرو شاہ کو دیکھتی ہوں جس نے مجھے زمین سے اُٹھا کر آسمان پر بٹھا دیا۔ اسی طرح میں اُس شہر یار کو دیکھتی ہوں جسے دیکھ کر مجھے یقین ملتا ہے کہ دنیا میں خلوص نام کا جذبہ ابھی موجود ہے۔ میں نے تمہارے بارے میں کچھ ایسا سوچ رکھا ہے، جیسا

تمہارے وہم وگماں میں بھی نہیں۔"

اس کی خمار آلود آواز سماعت میں اُتر رہی تھی اور دل میں شگوفے چھوڑ رہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ لبوں سے لگایا اور ممنونانہ بولا۔ "میڈم! آپ بہت گہری ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو غلط سمجھا۔"

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ بولی۔ "ہاں! یہ ہوئی ناں بات...... مگر تم تو منہ پھلائے ہوئے بھی اچھے لگ رہے تھے۔ آدمی اگر برہم ہو تو فطری صداقت یہی ہوتی ہے کہ وہ ناراض دکھائی بھی دے۔ جو شخص غم چھپا کر مسکراتا ہے، خوشی چھپا کر بے پروا نظر آتا ہے اور غصے کو دبا کر مسکراتا ہے، سمجھو کہ وہ لوگوں کی مرضی کے مطابق نظر آنا چاہتا ہے یعنی منافق ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم دہرے پن کا شکار نہیں ہو۔ آئی لو یو......"

اس نے ایک جھٹکے سے میری گود میں اپنا سر رکھ دیا، بولی۔ "بالوں میں انگلیاں پھیرو۔"

میرا ایک ہاتھ اس کے بدن کے نیچے تھا۔ دوسرا بالوں میں اُلجھ گیا۔ اس کے مخملیں بال انگلیوں کی پوروں پر سرکنا جانتے تھے، دریا کی خشک ریت کی طرح۔ وہ کافی دیر تک ایسے ہی اوندھے منہ پڑی رہی، پھر بولی۔ "کوئی بات کرو ناں!"

اس کے دل آویز رویے نے مجھ سے قوتِ گویائی چھین لی۔ میں نے دھڑکتے دل سے کہا۔ "میڈم! آپ سب سے مختلف ہیں۔"

"ہوں! یو نو؛ دا ڈیفرنس از سمبل آف بیوٹی؟" وہ چہکی۔

"یس آئی نو میڈم! ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو۔"

"کیا آپ واقعی میرے لیے پریشان تھیں؟"

"تو کیا میں جھوٹ بولتی ہوں؟" وہ بے پروائی سے بولی۔

"میرا مطلب یہ نہیں تھا۔" میں جھینپ گیا۔

"تمہارا مطلب کچھ بھی ہو، میں تم سے محبت کرتی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "میں آپ کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ اگر مناسب سمجھیں تو وہی کہانی مکمل کر دیں جو آپ مجھے مس عالیہ کے کلینک میں سنانے لگی تھیں۔"

"چندو ماہی اور بابا گاما گامن والی؟" وہ ہنسی۔

"جی وہی!" میں نے کہا۔ "انسان جس سے محبت کرے، اس کے بارے میں سب کچھ جاننے کا خواہش مند ہوتا ہے۔"

"ہاں! تم نے ٹھیک کہا۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی مگر وقت آنے پر......"

"بابا گامی اور اس کے خاندان کے تحفظ کی پالیسی کیا ہے؟"

"ہوں......" اس نے میری گود سے سر اُٹھایا، پرے ہٹ گئی اور بولی۔ "بتاتی ہوں۔ تم فریج سے بوتل، برف اور گلاس نکال لاؤ۔"

وہ پینا چاہتی تھی۔ میں نے شکوہ کناں نظروں سے اُسے دیکھا اور حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اس کے ایما پر بیڈ پر تینوں چیزیں رکھ دیں۔ وہ صوفہ چھوڑ کر بیڈ پر آ گئی۔ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ گلاس میں آگ انڈیل کر، سفید انگارے ڈال کر گھونٹ گھونٹ حلق میں انڈیلنے لگی، بولی۔ "شہریار! وہ تینوں اب بیٹ خیر پور میں محفوظ نہیں رہ سکتے کیونکہ وہ میرے حوالے سے منظرِ عام پر آ گئے ہیں۔ جب تک وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھے، زندہ اور محفوظ تھے۔ انہیں زندہ رکھنے کے لیے میں ان کی غربت کا کڑوا گھونٹ حلق میں اتار لیا کرتی تھی۔" اس نے ایک بڑا گھونٹ بھرا اور گلاس خالی کر دیا، بولی۔ "انسان کے پاس کروڑوں کا بینک بیلنس اور جائداد ہو، تب بھی وہ اپنے پیاروں کو پائی پائی کو ترستا دیکھ کر صبر کرے، بہت صبر آزما ہے مگر میں نے اس عذاب سے صرف اس لیے مفاہمت کیے رکھی کہ میرا دشمن ان پر وار نہ کرے۔ اب وہ بات نہیں رہی اس لیے میں نے انہیں ملتان میں رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ سخی محمد ان کے ساتھ ہے۔ چند دنوں میں ان کا معقول بندوبست کر دوں گی۔"

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ اس نے میرے پوچھے بنا میرے ذہن میں کلبلانے والے سوال کا جواب دے دیا تھا۔ اس نے ایک اور آتشیں جام تیار کیا۔ سر جھکا کر کچھ سوچا۔ ایسے میں اس کی انگلی نچلے ہونٹ سے کھیلتی رہی۔ سر اُٹھا کر بولی۔ "اب تم گھر جاؤ۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔"

میں نے اُس پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ حسبِ سابق اس نے آواز دے کر دروازے میں روک لیا۔ میں نے پلٹ کر سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ ہاتھ اُٹھا کر بولی۔ "تم نے میری توقع سے کہیں بڑا کام کر دکھایا۔ وہ، جسے میرو شاہ اور پیا جیسے گھاگ آدمی بھی کرنے میں ناکام رہے۔ تمہاری دل داری ضروری سمجھتی ہوں۔ تبھی پوچھتی ہوں کہ تمہیں کیا انعام دیا جائے؟"

پرانے وقتوں کے بادشاہ ایسے ہی پوچھا کرتے تھے کہ بول، تجھے کیا انعام دیا جائے...... پھر بولنے والے کا منہ موتیوں اور ہیروں سے بھر دیا جاتا تھا۔ وہ بھی شاہانہ انداز میں پوچھ رہی تھی۔ میں نے ایک طویل سانس لی۔ سوچا، آج انعام کا پوچھ رہی ہے، کل سلوک کا پوچھے گی، پھر بے ساختہ میری آنکھیں پھسلتی ہوئیں اُس کے سرخ اور رسیلے ہونٹوں پر جا کر رُک گئیں، بولنے لگیں۔ شاہِ وقت کے سوال کا جواب دینے لگیں۔

وہ میرا جواب بھانپ گئی۔ ایک ذرا مسکرائی اور شوخ نظروں سے اجازت نامہ ہوا میں اُچھالتی ہوئی آنکھوں کی زباں سے بولی۔ "ٹھیک ہے۔ تمہاری مراد تمہاری جھولی میں ڈال دی جائے گی۔"

مسکرا کر بولی "ٹھیک ہے۔ اس بارے میں سوچوں گی۔ فی الحال تو میں نے تمہارے لیے ایسا تحفہ سنبھال رکھا ہے جس کے بارے سن کر ہی تمہارا دل باغ باغ ہو جائے گا، بتاؤں؟"

میں نے کہا۔ "مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔"

"پوچھو تو سہی......" وہ ایک ادا سے بولی۔

"بتا دیں۔ آپ کا تحفہ یقیناً نایاب ہوگا۔"

"جب تم رنگو قسائی سے نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس لائے تھے تب تم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارے ماں باپ کو قتل کرنے والا رنگو قسائی ہے۔ تم نے اسے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی اور اس سے بدلہ لینے کی اجازت چاہی تھی۔ یاد ہے ناں؟" اس کی آواز تجسس جگانے لگی۔

میں نے چونک کر کہا۔ "جی میڈم! مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ پھر؟" رنگو قسائی کا خوفناک چہرہ میری آنکھوں کے سامنے لہرا گیا۔

"چونکہ تم اس کے پاس اپنے کام سے نہیں گئے تھے، میرے بھیجنے پر گئے تھے، اس لیے اسے میزبانی کے آداب ملحوظِ خاطر نہ رکھنے کی سزا دینا میرے لیے ضروری تھا۔ میرے حکم پر اس کی تلاش کا کام جاری تھا۔ کل شام اسے بورے والا کے علاقے عمر پور سے پکڑ کر 'سی ون' میں پہنچا دیا گیا۔ میں نے سوچا کہ رنگو قسائی تمہارے لیے میری طرف سے بہترین تحفہ ثابت ہوگا۔" وہ تمکنت سے بولی۔ "کیوں؟ کیا خیال ہے؟"

میرا دل بلیوں اچھلا۔ بے ساختہ منہ سے نکلا۔ "یو آر گریٹ میڈم! میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھلاؤں گا۔"

وہ فاخرانہ ادا سے دیکھ کر مسکرائی اور بولی۔ "میں کسی وقت تم سے فون پر رابطہ کروں گی۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

میری بے اختیار نگاہیں اس پر ساکت ہو گئیں۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر، گلاس دکھا کر بولی۔

"پیو گے؟"

میں نے جلدی سے انکار میں سر ہلایا۔

بولی۔ "کیا تمہارے پاس سگریٹ ہے؟"

میں نے پھر سر کو دائیں بائیں جنبش دی۔

وہ بے ساختگی آمیز مخمور لہجے میں بولی۔ "تو پھر رُک کیوں گئے؟ جاؤ ناں......"

☆☆☆

شام کا کھانا تناول کرنے کے بعد میں اپنے چچا زاد موج دین عرف موجو کے ہوم ورک والی کاپیاں چیک کر رہا تھا، میرے پہلو میں شانو بیٹھی چیک کر رہی تھی اور سختے درمے فرزانہ پر چوٹیں کر رہی تھی جب کال بیل بجی۔ میں نے فوجی اختر کو بھیجا۔ توقع تھی کہ پیاجی یا میرو شاہ آیا ہوگا۔ مگر فوجی اختر نے واپس آ کر مجھ سمیت سبھی کو چونکا دیا۔ "خالد آیا ہے۔"

وہ کیوں آیا تھا؟ میرے ذہن میں کئی وسوسے کلبلانے لگے۔ میں نے اُسے ڈرائنگ روم میں بٹھانے کا حکم دیا۔ فوجی اختر چلا گیا تو شانو بولی۔ "یہ مویا لوہار تمہاری جان زندگی بھر نہیں چھوڑے گا بھائی!"

اس کے لہجے میں طنز کی آمیزش نہیں تھی۔

تھوڑی دیر بعد کھالا میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کا حلیہ دیکھ کر دل کو تسلی ہوئی کہ خیریت ہی تھی کیونکہ وہ بن سنور کر، بال چپڑ کر آیا تھا۔ میں نے کھانے کا پوچھا تو اس نے کہا۔ "نہیں یار! کھانا کھا چکا ہوں۔ چائے پلوا دو۔ پھر تمہیں مزے کی بات سناتا ہوں۔"

میں نے بہ آوازِ بلند فوجی اختر کو چائے بنا لانے کا حکم صادر کیا۔ دروازے میں شانو نے جھانکا، بولی۔ "بھائی کھالے! ہمارا گاؤں کیسا ہے؟"

ہم دونوں چونکے۔ مجھے فرش پر پڑنے والے سایوں سے اندازہ ہو گیا کہ شانو کے ساتھ فرزانہ اور موجو بھی ہمہ تن گوش کھڑے تھے۔ کھالا اُٹھا، دروازے میں گیا اور تینوں کے سروں پر روایتی انداز میں ہاتھ رکھ کر پیار کرتے ہوئے نور پور کے بارے میں بتانے لگا۔ جب تینوں کی تشفی ہو گئی، تب انہوں نے کھالے کی جان چھوڑی۔

چائے پینے کے بعد اس نے میرے استفسار پر بتایا۔ "شہرے! میں نے کبھی زندگی میں نہیں سوچا تھا کہ میں اور بی بی جی اس طرح سائیکل پر سفر کریں گے۔ وہ بہت دکھی تھی۔ بات بات پر رو رہی تھی۔ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ اسے نئی زندگی دینے والا ظفر اقبال کون ہے؟ کہاں کا رہنے والا ہے؟ میں اُسے ٹالتا رہا کیونکہ تم نے مجھے کہا تھا کہ میں

اس پر تمہاری حقیقت نہ کھولوں۔ پورے راستے میرا دل حلق میں اٹکا رہا۔ ڈرتا رہا کہ کوئی ہمیں روک نہ لے۔ وہ دیسی برقعے کی وجہ سے دیکھنے میں بوڑھی لگتی تھی۔ بولتی تھی تو جوان آواز قلعی کھول دیتی تھی۔ جونہی ہم بلوچ نگر کے قریب پہنچے، وہ اچھل کر سائیکل سے اُتر گئی اور پوچھنے لگی۔ ”خالد! تمہیں میری قسم! سچ بتاؤ۔ ظفر اقبال کون ہے؟“

میں نے پوچھا۔ ”آپ کو کیا شک ہے؟“

وہ سوچ میں پڑ گئی، بولی۔ ”وہ دیکھنے میں پٹھان تھا۔ بولنے میں ٹھیٹھ سرائیکی جبکہ اس کی آواز میری سنی سنی لگتی تھی۔ چہرہ بھی دیکھا دیکھا لگتا تھا۔ وہ مجھے اور میرے خاندان کو جانتا تھا مگر میں اسے نہیں جانتی ہوں، تبھی پوچھ رہی ہوں۔“

اس نے مجھے اپنی قسم دی تو میں خود کو سچ بولنے سے روک نہ پایا اور بول پڑا۔ ”بی بی جی! وہ کوئی اور نہیں تھا، میرا یار تھا؛ شہرا خان...... اس نے سوانگ رچایا ہوا تھا تبھی آپ کی نظریں دھوکا کھا گئیں۔“

وہ پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ دل یقین کرتا تھا۔ دماغ منکر تھا۔ متردد انداز میں بولی۔ ”مگر اس نے مجھے یارن خان کے تہ خانے سے کیوں نکالا؟“

میں نے اُسے تمہارے بارے میں صاف صاف بتا دیا۔ وہ رونے لگی۔ کہنے لگی۔ ”مجھے کیا ہو گیا ہے؟ میں برے بھلے کی پہچان کھو بیٹھی ہوں۔ کبھی اُسے کتا قرار دیتی ہوں۔ کبھی اسے فرشتہ سمجھتی ہوں۔ خالد! یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ کیا میں پاگل ہو گئی ہوں؟“

مجھے اس کی حالت پر ترس آتا تھا۔ میں نے اُسے سائیکل پر بٹھایا اور اس کے اصرار پر بلوچ نگر سے کچھ فاصلے پر واقع اس کے باپ کے ڈیری فارم پر چھوڑا اور بڑے خان کے دارے پر پہنچ گیا۔ وہ زنان خانے میں تھا۔ میں نے سوئے ہوئے نوکر کو جگا کر بڑی مشکل سے خان کو جگا لانے کے لیے اندر بھیجا۔ تھوڑی دیر بعد خان آنکھیں ملتا ہوا دارے پر آ گیا۔ ناوقت جگائے جانے پر خاصا برہم تھا۔ پریشان بھی تھا۔ میں نے تخلیے میں اسے بی بی جی کے بارے میں بتایا تو اس کی سستی ایک دم اُڑنچھو ہو گئی۔ عام حالات میں وہ اپنے گن مینوں کے علاوہ دارے سے نہیں نکلتا۔ بی بی جی کا سن کر میرے ساتھ ڈیری فارم پر دوڑا چلا آیا۔ دونوں باپ بیٹی کی ملاقات کا منظر بڑا دردناک تھا۔

سردار حیدر خان مجھے اور خانزادی کو ساتھ لیے زنان خانے میں اپنے بیڈروم میں آ گیا۔ اس نے میری موجودگی میں ہی بی بی جی سے کرید کرید کر پوچھا۔ یارن خان اور میاں دلبر حسین کو جی بھر کر گالیاں دیں۔ بی بی جی نے کہا۔ ”بابا! میں جانتی ہوں کہ شہرا اپنی بہن کی وجہ سے آپ کا دشمن بنا تھا۔ اس نے مجھے چھوا تک نہیں۔ میاں دلبر اور یارن خان آپ کے خیر خواہ تھے جنہوں نے مجھے زندہ رہنے کے قابل نہیں چھوڑا۔“

باپ کو بیٹی کا چہرہ آئینہ بن کر شرمار ہا تھا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ بیٹی بولتی رہی۔ ”میں چاہتی ہوں کہ آپ اس کمینے میاں دلبر اور شیطان یارن خان کو زندہ رہنے کے قابل نہ چھوڑیں۔ وہ سسک سسک کر مریں گے تو مجھے چین آئے گا۔“

سردار حیدر کا چہرہ تاریک ہو گیا تھا۔ ہاتھ کپکپانے لگے تھے۔ اس نے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ وہ دونوں مردودوں کو زندہ نہیں چھوڑے گا اور شہرے کو چھیڑے کا نہیں۔ پھر دونوں باپ بیٹی مجھ سے تمہارے ٹھکانے کا اَتا پتا پوچھنے لگے۔ میں نے انہیں ٹال دیا اور صبح ہونے سے قبل لوٹ آیا۔ آج سہ پہر کو جب میں چوک قریشی کے ہوٹل پر چائے پی رہا تھا، حیدر خان کا ایک ہرکارہ مجھے ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ وہ کار میں آیا تھا اور مجھے اپنے ساتھ حیدر خان کے ڈیرے پر لے جانے پر مصر تھا۔ چونکہ دیہاڑی دار ڈرائیور بکنگ پر تھا، اس لیے میں نے معذرت کر لی اور کہا کہ پھیرا لے نور پور جاؤں گا اور واپسی پر خان کے دارے کا چکر لگا لوں گا۔ پھر میں نے ایسا ہی کیا۔ تیار شیار ہو کر دارے پر پہنچ گیا۔

بڑا خان میرا منتظر تھا...... منحوس! وہ کھالے لوہار کے انتظار میں دارے کے برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر خاص مہمانوں والے کمرے میں لے گیا۔ تم سے ملنے کی ضد کرنے لگا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میرا تم سے مسلسل رابطہ نہیں ہے اور نہ ہی مجھے تمہارے ٹھیے ٹھکانے کی خبر ہے۔ مجھے منانے میں ہر طرح سے ناکام ہونے کے بعد اُسے سمجھ آئی کہ میں کسی بھی صورت اسے تمہارے گھر کا پتا نہیں بتاؤں گا۔ تب اس نے پینترا بدلا اور مجھے کہنے لگا۔ ”کھالے! تم میرے ساتھ ملتان چلو اور اُسے تلاش کرو۔ جہاں کہیں ملے، اُسے میرے پاس لے آؤ۔ اگر نہ ملا تو واپس آ جانا۔“

میں نے مجبوراً اس کی بات مان لی اور اس کے ساتھ یہاں آ گیا۔ اس نے مجھے اپنا وزٹنگ کارڈ جس پر اس کا موبائل فون نمبر چھپا ہوا ہے اور دو ہزار کے کرارے نوٹ تھما کر تمہاری تلاش میں روانہ کر دیا۔ یوں میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔“

کھالے نے بات ختم کی اور صوفے سے پشت ٹکا دی۔ میں نے اُسے گھورا۔ ”تم تو نرے گنوار نکلے ہو۔ اس کے کارندے تمہارا پیچھا کر کے میرا دروازہ دیکھ گئے ہوں گے۔ مرواد یا ناں کوے کی اولاد!“

اس نے جواباً گھورا اور برہمی سے بولا۔ ”توں مکیوں بدھو سمجھا ہے؟ واہ بھئی واہ...... مجھے یہ ڈر تھا اس لیے میں آگے پیچھے دیکھ کر یہاں آیا ہوں۔ میں نے راستے میں کئی رکشے بدلے۔ جب یقین ہو گیا کہ خان نے میرے پیچھے کسی کو نہیں لگایا، تب میں نے ادھر کا رُخ کیا۔“

میں نے کہا۔ ”مگر وہ کمینہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟“

”وہ تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے۔ یار! کمال کرتے ہو تم بھی۔ ہر بات میں شک کے کیڑے نکالنے بیٹھ جاتے ہو۔ بُری بات ہے۔“ وہ بھتے سے اکھڑ گیا۔

”نہیں یار! اس کی خصلت بری ہے۔ وہ کسی کا احسان مند نہیں ہوتا۔ مجھے تو یہ وہم بھی ہے کہ وہ تمہیں اور اُسا کو بھی ’پار‘ کروا دے گا، دیکھ لینا۔“

اس نے مجھے ایسے دیکھا جیسے میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں۔ بولا۔ ”ہونہہ! پار کروا دے گا۔ جانتے ہو، وہ بی بی جی سے کتنا پیار کرتا ہے۔ اور وہ مجھے کیوں ’پار‘ کروائے گا؟ میں نے اُس کا کیا بگاڑا ہے، ہیں؟“

میں نے اس کی ناراضی کی پروا نہ کرتے ہوئے خان سے ملنے سے ترت انکار کر دیا۔ میں حیدر خان یا اسما سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ برابر مجھے مناتا رہا۔ سمجھاتا رہا کہ حیدر خان کا دل موم ہو گیا ہے۔ اس سے بنا کر رکھنی چاہیے۔ ہم غریب لوگ ہیں۔ امیروں سے ٹکراؤ ہمارے بس کی بات نہیں تھی، وغیرہ وغیرہ۔ میں نے اکتا کر پوچھا۔ ”یار کھالے! آخر مجھے اس سے ملنے کا کیا فائدہ ہو گا؟“

”آخر تمہیں نقصان بھی کیا پہنچے گا؟“ وہ زچ ہو کر بولا۔ ”بھلے آدمی! مل کر دیکھو تو سہی کہ وہ کیا کہتا ہے؟ کیا چاہتا ہے؟ اگر اس کی کوئی بات دل کو لگے تو ٹھیک ورنہ تم اپنے گھر خوش، وہ اپنے گھر۔“

میں نے اُسے ڈرائنگ روم میں چھوڑا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ فون پر میڈم شکیلہ سے رابطہ کیا۔ شکر ہوا کہ اس نے کال اٹینڈ کر لی۔ میں نے اُسے مختصر الفاظ میں کھالے کی آمد اور سردار حیدر خان کی خواہش کے بارے میں بتایا، وہ بولی۔ ”تمہارا دوست ٹھیک کہتا ہے کہ تمہیں اس سے مل لینا چاہیے۔ اُسے کہہ دو کہ تم حیدر خان سے کسی ہوٹل میں کل شام کو ملو گے۔ اپنے گھر یا حیدر خان کی کوٹھی پر نہیں۔ ہوٹل اور جگہ کے بارے تمہیں بتا دوں گی اور تم کل سہ پہر میں حیدر خان یا خالد کو انفارم کر دو گے۔ او کے اینڈ بائے!“

میں تفصیلاً بات کرنا چاہتا تھا مگر اس نے اپنا فیصلہ سنا کر فون بند کر دیا تھا۔ میں نے ڈرائنگ روم میں آ کر کھالے سے کہا۔ ”ٹھیک ہے یار! اگر تم بضد ہو تو میں ہی ہتھیار ڈال دیتا ہوں۔ اسے جا کر کہہ دو کہ کل شام ملاقات ہو گی۔“

کھالے کے لبوں پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری، بولا۔ ”مجھے الو نہ بناؤ۔ تم میری ضد پر ہتھیار نہیں ڈال رہے ہو بلکہ اپنی میڈم کی اجازت پر پھدک رہے ہو۔ خیر! مجھے آموں سے غرض ہے، پیڑوں سے نہیں۔ میں اُسے جا کر خوش خبری سنا دیتا ہوں۔“

”میں کل تین چار بجے تمہیں ہوٹل کا نام اور وقت بتا دوں گا۔ تم خان کو مطلع کر دینا۔“ میں اس کا طنز نظر انداز کر کے بولا۔ ”کیا تم ملتان میں رات گزارو گے؟“

”ہاں...... میں خان کی کوٹھی پر جاؤں گا۔ اب میں چلتا ہوں۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔ میں نے اصرار کیا کہ وہ رات میرے گھر میں رہے مگر وہ نہیں مانا اور چلا گیا۔

کھالا مجھے نئے مخمصے میں ڈال گیا۔ حیدر خان سے کسی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کیونکہ اس کی سرشت میں بھلائی اور شکر گزاری کا مادہ شامل نہیں تھا۔

جب سے مجھے میڈم نے رنگو قسائی کے بارے میں بتایا تھا، طبیعت میں عجیب سا ہیجان اور اضطراب بھر گیا تھا۔ توقع تھی کہ اگلی صبح مجھے میڈم کے خفیہ اڈے ’سی ون‘ میں پہنچا دیا جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ ایک بجے کے قریب میڈم نے فون پر شہر کے ایک معروف ہوٹل کا نام بتایا اور کہا۔ ”شہر یار! وہاں تمہارے لیے کمرا نمبر تین سو پانچ ریزرو ہے۔ تم چار بجے پہنچ جانا۔ حیدر خان کو پانچ بجے فون کر کے وہاں بلا لینا۔ اور ہاں! یہ دھیان رکھنا کہ تمہاری پرسنالٹی ڈیشنگ ہونی چاہیے۔ حیدر خان دیکھے تو دیکھتا ہی رہ جائے۔“

میں تیار ہو کر، نیا اور قیمتی سوٹ پہن کر چار بجے رکشا میں بیٹھ کر ہوٹل پہنچ گیا۔ پہلی مرتبہ اس ہوٹل میں آیا تھا جس کی جدید طرز کی بلند عمارت کو دیکھتے ہی دل پر دھاک بیٹھ جاتی تھی۔ اندر کا منظر آنکھوں کو خیرہ کرنے والا تھا۔ ہال سے گزر کر استقبالی کاؤنٹر پر پہنچا۔ تعارف اور اندراج کی عمومی کارروائی کے بعد روم کارڈ لیے گائڈ کی رہنمائی میں لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں تھرڈ فلور پر واقع روم نمبر تین سو پانچ میں تھا۔ وال ٹو وال کارپٹڈ روم

کے وسط میں اسپرنگ بیڈ لگا ہوا تھا۔ ایک طرف صوفے اور ٹیبل لگی ہوئی تھی۔ ان کے پیچھے وال ٹو وال پردہ لہرا رہا تھا۔

میں مقررہ وقت پر پہنچا تھا۔ چونکہ میرے پاس ایک گھنٹا فراغت تھی، اس لیے میں کمرے کو اپنے انداز میں ٹھونک بجا کر دیکھنے لگا۔

پانچ بجے میں نے کھالے سے رابطہ کیا اور اسے ہوٹل کا نام اور کمرا نمبر بتا دیا۔ اس نے تھوڑی دیر بعد مجھے کال کی، بولا۔ ''خان جی سے بات ہو گئی ہے۔ وہ ٹھیک چھ بجے تمہارے پاس پہنچ جائیں گے۔ یار شہرے! دھیان رکھنا۔ کوئی الٹی سیدھی بات مت کر دینا۔''

میں نے ہنستے ہوئے دلاسا دیا۔ ''فکر نہ کرو۔ میں تمہاری 'کتا عاشق بھیڑ معشوق' قسم کی محبت کو ذہن میں رکھوں گا۔''

اس نے حسبِ توقع شایانِ شان جذبۂ خیر سگالی پیش کیا۔ میں نے ہنستے ہوئے فون بند کیا اور میڈم سے رابطہ کیا۔ اسے رپورٹ دی، وہ بولی۔ ''شہر یار! حیدر خان سیاسی گرگٹ ہے۔ بھروسے والا آدمی نہیں ہے۔ تم اپنے کان اور آنکھیں کھلی رکھنا۔ ملاقات کے دوران اپنا فون سائیلنٹ موڈ پر کر دینا۔ میں کال کروں گی، تم ریسیو کر کے خاموشی اختیار کر لینا تاکہ میں تم دونوں کے بیچ ہونے والی گفتگو سنتی رہوں۔ میری مشاورت کی ضرورت محسوس کرو تو باتھ روم میں جا کر بات کر لینا۔ اور ہاں! تم نے برابری کی سطح پر اس سے بات چیت کرنی ہے۔''

فون بند ہو گیا۔ میں ننھی سی اسکرین کو گھورتا رہا۔ چھ بجے حیدر خان کو روم سرور نے میرے کمرے میں پہنچا دیا۔ میں نے میڈم کی ہدایات کے مطابق برابری کی سطح پر کھڑے ہو کر سردار حیدر خان کا استقبال کیا۔ وہ میرے ساتھ چلتا ہوا صوفے پر آن بیٹھا۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ اکیلے آئے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''نہیں۔ گارڈز کو نیچے پارکنگ میں چھوڑ آیا ہوں۔'' اس کی بھاری اور کڑک دار آواز کمرے میں گونجی۔

مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب میں اس فرعون کی بیلے والی حویلی کی ایک چارپائی پر بے حس و حرکت پڑا تھا اور وہ فرعونیت بھری آواز میں مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ ''بتا اوئے بھتنی کے بچے! خانزادی کہاں ہے؟''

تب میں نے اسے بتایا تھا کہ وہ میاں دلبر حسین کے پاس ہے تو اس کی شکل بگڑ گئی تھی۔ شاید اس نے میری بات کا یقین بھی نہیں کیا تھا۔ مقام اور ملاقات کی نوعیت بدل گئی تھی۔ اس کی شخصیت کا وہ دبدبہ جو ہم دیہاتیوں کی سرشت میں گھلا ہوا تھا، آج بہت کمزور ہو گیا تھا۔

میں نے انٹرکام پر فاسٹ فوڈ اور ڈرنکس کا آرڈر نوٹ کرایا اور اس کے قریب صوفے پر آن بیٹھا۔ اس نے حسبِ معمول آف وائٹ کرنڈی کا بہترین سوٹ اور کالے رنگ کی واسکٹ زیب تن کی ہوئی تھی۔ گرم اونی شال کندھوں پر مخصوص انداز میں ڈال رکھی تھی۔

مجھے دیکھتے ہوئے سرائیکی زبان میں پیار سے بولا۔ ''شہرے پتر! وڈا وڈا ای ہوندائے۔ نکا ہمیش کیتے نکا ای رہندائے۔ وڈا معافی منگے تاں وڈیائی، نکا من ونجے تاں وڈیائی...... ڈیکھ! میں حیڈے کولوں معافی منگن آیاں۔''

(شہرے پتر! بڑا بڑا ہی ہوتا ہے۔ چھوٹا ہمیشہ چھوٹا ہی رہتا ہے۔ بڑا اگر معافی مانگے تو یہ اس کی بڑائی اور چھوٹا مان جائے تو یہ اس کی بڑائی ہوتی ہے۔ دیکھو! میں تم سے معافی مانگنے کے لیے آیا ہوں)

مجھے ایک لمحے کو کانوں سنے پر یقین نہیں آیا۔ ایسے ہی وقت میڈم کی کال آ گئی۔ فون میرے ہاتھ میں تھا۔ اسکرین کے بلنک کرنے پر میں نے غیر محسوس انداز میں کال ریسیو کر لی، کہا۔ ''خان جی! ان باتوں کو چھوڑیں۔ جو ہونا تھا، ہو گیا۔ آگے کیا ہونا ہے، یہ سوچنے کی بات ہے۔''

وہ بولا۔ ''نہیں شہرے! دلوں میں میل ہو تو بیٹھنے اور باتیں کرنے کا فائدہ نہیں۔ جب مجھے خانزادی نے بتایا کہ تم نے اُسے کمینے یارن خان کی حویلی سے نکالا تو میرا سر فخر سے بلند ہو گیا کہ میرے خاندان کا جوان اپنے خاندان کی لج سنبھالنے جوگا ہو گیا ہے۔ میں نے اسی وقت تم سے ملنے اور تمہارا شکریہ ادا کرنے فیصلہ کر لیا۔''

وہ واقعی سیاست دان تھا۔ اس نے میری بہن کو اغوا کرایا تھا۔ اسے اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھانا چاہتا تھا۔ میرے چاچا اور چچی کو گھر سمیت جلا کر خاکستر کرنے والا مرکزی کردار وہی تھا جبکہ اس کے نزدیک میں نے اسما کو اغوا کیا تھا۔ ان سب باتوں پر پردہ ڈال کر میرا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ میڈم نے سچ کہا تھا کہ وہ سیاسی گرگٹ تھا۔ رنگ بدل کر وار کرتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''میں نے جو کچھ کیا، اسما کے لیے کیا، آپ کے لیے نہیں۔ چونکہ آپ اس کے والد ہیں، اس لیے میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔''

اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ میں نے اس کی بیٹی کا نام لیا تھا۔ اسے یہ گوارا نہیں تھا۔ پہلی مرتبہ جب میں نے اسما

کا نام اس کے سامنے لیا تھا تو اس نے پھاڑ کھانے کے سے انداز میں تنبیہ کی تھی۔ ”اپنی گندی زبان سے خانزادی کا نام مت لو ورنہ ابھی زبان کاٹ دوں گا۔“

آج اس نے یہ کڑوی گولی حلق میں اتار لی تھی، بولا۔ ”شہرے خان! مجھے تم پر فخر ہے۔ میں خانزادی کا بابا بن کر نہیں، بلوچ خانوادے کا بڑا بن کر تم سے بات کرنے آیا ہوں۔ مجھے فخر ہے کہ تمہاری رگوں میں اسی غیرت مند خاندان کا خون دوڑ رہا ہے، اس لیے چل کر آیا ہوں۔ مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔“

میں چونکا۔ ”کیسی مدد؟ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟“

وہ میری طرف جھک آیا، رازداری سے بولا۔ ”یارن خان نے خاندان سے باہر شادی کی تھی۔ تمہیں علم ہے اس بات کا؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ ”وہ کسی گندے خاندان کی عورت تھی۔ یہی وجہ ہے یارن خان کی آنکھوں پر بھی بے غیرتی کی چربی چڑھ گئی ہے۔ خانزادی اسما رشتے میں اس کی بیٹی بھتیجی لگتی تھی۔ دشمنی کے بغیر اس نے اپنی بیٹی کے ساتھ منہ کالا کیا۔ کیا یہ بات قابلِ معافی ہے؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں خان جی! خاندان کی بیٹی، سگی بیٹی جیسی ہوتی ہے۔ اس پر میلی نگاہ ڈالنا بے غیرتی ہے۔“

اس کے بدن کو جھٹکا لگا۔ یہ کڑوی گولی نگلنی مشکل تھی مگر ناچار نگل گیا، بولا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ جو آگ اس نے خاندان میں لگائی ہے، وہ اس کے گھر میں بھی بھڑکے۔“

”یعنی آپ چاہتے ہیں کہ اس کی بیٹی کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جائے جیسا آپ کی بیٹی کے ساتھ ہوا؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”ہاں...... تاکہ اس کے پاؤں جلیں۔“ اس نے تھوک نگلا، چہرہ متغیر ہوا مگر غصہ دبا کر بولا۔ ”اسے پتا چلے کہ کسی کی بہو بیٹی پر ہاتھ ڈالنے کا انجام کیا ہوتا ہے۔“

اس کی آنکھیں شعلہ بار ہو گئیں اور سانسیں پھول گئیں۔ تھوڑے سے توقف کے بعد بولا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم اس کام میں میری مدد کرو۔ میں بوڑھا آدمی ہوں۔ ہڈ پیر جواب دینے لگے ہیں جبکہ یہ جوانوں کا کام ہے۔ تم لاہور جاؤ اور اس کی بیٹی عافیہ خان کو اٹھا لاؤ۔ اس طرح کہ پتا یہی چلے کہ وہ اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ اُدھل گئی ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟“

میں اُس کے پل پل سرخ ہوتے چہرے کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی امید بھری نظروں کے جواب میں، میں نے نفی میں سر ہلایا، کہا ”نہیں خان جی! میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ آپ کو بھی مشورہ دیتا ہوں کہ آپ بھی وہ کام نہ کریں جو یارن خان نے کیا ہے۔“

اسے میرا مشورہ ایک آنکھ نہیں بھایا۔ منہ بنا کر بولا۔ ”میں نے کہا تھا کہ مجھے تمہاری مدد چاہیے، نصیحت کی بارش میرے دل میں بھڑکنے والی آگ کو نہیں بجھا سکتی۔ اس کام پر جتنا بھی خرچ آئے، میں دینے کے لیے تیار ہوں۔ دس، بیس، پچاس...... جتنے لاکھ بھی لگیں، میں دینے کو تیار ہوں۔ بولو!“

اس کے دل کی بات زبان پر آ گئی تھی۔ میں نے استہزائیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا مجرم اکیلا یارن خان ہی نہیں، میاں دلبر بھی ہے جس نے یاری کی آڑ میں آپ کی پیٹھ میں چھرا گھونپا ہے۔“

وہ تڑپ کر بولا۔ ”بے غیرت یارن کے بعد اس کی باری ہے۔ میں اس کتے کو کیسے بھول سکتا ہوں۔“

میں نے ادھر اُدھر کی گفتگو کے بعد واش روم کا قصد کیا۔ فون پر میڈم کی کال چل رہی تھی۔ میں نے فون کان سے لگایا اور نہایت مدھم آواز میں بولا۔ ”میڈم! آپ نے اس کتے کی باتیں سن لیں؟“

اس کی آواز کان میں گونجی۔ ”اس سے دو کروڑ میں سودا طے کر لو۔ آدھی ادائیگی پہلے، آدھی مال کی وصولی پر۔“

میں نے مزاحمت کی۔ ”مگر میڈم......“

”فضول باتیں نہ کرو۔ جو کہتی ہوں، وہ کرو۔“ اس کا لہجہ سخت تھا۔

میں واش روم سے نکل کر خان کے پاس آیا، کہا۔ ”خان جی! میں آپ کی باتیں سن اور سمجھ چکا ہوں۔ میں آپ کی مشکل آسان کر سکتا ہوں۔ آپ کو انتقام کی آگ ٹھنڈی کرنے کا موقع دے سکتا ہوں مگر اس کی قیمت آپ کو ادا کرنا ہوگی۔“

وہ خوش ہو گیا۔ ”ہاں ہاں بولو! مجھے منظور ہے۔“

میں نے دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائیں۔ ”دو کروڑ روپے......“

اس نے دیدے پھیلائے۔ ”دو کروڑ! یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔ میں اتنی رقم کہاں سے دے سکتا ہوں۔“

میں نے کندھے اُچکائے۔ ”تو پھر اس معاملے پر مٹی ڈالیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

زوردار بحث کے بعد آخر اسے ہتھیار ڈالنا پڑے اور دو کروڑ پر سودا ’ڈن‘ کرنا پڑا۔ میں نے اگلی شرط سنائی۔

”آدھی رقم ایڈوانس، آدھی کام ہونے پر۔“

اس نے اس شرط پر کوئی اعتراض نہیں کیا اور بولا۔ ”دس دن کے اندر تمہیں رقم پہنچا دوں گا۔ کام ہونے میں کتنا وقت لگے گا؟“

میں نے کہا۔ ”دس دن یا ایک ماہ...... گولی مارنے سے عزت پر دھبا لگانا مشکل ہوتا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ آپ کا کام ہو جائے گا۔“

اس نے مجھے تاکید کی کہ میں اس ڈیلنگ کا تذکرہ خالد عرف کھالے لوہار سے ہرگز نہ کروں۔ میں نے ہامی بھر لی۔ اس دوران تواضع کا سامان میز پر سرو کر دیا گیا۔ اس نے ایک سینڈوچ اور کولڈ ڈرنک لیا۔ وہ سیاست دان تھا۔ سیاسی ہنڈیا میں جھوٹ کی ترکاری ابالنے کے ہنر میں یکتا تھا۔ اس نے خوشامدانہ باتوں سے میرا دل موہنے کی بھرپور کوشش کی۔ خاندانی غیرت ابھاری۔ کئی میٹھے اور سہانے خواب میری جاگتی آنکھوں کے حوالے کرنے کے بعد اس نے رخصت چاہی۔ میں اُسے گیلری تک ’سی آف‘ کرنے آیا۔ ایسے میں میرے لبوں پر بھی دکھاوے کی مسکراہٹ چپکی ہوئی تھی۔

میں نے کمرے میں آ کر دروازہ بند کیا۔ بیڈ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ فون کان سے لگا کر بولا۔ ”میڈم! یہ آپ نے کیا، کیا؟ کیا اب میں یارن خان کی بیٹی کو اغوا کرنے لاہور جاؤں گا؟“

اس نے ہنستے ہوئے میری بات کاٹ دی، بولی۔ ”نہیں جانم! تمہیں کچھ بھی نہیں کرنا ہوگا۔ دیکھتے جاؤ، میں کیا کرتی ہوں۔“

”مگر......“

”اگر مگر مت کرو۔ فوراً کمرا چھوڑ دو اور فورتھ فلور پر روم نمبر فور فور ون میں آ جاؤ۔“

”کیا مطلب؟ کیا آپ بھی اسی ہوٹل میں ہیں؟“ میں حیران رہ گیا۔

”تو کیا میں تمہیں اکیلا چھوڑ سکتی ہوں۔ کم آن!“ اس نے کہا اور کال منقطع کر دی۔ میں کمرے سے نکلا۔ طویل راہداری کے آخر پر واقع سیڑھیاں چڑھ کر چوتھی منزل پر پہنچ گیا۔ کمرا نمبر چار سو اکتالیس تلاش کرنے میں دقت پیش نہیں آئی۔ دستک کے جواب میں میڈم نے دروازہ کھولا۔ میں اسے دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ وہ سرخ اور زرد رنگ کے نفیس امتزاجی سوٹ میں تھی۔ سیدھی دل میں اُتر گئی کیونکہ اپنے ثقافتی لباس میں وہ قیامت ڈھا رہی تھی۔ میں نے اُسے اکثر پینٹ شرٹ میں دیکھا تھا۔

وہ میرے انہماک کو تاڑ گئی، ایک ذرا مسکرا کر بولی۔ ”کیا باہر ہی کھڑے رہو گے۔ اندر آ جاؤ۔“

کمرے کی تزئین و آرائش ویسی ہی تھی جیسی نچلے فلور پر دیکھ آیا تھا۔ بے آواز چلتے ہوئے ٹی وی سے پھوٹتی ہوئی مختلف رنگوں کی کرنیں قالین اور در و دیوار پر تھرک رہی تھیں۔ نرم دودھیائی روشنی میں، میڈم کی ہوش ربا موجودگی میں کمرا خواب ناک کیفیت پیدا کر رہا تھا۔ وہ میرے آگے چلتی ہوئی انٹرکام تک آئی۔ مینو سلپ پر نگاہیں دوڑاتے ہوئے ریسیور کان سے لگا کر روم سروس کو کھانے کی ہدایات دینے لگی۔ فارغ ہو کر میری طرف پلٹی۔ چند لمحے اپنے مخصوص شوخ انداز میں دیکھتی رہی پھر ہوا میں اُچھلی اور دونوں بانہیں پھیلا کر چاروں شانے چت بیڈ پر گری۔ بیڈ کے اسپرنگوں نے اُسے کم و بیش تین فٹ اوپر اچھال دیا۔ چند لمحوں تک اوپر نیچے ہوتی رہی، پھر بولی۔ ”شہریار! آج میں اپنے لیے سگریٹ لے آئی ہوں۔“

میں نے برا سا منہ بنایا، کہا۔ ”آپ سگریٹ پیتی ہوئی اچھی نہیں لگتیں۔“

اس نے جواباً منہ بنایا۔ ”میں کب اچھی لگنا چاہتی ہوں۔“

اس نے اپنے بائیں ہاتھ پڑی تپائی پر ہاتھ مارا۔ سگریٹ کیس اور لائٹر اُٹھایا۔ ایک سگریٹ منتخب کر کے نکالی اور دانتوں میں داب کر سلگا لی۔ سگریٹ کے دھوئیں نے بند کمرے میں چکراتی ہوئی ائر فریشنر کی خوشبو کو آن واحد میں ہڑپ کر لیا۔ وہ میرے چہرے کے اُتار چڑھاؤ بھانپتی ہوئی ہنسنے لگی۔ ہنستے ہنستے کھانسنے لگی۔ سگریٹ والا ہاتھ ہوا میں لہرا کر بولی۔ ”سگریٹ کے ایک سرے پر آگ جلتی ہے اور دوسرے سرے پر احمق کا دل سلگتا ہے۔ ہے ناں مزے کی بات؟“

میں خاموشی سے کھڑا رہا، وہ بولی۔ ”میں بچپن میں چوری چوری حقہ پیا کرتی تھی۔ جب چلم میں گڑ کم ہوتا تب شدید کھانسی آتی۔ نہ جانے پھر بھی کیوں حقہ پینے میں مزہ آتا تھا۔ تم دیہاتی ہو۔ جانتے ہی ہو گے کہ حقہ پینے والا سارا دن بھوکا تو رہ سکتا ہے مگر حقے کے بغیر ایک گھنٹا نہیں گزار سکتا۔“

میں نے طویل سانس لی۔ ”پلیز! آپ سگریٹ نہ پیا کریں۔“

وہ بولی۔ ”تم ایسے کیوں منہ بنائے کھڑے ہو۔ ادھر آؤ ناں۔ اپنی برادری کے ایم پی اے کے بارے میں بتاؤ۔ آج وہ سانپ اپنی کینچ اُتار کر آیا تھا۔ کیسا لگ رہا تھا؟“

میں بیڈ کی ایک نکڑ پر ٹک گیا، بولا۔ ”اس کی عیارانہ

اداکاری کو دیکھ کر میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اس کا منہ توڑ دوں۔ دانت نکال کر ہتھیلی پر رکھ دو۔ اسے ذرہ بھر یاد نہیں رہا تھا کہ اس نے مجھ پر ناقابلِ معافی ظلم توڑے تھے۔ وہ احسان مندی کی رسی تھام کر مجھ تک پہنچ گیا۔ تف ہے ایسے بے غیرت سیاست دان پر!"

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "تم نے ابھی کچھ نہیں دیکھا۔ اس ملک کی سیاست اس طوائف کے مانند ہے جو بھوکے دلالوں کے ہاتھ لگ کر گوشہ گوشہ دوڑتی ہے مگر کہیں پناہ نہیں پاتی۔ نہ صرف حیدر خان، بلکہ یہاں سبھی ایک جیسے ہیں۔ کھانے کے دانت اور، دکھانے کے اور۔ اس کمینے سے کوئی مزارعہ دو چار بوریاں گندم کی مانگنے چلا جائے تو اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہوگی۔ آج اپنی بیٹی کی ہم عمر لڑکی جو بقول اس کے، اس کی بھی بیٹی بھتیجی لگتی ہے، کو نوچنے کے لیے دو کروڑ دینے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ دو کروڑ!...... اتنی بڑی رقم جس سے پورا ایک گاؤں نئے سرے سے بسایا جاسکتا ہے۔ مگر وہ بڑا کمینہ ہے۔ ایک طرف دو کروڑ خرچ کرے گا۔ دوسری طرف یارن خان کو نیچا دکھا کر تین کروڑ مانگے گا۔ یہی حربہ میاں دلبر پر آزمائے گا۔ اپنا انتقام بھی لے گا اور دام بھی کھرے کرے گا۔"

اس نے لمبا کش لیا اور دھواں میری طرف اچھال دیا۔ میں نے ہاتھ سے دھوئیں کے مرغولوں کو منتشر کیا، کہا۔ "میڈم! میں اس کے ہوسیلے کھیل میں معاونت نہیں کرنا چاہتا۔"

وہ بولی۔ "کیا تمہیں یارن خان سے ہمدردی ہے؟"

میں نے جھٹ سے کہا۔ "نہیں۔ مگر میں کسی لڑکی کو پامال کرنا بزدلی اور کمینگی سمجھتا ہوں۔"

وہ اُٹھ بیٹھی۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "تمہارے ساتھ جو کچھ ہوا، کیا وہ کمینگی نہیں؟"

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ میں نے اُسے شکوہ بار نظروں سے دیکھا، کہا۔ "میڈم! آپ مجھے سمجھنے کی کوشش کریں۔"

"مجھے سمجھانے کے بجائے تم دو کروڑ روپے کی طاقت کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ گنتے گنتے انگلیاں شل ہو جاتی ہیں۔"

اس نے مربیانہ انداز میں کہا۔ "تم نے رات میں اسما کو دیکھا۔ نہ زندہ، نہ مردہ ہے۔ دو چار دنوں کے بعد اُسے پھر دیکھنا۔ وہی، جو تمہیں فرشتہ قرار دے رہی تھی، تمہیں انسان قرار دینے سے گریزاں ہو جائے گی۔ پہلے کی طرح خوبصورت اور پاکیزہ دکھائی دینے لگے گی کیونکہ اس کی شخصیت کے عقب میں اس کے سیاست دان باپ کا کروفر چھپا ہوا ہے۔ فرعونیت چھپی ہوئی ہے۔ وہ بھول جائے گی کہ اُس کے ساتھ کیا انسانیت سوز اور اخلاق باش سلوک کیا گیا تھا۔ ہاں! یارن خان کی بیٹی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوگا اور وہ وقت گزرنے پر بھول جائے گی۔ غریبوں کی لڑکیاں خود کشیاں کرتی ہیں اور تم کیا سمجھتے ہو کہ یہ خانزادیاں، اسما یا عافیہ خان، باکردار اور پارسا لڑکیاں ہیں؟ کیا ان کی راتوں میں انگارے پھینکنے والا کوئی مشتاق چاند طلوع نہیں ہوتا؟...... نہیں شہریارا کوئی ظلم نہیں ہوگا اگر ان کی دو چار راتیں بیچ کھائی جائیں گی۔"

میں اس کی باتوں میں چھپی سنگین معنویت سمجھ رہا تھا۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ میڈم میرے سمجھانے کے باوجود وہی کرے گی جو وہ دل میں ٹھان چکی تھی۔ تبھی میں نے کندھے اُچکائے، کہا۔ "میڈم! آپ بہتر فیصلہ کر سکتی ہیں۔"

وہ خوش ہو گئی، سگریٹ کو شیشے کی ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے بولی۔ "گڈ! اب ہم اس موضوع کو وقت آنے پر ڈسکس کریں گے۔"

وہ میری جانب جھکی۔ قریب آتے آتے رُک گئی۔ سوچ میں پڑ گئی۔ عادتاً نچلے ہونٹ پر انگلی رکھی۔ دائیں گوشے تک دھیرے دھیرے پھسلائی، پھر گلاب کے پتوں پر پڑے اوس کے قطروں جیسے ننھے ننھے اُبھاروں کے بیچ لا کر روک دی۔ آنکھیں چندھیا کر انگلی کی پور چوم لی۔ پھر بیڈ سے اُتر کر باتھ روم میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد لوٹی، بولی۔ "تمہیں سگریٹ کی بو اچھی نہیں لگتی اس لیے میں ماؤتھ واش لینے گئی تھی۔ وہ نہیں ملا تو برش کرنا پڑا۔"

میں نے نہ سمجھتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ وہ بولی۔ "تمہارا منہ مانگا انعام تمہارے شایانِ شان تو ہونا چاہیے ناں!"

وہ بیڈ پر لیٹ گئی۔ اَدھ کھلی آنکھوں سے دعوت انگیز انداز میں دیکھنے لگی۔ ہونٹ نیم وا کر کے بولی۔ "آؤ مسٹر الیگزینڈر دی گریٹ...... اپنی فتح یابی کا جشن مناؤ...... اپنا انعام وصول کرو۔"

مجھے یوں لگا جیسے میرا بدن شل ہو گیا ہو۔ اپنا منہ مانگا انعام وصول کرنے کا حوصلہ یکدم دم توڑ گیا اور میں مدد طلب نظروں سے اُسے دیکھنے لگا جسے دیکھنا بھی دل گردے کا کام تھا۔

معاشرتی ناہمواریوں پر مبنی دلوں کی دھڑکن، لہو کی گردش تیز کر دینے والے سطر بہ سطر جاری
اس سفر کے اگلے پڑاؤ کا احوال آئندہ ماہ

شہرِ برباد کی دھول

ڈاکٹر شیر شاہ سید

ہر قوم تاریخ میں اپنی تہذیب اور ثقافت کے حوالے سے ایک الگ شناخت قائم کرتی ہے... مگر اس قوم کی کوئی انفرادیت کسی ورق پر محفوظ نہیں رہتی جو اپنی تباہی کا سبب خود بن جائے اور جب انہی قصّوں کو دہرانے والے دنیا سے پردہ کرتے ہیں تو اپنے ساتھ ان داستانوں کو بھی دفن کر جاتے ہیں۔

دل سوز قصوں کی سرزمین...... جہاں ہر چہرے کی الگ کہانی ہے

بڑی سی واشنگٹن فلائر کی ٹیکسی کے لمبے چوڑے، گورے چٹے ڈرائیور نے میرا سوٹ کیس اور بیگ اٹھا کر ڈگی میں ڈالا اور پچھلی سیٹ کا دروازہ میرے لیے کھول دیا۔ مجھے پیچھے بیٹھنے میں ہمیشہ کوفت ہوتی ہے۔ میں آگے کا دروازہ کھول کر آگے ڈرائیور کی سیٹ کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ وہ بھی پچھلا دروازہ بند کر کے فوراً ہی اپنی سیٹ پر آن بیٹھا تھا۔

"ہاؤ آر یو؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"الحمدللہ، فائن تھینکس گاڈ۔" میں چونک گیا، کسی

گورے کے منہ سے الحمدللہ؟

ڈیلس ایرپورٹ واشنگٹن پہنچ کر مجھے ٹیکسی پکڑنی تھی اور پراچہ کے آفس پہنچنا تھا۔ امریکا میں کلینک کو آفس کہتے ہیں۔ پراچہ ورجینیا میں آنکھوں کا ڈاکٹر تھا، مجھے اس کے پاس ہی رہنا تھا اور واشنگٹن میں ہی ایک پانچ روزہ کانفرنس میں شرکت کرنی تھی۔ یہ کانفرنس دنیا میں تہذیبوں کے عروج وزوال کے موضوع پر منعقد کی جارہی تھی۔ کانفرنس میں نسل، ذات اور زبانوں کے نام پر قتل وغارت گری کے حوالے سے بھی بات ہونی تھی۔ یہ کانفرنس واشنگٹن میں کتابوں کے ایک ادارے اور واشنگٹن یونیورسٹی کے تعاون سے ہورہی تھی۔ نہ جانے یہ لوگ تہذیبوں کے عروج وزوال پر ماتم کر کے کیا سیکھنا چاہ رہے تھے۔ ان کی تو تہذیب بھی محفوظ تھی اور انہوں نے تو تاریخ سے سیکھا بھی تھا جس کے مطابق وہ اپنا ملک چلا رہے ہیں۔ یہ کانفرنس ہونی تو ہمارے ہاں چاہیے تھی جہاں تہذیبیں مٹ رہی ہیں، زبانیں موت کے گھاٹ اتاری جارہی ہیں، نسلوں کا خاتمہ ہورہا ہے، ذاتیں، ذات کے نام پر ہی خاموشی سے مٹتی چلی جارہی ہیں۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

میں تاریخ پڑھاتا تھا اور تاریخ ہی میرا اوڑھنا بچھونا تھا۔ پاکستان میں تاریخ پڑھانے والے پروفیسر کی تنخواہ اتنی نہیں ہوتی ہے کہ وہ واشنگٹن میں کسی کانفرنس میں جاسکے۔ صرف ہوائی جہاز کا کرایہ ہی میری چھ ماہ کی تنخواہ کے برابر تھا۔ پھر کانفرنس میں شمولیت کی فیس، واشنگٹن میں رہنے کا خرچہ اور اگر پاکستان سے باہر نکلنا ہو تو کچھ نہ کچھ خریداری بھی کرنی ہی پڑتی ہے۔ ادھر یہ حال کہ یونیورسٹی کا پروفیسر دال روٹی کھا کر عزت سے گزارہ ہی کرلے تو کافی ہے۔ ہمارے جیسے ملکوں میں تاریخ کی کیا اہمیت ہے۔ اگر تاریخ کی اہمیت ہوتی تو ہمارا یہ حشر ہی کیوں ہوتا۔

تاریخ سے کچھ نہیں سیکھا تھا ہم لوگوں نے، جبھی تو ملک ٹوٹ گیا تھا، جبھی تو شہر بہ ظاہر بڑھ رہے ہیں مگر اندر سے ختم ہورہے ہیں جیسے دیمک چاٹ جاتی ہے لکڑی کو۔ اس خطۂ زمین کی تاریخ بھی عجیب تھی۔ حکمرانوں کی تاریخ الگ تھی اور جنتا کی تاریخ الگ تھی۔ عوام موئنجودڑو سے پہلے بھی غلام تھے اور موئنجودڑو کے بعد بھی غلام ہیں اور حکمران طبقہ ہر دور میں حکمران ہی رہا تھا۔

پراچہ اور میں ایک ہی اسکول میں پڑھے تھے۔ کراچی کی پی آئی بی کالونی میں پل کر بڑے ہوئے تھے، مجھے کیمسٹری اور بیالوجی سے الجھن ہوتی تھی اور اسے پورس کے ہاتھی اور اشوک کے چکر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ میڈیکل کالج میں داخل ہوگیا اور واشنگٹن میں آنکھوں کا ایک بڑا ڈاکٹر بن گیا۔ میں نے تاریخ میں ایم اے کیا تھا، پھر صرف قسمت کا ہی چکر تھا کہ گوئٹے انسٹی ٹیوٹ سے مجھے جرمنی کا اسکالرشپ مل گیا اور میں نے یورپ کی تاریخ پر جرمنی میں پی ایچ ڈی کرڈالی۔ وہ پانچ سال میری زندگی کے خوب صورت سال تھے۔ پورا یورپ، انگلینڈ، آئرلینڈ دیکھ لیا تھا۔ میں کمیونسٹ ممالک بھی جاکر دیکھ کر آیا تھا۔ پانچ سال تک پڑھا، ملک گھومے، بچت کچھ نہیں کرسکا پاکستان واپس آیا تو ایک چھوٹا سا مکان جو والد صاحب سے ورثے میں ملا تھا میرا کل اثاثہ تھا اور وہ بھی ایسا تھا کہ اس میں کچھ مرمت، کچھ تبدیلیاں کرا کر رہ سکوں۔ پراچہ نے ہی مجھے اس میٹنگ کے لیے بلالیا تھا۔ میرا ٹکٹ بھی خریدا، کانفرنس کی فیس بھی دی اور کانفرنس کے بعد ایک ہفتے کی چھٹی کر کے امریکا گھمانے کا پروگرام بھی بنایا تھا...... ہماری بچپن کی دوستی میں اس کی مصروفیت کوئی خاص برا اثر نہیں ڈال سکی تھی۔

پروگرام یہی تھا کہ میں ڈیلس ایرپورٹ سے پراچہ کے آفس پہنچ جاؤں گا پھر وہاں سے کچھ دیر کے بعد پراچہ کے گھر چلیں گے جہاں باتیں ہوں گی اور مزید پروگرام بنے گا۔ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ ایرپورٹ پر واشنگٹن فلائر کی ٹیکسی مل جائے گی۔ وہ خود نہیں آسکتا تھا کیونکہ اسے ایک آپریشن کرنا تھا۔

ڈرائیور کے الحمدللہ سے میں یہی سمجھا تھا کہ یہ کوئی امریکن مسلمان ہے۔ آج کل امریکا میں ہر سال ہزاروں لوگ مسلمان، بدھسٹ، ہری راما ہری کرشنا اور چین کے مختلف مذہب اپنا رہے تھے۔ جن سماجوں میں دولت کی فراوانی ہوتی ہے اور سننے کی برداشت ہوتی ہے، وہاں کے لوگ اپنے مذہب، اپنے اعتماد، اپنے یقین سے اکتا جاتے ہیں اور ایک اقلیت مذہب تک بدل دیتی ہے یا لامذہب ہوجاتی ہے۔ امریکا، یورپ، جاپان میں یہی ہورہا تھا۔ سائنسی ترقی اور مادی آسائشوں نے روحانی خلا پیدا کردیا تھا جس کے لیے یہ سب کچھ ہورہا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا کہ کیا وہ امریکن ہے؟

اس نے جواب دیا تھا ”نہیں امریکن نہیں افغانی ہوں۔“ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ واشنگٹن میں افغانی ڈرائیور سے ملاقات ہوجائے گی۔ افغانستان تو ہمارا پڑوسی ملک تھا اور میں ایک بار شاہ ظاہر شاہ کے زمانے میں

افغانستان جا بھی چکا تھا اور اب جو کچھ وہاں ہوچکا تھا اور جو کچھ ہورہا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ تباہی کے وہ بادل پاکستان میں بھی آئیں گے۔ ابھی بادلوں کی کمی ہے۔ وہ جمع ہورہے ہیں آہستہ آہستہ گھنگھور گھٹا بن کر چھا جائیں گے اور جب چھٹیں گے تو بہت کچھ لٹ چکا ہوگا۔

میں نے پوچھا۔ ”کب آئے آپ افغانستان سے؟ میں پاکستان سے آیا ہوں اور کابل، قندھار خوب گھوم چکا ہوں۔ جب اچھے حالات تھے وہاں کے۔“ میں نے اپنے بارے میں بتاتے ہوئے بات بڑھائی تھی۔

”میں قندھار کا رہنے والا ہوں۔ آپ پاکستان میں کہاں سے آئے ہیں؟ میں کراچی کے منو ہوٹل میں رہ چکا ہوں۔ آپ جانتے ہو منو ہوٹل۔“ اس نے سوال کیا تھا۔ ”مکی مسجد کے پاس ہے۔“ اس نے خود ہی جواب بھی دے دیا تھا۔

”میں کراچی کا ہی ہوں مگر اب منو ہوٹل اسپتال بن گیا ہے۔ کراچی میں ہوٹل، سینما، پارک، سب ختم ہوتے جارہے ہیں اور اب صرف پاگل خانے، اسپتال اور گندی گندی عمارتیں بن رہی ہیں۔“ میں نے ہنس کر جواب دیا۔ ساتھ ہی پوچھ لیا کہ آپ منو ہوٹل میں کیا کررہے تھے؟

”امریکا آنے سے پہلے بہت جگہ جانا پڑ گیا، کراچی بھی ایک ایسی ہی جگہ ہے۔ ہم افغانیوں کی ایسی ہی کہانی ہے۔ اب کوئی نہیں ہے ہمارا، کوئی زمین نہیں ہے۔ ہماری قوم بین الاقوامی سطح پر مفلوک الحال ہوکر رہ گئی ہے۔ اچھوت جنہیں کوئی چھو بھی نہیں سکتا ہے جن سے لوگ نفرت کرتے ہیں، جو خود اپنا وقار اپنی نظروں میں کھو چکے ہیں۔ کبھی کہانی نے چھوڑیں۔“ اس نے جواب دیا تھا۔

”کہانیوں سے تو مجھے بڑی دلچسپی ہے۔ نہیں، مجھے بتائیں کیا ہوا تھا۔“ میں نے بڑی دلچسپی سے کہا۔ ”مجھے ابھی تک قندھار یاد ہے۔ میں وہاں رمضان کے دوران میں گیا تھا اور توپ خانہ بازار کے پاس ایک چھوٹے سے ہوٹل میں ٹھہرا تھا اور مجھے یاد ہے رمضانوں میں سارا شہر رات بھر جاگتا تھا۔ تراویح کے بعد ہوٹلوں میں موسیقی چلتی رہتی تھی اور فنجانوں میں لوگ چائے پیتے رہتے تھے۔ اب تو مجھے یاد نہیں ہے، گانے والوں کا نام مگر کچھ نام ابھی تک یاد ہیں۔ ارے ہاں میں نے وہاں کے منزل باغ سنیما میں دلیپ کمار کی فلم ”داستان“ بھی دیکھی تھی۔ وہی میری زندگی کی پہلی ہندوستانی فلم تھی۔“

وہ لمبی سیاہ شاہراہ پر دور نظر جمائے ٹیکسی چلا رہا تھا۔

میں نے دیکھا اس کی آنکھوں کے کونے نم ہوگئے ہیں اور آنسوؤں کے دو قطرے ٹپک کر گالوں پر پھیل رہے ہیں۔ میں نے شاید اس کو دکھی کردیا تھا۔ اس نے ٹشو پیپر نکال کر آنسو پونچھے تھے اور بڑی گلوگیر آواز میں بولا تھا۔ ”سب ختم ہوگیا۔ اب توپ خانہ بازار اور باغ پل پر زندگی مرچکی ہے۔ منڈی بازار میں سناٹا ہے اور منزل باغ کا سنیما ختم کر کے وہاں مسجد بنادی گئی ہے۔ سب ختم ہوگیا افغانستان میں۔ میں تو ہوں ہی قندھار شہر کا اور آپ نے جو یہ سارے نام لیے تو جیسے میرے سینے پر گولی ماری ہے۔ وہ ساری چیزیں میرے سامنے آگئی ہیں اور دل رونے لگا ہے۔“ اس نے بڑی سادگی سے کہا۔ ”بڑی عجیب کہانی ہے میری۔ میں کابل یونیورسٹی میں فزکس پڑھاتا تھا اور اب واشنگٹن کی سڑکوں پر ٹیکسی چلاتا ہوں۔ کابل یونیورسٹی کے پروفیسر کپڑوں اور قالینوں کا بازار لگاتے ہیں، اسکول استاد برگر بیچتے ہیں اور ہوٹلوں میں ویٹر بن گئے ہیں۔ فوج کے کرنل اور جنرل اور ایرکموڈور دنیا کے شہروں شہروں میں مسافر بن کر وظیفوں پر زندہ ہیں۔“

ہماری بچیاں جو وہاں پر اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں یہاں بڑے بڑے اسٹوروں میں سیلز گرل بن گئی ہیں۔ یہ ہورہا ہے افغانستان کے ساتھ۔ دنیا کے ہر ملک میں افغانی موجود ہیں۔ وہ ہر کام کرتے ہیں، جھاڑو لگانے سے لے کر عزت بیچنے تک۔ پیٹ سب کچھ کراتا ہے۔ میرے جیسے نہ جانے کتنے لوگ کہاں کہاں پر کس کس طرح کیا کیا کررہے ہیں نہ آپ کو اندازہ ہے اور نہ ہی ان لوگوں کو اندازہ ہے جو ان سب چیزوں کے ذمے دار ہیں اور افغانستان میں جو ہورہا ہے اس کی تو مثال ہی شاید کہیں نہیں ملے گی۔“

”آپ کیسے نکلے تھے؟“ میں نے انہیں بیچ میں روک کر پوچھا تھا۔

”یہ سب کچھ یکا یک ہی ہوگیا تھا۔ روسیوں کے جانے کے بعد ہم نے سوچا تھا کہ اب کچھ امن وامان ہوجائے گا۔ اب دوبارہ زندگی سانس لے گی، اب دوبارہ سڑکوں پر رونقیں بحال ہوں گی، دوبارہ اسکول، کالج، یونیورسٹی میں تعلیم کا دور دورہ ہوگا، دوبارہ لوگ غریب ہوں گے مگر ذہن ودل کے امیر ہوں گے مگر یہ کچھ نہیں ہوا۔ ایک تیسری جنگ، ایک اور بڑی جنگ میں تبدیل ہوگئی تھی اور ایسی صورت حال ہوگئی کہ ہر پڑھے لکھے ہنرمند قابل آدمی کو افغانستان چھوڑنا پڑ گیا تھا۔ میں بھی کسی نہ کسی طرح سے بھاگ کر کابل سے نکلا تھا۔ کسانوں کی طرح کے کپڑے

پہن کر اپنی بیوی کے ساتھ۔ رات کے اندھیرے میں کھیتوں، وادیوں کو پھلانگتے ہوئے، ندی نالوں کو پھلانگتے ہوئے کھاڑیوں سے اور جنگجوؤں سے بچتے ہوئے قندھار سے ہوکر چمن اور پھر کوئٹہ پہنچ گیا تھا۔ کس کس طرح سے میں نے اپنی بیوی کی حفاظت کی ہے اس کا سوچ کر بھی خوف آتا ہے۔ میرے کتنے ہی ساتھی کابل یونیورسٹی میں گولیوں کا نشانہ بن گئے ان کی بیویاں طوائف بن گئیں، ان کے بچے بھکاری بن کر رہ گئے ہیں۔ قندھار جانا ضروری تھا۔ کچھ سونا تھا۔ ماں باپ کے زیورات تھے جن کا لے جانا ضروری تھا کیونکہ بغیر پیسے کے ہم لوگ کہیں بھی نہیں جاسکتے تھے۔''

وہ ذرا دیر کے لیے رکا۔ ''ساری باتیں تو بتانا مشکل ہے، مہینے گزر جائیں گے کہانیاں ختم نہیں ہوں گی۔ صرف واشنگٹن میں ہی تیس ہزار افغانی ہیں اور تیس ہزار کہانیاں ہیں۔ پھر آپ کی بتائی ہوئی جگہ بھی آجائے گی۔ مگر میں آپ کو بتاتا ہوں۔ آج بہت دنوں کے بعد آپ نے مجھے رلادیا ہے۔ آج ہم افغانیوں کے پاس آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں ہے۔'' اس نے رک رک کر کہا۔

''کوئٹہ میں ہی ایک ایجنٹ عبدالولی سے ملاقات ہوئی اور اس نے کراچی میں ایک ٹریول ایجنٹ سے رابطہ کرایا تھا اور ہم لوگ ٹرین سے کراچی آئے اور منو ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ سونے کے زیورات بیچ کر جو بھی ہمارے پاس تھا اور دوسرے رشتے داروں سے ادھار لے کر دو دو لاکھ میں طے ہوا اور ہم لوگوں کو سوئڈش پاسپورٹ مل گیا تھا اور ساتھ میں ٹکٹ بھی۔ وہ پاسپورٹ جعلی تھے، ان پر ویزا بھی جعلی تھا۔ ہم لوگ کراچی سے نکلے، ترکی پہنچے، ترکی سے اٹلی اور اٹلی سے سیدھا نیویارک۔ نیویارک ایئرپورٹ پر ہی ہم نے امریکن پولیس کو بتادیا تھا کہ ہم لوگ سوئیڈن کے نہیں ہیں بلکہ جعلی ویزے پر سوئڈش بن کر آئے ہیں۔ ہم لوگ افغانی ہیں اور سیاسی پناہ چاہتے ہیں۔ چھ گھنٹے کے انٹرویو کے بعد ہمیں رہنے کی اجازت ملی تھی۔ ایجنٹ نے ہی نیویارک کے ایک یہودی وکیل کا پتا بتایا تھا جس کو ہم نے ایئرپورٹ سے ہی فون کردیا تھا۔ اس کے لوگ پہنچ گئے تھے۔ وکیل کو دینے کے لیے کچھ پیسے نہیں تھے ہمارے پاس مگر نیویارک کا نظام بہت اچھا ہے اور یہودی وکیل اپنے کام میں پکے ہیں۔ انہوں نے ہم سے صرف یہ کہا تھا کہ ہم لوگوں کو بعد میں قسطوں میں پانچ ہزار ڈالرز دینے ہوں گے جب نوکری کی اجازت ملے گی اور ایک معاہدہ بھی دستخط کرایا تھا اس نے۔

چھ گھنٹے کے بعد امریکن حکومت کے خرچے پر ہی ایک سیاسی پناہ گزینوں کی پناہ گاہ میں ہم لوگوں کو رکھ لیا گیا تھا اور اس یہودی وکیل نے تین ہفتے میں ہی ورک پرمٹ کا انتظام کرادیا تھا۔ اب ہم لوگ امریکی حکومت کے مہمان تھے، کام کرسکتے تھے، بینک سے ادھار لے سکتے تھے، ہم سب کو سوشل سیکیورٹی کا نمبر مل گیا تھا۔ اب تو سات سال ہوگئے ہیں اور گرین کارڈ بھی بن گیا ہے اور تھوڑے دنوں میں امریکن پاسپورٹ بھی مل جائے گا۔ ووٹ بھی دے سکیں گے ہم لوگ۔ ہزاروں سال میں جو حق افغانستان میں نہیں ملا تھا وہ یہاں چند سالوں میں مل گیا ہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے لمبی سانس لی اور گاڑی میں لگے ہوئے فون پر کسی کو فون کرکے پراچہ کے آفس جانے کا راستہ سمجھا پھر فون رکھ کر کہا۔ ''اب ہم لوگ سب امریکن ہیں، بچے امریکن اسکولوں میں جاتے ہیں، میری بیوی نے ایم اے کیا تھا اور کابل کے دفتر خارجہ میں کام کرتی تھی، اب وہ کے مارٹ میں کام کرتی ہے اور میں فزکس پڑھاتا تھا، واشنگٹن کی سڑکوں پر ٹیکسی چلاتا ہوں۔ اگر آپ کو فرصت ہو اور آپ کو افغانوں کو دیکھنا ہو تو اتوار کو مجھے ملیں، میں آپ کو یونیورسٹی کے پروفیسر دکھاؤں گا جو پارکنگ لاٹ میں گاڑیوں کو پارک کراتے ہیں، وہ جج دکھاؤں گا جو ہوٹلوں کے دروازوں پر کھڑے ہیں، وہ افغانی عورتیں دکھاؤں گا جو ریسٹورنٹ میں ٹیبل صاف کرتی ہیں۔ اس ملک میں ڈالر کے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ زندہ رہنے کے لیے ڈالر چاہیے اور ڈالر درختوں پر نہیں اگتے ہیں۔ اب زیادہ دور نہیں ہیں ہم لوگ۔'' اس نے گاڑی ہائی وے سے چھوٹی سڑک پر گھماتے ہوئے کہا۔

میں بھی باتوں میں تقریباً کھو گیا تھا۔ ایک طرف سنتا جا رہا تھا دوسری جانب ذہن نہ جانے کہاں کہاں کی باتیں سوچ رہا تھا، طرح طرح کے خیالات ذہن کو جھٹکے دے رہے تھے۔ میں جو تاریخ کا پروفیسر تھا، تہذیبوں کے زوال وعروج پر کانفرنس میں شمولیت کے لیے واشنگٹن آیا تھا، میرے ملک کے برابر میں ایک اپنی تہذیب مٹی میں مل رہی تھی جس کے سپوتوں نے ہندوستان سے ترکی تک ہزاروں سال حکومت کی تھی، جن کی زبان میں چاشنی تھی، جن کے گیتوں میں بلا کا درد تھا، جن کے شاہوں کے دربار میں علم وفضل کی رسائی تھی، جن لوگوں پر دنیا کی کوئی اور قوم حاکم نہیں ہوسکی تھی۔ وہ ریزہ ریزہ ہوکر بکھر گئے ہیں۔ زمین پر پڑے ہوئے ایک پتھر کی طرح جس کی کوئی سمت نہیں ہوتی جو لوگوں کی ٹھوکروں کی مرضی سے اپنے راستے کا تعین کرتا

ہے۔ مجھے ایک شدید دھچکا سا لگا۔ میرے ذہن میں سوال آیا اور میں پوچھ بیٹھا کہ اگر افغانستان کے حالات صحیح ہوجائیں تو تم واپس جاؤ گے؟

اس نے کہا۔ ''ضرور جاؤں گا، فوراً جاؤں گا۔ یہ میرا ملک نہیں ہے، یہ میرا کلچر نہیں ہے، یہ زمین میری نہیں ہے، یہاں میری ماں کی قبر نہیں ہے، میرے دادا کا مکان یہاں نہیں ہے، میں کیا، میرے خیال میں ساٹھ ستر فیصد سے زیادہ افغانی فوراً واپس چلے جائیں گے۔ اگر ہمارا پرانا کابل ہمیں مل جائے۔'' اس کی آواز پھر بھرا گئی۔ ''مگر حالات اب کبھی صحیح نہیں ہوں گے۔ افغانستان کی موت ہوگئی ہے۔ وہاں اب ایسے لوگ ہیں جو مٹی کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے بتوں سے خوف زدہ ہیں، جو پہاڑوں میں کاٹے گئے ہزاروں سالوں سے ایستادہ گوتم بدھا کے غیر مسلح مجسمے سے جنگ کررہے ہیں، جو بھوک کے عفریت سے خوف زدہ ہیں، جو غربت کے عذاب سے جنگ نہیں کرتے، جو ناانصافی کے چنگل سے نہیں نکلنا چاہتے، جو صدیوں کی جہالت کو مستقل کرنا چاہتے ہیں، جو دنیا بھر کے خلاف ہیں مگر دنیا بھر سے بھیک لینے پر کسی قسم کا اعتراض نہیں رکھتے ہیں۔ وہاں اب ایسے لوگ ہیں جو افغانستان کو اس قبائلی دور میں واپس لے گئے ہیں جہاں پیغمبروں کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ اب پیغمبر نہیں آئیں گے اور افغانستان تباہ ہوتا چلا جائے گا۔ آپ اخبار تو پڑھتے ہوں گے، کبھی بی بی سی بھی سنتے ہوں گے۔ ریڈیو ایران کی آواز بھی آتی ہوگی، وائس آف امریکا کی آواز بھی آتی ہوگی، یہ سب کیا کہہ رہے ہیں؟ اب وہاں کیا ہورہا ہے؟ آپ تو پاکستانی ہیں ناں، آپ کو تو پتا ہونا چاہیے کہ آپ کی فوج نے آپ کے ملک کے ان حکمرانوں نے جو جنگ روسیوں سے شروع کی تھی، وہ کہاں ختم ہوئی ہے؟''

تھوڑی دیر وہ بھی خاموش رہا اور میں نے بھی کچھ نہیں کہا، مگر پھر پوچھا کہ آخر کیسے ہوگیا یہ سب کچھ؟ اس کے جواب نے مجھے دوبارہ چونکا دیا تھا۔ ''یہ بھی ایک لمبی کہانی ہے۔ میں نے ساری زندگی فزکس پڑھائی ہے۔ توانائی کے اصولوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ کائنات کی ابتدا اور کائنات کی انتہا کے معموں پر غور کرتا رہا ہوں۔ اب بھی جب ان سڑکوں پر ٹیکسی چلا رہا ہوتا ہوں تو کابل کی کوئی صبح، کوئی شام، کوئی تھکی ہوئی دوپہر یاد آجاتی ہے جب کابل یونیورسٹی میں کوئی لڑکا یا لڑکی مجھ سے پوچھتے تھے کہ آئن اسٹائن کے انرجی کے قوانین کے مطابق کیا انرجی کے لیے

سورس کا ہونا ضروری ہے؟ کوئی مجھ سے پوچھتا تھا کیا زمینی کشش کی طرح دوسرے سیارے کشش رکھتے ہیں؟ کیا انسان کبھی چاند سے بھی اوپر جاکر دوسری دنیاؤں میں پہنچ سکے گا؟ کیا کبھی بلیک ہول کی اصلیت کا پتا چل سکے گا؟ کابل کی وہ یونیورسٹی ویانا کی یونیورسٹی یا آکسفورڈ یونیورسٹی یا ہارورڈ کی طرح سے مالامال یونیورسٹی نہیں تھی، مگر احساس امن تھا۔ وہاں پر تعلیم کی کشش تھی، وہاں زندہ رہنے اور زندہ رہنے دینے کی روایات تھیں۔ وہاں پر اب جہالت کا ایک بہت بڑا بلیک ہول بن کر رہ گیا ہے۔ جہل کی ہر چیز کھنچ کھنچ کر چل رہی ہے اور کوئی نہیں ہے ذمّے دار اس کا۔ ہم افغانی، صرف افغانی ہی ذمّے دار ہیں اس کے۔'' لمبی سیاہ سڑک لگتا تھا کہ کبھی ختم نہیں ہوگی اور اس کی نظریں روڈ پر جمی ہوئی تھیں اور لگتا تھا کہ ذہن کہیں دور، بہت دور گھوم رہا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا، اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ بے وطن، بے زمین آدمی کے آنسو ایسے ہی ہوتے ہوں گے، ایسا ہی کرب ہوتا ہوگا دلوں میں جس کو اگر چھیڑ دیا جائے تو چھلک جاتا ہے اسی طرح سے۔ مجھے دل ہی دل میں افسوس سا ہونے لگا تھا۔

یہ روسیوں کا کام ہے اور نہ امریکیوں کا، یہ تو ہمارا ہی کیا دھرا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر بولا۔'' اس کا ذمّے دار نہ پاکستان ہے اور نہ ہی ایران، یہ افغان قوم ہی ذمّے دار ہے اس کی۔ دنیا میں ایسی بہت کم قومیں ہوں گی جنھوں نے آپس میں ایک دوسرے کا اتنا خون بہایا ہوگا، پانی کی طرح۔ امیروں نے بھی، غریبوں نے بھی، پڑھے لکھے لوگوں نے بھی، جاہلوں نے بھی۔ افغانیوں کی جنگ، میری جنگ، میری بیوی کی جنگ، میرے بچوں کی جنگ لڑنے والا کوئی نہیں ہے اور جس قوم کے لوگ اپنی ہی قوم کے خلاف غیروں کی جنگ لڑتے ہیں انہیں تباہی اور بربادی کے سوا کیا مل سکتا ہے؟'' میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا، خون کا سمندر اس کے چہرے پر موجیں مار رہا تھا۔

پھر میری منزل آگئی۔ پراچہ کے کلینک کے سامنے گاڑی رک گئی تھی۔ اس کے چہرے پر ابھی تک سرخی نمایاں تھی۔ اس کے اندر کا درد ابھی تک اس کے چہرے پر عیاں تھا۔ ٹیکسی دیکھ کر اندر سے پراچہ کی سیکریٹری باہر آگئی۔ میرے منع کرنے کے باوجود اس نے ٹیکسی کا کرایہ دے دیا۔

پانچ دن کی کانفرنس بہت اچھی تھی، ساری دنیا سے تاریخ داں آئے ہوئے تھے۔ لاطینی امریکا کے، مایا تہذیب سے لے کر اہرام مصر کی کہانی دہرائی گئی تھی۔ یمن کی عمارتوں سے لے کر موہنجوداڑو کی تعمیرات کے معجزوں پر غور کیا گیا تھا۔ ہلاکو خان سے سکندر اعظم تک کیا ہوا تھا، ہٹلر سے ویت نام تک ایک ہی کہانی تھی، قومیں، نسلیں، ذاتیں، ثقافتیں، تمدن، زبان، تہذیب، مذہب، اعتقاد، ایمان، یقین سب اسی وقت تباہ ہوئے جب انسانوں نے آپس میں جھگڑا شروع کیا، اپنے اندر سے فساد کا آغاز کیا۔ ہر آغاز کا نام نیا، پر انجام مختلف نہیں تھا۔ قتل و غارت گری، عورتوں کی پامالی، بچوں کی رسوائی، بوڑھوں کی کسمپرسی اور جوانوں کے خون کا نذرانہ...... تاریخ تو بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کرتی ہے مگر نہ جانے کیوں انسان سمجھتا نہیں ہے۔ وائٹ ہاؤس سے وائٹ ہال تک، کریملن سے تن مِن اسکوائر تک، اسلام آباد سے دلی تک، تل ابیب سے بیروت تک اور نکاراگوا سے پیرس تک۔ ساری کانفرنس کے دوران میں سنتا رہا، سمجھتا رہا اور سوچتا رہا تھا۔

کانفرنس کے اختتام پر مجھے کابل یونیورسٹی کا وہ پروفیسر بہت یاد آیا جو واشنگٹن میں ٹیکسی چلاتا ہے۔ اس کا تو نام بھی نہیں پوچھا تھا میں نے مگر نام میں کیا رکھا ہے۔ ہزاروں لاکھوں افغان مہاجروں کے کوئی نام تھوڑی ہیں، سب مہاجر ہیں اور سب اس ٹیکسی ڈرائیور کی طرح بے سکون، بے اطمینان، بے منزل، بے مکان۔

میں نے پراچہ سے پوچھا تھا کہ واشنگٹن کی سڑکوں، محلوں، بازاروں اور مضافاتی علاقوں کا نقشہ سمجھنے میں کتنے دن لگیں گے؟ کیا وہ مجھے ادھار پر ہی سہی ایک ٹیکسی دلادے گا؟ جب پڑوس کا طوفان ہمارے پاس بھی پہنچے گا، سرحد کے اس طرف پشاور سے کراچی تک، جب نیویارک کا وہ یہودی وکیل مجھے بھی سیاسی پناہ دلاکر امریکا میں کام کرنے کا ورک پرمٹ دلادے گا تو میں اس فزکس کے پروفیسر کی طرح واشنگٹن کی سڑکوں پر اپنی قوم کی بے غیرتی کی کہانی سناؤں گا کیونکہ تاریخ پڑھنے کا وقت ختم ہوچکا ہوگا۔

پراچہ ہنس پڑا، بڑے زور سے، بڑی بے یقینی کے ساتھ۔ وہ ڈاکٹر تھا آنکھوں کی بیماریوں کا ماہر، آنکھوں کے اندر جو ایک عدسہ ہوتا ہے اس کے آپریشن میں یکتا۔ اسے میری طرح سے کیمسٹری یا بیالوجی سے نفرت نہیں رہی تھی۔ اسے سکندر اعظم اور راجا پورس کی جنگ سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے تاریخ نہیں پڑھی تھی۔

اس لیے وہ ہنس رہا تھا اور میری آنکھوں میں دھول اڑ رہی تھی، لٹتے ہوئے قریوں کی دھول......

چھوٹے چھوٹے قصبوں میں خبریں جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہیں۔ ہوسٹن میں بھی یہ بات ہر فرد کے علم میں تھی کہ ولبر آج بستر مرگ پر ہے۔ ڈاک خانے، ریسٹوران یا کسی دکان پر جب بھی چار آدمی جمع ہوتے ولبر کی خوبیوں اور خامیوں پر متاسفانہ لہجے میں تبصرہ کرنے لگتے۔ بہرحال اس بات پر سبھی متفق تھے کہ ولبر نے زندگی میں جو مقام بنایا وہ اس کی بیوی میرینا کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

شادی سے پہلے ولبر نے بیسیوں نوکریاں کی تھیں اور

آخری رسم

یوسف شیرانی

دنیا عجیب و غریب قصّوں سے بھری پڑی ہے۔ انہی میں ان کا شمار بھی ہوتا تھا جو ہر ایک کے لیے ایک مثالی جوڑا تھا مگر جو کچھ انہوں نے کیا اس کی بھی مثال کہیں ملنا مشکل تھی لیکن... یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اسے ہر حال میں اُس خاکے کو مکمل کرنا تھا جو اس اچانک پیش آنے والی صورتِ حال سے ادھورا رہ جاتا۔

اپنے فیصلوں پر اٹل ایک پُرعزم

صنفِ نازک کا قصہ

ہر جگہ سے نکال دیا گیا تھا کیونکہ وہ ہر جگہ تاخیر سے پہنچنے اور کام میں بے پروائی برتنے کا عادی تھا پھر اس نے ایک جگہ مزدوری کا کام حاصل کیا تو اس کی ملاقات میرینا سے ہوگئی۔ میرینا لمبے چوڑے قد کاٹھ اور مضبوط ہاتھ پیر کی عورت تھی۔ اس کی آواز میں مردانہ سا کھردراپن اور بالائی لب پر ہلکا سا روآں بھی تھا۔ وہ ایک اسکول ٹیچر تھی۔ جلد ہی ان دونوں کی شادی ہوگئی۔ میرینا عمر میں بھی ولبر سے کچھ بڑی تھی۔

اس شادی نے ولبر کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ اس کے ہر کام میں باقاعدگی آگئی۔ شادی کے چند روز بعد ہی میرینا نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے اسے قصبے کے اکلوتے بینک میں ملازمت دلوادی۔ بینک کے صدر نے اس اُمید پر ولبر کو ملازم رکھا کہ آزمائشی مہینے ہی میں وہ ولبر کی فطری بے پروائی کو بنیاد بنا کر اسے نوکری سے نکال باہر کرے گا لیکن اس وقت وہ بھونچکا رہ گیا جب نوکری کے پہلے ہی دن عین صحیح وقت پر ولبر نے بینک میں قدم رکھا اور مسکرا کر اسے صبح بخیر کہا۔ زندگی بھر کے معمول کے برخلاف اس کے کپڑے بھی صاف ستھرے اور جوتے پالش شدہ تھے۔ اس کے بعد تیس سال گزر گئے اور ولبر ایک دن بھی اپنی ڈیوٹی پر تاخیر سے نہ پہنچا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ترقی کرتے کرتے بینک کے نائب صدر کے عہدے پر پہنچ گیا۔ لوگوں میں افواہیں مشہور تھیں کہ ولبر کی بیوی نے بہ زور بازو اسے باقاعدگی سکھائی تھی۔

تیس سال کی ازدواجی زندگی میں ان کے ہاں دو بچے پیدا ہوئے ایک لڑکا اور ایک لڑکی، جو اب خود بھی شادی شدہ تھے اور صاحبِ اولاد ہو چکے تھے۔ ولبر نے ذاتی مکان بنالیا تھا لیکن یہ زندگی جس میں انقلاب لا کر اس نے پورے قصبے کو حیران کر دیا تھا، اب اس کے ہاتھوں سے نکل رہی تھی، وہ بستر مرگ پر تھا۔

میرینا اس کے برابر والے کمرے میں افسردہ بیٹھی تھی اور بار بار ایک سفید رومال سے آنکھیں پونچھ رہی تھی۔ وہ خاموشی سے روئے جا رہی تھی۔ ازدواجی زندگی کے تیس برسوں نے اس میں کوئی خاص جسمانی تغیرات پیدا نہیں کیے تھے، سوائے اس کے کہ بالائی لب پر موجود روآں کچھ اور گہرا ہو گیا تھا اور تیس سال تک باقاعدگی سے ولبر کو ڈانٹ پھٹکار ہی کا نتیجہ تھا کہ ولبر جیسے ناکارہ انسان کی زندگی سنور گئی تھی یہی نہیں بلکہ اس نے اچھی خاصی شدید بیماریوں کے دوران میں بھی کبھی چھٹی نہیں لی تھی۔ بستر مرگ پر پہنچ کر ہی اس کے معمولات درہم برہم ہوئے تھے۔

ڈاکٹر، ولبر کے کمرے سے باہر آیا تو میرینا اٹھ کھڑی ہوئی۔ ڈاکٹر نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ اس کے چہرے پر وہی متانت اور پراسرار سنجیدگی طاری تھی جو اکثر ڈاکٹروں کے چہرے پر ہوتی ہے۔

”سناؤ ڈاکٹر، کیا کیفیت ہے؟“ میرینا نے پوچھا۔

”میں نے ہر کوشش کر کے دیکھ لی ہے۔“ ڈاکٹر نے آہ بھری۔ ”جدید طبی تحقیق کا ہر نسخہ آزما کر دیکھ لیا ہے لیکن ...... لیکن کوئی اُمید نہیں۔“

”تمہارے خیال میں اس کے پاس کتنی گھڑیاں ہیں؟“ میرینا نے سرگوشی میں پوچھا۔

ڈاکٹر ہچکچایا تو وہ ملتجیانہ لہجے میں بولی۔ ”خدارا ڈاکٹر! مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ مجھے عزیز و اقارب کو بھی مطلع کرنا ہے۔“

ڈاکٹر نے پُرخیال انداز میں ٹھوڑی کھجائی۔ ”وہ یہ رات بھی نہیں گزار سکے گا۔“ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”کبھی کبھی کوئی مریض کچھ عرصے کے لیے اس بیماری سے جانبر ہو جاتا ہے لیکن ولبر......“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ولبر کی یہ آخری رات ہے۔“

میرینا نے یہ بات اسی جرأت مندی اور بلند حوصلے سے سنی جو اس کی فطرت کا خاصہ تھا۔ اس نے رومال سے آنکھیں خشک کیں۔ سر اٹھا کر ایک گہری سانس لی اور ہموار آواز میں کہا۔ ”تب تو مجھے عجلت کے ساتھ کئی کام کرنے پڑیں گے۔“

ڈاکٹر نے دوبارہ اس کا کندھا تھپتھپایا۔ ”تم ایک بلند حوصلہ عورت ہو میرینا۔“

میرینا اس سے متفق تھی اور اس کے خیال میں اس بے رحم دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے ہر انسان کے لیے اپنا حوصلہ بلند رکھنا ضروری تھا۔ سب سے پہلے تو اسے دور دراز ملکوں میں اپنے تمام عزیزوں، رشتے داروں کو فون کرنا تھے جن میں اس کا بیٹا اور بیٹی بھی شامل تھے۔ بیٹی ایک فوجی کے ساتھ بیاہی ہوئی تھی جو جرمنی میں تعینات تھا۔ بیٹا اپنی بیوی اور اس کے کنبے کے ساتھ جنوبی امریکا میں مقیم تھا جہاں وہ تیل کی ایک کمپنی میں ملازم تھا۔ باقی بیسیوں رشتے دار کرۂ ارض پر مختلف سمتوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ میرینا نے عام جذباتی لوگوں کی طرح انہیں ولبر کی بیماری کی شدت سے مطلع نہیں کیا تھا کیونکہ وہ بے چارے اس معاملے میں کر بھی کیا سکتے تھے۔ بہرحال ولبر کے جنازے میں تو ان کی شرکت لازمی تھی۔

ان سب کو بھرائی ہوئی آواز میں متوقع جنازے کی خبر دیتے ہوئے سہ پہر ہوگئی۔ بہرحال اس غم انگیز اور پریشان کن وقت میں کسی نہ کسی قسم کی مصروفیت، فارغ بیٹھنے سے بہتر تھی۔ اب میرینا کو جیروم کے ساتھ معاملات طے کرنا تھے جو کہ قصبے میں تجہیز و تکفین کرنے والی اکلوتی کمپنی کا مالک تھا۔ میرینا کے خیال میں اس قسم کے معاملات کو آخری لمحوں میں نمٹانا فاش غلطی تھی۔ انتقال ہونے کے بعد تو لواحقین ویسے ہی صدمے سے بے حال ہوتے ہیں۔ ایسے عالم میں تجہیز و تکفین کے انتظامات کے لیے بھاگ دوڑ کرنا کہاں کی دانش مندی ہے۔

جیروم جو کہ مرنے والوں کے لواحقین کو غم و اندوہ کی شدت سے پیدا ہونے والی نیم دیوانگی کی کیفیت میں اپنے سامنے بیٹھا دیکھنے کا عادی تھا، میرینا سے معاملات طے کرتے وقت ساری چوکڑی بھول گیا اور جب وہ رخصت ہوگئی تو جیروم سر تھام کر بیٹھ گیا۔ نہ جانے کس طرح میرینا اس سے تیسرے درجے کی تجہیز و تکفین کے نرخوں میں اوّل درجے کی تجہیز و تکفین کا معاملہ طے کر گئی تھی۔

پرسوں کا دن تجہیز و تکفین کے لیے طے ہوا تھا۔ میرینا کے اندازے کے مطابق اتنی مہلت تمام عزیز و اقارب کے یہاں پہنچنے کے لیے کافی تھی۔ جیروم کے دفتر سے میرینا ملبوسات کی دکان پر پہنچی اور اپنے لیے ایک سیاہ لباس منتخب کیا۔ جس میں ترمیم و تبدیلی کی کافی گنجائش تھی اور وہ آئندہ کئی برسوں تک متوقع موقعوں پر کام آسکتا تھا۔

اب جنازے کی خبر اخبار میں چھپوانے کا کام باقی تھا۔ ہوسٹن میں ایک ہی ہفت روزہ اخبار شائع ہوتا تھا۔ تھامس سیلنگ اس کا ایڈیٹر تھا۔ جنازے کے لیے جمعے کا دن طے ہوا تھا اور آج بدھ تھا۔ جمعرات کا اخبار شائع ہونا تھا اور جب میرینا تھامس سیلنگ کے پاس پہنچی تو اخبار کی ساری ترتیب مکمل ہو چکی تھی اور وہ چھپنے کے لیے پریس جا رہا تھا۔ بہرحال ولبر قصبے کے ممتاز افراد میں سے ایک تھا۔ ایڈیٹر نے کاپیاں رکوادیں۔ اس کے جنازے کی خبر تیار کروا کے صفحۂ اوّل پر لگائی اور میرینا مطمئن ہو کر دفتر سے نکل آئی۔

اب چند چھوٹے موٹے لیکن اہم کام باقی تھے مثلاً پھولوں کی فراہمی کا مسئلہ۔ میرینا کے اپنے بچے اور دوسرے رشتے دار جنہیں دور دراز مقامات سے یہاں پہنچنے کے لیے جہاز اور ٹرینیں پکڑنا تھیں ان کے پاس بھلا اتنا وقت کہاں ہوگا کہ وہ پھولوں کا بندوبست کر کے آئیں۔

قصبے میں پھولوں کی ایک ہی چھوٹی سی دکان تھی جسے اکثر ہنگامی ضرورت پڑنے پر قریبی شہر سے پھول منگوانے پڑتے تھے، لہٰذا بہتر یہی تھا کہ پہلے ہی دکاندار سے مل کر یہ انتظام بھی کر لیا جائے۔ میرینا نے کچھ دیر دکاندار کے پاس ٹھہر کر یہ تفصیلات بھی طے کیں۔ اب مسئلہ تھا کھانے کی فراہمی کا۔ ظاہر ہے جب پورا گھر عزیز و اقارب سے کھچا کھچ بھرا ہوگا اور سب رونے دھونے میں مصروف ہوں گے تو کھانا تیار کرنے کا ہوش کسے ہوگا۔ قصبے میں ایک ریستوران موجود تھا۔ جو غمی اور خوشی کے موقعوں پر کھانے کا بندوبست بھی کیا کرتا تھا۔ میرینا نے ریستوران کے مالک سے ملاقات کی اور جمعے کی شام کے کھانے کے لیے بھنے ہوئے مرغوں کا آرڈر بک کروایا۔ مہمان تجہیز و تکفین کی مشقت سے فارغ ہو کر واپس آئیں تو انہیں اچھا کھانا ملنا چاہیے، میرینا نے سوچا تھا۔

اس وقت شام ہونے لگی تھی۔ جب میرینا ان تمام کاموں سے فارغ ہو کر گھر واپس آئی۔ وہ خاصی تھک چکی تھی۔ رات تک ولبر کی دیکھ بھال کرنے والی نرس مسز شین ولبر کے پاس موجود تھی۔ اس کے رخصت ہونے کے بعد رات کے دس بجے دوسری نرس مس ریڈنگ کو آنا تھا اور ولبر

مزاحیات

وائف۔ ”میری شادی تو اسٹڈی کی وجہ سے لیٹ ہوئی۔ آپ کی شادی کیوں لیٹ ہوئی؟“

شوہر۔ ”میں صدقہ بہت کثرت سے دیا کرتا تھا۔

وائف۔ ”شادی سے صدقے کا کیا تعلق ہے؟“

شوہر۔ ”صدقہ بلاؤ کو ٹالتا ہے۔“

ایک سردار اپنے بیٹے کے رشتے کے لیے لڑکی کے گھر گئے۔ لڑکی والوں نے کہا کہ ”ہماری بیٹی ابھی پڑھ رہی ہے۔ ہم اس کی شادی نہیں کر سکتے۔“

سردار نے کہا کہ ”چلو کوئی بات نہیں انہیں پڑھنے دو ہم لوگ ایک گھنٹے بعد آئیں گے۔“

مرسلہ: عدنان یوسف، بنوں

کی تیمارداری اور دیکھ بھال کا فریضہ سنبھالنا تھا لیکن آج رات مس ریڈنگ کی موجودگی ضروری نہیں تھی۔ ایک تو اس لیے کہ ولبر مسلسل بے ہوشی کی حالت میں تھا۔ نرس اب اس کے سرہانے بیٹھ کر سوائے اس کی آخری سانس کا انتظار کرنے کے اور کیا کرسکتی تھی؟ یہ کام میرینا اپنی فطرت کے خلاف خود کرنا چاہتی تھی۔ ولبر کی زندگی کی آخری گھڑیوں میں وہ خود کو اس کے قریب رکھنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے فون کرکے مس ریڈنگ کو آج رات آنے سے منع کردیا۔

رات گزرنے کے ساتھ ساتھ ولبر کی سانسیں مدھم ہوتی جارہی تھیں۔ میرینا تھوڑی تھوڑی دیر بعد نگاہ اٹھا کر اس کلاک کی طرف دیکھ لیتی تھی جس میں وہ ہمیشہ آدھا گھنٹے آگے کا وقت سیٹ کرکے رکھ لیتی تھی۔ اس طرح ولبر کو اس کی تمام تر سستی کے باوجود وقت پر تیار کروا کر کام پر بھیجنے میں آسانی رہتی تھی۔

رات گہری ہونے پر میرینا کو بار بار اونگھ آنے لگی۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگتیں اور گردن آگے جھکنے لگتی تو وہ ہڑبڑا کر سنبھل جاتی۔ ایسے ہی ایک جھٹکے کے دوران میں اس نے ولبر کو انگڑائی لیتے اور پھر اٹھ کر بیٹھتے دیکھا۔

”ہیلو میرینا۔“ اس نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ ”میں کہاں ہوں؟“

میرینا کا منہ کھلا مگر زندگی میں پہلی مرتبہ یہ اتفاق ہوا کہ اس کے حلق سے کوئی آواز برآمد نہ ہوئی۔ ولبر نے ادھر اُدھر دیکھا۔ اس کی حرکات وسکنات میں صرف معمولی سی نقاہت نظر آرہی تھی۔ ”اوہ مجھے یاد آیا میں بیمار تھا، ہے نا؟“

میرینا اب بھی خاموش تھی۔ ولبر پر تین دن سے مکمل سکتہ طاری تھا اور تقریباً ایک ہفتے سے اس نے بات نہیں کی تھی اور اب وہ بڑے آرام سے پلنگ پر بیٹھا روشن آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

”تت...... تم کیا محسوس کررہے ہو ولبر؟“ بالآخر میرینا نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

”میں صرف بھوک محسوس کررہا ہوں۔ گھر میں کھانے کے لیے کچھ ہے میرینا؟“

میرینا کرسی کا سہارا لے کر بہ مشکل اٹھی تو وہ بولا۔ ”میرے لیے کچھ چانپیں تل لاؤ اور ہاں بیئر کی ایک بوتل بھی لے آنا۔“

میرینا کمرے سے نکلی تو عقب میں ولبر نے ہانک لگائی۔ ”دیکھنا شاید فریج میں مرغ کی ران بھی موجود ہو۔“

میرینا حواس باختہ ہوکر فریج سے کھانے پینے کی چیزیں نکالنے لگی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اس بیماری میں کوئی مریض کچھ عرصے کے لیے جانبر بھی ہوجاتا ہے لیکن اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ کوئی مریض ولبر بھی تو ہوسکتا ہے اور اب میرینا کو کئی ایسی مثالیں یاد آرہی تھیں جب ڈاکٹروں نے کئی مریضوں کے بارے میں حتمی فیصلہ دے دیا تھا کہ وہ زندہ نہیں بچ سکتے مگر ہوا یہ تھا کہ مریض تو بھلے چنگے ہوکر اٹھ بیٹھے اور ڈاکٹر ملک عدم کو سدھار گیا۔

میرینا نے بے دھیانی کے عالم میں کچھ چیزیں الٹی سیدھی تیار کرکے ٹرے میں رکھیں اور ولبر کے کمرے کی طرف چل دی۔ اس کا ذہن ان متوقع پریشانیوں میں الجھا ہوا تھا جو حالات کے اس طرح پلٹا کھانے کی وجہ سے پیش آنے والی تھیں۔ اس نے تمام انتظامات شیڈول کے مطابق بڑے نظم وضبط سے مکمل کیے تھے مگر ولبر کی موت کی سرحد سے بے وقت واپسی نے سب کچھ خاک میں ملادیا تھا۔ اب اتنا وقت نہیں تھا کہ رشتے داروں کو آنے سے روکا جاسکتا۔ اب تک تو وہ یقیناً اپنے گھروں سے روانہ ہوچکے ہیں۔ کل تک گھر مہمانوں سے بھر جاتا تھا۔ اب انہیں جنازے کے انتظار میں ہفتہ دو ہفتہ یا اس سے زیادہ تو نہیں ٹھہرایا جاسکتا تھا، ان کے کھانے پینے کا بندوبست کہاں سے ہوتا؟ اس کے بیٹے اور داماد کو اتنی لمبی چھٹی کیسے ملتی؟ ادھر پھولوں کی دکان والا بھاری مقدار میں پھولوں کا آرڈر بذریعہ تار شہر روانہ کرچکا تھا اور تو اور اب وہ اخبار بھی چھپنے کے لیے پریس جاچکا تھا جس میں ولبر کے جنازے کی خبر شائع ہورہی تھی۔

شدید پریشانی اور صدمے کی حالت میں وہ ٹرے اٹھائے ولبر کے قریب آئی اور ٹرے تپائی پر رکھ دی۔ ولبر اس کی طرف سادگی سے دیکھ کر مسکرایا۔ ”واقعی بڑی بھوک لگی ہے۔“

”لیٹ جاؤ ولبر۔“ میرینا نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ”ابھی تم بہت کمزور ہو۔“

وہ سعادت مندی سے تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ میرینا نے دوسرا تکیہ اٹھایا اور اس کی گردن پر رکھ کر پوری طاقت سے دبانے لگی۔ ولبر نے کمزور سے انداز میں مزاحمت کی۔

”ہلنے جلنے کی کوشش مت کرو۔“ وہ غرائی۔ ”غضب خدا کا اگر میں نہ ہوتی تو تم نے خود اپنے جنازے میں تاخیر ہی کردینی تھی۔ ہر کام میں دیر کرنے کی تمہاری پرانی عادت ابھی تک نہیں گئی۔“

ضیا تسنیم بلگرامی

شیخ المشائخ

دنیا کی تاریکی دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگ ایسے بھی پیدا کیے جو لہو و لعب سے دور ہوکر روشنی پھیلانے کا سبب بنتے رہے... اور اللہ کے ولی ٹھہرے۔ اس راہ کی کٹھنائیوں کو عبور کرنا خاص الخاص لوگوں کا وتیرہ رہا۔ آپ کا شمار بھی انہی روشن ضمیر انسانوں میں ہوتا ہے جن کا فیض مخلوق خدا کو پہنچتا رہا۔

لوگ یہ دیکھ دیکھ کر حیران ہوا کرتے تھے کہ شاہی خاندان کا ایک فرد عبداللہؒ تکلفات اور تعیشات شاہی سے بے نیاز بلکہ نفور، نفس کشی اور چلوں میں مشغول رہتا ہے۔ ٹاٹ کا لباس زیب تن کیے ہوئے بیس سال گزر چکے تھے۔ خاندان کے لوگ آپ کے پاس آتے اور کہتے۔ ”عبداللہ! یہ تمہیں کیا سوجھی ہے؟ اللہ نے تمہیں سب کچھ دے رکھا ہے لیکن تم نے ٹاٹ کا لباس پہن رکھا ہے۔ کیا یہ کفرانِ نعمت نہیں ہے؟“

عبداللہؒ نے جواب دیا۔ ”کفران نعمت یہ ہے کہ انسان اپنے اعضائے جسمانی کو اپنے معبود کی عبادت اور شکر گزاری سے

محروم رکھے اور میں اپنے رب کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے ایسی عقل عطا فرمائی جس سے میں اپنے دنیوی اور آخروی نفع ونقصان کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔"

انہوں نے اپنے کاموں کے لیے ایک آدمی رکھ لیا تھا جو گھر کے کام کے علاوہ آپ کے کھانے کی خاص فکر رکھتا تھا۔ آپ کا حکم تھا کہ جب دن بھر کے روزے کے بعد افطار کا وقت آئے تو خادم گن کر سات منقے دے دیا کرے۔ ایک عرصے تک اس پر عمل درآمد ہوتا رہا۔ آپ کی صحت گرتی رہی لیکن آہ نیم شبی میں لذت محسوس ہوتی رہی۔ اس لذت نے ان کے دل سے ضعف نقاہت کا خیال تک نکال دیا تھا۔

نصف رات گزر چکی تھی۔ وہ خدا کی بارگاہ میں گرے ہوئے آہ وزاری میں مشغول تھے لیکن آج روز جیسی لذت اور کیفیت سے وہ محروم تھے۔ وہ جب بھی اپنی زبان سے "اللہ" کہتے تو دل میں وہ چمک اور وہ لذت نہیں پیدا ہوتی جو ہمیشہ کا خاصہ تھا۔ ان کا دل سوز درونی سے محروم ہو چکا تھا۔ عبداللہؒ بہت پریشان تھے۔ ان کی تو گویا متاعِ حیات ہی چھن چکی تھی۔ اب ان کا دل اللہ کی یاد میں نہیں، اس میں مشغول تھا کہ اس سقم کا پتا چلایا جائے جس نے ان کی لذت وکیفیت چھین کر انہیں خالی کر دیا ہے۔ انہوں نے رات کے پچھلے پہر اپنے خادم کو طلب کیا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا آپ کے سامنے آکھڑا ہوا، ادب سے عرض کیا۔ "خلاف معمول طلبی پر یہ عاجز پریشان اور خوفزدہ ہے۔ اس ناچیز سے کوئی غلطی تو نہیں سرزد ہو گئی؟"

آپ نے دریافت کیا۔ "میں تجھ سے ایک بات معلوم کرنا چاہتا ہوں اور اس یقین کے ساتھ کہ تو جھوٹ نہیں بولے گا۔"

خادم نے عرض کیا۔ "یہ میری مجال کہ میں جھوٹ بولوں اور وہ بھی آپ سے، مجھ میں نہ اتنی ہمت ہے نہ حوصلہ۔"

آپ نے کہا۔ "آج رات معلوم نہیں کیوں، مجھ پر نیند غلبہ کر رہی ہے اور اعصاب آسودگی سی محسوس کر رہے ہیں۔ میں بڑی کوشش کرتا ہوں کہ ان لذتوں اور کیفیتوں کا مزہ چکھوں، جو ہر رات مجھے حاصل رہی ہیں لیکن انتہائی کوششوں کے باوجود میں ان سے محروم ہوں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تو نے افطار میں مجھے جو منقے دیے تھے، ان میں کوئی خاص فرق تو نہیں تھا، کوئی تبدیلی کوئی تغیر؟"

خادم سناٹے میں رہ گیا، بڑی بے بسی سے آپؒ کی صورت دیکھنے لگا، بولا۔ "میں ایک عرصے سے یہ محسوس کر رہا ہوں کہ حضور کی صحت روز بہ روز گرتی جا رہی ہے۔ اور ضعف ونقاہت سے حضور کی آنکھیں حلقوں میں چلی گئی ہیں اور اوپر کا نصف جسم جھکتا جا رہا ہے۔ میں اس کا اور کوئی علاج تو نہیں کر سکتا تھا، فوری اور قابل عمل جو تدبیر میرے ذہن میں آئی وہ یہ تھی کہ میں حضور کے منقوں کی تعداد میں نہایت ہوشیاری سے اضافہ کرتا چلا جاؤں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ منقوں کی تعداد میں ایک معتد بہ اضافہ حضور کی کمزوری اور نقاہت پر غالب آجائے گا۔"

آپ نے غصے میں پوچھا۔ "تو نے آج افطار میں مجھے کتنے منقے دیے تھے؟"

خادم نے جواب دیا۔ "آٹھ منقے آج میں نے ایک کا اضافہ کیا تھا۔"

آپؒ کو رونا آ گیا، گلوگرفتہ آواز میں بولے۔ "ظالم! تو نے یہ کیا غضب کر دیا؟ تو جانتا ہے اس ایک منقے نے میرے جسم میں کیا فتور کر رکھا ہے۔ میرے اعصاب آرام طلبی میں مبتلا ہیں اور دل ودماغ سو جانے پر مائل ہیں۔ آہ! مجھ سے میری آہ نیم شبی کی لذت اور کیفیت چھن گئی۔ تو نے یہ کیا کر دیا ظالم انسان!"

خادم سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ آپؒ بھی بڑی دیر تک سر جھکائے کچھ سوچتے رہے، آخر فرمایا۔ "اب جا، آرام کر میں تجھ سے صبح بات کروں گا۔ لیکن صبح مجھ سے یہ امید ہرگز نہ رکھنا کہ میں تجھے معاف کر دوں گا۔ تو مجھے جسمانی اذیت پہنچاتا تو میں تجھے معاف بھی کر دیتا لیکن تو نے میری زندگی بھر کی کمائی چھین لی، میرا سوز چھین لیا، میری آہ کی لذت لوٹ لی پھر میں تجھے کس طرح معاف کر دوں گا۔"

خادم نے لجاجت سے عرض کیا۔ "میں نے جو کچھ کیا تھا آپ کی بھلائی کے پیش نظر کیا تھا۔"

آپؒ نے جواب دیا۔ "وہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں کہ مجھے نادان دوست کو اپنے ساتھ نہیں رکھنا ہے۔ تو نے جو کام میری فلاح کے خیال سے کیا تھا اس سے مجھے زبردست نقصان پہنچ گیا۔ کل ایسی نوع کا تو کوئی اور کام میری بہبود کی خاطر کرے گا اور اس سے میں بالکل ہی تباہ وبرباد ہو گیا تو کیا ہو گا؟ میں نادان دوست کو نہیں برداشت کر سکتا۔"

خادم خوفزدہ ولرزیدہ سامنے سے ہٹ گیا اور آپ پوری قوت ارادی سے خدا سے لو لگاتے رہے لیکن اس وقت ان کی عجیب سی کیفیت تھی۔ کسی کسی لمحے سوز درونی کی شمعیں جھلملاتی تھیں اور پھر بجھ جاتیں وہ رونے لگے۔ انہوں نے بارگاہِ ایزدی

میں عرض کیا۔ "اے الہ العالمین! ایک منقے کی اتنی بڑی سزا نہ دے کہ میں اپنی لذت آہ نیم شبی ہی سے محروم ہو جاؤ۔ اپنے حبیب ﷺ کے صدقے میں اس غلطی کو نظر انداز فرما دے۔ اب آئندہ ایسی غلطی نہیں ہو گی۔"

صبح آپؒ نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے خادم کو رخصت کر دیا اور اس کی جگہ دوسرا آدمی رکھ لیا۔ اس واقعے کے بعد لوگ آپؒ کو خفیف کہنے لگے۔

توکل اور استغناء کا یہ عالم تھا کہ آپ کسی سے اپنا کوئی کام نہ کہتے تھے نہ لیتے۔ ہاں دوسروں کا کام البتہ کر دیا کرتے تھے۔ آپؒ نے حج کا ارادہ کیا تو قافلے والوں سے اتنی بے تکلفی اختیار کی کہ صرف پیاس کا خیال رکھا اور کسی چیز کی پروا نہ کی۔ سامان سفر میں ایک ڈول اور ایک رسی ساتھ لی اور حج کی نیت سے نکل کھڑے ہوئے۔ قافلے والوں کی اتباع، پیروی یا پابندی آپ کے بس کی بات نہ تھی۔ چنانچہ کچھ دور تک تو آپ قافلے کے ساتھ رہے اس کے بعد آپ اس سے الگ ہو گئے۔ بھوک لگتی تو چند منقے کھا لیتے اور پیاس لگتی تو کسی چشمے سے اپنا ڈول بھر کر پیاس بجھا لیتے۔

دوران سفر ایک ایسا مرحلہ بھی پیش آیا کہ کافی دور تک آپ کو کوئی چشمہ نہ ملا۔ پیاس آپ کو تنگ کرنے لگی۔ آپ چشمے کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑا رہے تھے۔ آخر آپ نے کافی فاصلے پر ایک ہرن کو زمین کی طرف سر جھکائے کھڑے دیکھا۔ اس کے کھڑے ہونے کا انداز بتا رہا تھا کہ ہرن پانی پی رہا ہے۔ آپ بے چینی سے اس طرف چل پڑے۔ جب قریب پہنچے تو ہرن ان کی آہٹ محسوس کر کے بھاگ کھڑا ہوا۔ آپ نے آگے بڑھ کر جو دیکھا تو نشیب میں ایک چشمہ رواں تھا۔ پانی کی سطح اتنی بلند تھی کہ ڈول رسی کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اگر سطح نیچی ہوتی تو ہرن اپنی پیاس نہ بجھا سکتا۔ آپ نے دونوں ہاتھوں کو چلو بنا کے پانی پینا چاہا لیکن انہیں یہ دیکھ کر حیرت ہو گئی کہ جیسے جیسے وہ ہاتھ پانی کی طرف لے جاتے تھے، پانی کی سطح نیچے ہوتی چلی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ پانی کی طرف منہ کے بل کافی جھک گئے اور بڑی کوشش کی کہ پانی پی لیں لیکن پانی تک ان کے ہاتھ نہیں پہنچ سکے۔ آخر تنگ آکر انہوں نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے اور چشمے کے کنارے بیٹھ کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے عرض کیا۔ "میرے مولا! یہ ایک اسرار ہے کہ اسی چشمے سے ہرن نے بھی پانی پیا تھا اور اس وقت اس کی سطح اونچی تھی لیکن جب میں نے پانی پینا چاہا تو اس کی سطح حیرت انگیز طور پر نیچی ہوتی چلی گئی۔ کیا تو مجھ سے ناراض ہے؟"

یہ خاموش ہو کر رونے لگے۔ ان کے دونوں رخسار آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ کچھ دیر بعد بولے۔ "اے اللہ! میں اپنی گریہ وزاری کا جواب چاہتا ہوں۔ مجھے صرف یہ بتا دے کہ کیا میرا مرتبہ ہرن سے بھی کم ہے؟"

انہیں اپنے قریب ہی سے جواب ملا، کوئی کہہ رہا تھا۔ "عبداللہؒ! ہرن کے پاس ڈول رسی نہیں تھی اس لیے اس کے لیے پانی کی سطح اونچی کر دی گئی تھی۔ لیکن تو نے ڈول رسی کا سہارا لیا، تو اب رو کیوں رہا ہے؟ گریہ وزاری کیوں کر رہا ہے؟ رسی میں ڈول پھنسا اور بھر لے پانی ہم سے شکوہ کیوں کر رہا ہے؟"

آپؒ نے بڑی ندامت محسوس کی اور ڈول رسی پھینک کر آگے روانہ ہو گئے، بولے۔ "میں پیاسا رہ لوں گا لیکن اب ڈول رسی کا سہارا نہیں لوں گا۔"

ابھی کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ پھر آواز سنائی دی۔ "عبداللہؒ! کہاں جاتے ہو؟ کیا ناراض ہو گئے؟"

عبداللہؒ بولے۔ "اے اللہ! کیا کسی بندے میں اتنی ہمت ہے کہ اپنے آقا سے ناراض ہو جائے۔"

آواز آئی۔ "پھر تو پانی پیے بغیر ہی کیوں چل پڑا جبکہ میں جانتا ہوں کہ تو بہت زیادہ پیاسا ہے۔"

عبداللہؒ نے کہا۔ "مجھے میری غیرت اور ندامت نے سختی سے منع کر دیا ہے کہ یہ پانی ہرگز نہ پیوں۔"

جواب ملا۔ "نہیں چشمے پر واپس جا اور پانی پی لے۔ اس طرح تیرے صبر کا امتحان لیا جا رہا تھا۔ چشمے پر واپس جا اور اس کے پانی سے اپنی پیاس بجھا۔"

آپ چشمے پر دوبارہ واپس پہنچے اور یہ دیکھ کر ان کا دل بھر آیا کہ پانی کی سطح اتنی ہی اونچی ہو چکی ہے جتنی ہرن کے پانی پینے کے وقت تھی۔ آپ نے ہاتھ کو چلو بنا کے پانی پینا شروع کر دیا۔ پانی پیتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔ جب خوب شکم سیر ہو کر پانی پی چکے تو اس پانی سے وضو بھی کیا۔

آپؒ حج سے فارغ ہو کر جب بغداد واپس آئے تو آپ نے اس عہد کے سب بڑے صوفی جنید بغدادیؒ سے ملاقات کی اور ان کے سامنے پانی والا واقعہ دُہرا دیا۔ جنیدؒ نے جواب دیا۔ "عبداللہؒ! اگر تم ذرا سا صبر اور کر لیتے تو چشمہ تمہارے قدموں میں بہنے لگتا۔"

آپ خاموش ہو گئے کچھ دیر بعد فرمایا۔ ''جنیدؒ! اگر تمہارے جیسا مشیر اور دوست اس وقت مجھے میسر آجاتا تو آج میں اس سعادت سے بھی ہمکنار ہو چکا ہوتا۔''

☆☆☆

کچھ دن بغداد میں رہنے کے بعد آپ کو کسی نے بتایا۔ ''عبداللہؒ! تم کیا مراقبہ کرو گے! میں نے مصر میں ایک نوجوان کو کچھ ایسا مراقبے میں دیکھا کہ حیران رہ گیا۔ اسے اپنے آس پاس کی کوئی خبر ہی نہیں۔''

آپ نے تڑپ کر پوچھا۔ ''کیا تو مجھے اس شخص کا پتا بتا سکتا ہے؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''کیوں نہیں؟''

اس کے بعد اس شخص نے آپ کو اس نوجوان کا پتا بتا دیا۔ آپ اسی وقت مصر روانہ ہو گئے۔ کافی دنوں بعد سفر کی صعوبتیں اور پریشانیاں جھیل کر جب آپ مصر میں اس نوجوان کے پاس پہنچے تو یہ دیکھ کر واقعی حیران رہ گئے کہ اس کے آس پاس لوگوں کا مجمع لگا ہوا ہے مگر اس نوجوان کے خضوع وخشوع، انہماک اور مراقبے میں کوئی فرق نہیں آرہا۔

عبداللہؒ اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور بہ آواز بلند سلام عرض کیا لیکن اس نوجوان نے سلام کا جواب نہیں دیا۔ عبداللہؒ نے اسے پھر سلام کیا اور نوجوان نے اس بار بھی کوئی جواب نہ دیا۔ آپ نے تیسری بار بھی سلام کیا مگر اس بار بھی جواب سے محروم رہے۔

آپ نے چوتھی بار سلام کیا اور ساتھ ہی کہا۔ ''اے نوجوان! ایسا بھی انہماک اور مراقبہ کس کام کا کہ میں سنت رسول ﷺ ادا کر رہا ہوں اور تو میرے سلام کا جواب تک نہیں دے رہا۔''

نوجوان نے اپنا سر اٹھایا اور آہستہ سے جواب دیا۔ ''اے خفیف! میرا خیال ہے کہ تمہارے پاس بڑا وقت ہے اور تم اپنے اہم کاموں کو انجام دے کر فرصت حاصل کر چکے ہو حالانکہ تمہیں اس حقیقت کا علم ہونا چاہیے تھا کہ دنیا بہت قلیل اور عمر بہت مختصر ہے۔ اگر تم چاہو تو اس قلت میں سے کثرت حاصل کر لو لیکن تمہارا یہ حال ہے کہ تم نے میرے جیسے بے کار آدمی سے ملنے کی خاطر مصر تک کا سفر کیا اور بار بار سلام کر کے اپنا ہی نہیں بلکہ میرا بھی وقت ضائع کرنا چاہتے ہو۔''

اتنا کہہ کر اس نے عبداللہؒ کے جواب کا بھی انتظار نہیں کیا اور پھر مراقبے میں چلا گیا۔

جب یہ اس نوجوان کے پاس پہنچے تھے تو ان کا بھوک سے بہت برا حال تھا لیکن نوجوان کے جواب نے ان کی بھوک اڑا دی تھی۔ یہ اس کے قدموں میں بیٹھ گئے اور کہنے لگے۔ ''اے نوجوان! میں نے تو فیصلہ کر لیا ہے کہ ظہر اور عصر کی نماز میں تیرے ساتھ ہی پڑھوں گا۔''

دونوں نے ظہر کی نماز پڑھی اور اس کے بعد عصر کی نماز بھی ایک ساتھ ادا کی۔ آپ نے اس نوجوان کا بہت شکریہ ادا کیا اور کہا۔ ''میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے میری خواہش پوری کی اور دو نمازیں میرے ساتھ ادا کیں۔ اب ایک آخری خواہش بھی پوری کر دے۔''

نوجوان نے پوچھا۔ ''کون سی خواہش؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''میں چاہتا ہوں تو مجھے کوئی نصیحت کرے۔''

نوجوان نے کہا۔ ''خفیف! جو شخص خود ہی گرفتار بلا ہو، اس کی زبان اس لائق کہاں کہ کسی کو نصیحت کرے۔ میں تو خود ہی ایک عرصے سے یہ امید لگائے ہوئے ہوں کہ کوئی مجھے نصیحت کرے۔''

عبداللہؒ نے کہا۔ ''اے شخص! میں کوئی نصیحت سنے بغیر واپس نہ جاؤں گا۔''

نوجوان نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ''خفیف! اس وقت تمہارے اصرار پر میں ایک ہی نصیحت کروں گا، وہ یہ کہ تم ہمیشہ ایسوں کی صحبت اختیار کرو، جن سے خدا کی یاد تازہ رہے اور یہ لوگ ایسے ہوں جو خدا کی یاد کی زبانی تلقین نہ کرتے ہوں بلکہ صحیح معنوں میں عمل کر کے تمہیں اس کا عامل بنا دیں۔''

آپ اس نصیحت پر زار وقطار روئے اور کہا۔ ''آہ، میں ایسے دوست کہاں پاؤں گا جو اپنے عمل سے مجھے خدا کی یاد پر ڈال دیں جبکہ میں خود بھی اس راہ کا ایک ادنیٰ سا مسافر ہوں۔''

آپ نے واپسی میں ایک جنگل سے گزرتے ہوئے، ایک لاش پڑی دیکھی۔ اس لاش کے آس پاس آہستہ آہستہ لوگ آ آ کر جمع ہو رہے تھے۔ آپ ان لوگوں کے قریب پہنچے اور پوچھا۔ ''یہ کس شخص کی لاش ہے؟''

کسی نے جواب دیا۔ ''یہ ہمارا راہب تھا اور اس نے اپنی پوری زندگی خدا کی یاد میں گزار دی۔''

آپ نے دریافت کیا۔ ''اب اس لاش کا تم لوگ کیا کرو گے؟''

جواب ملا۔ ''اس راہب نے مرنے سے پہلے ایک وصیت کی تھی۔ ہم لوگ اسی پر عمل کرنے جا رہے ہیں۔''

آپ نے تعجب سے پوچھا۔ ''اس نے کیا وصیت کی تھی؟''

جواب دیا گیا۔ ''اس نے کہا تھا کہ جب میں مر جاؤں تو مجھے دفن کرنے کے بجائے جلا دیا جائے اور میری راکھ کو محفوظ کر لیا جائے اور یہ راکھ ان لوگوں کی آنکھوں میں سرمے کے طور پر لگائی جائے جن کی آنکھیں خراب ہوں یا ان کی بینائی رخصت ہو چکی ہو۔''

آپ نے کہا۔ ''لیکن اس عمل کا فائدہ؟''

کسی نے جواب دیا۔ ''اس عمل کا فائدہ یہ ہوگا کہ خراب آنکھ ٹھیک ہو جائے گی اور کور چشم بینا ہو جائیں گے۔''

آپ کو ان باتوں پر یقین نہیں آیا۔ آپ وہیں کھڑے ہو کر لاش کے جلنے کا منظر دیکھنے لگے۔ لوگوں نے واقعی راہب کی راکھ کو اپنی اپنی شیشیوں میں محفوظ کر لیا۔ آپ ان کی خوش عقیدگی پر افسوس کرتے رہے۔ آپ نے پوچھا۔ ''کیا تم لوگوں کو واقعی یقین ہے کہ اس راکھ سے خراب آنکھیں درست اور نابینا بینا ہو جائیں گے؟''

ایک کٹر مسیحی نے طنزاً کہا۔ ''تم مسلمان ہو اس لیے تمہیں ہماری باتوں پر یقین نہیں آرہا لیکن میں تمہیں اس کا مشاہدہ ہی کیوں نہ کرادوں۔''

وہ مسیحی آپ کو اپنے گھر لے گیا اور میزبانی کے فرائض انجام دیے۔ اس کے بعد اس نے بستی کے ان آدمیوں کو تلاش کرنا شروع کر دیا جن کی آنکھیں خراب تھیں یا ان کی بینائی رخصت ہو چکی تھی۔ بہ مشکل اس نے چار آدمی تلاش کر لیے۔

ان میں تین کی تو آنکھیں خراب تھیں اور ایک اندھا تھا۔

اس مسیحی نے ان چاروں کو عبداللہؒ کے سامنے کھڑا کر دیا، کہا۔ ''حضرت! ان چاروں کی آنکھیں ملاحظہ فرمالیں۔ ان میں سے تین کی تو آنکھیں خراب ہیں اور ایک نابینا ہے۔ اب میں اس راکھ کا اثر آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔''

آپ دم بخود حیرت زدہ یہ تماشا دیکھنے لگے۔

اس مسیحی نے یکے بعد دیگرے خراب آنکھوں میں راکھ کی سلائیاں پھیریں اور انہیں ایک تاریک کمرے میں جا کر چھوڑ دیا، بولا۔ ''جب تک میں بلاؤں نہ، تم تینوں اندر ہی رہو گے۔''

یہ تینوں کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔ آخر میں اس نے نابینا کی آنکھوں میں راکھ کی سلائیاں پھیر کر انہیں پٹی سے باندھ دیا اور کہا۔ ''تم یوں ہی بیٹھے رہو، یہ پٹی میں خود ہی کھولوں گا۔''

عبداللہؒ حیرت سے یہ سب دیکھتے رہے۔ وہ شخص آپ کو لے کر اس کمرے میں چلا گیا جہاں ان کی اقامت کا انتظام کر دیا تھا۔ آپ نے شام تک کا وقت بڑی بے چینی اور اضطراب میں گزارا۔ مغرب کے بعد آہستہ آہستہ اندھیرا پھیلنے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دن کی سپیدی کو رات کی چادر نے لپیٹ کر انسانی نظروں سے اوجھل کر دیا۔ اس رات آسمان پر بارھویں کا چاند چمک رہا تھا اور چاند کی روشنی میں ستارے اپنی چمک دمک کمزور کر چکے تھے۔ مسیحی، عبداللہؒ سے باتیں کرتے کرتے اپنی جگہ سے اٹھا اور کہا۔ ''شاید اب وقت آگیا ہے کہ میں ان چاروں کو آپ کے پاس لے آؤں اور راہب کی راکھ کے کرشمے دکھا دوں۔''

آپ نے پوچھا۔ ''کیا تیرا یہ خیال ہے کہ وہ فضول راکھ اپنا کام کر چکی ہوگی؟''

مسیحی نے کہا۔ ''جناب! آپ کی بڑی مہربانی ہوگی، اگر آپ اس مقدس راکھ کو فضول نہ کہیں۔''

آپ نے آہستہ سے کہا۔ ''اگر میری اس بات نے تیرے دل کو دکھ پہنچایا ہے تو میں معذرت خواہ ہوں۔''

مسیحی ان تینوں کو کمرے سے باہر لے آیا۔ ان تینوں نے ابھی تک اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ مسیحی نے ایک شخص کو عبداللہؒ کے قریب کھڑا کر دیا اور اسے حکم دیا۔ ''اے شخص! آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھول اور ہمیں بتا کہ اس راکھ نے کوئی اثر کیا یا آنکھیں اب بھی خراب ہیں؟''

اس شخص نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولنا شروع کر دیں اور جب اس کی دونوں آنکھیں پوری طرح کھل گئیں تو وہ خوشی میں چیخ اٹھا۔ ''آہ، اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میری آنکھیں بالکل درست ہو چکی ہیں۔''

آپ کو اس کی باتوں پر یقین نہیں آیا۔ اس شخص سے کہا۔ ''اے شخص! تو جو کچھ کہہ رہا ہے وہ درست ہے یا اپنے مذہب

اور عقائد کی طرفداری میں ایسی بات کر رہا ہے؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "میں نہیں جانتا کہ تو کون ہے اور ایسی بات کیوں کر رہا ہے لیکن میں اب مسیح علیہ السلام کی قسم کھا کر تجھے یقین دلانے کی کوشش کروں گا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، تو اس کی صداقت پر شک و شبہ نہ کر۔"

اس کے بعد دوسرے اور تیسرے شخص کی آنکھیں بھی کھلوائی گئیں اور ان دونوں نے بھی ویسی ہی باتیں کیں جیسی پہلا شخص کر چکا تھا۔ ان تینوں کی آنکھیں ٹھیک ہو چکی تھیں۔

آپ نے اس مسیحی سے کہا۔ "بھائی میں حیران ہوں اور مجھے ان تینوں کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ کسی مردے کی راکھ دوا کا کام دے۔"

مسیحی نے جواب دیا۔ "اے مسلمان درویش! مردے کی راکھ کہہ کر ہمارے مقدس بزرگ کی بے حرمتی نہ کیجیے۔ اگر وہ مقدس نہ ہوتا تو کبھی بھی اس کی راکھ میں یہ اثر نہ ہوتا۔"

آپ نے کہا۔ "اب اس نابینا کی پٹی تو کھول کر دکھاؤ۔ اس اعتبار سے وہ گویا بینا ہو چکا ہوگا۔"

"بے شک۔" مسیحی نے جواب دیا۔ "مجھے اس پر ذرا سا بھی شبہ نہیں۔"

اس کے بعد وہ مسیحی اس نابینا کو لے آیا اور آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں پر سے پٹی ہٹانے لگا۔

ایک آنکھ پر سے ذرا سی پٹی ہٹا کر اس نے کہا۔ "اے شخص! اپنی آنکھ کے گوشے سے دنیا دیکھنے کی کوشش کر، کیا تجھے کچھ نظر آیا؟"

اس شخص نے جواب دیا۔ "ہاں، میں اپنی آنکھ کے کھلے ہوئے گوشے سے بادلوں کا جھنڈ دیکھ رہا ہوں یا پھر ایسا ہے کہ میں کہر آلود فضا میں کھڑا ہوں۔"

مسیحی نے پٹی ذرا سی اور کھسکا دی، پوچھا۔ "اور اب؟"

"بادل بدستور موجود ہے، کہر آلود فضا۔"

اس کے بعد مسیحی نے پوری پٹی ہٹا دی۔ نابینا کی بینائی واپس آ چکی تھی۔ عبداللہؒ حیران تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ کیا مسیحی حق پر ہیں؟ کیا ایک راہب اپنی موت کے بعد بھی مخلوق کے لیے اتنا مفید اور فائدہ رساں ہو سکتا ہے؟ یہ سوالات انہیں پریشان کرتے رہے۔ رات کو جب یہ سو گئے تو خواب میں رسول مقبول ﷺ کو دیکھا، آپ ﷺ نے فرمایا۔

"اے خفیف! تم الجھنوں کا شکار کیوں ہو گئے ہو؟ اس راہب کی راکھ نے تمہیں اتنا پریشان کیوں کر دیا ہے؟ ان باتوں سے تمہیں ایک بات ذہن نشین کر لینی چاہیے، صدق ریاضت سے باطل دین والوں میں بھی یہ اثر پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر دین حق والے بھی صدق و ریاضت سے کام لیں تو ان میں اس راہب سے زیادہ کمالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ صدق و دیانت، ریاضت اور خلوص، یہ کہیں بھی ہوں، ظاہر ہو کر رہتے ہیں۔"

آپ کے دل کو قرار آ گیا اور کچھ دن اس مسیحی کے مہمان رہ کر روانہ ہو گئے۔

آپ نے ایک بار پھر رسول مقبول ﷺ کو خواب میں دیکھا۔ آپ ﷺ نے عبداللہؒ سے فرمایا۔ "اے خفیف! اگر راہ طریقت کا واقف بھی اس راستہ پر گامزن نہ ہوگا تو محشر میں یہی شخص عذاب کا سب سے زیادہ مستحق قرار پائے گا۔"

آپ پر اس قول کا اتنا شدید اثر ہوا کہ آپ نے اتباع سنت ﷺ میں انگوٹھوں کے بل پر کھڑے ہو کر نماز ادا کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں کامیابی نہ حاصل کر سکے۔ آپ نے زار و قطار روتے ہوئے عرض کیا۔ "یا رسول اللہ ﷺ! میں نے تو بڑی کوشش کی کہ آپ ﷺ کی اتباع میں انگوٹھوں کے بل کھڑے ہو کر نماز پڑھوں لیکن میں اس میں ناکام رہا۔ اب آپ ﷺ ہی فرمایئے کہ میں راہ طریقت پر کس طرح چلوں کہ محشر میں مجھے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔"

آپ نے اسی رات خواب میں دیکھا۔ رسول اللہ ﷺ فرما رہے ہیں کہ "اے خفیف! انگوٹھوں کے بل کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا تیرے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ بات میری ذات تک مخصوص تھی۔ تجھے اس معاملے میں میری اتباع نہیں کرنا چاہیے۔"

ایک بار آپ نے خواب میں دیکھا کہ قیامت قائم ہو چکی ہے۔ ہر طرف نفسا نفسی کا بازار گرم ہے۔ لوگ حیران و سرگرداں ادھر ادھر بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ پل صراط پر لوگوں کا ہجوم ہے اور اس پر سے گزرنا مشکل ہو رہا ہے۔ اس عالم میں آپ نے دیکھا ایک چھوٹا سا بچہ کسی طرف سے نمودار ہوا اور ایک شخص کا ہاتھ پکڑ لیا، بولا۔ "ابا جان! آپ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں؟ ادھر آیئے میرے ساتھ تاکہ میں آپ کو پل صراط کے اس پار پہنچا دوں۔"

اس شخص نے اپنا ہاتھ اس لڑکے کے ہاتھ میں دے دیا۔ لڑکے نے اسے نہایت آسانی سے پل صراط کے اس پار پہنچا دیا۔ سامنے ہی جنت تھی، لڑکے نے کہا۔ "ابا جان! آیئے میرے ساتھ، میں آپ کو جنت میں داخل کرا دوں۔"

چنانچہ اس لڑکے نے اپنے باپ کو جنت میں پہنچا دیا اور خود کہیں غائب ہو گیا۔

آپ نے بیدار ہوتے ہی کسی عورت سے نکاح کر لیا۔ دس گیارہ ماہ بعد گھر میں ایک حسین بچہ پیدا ہوا جو چند گھنٹے زندہ رہ کر چل بسا۔ بیوی چیخیں مار مار کر رونے لگی۔ آپ بھی بہت اداس تھے، آہستہ آہستہ چل کر بیوی کے پاس پہنچے اور کہا۔ "بی بی! تم اتنا مت رو، خدا کی مشیت میں کوئی کس طرح دم مار سکتا ہے۔ رضائے الٰہی پر تمہیں اپنا سر جھکا دینا چاہیے کیونکہ اللہ اس بات سے بہت خوش ہوتا ہے۔"

بیوی نے روتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپ میرے پاس اس قسم کی باتیں کر کے دل دکھانے آئے ہیں۔ میں کس طرح صبر کر لوں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "تم کس طرح یہ کہہ سکتی ہو کہ میں نے یا میرے کسی رویے میں تمہارے لیے تکلیف اور اذیت کا محرک پایا جاتا تھا۔ میں نے تو تم سے کسی اور ہی مقصد سے شادی کی تھی۔ آج وہ مقصد پورا ہو چکا ہے اس لیے مجھے اجازت دیجیے۔ میں کہیں اور چلا جاؤں گا۔ میں تمہیں طلاق بھی دے سکتا ہوں کیونکہ لڑکے کی پیدائش اور اس کی فوری موت نے میرے مسائل حل کر دیے۔ اب میں اس فکر سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔"

بیوی نے آہستہ سے جواب دیا۔ "میں نے طلاق لینے کے لیے یہ شادی نہیں کی تھی۔ یہ طلاق کیوں لوں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اگر تم اب بھی میرے ہی ساتھ رہنا چاہتی ہو تو میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔"

بیوی کا دل گداز اور کمزور تھا۔ شوہر کو اداس اور ملول دیکھ کر خود بھی رونے لگی۔

☆☆☆

آپ کے مریدوں میں دو ایسے بھی تھے جن کا نام احمد تھا۔ آپ نے ان دونوں میں تمیز کی خاطر ایک کا نام احمد کہہ اور دوسرے کا نام احمد مہ رکھ دیا لیکن آپ کو احمد کہہ سے بڑی انسیت تھی۔ حالانکہ عبادت اور ریاضت میں احمد مہ کا کوئی جواب ہی نہ تھا۔ دوسرے مرید جب یہ دیکھتے کہ ایک دیندار کے مقابلے میں دوسرے کمتر درجے کے دیندار کو زیادہ سراہا جا رہا ہے تو وہ پریشان ہو گئے۔

ایک دن ایک مرید نے عرض کیا۔ "حضرت! میں ایک بات معلوم کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ اگر اس کا صحیح جواب مل جائے گا تو میں نہایت خشوع و خضوع سے یاد الٰہی میں مشغول رہ سکوں گا۔"

آپ نے کہا۔ "وہ کیا، پوچھو۔"

مرید نے عرض کیا۔ "آپ کے دونوں مرید احمد کہہ اور احمد مہ میں جو زیادہ عبادت گزار اور متقی ہے آپ اس کے مقابلے میں اسے زیادہ چاہتے ہیں جو نسبتاً کم عبادت گزار ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں تیرے سوال کا جواب کسی خاص وقت پر دوں گا۔ اس کے لیے تجھے انتظار کرنا ہوگا؟"

مرید چپ ہو گیا۔ اس بات کو ایک عرصہ گزر گیا۔

آپ ایک بڑے اجتماع سے مخاطب تھے۔ آپ کے دلکش انداز وعظ گوئی نے مجمع پر سحر سا کر رکھا تھا۔ وعظ کے خاتمے پر آپ نے احمد مہ سے کہا۔

"احمد مہ! میرا ایک کام تو کر دے۔"

احمد مہ نے ادب سے عرض کیا۔ "ارشاد، ایک کیا دس کا ارشاد فرمایئے میں دل و جان سے اس کی تعمیل کروں گا۔"

آپ نے کہا۔ "میرے اونٹ کو، جو باہر بندھا ہوا ہے، ذرا اوپر چھت پر باندھ دے۔"

احمد مہ آپ کی صورت دیکھنے لگا، آپ نے پوچھا۔ "میری صورت کیا دیکھ رہا ہے، میں نے جو کام تیرے سپرد کیا ہے اسے انجام دے۔"

احمد مہ نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ "حضرت! آپ نے اس پر غور بھی فرمایا ہے کہ کیا حکم دے رہے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں نے تجھے جو حکم دیا ہے اچھی طرح سوچ سمجھ کر دیا ہے، اونٹ کو چھت پر لے جا کر باندھ دے۔"

احمد مہ نے کہا۔ "حضرت! ذرا غور تو فرمایئے، اونٹ کوئی بکری یا بھیڑ کا بچہ تو ہے نہیں جسے میں گود میں لے کر چھت پر

پہنچادوں۔‘‘

آپ نے احمد کہہ کو آواز دی۔ ’’احمد کہہ! ذرا میرے قریب تو آنا۔‘‘

احمد کہہ بھاگا بھاگا آپ کے روبرو آن کھڑا ہوا۔ ’’ارشاد!‘‘

آپ نے فرمایا۔ ’’ذرا میرے اونٹ کو چھت پر لے جا کر باندھ تو دے۔‘‘

احمد کہہ نے گردن جھکا کر بصد ادب عرض کیا۔ ’’بہتر ہے، ابھی لے لیجیے۔‘‘

احمد کہہ فوراً اٹھا اور اونٹ کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے اونٹ کو دونوں ہاتھوں میں سمیٹنے کی کوشش کی لیکن اس کا ایک ہاتھ اگر اونٹ کی پچھلی ٹانگ پر تھا تو دوسرا اونٹ کے نصف حصے تک پہنچ کر رک جاتا تھا۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ اونٹ کو گود میں اٹھالے لیکن ناکام رہا۔

آپ اپنے چند مریدوں کو ساتھ لے کر احمد کہہ کے پاس پہنچ گئے۔ ان میں وہ مرید بھی شامل تھا جس نے کچھ عرصہ پہلے یہ سوال کیا تھا کہ آپ عبادت گزار احمد مہ کے مقابلے میں نسبتاً کم عبادت گزار احمد کہہ کو کیوں زیادہ چاہتے ہیں۔ آپ نے اپنے مریدوں کے ساتھ یہ تماشا دیکھا کہ احمد کہہ پسینے میں تربہ تر اونٹ کو اٹھالینے کی کوشش میں ہلکان ہو رہا ہے لیکن اونٹ کو جنبش تک نہیں دے پا رہا۔ آپ نے احمد کہہ سے کہا۔ ’’اب بس کر اگر اونٹ تیرے اٹھائے نہیں اٹھتا تو مت اٹھا، میرا منشا پورا ہو چکا۔‘‘

مرید حیرت سے آپ کی شکل دیکھنے لگے۔ احمد کہہ نے عرض کیا۔ ’’حضرت! میں کوشش کر رہا ہوں کہ آپ کا حکم بجالاؤں۔‘‘

آپ نے کہا۔ ’’میرا حکم تو تو بجالایا اب مزید ہلکان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اونٹ تیرے اٹھائے نہیں اٹھے گا۔‘‘

جس مرید نے کچھ عرصے پہلے اعتراض کیا تھا، اس نے کہا۔ ’’آپ کو خود بھی اس کا پہلے ہی علم ہوگا کہ اونٹ اس کے اٹھائے نہیں اٹھے گا پھر اسے خوامخواہ ہلکان فرمایا۔‘‘

آپ نے جواب دیا۔ ’’تجھے اور تیرے جیسے دوسروں کو یہ بتانے کے لیے کہ میں عبادت گزار احمد مہ کے مقابلے میں کم عبادت گزار احمد کہہ کو کیوں زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔‘‘

مرید نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ ’’اس طرح اس ناچیز کی سمجھ میں یہ بات اب بھی نہیں آئی۔‘‘

آپ نے جواب دیا۔ ’’میں نے ایک ہی حکم دونوں کو دیا۔ ان میں جو زیادہ عبادت گزار تھا، وہ اپنی عبادت پر نازاں رہا اور میرے حکم کی بجا آوری کے بجائے یہ عذر پیش کر دیا کہ اونٹ کو چھت پر لے جانا اس کے بس کی بات نہیں۔ اس کے برعکس احمد کہہ، جو تم سب کی نظروں میں احمد مہ کے مقابلے میں کم عبادت گزار ہے، میرا زیادہ فرماں بردار ہے۔ چنانچہ جب میں نے اسے یہ حکم دیا کہ اونٹ کو چھت پر باندھ دے تو اس غریب نے کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ تعمیل حکم کی کوشش میں مشغول ہو گیا۔ مجھے ایسا ہی انسان زیادہ پسند ہے جو حکم کی بجا آوری میں احمد کہہ جیسا ہو۔‘‘

معترض مرید اور اس جیسے دوسرے مریدوں کو اپنے اپنے شک و شبہات کا جواب مل چکا تھا۔ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

☆☆☆

ایک شخص آپ کے پاس آیا اور درخواست کی کہ میرے ساتھ کھانا تناول فرمانے کی سعادت عطا فرمائیں۔

آپ نے پہلے تو تامل سے کام لیا لیکن جب اس کا اصرار بہت زیادہ بڑھ گیا تو آپ نے اس کی دعوت قبول کر لی اور ارشاد فرمایا۔ ’’مجھے کھانے کے وقت اپنے ساتھ لے جانا۔‘‘

وہ شخص چلا گیا اور کھانے کا اہتمام کرنے لگا۔ جب کھانا پک چکا تو وہ آپ کو بلانے آ گیا۔

آپ کھانا کھانے بیٹھے تو پہلے ہی لقمے پر کچھ کراہت سی محسوس ہوئی۔ آپ کو گوشت میں کچھ خرابی محسوس ہوئی۔ صاحب خانہ نے پوچھا۔ ’’حضرت! کوئی خاص بات؟‘‘

آپ نے اس کی پردہ پوشی کی۔ ’’نہیں تو، کوئی خاص بات نہیں۔‘‘

اس شخص نے نہایت عقیدت اور محبت سے عرض کیا۔ ’’حضرت! میں ایک سعادت اور حاصل کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

آپ نے پوچھا۔ ’’وہ کیا؟‘‘

اس نے عرض کیا۔ ’’میں لقمے اپنے ہاتھ سے آپ کو کھلانا چاہتا ہوں۔‘‘

آپ نے اپنے ہاتھ کھینچ لیے، بولے۔ ’’تو اپنی یہ خواہش بھی پوری کر لے۔‘‘

اس شخص نے اپنے ہاتھ سے آپ کو کھلانا شروع کر دیا۔ جیسے جیسے وہ لقموں کو چباتے تھے انہیں گوشت کی خرابی اور سڑاند کا

احساس شدید ہوتا جا رہا تھا۔ جب وہ آپ کے چہرے سے نظریں ہٹا لیتا تو آپ کے چہرے پر کراہیت کی شکنیں نمودار ہو جاتیں اور جب وہ دیکھنے لگتا تو آپ ضبط و احتیاط سے کام لیتے کہ کہیں اس کی دل شکنی نہ ہو جائے لیکن آخر کار صاحب خانہ کو اس کا احساس ہو گیا کہ گوشت صحیح نہیں ہے اور اس میں سڑاند محسوس ہو رہی ہے۔ اس نے شرمندگی سے منہ چھپا لیا۔ آپ نے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور اسے اچھی طرح نادم ہونے کا موقع دیا۔

اسی سال آپ ایک بار پھر حج پر روانہ ہو گئے۔ آپ جس قافلے کے ساتھ سفر کر رہے تھے، وہ قادسیہ پہنچ کر راستہ بھول گیا یہ اپنے قافلے کے ساتھ بھٹکنے لگے۔ پاس کھانے کو جو کچھ تھا، ختم ہونے لگا۔ آس پاس کوئی بستی بھی نہ تھی۔ یہ کئی دن تک بھٹکنے کے بعد اپنا کھانے پینے کا سامان تک ختم کر بیٹھے اور نوبت فاقوں تک پہنچ گئی۔ ان لوگوں نے کھانے کے لیے بڑی دوڑ دھوپ کی لیکن بڑی مایوسی رہی اور بھوک حد سے تجاوز کرتی رہی۔

آخر وہ لوگ اضطراری حالت کو پہنچ گئے جہاں حرام بھی حلال ہو جاتا ہے۔

بھوک نے ان سب کو جاں بہ لب کر رکھا تھا۔ قافلے کے لوگ ادھر ادھر پھیل گئے۔ وہ آبادی کی تلاش میں پریشان اور سرگرداں تھے۔

اس وقت آپ کو وہ شخص یاد آ رہا تھا جس نے آپ کی دعوت کی تھی کہ گوشت کی سڑاند کا علم ہو جانے کے بعد شرمندہ اور نادم ہو کر ایک طرف جا بیٹھا تھا اور آپ نے اس کی ندامت دور کرنے کی ذرا سی بھی کوشش نہ کی تھی۔ آپ کو اچانک احساس ہوا کہ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے، اس عذاب میں ہو رہا ہے۔ آپ کو اس شخص کی ندامت اور دل شکنی کا خیال ضرور کرنا چاہیے تھا۔ شاید یہ اسی بات کی سزا ہے۔

☆☆☆

آپ نے آخری عمر میں بادشاہ کے دربار میں جانا شروع کر دیا تھا۔ لوگ اس تغیر پر حیران تھے لیکن آپ بڑی پابندی سے دربار جانے لگے تھے۔ آپ کے مرید اس پر معترض تو تھے لیکن زبان سے کچھ بھی نہ کہتے تھے۔ کسی نے احمد کہہ کو آمادہ کرنا چاہا کہ وہ آپ سے پوچھے کہ آپ نے بادشاہ کی درباداری کیوں شروع کر دی ہے؟

لیکن احمد کہہ نے صاف انکار کر دیا کہ میں یہ سوال نہیں کروں گا۔ آپ دربار جا رہے تھے اور آپ کے مرید گومگو بیٹھے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ان میں ہر شخص اس تبدیلی کو بڑی ناگواری سے محسوس کر رہا تھا۔ جب آپ دربار چلے گئے تو آپ کی عدم موجودگی .... میں دو درویش نہایت دور دراز سے سفر کر کے آپ سے ملاقات کو حاضر ہوئے۔ انہوں نے پوچھا۔ ’’عبداللہ خفیفؒ کہاں ہیں؟‘‘

کسی مرید نے جواب دیا۔ ’’وہ بادشاہ کے پاس تشریف لے گئے ہیں۔‘‘

درویشوں نے حیرت سے کہا۔ ’’عبداللہ خفیفؒ اور بادشاہ؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟‘‘

مرید نے جواب دیا۔ ’’ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں سچ کہہ رہے ہیں۔ ادھر کچھ دنوں سے وہ شاہی دربار میں باقاعدگی سے حاضری دے رہے ہیں۔‘‘

ایک درویش نے اپنے ساتھی درویش سے کہا۔ ’’یہ کیسے بزرگ ہیں جو شاہی دربار میں جایا کرتے ہیں۔ حالانکہ درویشوں کو شاہوں اور ان کے درباروں سے کیا تعلق؟‘‘

دوسرے درویش نے جواب دیا۔ ’’خدا عالم الغیب ہے، وہی چھپی باتوں اور دلوں کے رازوں سے واقف ہوتا ہے۔‘‘

دونوں درویش آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ عبداللہ خفیفؒ کا کہاں انتظار کیا جائے؟ ان کی خانقاہ میں یا کہیں اور پھر دونوں نے یہ طے کیا کہ شیراز کے بازاروں میں گھوم پھر لیا جائے۔ یہ طے کر کے دونوں بازار کی طرف نکل گئے۔ وہ کافی دیر تک گھومتے پھرتے رہے۔ اچانک ان کی نظر ایک درزی پر پڑی۔ ایک درویش کے خرقے کی جیب پھٹی ہوئی تھی اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ’’میرا خیال ہے وقت غنیمت ہے، کیوں نہ میں اپنے خرقے کی جیب سلوالوں۔‘‘

دوسرے درویش نے تائید کی، بولا۔ ’’بے شک، وقت غنیمت ہے۔‘‘

دونوں درزی کی دکان پر بیٹھ گئے اور ایک درویش نے اپنا خرقہ اتار کر درزی کے حوالے کیا اور کہا۔ ’’او بھائی درزی! ذرا میری یہ پھٹی ہوئی جیب تو سی دے۔‘‘

درزی نے خرقہ لیا اور جیب سینے لگا۔ اسی دوران اسے قینچی کی ضرورت پیش آ گئی۔ اس نے اپنے سامان میں قینچی

تلاش کی لیکن وہ نہیں ملی۔ اس نے ان درویشوں کی طرف دیکھا۔ کوسوں کی مسافت طے کیے ہوئے یہ درویش پراگندہ و پریشان عجیب بے اعتبارے سے محسوس ہوئے۔ درزی نے ان سے پوچھا۔ ''تم دونوں نے میری قینچی تو نہیں دیکھی؟''

دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔ ''بابا! ہم دونوں اس شہر میں نووارد ہیں اور بھلا ہمیں تیری قینچی کا کیا علم؟ یہ سوال تو تو ان سے کر جو تیری دکان پر اٹھتے بیٹھتے ہیں۔''

درزی کا شک اور بڑھا۔ ''سیدھی طرح بتادو کہ میری قینچی کہاں ہے ورنہ میں کوئی دوسرا طریقہ اختیار کروں گا۔''

ایک درویش نے کہا۔ ''تو دوسرا نہیں تیسرا طریقہ اختیار کر، جب ہمارے پاس تیری قینچی موجود نہیں تو تیرا دوسرا یا تیسرا طریقہ اسے کہاں سے فراہم کردے گا۔''

درزی نے کہا۔ ''تم دونوں ہی میری دکان پر آئے تھے یا تمہارے ساتھ کوئی تیسرا بھی تھا؟''

ایک درویش نے جواب دیا۔ ''ہم دو ساتھی ہیں، بہت دور سے ہی آئے ہیں اور تیری دکان میں ہم دونوں ہی آئے ہیں، تیسرے ساتھی سے تیری کیا مراد ہے؟''

درزی نے کہا۔ ''تم دونوں کا کوئی تیسرا ساتھی ضرور ہوگا اور تم دونوں نے میری قینچی اس کے حوالے کرکے اسے چلتا کردیا ہوگا۔''

دونوں درویشوں کو غصہ آگیا، ایک نے ذرا جوشیلے لہجے میں کہا۔ ''تیرا دماغ تو صحیح ہے، تو ہم دونوں کو چور ٹھہراتا ہے۔ تجھے شرم آنی چاہیے۔ ہم درویشوں کو چوری چکاری سے کیا تعلق؟''

درزی نے کہا۔ ''میں تمہاری کوئی بات نہ سنوں گا۔ بس سیدھی طرح میری قینچی فراہم کردو، ورنہ میں پولیس بلالوں گا۔''

ایک درویش نے عاجزی سے کہا۔ ''بھائی! یہ تجھے ہو کیا گیا ہے جو ہم کو چور بناتا ہے، کچھ تو خدا کا خوف کر۔''

درزی نے جواب دیا۔ ''میں خدا کا خوف کیوں کروں؟ تم چوری کرکے بھی خدا سے ڈر نہیں رہے اور مجھے خدا سے ڈراتے ہو، کمال کے ہو تم دونوں۔''

دوسرے درویش نے کہا۔ ''بھائی! یہ تکرار بعد میں کرلینا، پہلے میرے خرقے کی جیب تو سی دو۔''

درزی نے خرقہ اٹھا کر دکان کے اندر پھینک دیا، کہا۔ ''اب یہ اس وقت تک نہیں ملے گا جب تک تم دونوں میری قینچی نہیں دوگے۔''

ایک درویش نے اپنا سر پکڑلیا، پیشانی دباتا ہوا بولا۔ ''بھائی! تو نے تو کمال ہی کردیا۔ ہم دونوں پر چوری کا الزام لگاتا ہے اور خدا کے غضب سے ذرا بھی نہیں ڈرتا۔''

درزی نے جھنجلا کر کہا۔ ''دیکھو مجھے بار بار خدا کے غضب سے مت ڈراؤ۔ میں بہت برداشت سے کام لے رہا ہوں ورنہ اب تک پولیس آچکی ہوتی۔''

درویش نے کہا۔ ''دیکھ تنگ نہ کر، ہم چور نہیں ہیں۔''

درزی نے کہا۔ ''تم چور اگر نہیں تو پھر میری قینچی کہاں چلی گئی؟''

درویش نے گرم ہوکر کہا۔ ''ہم کیا جانیں تیری قینچی کہاں چلی گئی؟''

درزی نے کہا۔ ''واہ جناب! ایک تو میری قینچی غائب کردی، دوسرے مجھی کو آنکھیں بھی دکھاتے ہیں۔''

ایک درویش نے نرمی سے کہا۔ ''بابا! کیسی باتیں کرتے ہو۔ ہم تمہیں کس طرح یقین دلائیں کہ ہم نے تمہاری قینچی نہیں لی۔''

درزی نے جواب دیا۔ ''تمہیں یقین دلانے کی کوئی ضرورت نہیں، کیونکہ میں یقین کرنے کو تیار ہی نہیں۔ مجھے یا تو میری قینچی واپس کردو ورنہ میں سپاہیوں کو بلاتا ہوں۔''

درویش نے کہا۔ ''تم ہمیں برابر سپاہیوں کی دھمکی دیے جارہے ہو۔ اگر تم واقعی ہماری بے گناہی پر یقین نہیں رکھتے تو کوئی بات نہیں پھر وہی کرو جس پر تمہارا دل راغب ہے۔''

درزی نے اسی وقت سپاہیوں کو بلالیا اور ان دونوں درویشوں کو قینچی چرانے کے جرم میں گرفتار کرادیا۔ سپاہیوں نے انہیں حکمران کے دربار میں پیش کردیا۔ وہاں عبداللہ خفیفؒ پہلے ہی سے موجود تھے۔ آپ نے دونوں درویشوں کو دیکھا اور مسکرادیے اور ان سے سوال کیا۔ ''درویشو! میں تمہیں بتاؤں کہ میں بادشاہ کے دربار میں کیوں آتا ہوں؟''

دونوں درویش بہت پریشان تھے، بولے۔ ''اس وقت تو ہم دونوں مصیبت میں گرفتار ہیں، اس سے نجات ملے تو کچھ

عرض کریں۔''

عبداللہ خفیفؒ نے بادشاہ سے کہا۔ ''تیرا میری بابت کیا خیال ہے؟''

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''میں آپ کو انتہائی بزرگ سمجھتا ہوں۔''

آپ نے پوچھا۔ ''میں سچا ہوں یا جھوٹا؟''

بادشاہ نے جواب دیا۔ ''آپ سچے ہیں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''اگر تو مجھے سچا سمجھتا ہے تو میری بات کا یقین کر، یہ دونوں درویش دور دراز سے میری ملاقات کو آئے ہیں۔ یہاں بے وجہ چوری کے الزام میں گرفتار کرکے، تیرے دربار میں لاکھڑے کیے گئے۔ ان بے گناہوں کو چھوڑ دے۔''

بادشاہ نے ان دونوں کو اسی وقت رہا کردیا۔ آپ ان دونوں کو لے کر دربار سے باہر نکلے اور سیدھے درزی کے پاس پہنچے۔ درزی سے پوچھا۔ ''کیا تو ان دونوں کو چور سمجھتا ہے؟''

درزی بہت ڈرا سہما تھا، اس نے جواب دیا۔ ''نہیں تو، میں اپنی غلطی پر نادم ہوں۔''

آپ نے پوچھا۔ ''تیری قینچی ملی یا نہیں؟''

درزی نے جواب دیا۔ ''مل گئی، وہ کپڑوں میں بندھ گئی تھی۔''

آپ نے کہا۔ ''تب پھر تو نے اپنے کپڑوں میں پہلے ہی اسے اچھی طرح کیوں نہیں تلاش کرلیا تھا؟''

آپ نے دونوں درویشوں سے کہا۔ ''میں شاہی دربار کیوں جاتا ہوں؟ یہ تو تم دونوں کو معلوم ہی ہوچکا ہوگا۔ آج اگر میں دربار میں موجود نہ ہوتا تو تم دونوں کا معلوم نہیں کیا حشر ہوتا۔'' پھر درزی سے کہا۔ ''کیا ان کے خرقے کی جیب سل گئی؟ اگر سل گئی ہے تو وہ دے دے۔''

درزی نے خرقہ آپ کے حوالے کردیا، کہا۔ ''اسے تو میں نے سب سے پہلے سی دیا تھا۔''

آپ نے اس کی سلائی دریافت کی، لیکن درزی نے سلائی نہیں لی۔ آپ دونوں درویشوں کو اپنی خانقاہ لے گئے۔ وہاں ان دونوں نے اپنی بدگمانی کی معافی مانگی۔

☆☆☆

ایک مسافر نے آپ کی خانقاہ میں قیام کیا۔ وہ بہت تھکا ہارا تھا۔ معلوم نہیں اس نے ناقص کھانے یا شیراز کے پانی کی ناموافقت سے اپنے پیٹ میں گڑبڑ محسوس کی۔ پھر اجابت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ آپ اس کی تیمارداری میں لگ گئے۔ اس کی حالت نازک ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ رات کے پچھلے پہر تک اسے پچاس بار رفع حاجت کے لیے جانا پڑا۔ رات کے آخری حصے میں آپ کی آنکھ لگ گئی، مہمان کو ایک بار پھر رفع حاجت کی ضرورت پیش آگئی۔ اس نے آپ کو آواز دی لیکن نیند اتنی گہری تھی کہ آپ کی آنکھ نہیں کھلی۔ اس نے پھر آواز دی لیکن آپ سوتے رہے۔ مہمان پر کمزوری اتنی غالب تھی کہ اس کا دماغی توازن خراب ہوچکا تھا۔ اس نے آپ کو پوری قوت سے پکارا اور جب یہ محسوس کیا کہ آپ بیدار نہیں ہوئے تو اس نے گستاخانہ لہجے میں کہا۔ ''او شیخ! تجھ پر خدا کی لعنت، کہاں چلا گیا؟''

مریدوں نے آپ سے کہا۔ ''حضرت! آپ نے اس کے گستاخانہ کلمات سنے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں نے اس کے کلمات رحمت سن لیے۔''

اس کے بعد آپ مہمان کو بیت الخلاء لے گئے۔ جب واپس آئے تو مریدوں نے کہا۔ ''گستاخانہ کلمات کو کلمات رحمت کیوں کہہ رہے ہیں آپ؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''خدا نے مجھے خراب بات سننے کے لیے کان نہیں دیے۔ میں نے تو اسے یہ کہتے سنا کہ 'او شیخ! تجھ پر خدا کی رحمت، کہاں چلا گیا؟''

مریدوں نے عرض کیا۔ ''آپ اس گستاخ کی بے جا طرف داری فرما رہے ہیں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ اپنے منصب کا حق ادا کررہا ہوں۔''

مریدوں نے خاموشی اختیار کی۔

☆☆☆

ایک مسافر آپ کی خدمت میں اس طرح حاضر ہوا کہ اس نے جو کچھ پہن رکھا تھا، سیاہ تھا۔ گویا ماتم کدے کی چلتی پھرتی تصویر تھا۔ آپ نے اس سے پوچھا۔ ''تو نے یہ سیاہ لباس کیوں پہن رکھا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''اے خفیفؒ! میرے حکمران یعنی نفس اور ہوا، دونوں فوت ہو چکے ہیں اس لیے میں نے ماتمی لباس پہن لیا ہے۔''

آپ نے حکم دیا۔ ''اس شخص کو فوراً نکال باہر کرو۔''

مریدوں نے حکم کی تعمیل کردی اور اس شخص کو نکال باہر کیا لیکن ذرا دیر بعد دیکھا کہ وہ شخص پھر آ گیا ہے۔ آپ نے اسے پھر نکلوا دیا اور اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار تک نظر نہ آئے۔ آخر آپ نے فرمایا۔ ''اے شخص! واقعی یہ لباس تجھے زیب دیتا ہے۔ کیونکہ ستر بار کی تذلیل بھی تجھے آزردہ نہیں کرسکی۔''

آپ نے ایک بار دوران وعظ ارشاد فرمایا۔ ''لوگو! اللہ تعالیٰ نے پہلے ملائکہ اور انس و جن کو تخلیق فرمایا۔ ان کے بعد عصمت، کفایت اور جبلت کو تخلیق فرما کر حکم دیا کہ تینوں ان میں سے ایک ایک شے اپنے لیے پسند کرلیں۔ چنانچہ ملائکہ نے عصمت، اجنہ نے کفایت کو اور انسانوں نے جبلت کو منتخب کرلیا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کثرت سے حیلہ سازی سے کام لیتا ہے۔ عہد گزشتہ میں انسان اجنہ پر غالب رہتے تھے۔ لیکن پھر معاملہ الٹا ہوگیا۔''

کسی مرید نے دریافت کیا۔ ''حضرت! فقر کی خوبیان بیان فرمایئے۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''وہ تو میں بیان کردوں گا لیکن یہ اچھی طرح ذہن نشین کرلے کہ اظہار فقر معیوب شے ہے۔'' پھر فرمایا۔ ''جو کچھ میسر آجائے کھا کر خدا کا شکر ادا کرے اور میسر نہ آئے تو صبر سے کام لے۔''

آپ نے ایک دوسرے موقع پر فرمایا۔ ''لوگو! کچھ جانتے ہو، عبادت کسے کہتے ہیں؟''

لوگوں نے جواب دیا۔ ''نہیں، آپ اس کی وضاحت فرمادیجیے۔''

آپ نے کہا۔ ''عبادت نام ہے دائمی غم اور خوشی کو ترک کردینے کا۔'' پھر پوچھا۔ ''اور وصل کیا ہوتا ہے؟''

لوگوں نے جواب دیا۔ ''آپ ہی ارشاد فرمائیں، ہم نہیں جانتے۔''

آپ نے کہا۔ ''وصل نام ہے محبوب سے اس اتصال کا جس کے بعد کچھ بھی نہ یاد رہے۔'' پھر پوچھا۔ ''اور تقویٰ کیا ہے؟''

لوگوں نے پھر نفی میں جواب دیا۔ ''حضرت! اس سوال کا جواب بھی آپ ہی مرحمت فرمائیں گے۔''

آپ نے کہا۔ ''نفس، دنیا اور ابلیس سے بیک وقت کنارہ کشی اختیار کرنے کا نام تقویٰ ہے۔''

''اور رہی ریاضت؟ تو اس کے معنی ہیں، عبادت الٰہی سے نفس کو شکست دینا۔ اسی چیز کو ریاضت کہتے ہیں۔''

آخری عمر میں جب آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو آپ نے فرمایا۔ ''اے خادم! ادھر میرے پاس آؤ۔''

خادم آپ کے روبرو آکر کھڑا ہوگیا۔ آپ نے وصیت فرمائی کہ۔ ''موت کے بعد میرے ہاتھوں میں رسی باندھ کر اور گلے میں طوق ڈلوا کر قبلہ رو بٹھا دینا، شاید اسی طرح میری مغفرت ہوجائے۔''

آپ کے انتقال کے بعد خادم نے اس پر عمل کرنے کی کوشش کی تو کسی نے اسے ڈانٹ دیا۔ ''خبردار! بے ادب! جو تو نے خفیفؒ کی وصیت پر عمل کیا، کیا تو ہمارے محبوب کو رسوا کرنا چاہتا ہے۔''

خادم نے خوفزدہ ہو کر آپ کی وصیت پر عمل نہیں کیا۔

آپ کے بعد کسی نے آپ کے مزار پر لکھ دیا۔ ''قابو یافتہ شے سے اعراض اور غیر قابو یافتہ شے کو طلب نہ کرنا قناعت ہے۔ زہد نام ہے زر و مال کو نظر انداز کردینے کا اور اپنے تمام امور کو خدا کے سپرد کرکے مصائب پر صبر کرنے کا نام ہے عبودیت۔''

آپ کو آپ کے ہم عصر بزرگوں نے مشائخین کے شیخ کا لقب دیا تھا جو آپ کے نام کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وابستہ ہوگیا۔

ماخذات

خزینتہ الاصفیا، مفتی غلام سرور لاہوری۔ تذکرۃ الاولیا، شیخ فرید الدین عطار۔
سیکنتہ الاولیا، شہزادہ دارا شکوہ۔ طبقات الکبریٰ، علامہ شعرانی۔
ریاض الریاحین، ابی جعفر۔ سیفنتہ الاولیا، شہزادہ دارا شکوہ

گھر کا بھوت

مریم کے حنان

چاہنے والوں کی جنس اور شکل چاہے جو بھی ہو مگر یہ آفاقی جذبہ بڑے بڑے سورماؤں کو محبوب کے قدموں کی خاک چاٹنے پر مجبور کردیتا ہے۔ جس کے سائے سے بھی اس کی جان نکل جاتی تھی رفتہ رفتہ دل کے نہاں خانوں میں اترتا چلا گیا۔ اس موڑ پر جذبۂ رقابت نے وہ رنگ اختیار کیا کہ زندگی کا رنگ ڈھنگ ہی بدل گیا۔

پراسرار محبت کی قید سے راہ فرار پانے والوں کا ماجرا

مجھے یعنی میری این کو شدت سے جان پر غصہ آرہا تھا۔ جان میرا عزیز از جان شوہر ہے لیکن اس وقت وہ مجھے زہر لگ رہا تھا کیونکہ وہ اس گھر کو خریدنے کے لیے مرا جارہا تھا جو دیکھنے میں آسیب زدہ نظر آرہا تھا۔ سامنے بڑا سا اجاڑ لان جس میں سوکھی گھاس اُگی ہوئی تھی اور جابہ جا گرگٹ اور اسی نسل کے جانور بھاگ دوڑ کررہے تھے۔ ایک طرف فولادی زنجیر سے دو جھولے لٹکے ہوئے تھے جن کے تختے گھاس میں غائب ہوگئے تھے۔ دو منزلہ پتھر اور لکڑی سے

بنے اس مکان کا رنگ و روغن جگہ جگہ سے اڑ گیا تھا۔ لکڑی کا فرش بدرنگ ہو رہا تھا۔ اندر سے تمام واش رومز اور کچن کی سینیٹری برباد ہو گئی تھی۔ عقبی لان کی حالت بھی مختلف نہیں تھی۔ سامنے والی سڑک جو گرین بیلٹ کے ساتھ تھی اس پر بہت پرانے اور اونچے درخت لگے تھے۔ بے شک یہ اس مکان سے بہت بڑا تھا جہاں اب تک ہم رہ رہے تھے لیکن اس کی حالت حد سے زیادہ خراب تھی۔

جان نے تین سال پہلے بینک سے قسطوں پر مکان لیا تھا۔ یہ بہت خوب صورت اور تمام سہولتوں سے آراستہ دو بیڈ رومز کا مکان تھا۔ اس کے نیچے ایک خوب صورت نشست گاہ ایک حصہ ڈائننگ کے لیے اور ایک بند ہو جانے والا گیراج تھا۔ ہماری شادی کو ابھی تین سال ہوئے ہیں۔ پندرہ سال میں جان کو پانچ لاکھ ڈالرز کی رقم قسطوں میں ادا کرنی تھی۔ اس وقت مکان کی مالیت اتنی ہی تھی اور امید تھی کہ اس کی قیمت مزید بڑھے گی۔ لیکن امید کے بر خلاف کساد بازاری کی وجہ سے مکانوں کی قیمت گر گئی اور پانچ لاکھ ڈالرز مالیت کا مکان اب ڈیڑھ لاکھ کا بھی نہیں رہا تھا۔ ظاہر ہے کوئی اسے ڈیڑھ لاکھ کا بھی نہ لیتا کیونکہ ابھی اس پر چار لاکھ کا قرض تھا۔ ہم نے تین سال میں ایک لاکھ ڈالرز سے کچھ اوپر رقم ادا کر دی تھی۔ پھر جان بے روزگار ہو گیا۔ وہ شیشے کے کام کا ماہر تھا۔ وہ ایک کارخانے میں کام کرتا تھا اور اس کی تنخواہ بہت اچھی تھی لیکن اقتصادی بحران کا اثر گلاس انڈسٹری پر بھی پڑا تھا۔ کارخانے ایک ایک کر کے بند ہو رہے تھے۔ جان کا کارخانہ بھی بند ہو گیا۔ اب اسے ایک ورکشاپ میں کمیشن پر کام ملا تھا۔ یعنی وہ جتنا کام کرتا اسے اتنا ہی معاوضہ مل جاتا۔

بے شک ہم اپنے خوب صورت مکان کی قسط دینے کے قابل نہیں رہے تھے اور اب ہمیں وہ مکان چھوڑنا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ جان مجھے اس بھوت بنگلے میں لا کر رکھے۔ مجھے مکان سے زیادہ اپنے پڑوسی اور علاقے کے لوگ یاد آ رہے تھے۔ کتنی ہی اچھی فیملیوں سے ہمارے تعلقات بن گئے تھے۔ ویک اینڈز کتنے اچھے گزرتے تھے۔ اکثر کہیں نہ کہیں پارٹی ہوتی تھی۔ مہینے میں ایک دو بار سب جاننے والے مل کر باربی کیو کرتے تھے یا پھر سب مل کر کہیں پکنک منانے جاتے تھے۔ یہ تین سال جیسے خواب میں گزرے تھے اور مجھے اولاد کی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ حالانکہ میری خواہش تھی کہ میں شادی کے بعد جلد از جلد ماں بن جاؤں مگر جان چاہتا تھا کہ ہم کچھ جمع کر لیں پھر اولاد کو دنیا میں لانے کی کوشش کریں۔ جب یہ طے ہو گیا کہ ہمیں مکان چھوڑنا ہے تو ہم نے دوسرے مکان کی تلاش شروع کر دی۔ میری تو خواہش تھی کہ ہم اسی علاقے میں رہیں لیکن یہ علاقہ نہایت مہنگا تھا یہاں کوئی مکان ڈھائی ہزار ڈالرز سے کم کرائے پر دستیاب نہیں تھا۔ عجیب بات تھی کہ مکانوں کی قیمتیں گر گئی تھیں اور کرائے بڑھ گئے تھے۔

جان نے کئی ریالٹرز سے کہہ رکھا تھا کہ وہ ہمیں کوئی سستا سا مکان دلائیں۔ اسمتھ نامی ریالٹر نے جو اتفاق سے جان کا بچپن کا دوست بھی تھا اور اس کا اسکول فیلو بھی۔ اس نے اس بھوت بنگلے کا بتایا۔ یہ مکان صرف اسی ہزار ڈالرز میں مل رہا تھا۔ جان کا کہنا تھا کہ وہ انشورنس سے اپنی رقم وصول کر لے گا۔ بینک نے مکان اس شرط پر دیا تھا کہ ڈیفالٹ کرنے والے کو اس کی رقم واپس نہیں ملے گی لیکن جان نے عقل مندی کرتے ہوئے اپنی ادا شدہ رقم کا انشورنس کرا لیا تھا اس لیے وہ ڈیفالٹ کرتا تو انشورنس کمپنی اس کی رقم دینے کی پابند تھی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہمیں نقصان نہیں ہوا تھا۔ جب میں نے مکان دیکھا اور جان سے پوچھا۔ ”کیا اسمتھ سے تمہاری کسی لڑکی پر لڑائی ہوئی تھی؟“

”نہیں تو... کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”میرا خیال ہے وہ تم سے بدلہ لینے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”اسمتھ میرا بہت اچھا دوست ہے۔“ جان نے صفائی پیش کی۔

میں نے طنز کیا۔ ”یہ تو مکان کی حالت سے ظاہر ہے کہ وہ تمہارا کتنا اچھا دوست ہے۔ تبھی یہ بھوت گھر دلانے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”میری، مکان اچھا ہے۔ ٹھیک ہے یہ ہمارے پہلے مکان جیسا نہیں ہے لیکن اسے ٹھیک کیا جا سکتا ہے۔“

”یہ ٹھیک ہو کر بھی ویسا نہیں ہو گا۔“ میں نے چمک کر کہا۔

”او کے میں یہ بھی مانتا ہوں۔ لیکن اسی ہزار ڈالرز میں اتنا بڑا مکان کہیں نہیں ملے گا۔ یہ علاقہ بھی اچھا ہے۔ دیکھو مکان کے پیچھے کتنا شاندار جنگل ہے۔ پھر یہاں سے مجھے ورکشاپ بھی قریب پڑے گی۔ ابھی تو ایک گھنٹا آنے اور اس سے زیادہ وقت جانے میں لگ جاتا ہے۔ وقت کے ساتھ گیس بھی کتنی خرچ ہوتی ہے۔ یہاں سے تو میں پندرہ منٹ میں پہنچ جاؤں گا۔ گیس کی بچت الگ ہو گی۔“

”اسے ٹھیک کرانے میں اچھا خاصا خرچ ہو گا۔“

”نہیں، کلر، پالش اور ضروری مرمت کے بعد دیکھنا تم اس کا حلیہ بالکل بدل جائے گا۔“

”پلیز جان... یہ جگہ مجھے آسیب زدہ لگتی ہے۔“ میں نے کہا تو لان میں موجود جھولا یوں چرچرایا جیسے کسی نے اسے ہلایا ہو۔ میں نے سہم کر اس طرف دیکھا۔ جان نے میری طرف دیکھا۔

”میری، احمقانہ باتیں مت کرو... آج کل بھوت بھی بیروزگاری سے تنگ آ کر کسی اور ملک جا چکے ہیں۔“

ایسا لگ رہا تھا، جان فیصلہ کر چکا تھا اور اندر سے میں بھی جانتی تھی کہ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہ جاننے کے باوجود میرا دل نہیں مان رہا تھا۔ جان نے ڈن کیا تو اسمتھ کی باچھیں کھل گئیں اور وہ اس وقت مجھے نہایت برا لگ رہا تھا۔ حالانکہ وہ اچھا خاصا خوش شکل نوجوان تھا۔ جان نے میری طرف دیکھا اور سنجیدہ مزاج کے انداز میں بولا۔ ”اسمتھ یہاں کوئی بھوت تو نہیں ہے، تم جانتے ہو میرا بچپن سے بھوتوں سے دم نکلتا تھا۔“

میں پاؤں پٹختی ہوئی باہر جانے لگی۔ اسمتھ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”ہاں بھوت ہے تو لیکن بے ضرر ہے۔“

میں لان کے پاس سے گزری تو جھولا پھر چرچرا کر ہلا۔ میرے جسم میں خوف کی لہر سی دوڑ گئی۔ مجھے لگا جیسے کوئی جھولے پر بیٹھا مجھے دیکھ رہا ہو۔ میں جلدی سے جا کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ جان ٹھیک کہہ رہا تھا، آس پاس سارے اچھے مکان بنے تھے بس یہی ایک بھوتوں کا گھر لگ رہا تھا۔ جب ہم یہاں شفٹ ہو جاتے تو جان کام پر چلا جاتا اور مجھے سارا دن یہاں اکیلے رہنا پڑتا۔ اس لیے اگر یہاں کوئی بھوت تھا بھی تو میں اس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ جان بھی تو اتنا خوش تھا کہ مجھے ہمت نہیں ہوئی کہ اب مزید کوئی اعتراض کروں۔ وہ سچ مچ میرا محبوب شوہر ہے۔ بس کبھی کبھی اس پر شدید غصہ آتا ہے۔

آنے والے دو ہفتے نہایت مصروف گزرے۔ جان نے مکان بینک کو واپس کر دیا۔ انشورنس سے معاملات طے کیے۔ اس مکان کے مالک سے بات کی۔ اس دوران میں ہم اپنا سامان پیک کرتے رہے۔ دو ہفتے بعد رقم مل گئی اور ہم نے مکان خرید لیا۔ جان نے ورکشاپ سے ایک ہفتے کی چھٹی لی۔ وہ سامان لایا۔ ہم نے اپنا سارا سامان اور فرنیچر فی الحال ایک کمرے میں بھر دیا تھا۔ اس کے بعد ہم نے گھر کی حالت درست کرنے کی مہم کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے تمام ناکارہ اور خراب ہو جانے والی چیزیں تبدیل کیں۔ کچرا اور کاٹھ کباڑ جو بیسمنٹ اور اوپر دو چھتی میں بھرا تھا اسے نکالا۔ دو منزلوں کے اوپر ایک تکون چھت والا کمرا تھا جسے دو چھتی کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ نیچے تین بیڈ رومز تھے اور گراؤنڈ پر ایک بڑی سی نشست گاہ، ایک ٹی وی لاؤنج اور بڑا سا کچن تھا جس میں ڈائننگ ٹیبل کی جگہ بھی تھی۔ اس کے علاوہ ایک کمرا تھا جسے اسٹڈی یا اضافی بیڈروم کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ کباڑ اتنا تھا کہ ایک پورا دن تو صرف اسے صاف کرنے میں گزر گیا۔ دوسرے دن جان نے سارے نل اور سینیٹری کا سامان تبدیل کیا۔ کھڑکیوں پر نئے شیشے لگائے اور جو جگہیں مرمت چاہتی تھیں ان کی مرمت کی۔ اس دوران میں، میں دیواروں سے ناکارہ رنگ اور وال پیپر اتارتی رہی۔

چیزوں کی تبدیلی اور مرمت کے بعد جان نے رنگ کا آغاز کیا۔ میں وال پیپر لگا رہی تھی۔ ایک ہفتے میں جا کر یہ کام مکمل ہوا۔ جان لکڑی کے لیے پالش اور مرمت کا سامان لے آیا تھا۔ آنے والا مزید ایک ہفتہ اس میں لگا۔ ہم صبح سویرے سے کام میں لگ جاتے تھے اور بغیر رکے رات تک کام جاری رہتا تھا۔ چونکہ کچن بھی سیٹ نہیں تھا اس لیے کھانا باہر سے آتا تھا۔ رات گئے ہم فرش پر گدے بچھا کر سو جاتے تھے مگر نیند پوری نہیں ہوتی تھی۔ جان سارا کام جلد از جلد نمٹا لینا چاہتا تھا تاکہ اسے کم سے کم چھٹی لینی پڑے۔ تھکن سے برا حال ہو گیا تھا لیکن ابھی فرنیچر اور سامان بھی سیٹ کرنا تھا۔ خدا خدا کر کے یہ مرحلہ بھی ختم ہوا۔ اب صرف مکان کے باہر کا رنگ و روغن اور آگے پیچھے کے لان کی درستی کا کام باقی تھا۔ اسے جان نے ہفتہ وار چھٹیوں کے لیے اٹھا کر رکھنے کا فیصلہ کیا کیونکہ اب مزید چھٹی نہیں مل سکتی تھی۔ وہ پہلے ہی ایک ہفتے کا کہہ کر دو ہفتے کی چھٹی کر چکا تھا۔

جس دن جان کام پر گیا اس روز میں پہلی بار اکیلی گھر میں رہی۔ جان کے جانے کے بعد مجھے ہلکا سا خوف محسوس ہوا اور میں اسے ٹالنے کے لیے کافی کا مگ لے کر باہر نکل آئی۔ لان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ میں وہاں جاتی اس لیے ڈرائیو وے پر ٹہلنے لگی۔ اندر سے مکان کی حالت بہت بہتر ہو گئی تھی لیکن باہر سے یہ ابھی تک اجاڑ تھی۔ ہمارے پاس گھاس کاٹنے والی الیکٹرک مشین تھی، میں نے فیصلہ کیا کہ ایک دن آرام کر کے لان کی گھاس صاف کروں گی۔ کافی پی کر میں اندر آئی اور حیران رہ گئی۔ سنک کا نل کھلا تھا اور پانی زور و شور سے بہہ رہا تھا۔ جبکہ مجھے یاد تھا کہ میں جب گئی تو نل بند تھا۔ میں نے اسے دوبارہ بند کر دیا۔ پھر کچن کی صفائی کرنے لگی۔ اچانک عقب سے دوبارہ آواز آئی اور نل پھر پُر شور انداز میں بہنے لگا۔ میں

چونکی، میرے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی تھی۔ نل بالکل نیا تھا اور اس میں خرابی کا امکان کم تھا پھر یہ خود بہ خود کس طرح کھل رہا تھا؟ میں نے اسے دوبارہ بند کیا اور زیادہ زور لگا کر بند کیا۔ پھر مڑ کر صافی اٹھانا چاہی تو وہ اپنی جگہ نہیں تھی حالانکہ میں نے میز پر صافی رکھی تھی جبکہ وہ میز کے بجائے چولہے پر پڑی تھی اور چولہا آن تھا۔ صافی نے بھک سے آگ پکڑ لی۔ میں نے جلدی سے اسے اٹھا کر سنک میں پھینکا اور نل کھولا تو اب پانی نہیں آ رہا تھا اور صافی سے شعلے اٹھ رہے تھے۔ بدحواسی میں، میں نے دوسری صافی سے مار کر آگ بجھانی چاہی تو اس نے بھی آگ پکڑ لی اور میں نے دونوں کو چمٹے کی مدد سے باہر لے جا کر پھینکا۔ اتنی دیر میں کچن دھواں دھواں ہو گیا تھا۔ واپس آ کر میں نے کھڑکیاں کھولیں تاکہ دھواں نکل جائے اور پھر جان کو کال کی۔ میں نے لرزتی آواز میں اسے بتایا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے اور پھر رو دینے والے لہجے میں بولی۔

''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ یہ گھر آسیب زدہ ہے۔''

''ایزی ڈیئر... ایزی... میرا خیال ہے تم بہت تھک گئی ہو اور جب انسان بہت تھک جاتا ہے تو اس سے غلطیاں ہو جاتی ہیں۔''

''مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی اور میں پہلی بار نہیں تھکی ہوں۔'' میں نے تند لہجے میں کہا۔ ''لیکن نہ مجھ سے نل کھلا رہا اور نہ میں نے صافی چولہے پر رکھی تھی۔ چولہا بند تھا اور پہلے نل بھی بند تھا پھر میں نے اسے کھولا تو پانی...''

''میری، میں اس وقت بہت مصروف ہوں۔ ایسا کرتا ہوں شام کو گھر آ کر بات کرتا ہوں۔'' جان نے کہا اور کال کاٹ دی۔ میں ہیلو ہیلو کرتی رہ گئی اور پھر موبائل میز پر پٹخ دیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میرے ساتھ جو ہوا تھا اس میں کسی دوسرے فرد کا ہاتھ تھا اور وہ دوسرا فرد چونکہ نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے وہ یقیناً کوئی بھوت تھا۔ آگ لگنے کے بعد کچھ نہیں ہوا تھا۔ چولہا بند پایا گیا تھا حالانکہ میں نے اسے بند نہیں کیا تھا اور نل سے پانی آ رہا تھا۔ میں نے تھوک نگلا اور ممکن حد تک بلند آواز میں کہا۔ ''دیکھو تم جو کوئی بھی ہو یہاں سے چلے جاؤ، اب یہ گھر ہمارا ہے۔''

''لیکن میں پہلے سے رہتا آیا ہوں۔'' کسی نے میرے کان کے پاس کہا اور میں چیخ مار کر اوپر کی طرف بھاگی اور بیڈ روم میں گھس کر دروازہ اندر سے بند کیا۔ پھر بستر میں گھس کر اوپر سے چادر اوڑھ لی۔ میرا پورا بدن لرز رہا تھا اور میری صحیح معنوں میں گھگی بندھی ہوئی تھی۔ بدقسمتی سے موبائل بھی نیچے بھول آئی تھی اور یہاں کوئی ٹیلی فون بھی نہیں تھا۔ میں جان کو کیسے کال کرتی اس لیے چادر میں دبکی کانپتی رہی اور دل ہی دل میں جان کو برا بھلا کہتی رہی کہ اسی نے یہ مکان لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ خاصی دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ اس طرح بستر میں دبکے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس لیے ہمت کر کے بستر سے نکلی اور پھر نیچے آئی۔ ڈرتے اور کانپتے رہنے سے بہتر تھا کہ میں خود کو کسی مصروفیت میں لگا لوں اور اس طرف سے میرا دھیان ہٹ جائے۔ مجھے لان کا خیال آیا اگرچہ میں نے ایک دن کے لیے لان کی صفائی کا کام ملتوی کر دیا تھا لیکن اس وقت مجھے مصروفیت درکار تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں آج ہی لان ٹھیک کروں گی۔

مشین اور دوسرا سامان پیچھے شیڈ میں رکھا تھا۔ میں نے پہلے مشین کی مدد سے پوری گھاس صاف کی۔ اس کے بعد اس گھاس اور جمع ہونے والے پتوں کے ڈھیر کو آگ لگا دی۔ جب تک آگ بجھی میں نے کٹر کی مدد سے بڑھ جانے والے درختوں کی نیچی شاخیں کاٹیں۔ پھر راکھ کو پورے لان میں پھیلا کر پانی دیا۔ دوپہر تک لان کی اچھی خاصی صورت نکل آئی تھی لیکن میری اپنی صورت دھول مٹی اور پسینے سے مل کر خراب ہو گئی تھی۔ مجھے باتھ کی ضرورت تھی مگر اندر جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ بہرحال ہمت کر کے اندر آئی۔ واش روم میں جا کر میں نے کپڑے اتارے اور شاور کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ دھول مٹی ہٹی تو سکون ملا۔ میں نے بالوں میں شیمپو لگایا اور بوتل اسٹینڈ پر رکھ دی۔ کچھ دیر بعد دوبارہ شیمپو لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو بوتل وہاں نہیں تھی۔ وہ نیچے فرش پر رکھی تھی۔ اس بار خوف کے بجائے مجھے غصہ آیا اور میں نے جلدی سے تولیا لے کر لپیٹتے ہوئے بلند آواز سے کہا۔

''دیکھو تم جو کوئی ہو لیکن یہ نہایت غیر شریفانہ حرکت ہے، کسی عورت کے باتھ روم میں آنا...... جب وہ نہا رہی ہو بالکل بھی اچھی بات نہیں ہے۔ تمہیں شرم آنی چاہیے۔''

اس پر باتھ روم کا دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔ گویا وہ باہر چلا گیا تھا لیکن مجھے یقین نہیں آیا تھا اور میرا غصہ بھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ میں نے باتھ مکمل کر کے باتھ روب پہنا اور باہر آ کر غصے سے بولی۔ ''سنو تم جو بھی ہو مجھے تم سے بات کرنی ہے، دوبدو... ابھی اور اسی وقت۔''

کھڑکی کے پاس رکھی کرسی ہلی تو میں نے چونک کر دیکھا۔ اس پر ایک آدمی بیٹھا تھا۔ آدمی کیا نوجوان تھا اور خاصا خوش شکل تھا۔ سنہری بال اور دلکش نقوش تھے۔ جسامت ورزشی تھی۔ اس نے جینز کے اوپر نیلی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ گلے میں سنہرے رنگ کی زنجیر تھی اور ایک کان میں سنہری رنگ پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں چمک دار تھیں اور وہ کہیں سے بھی بھوت نظر نہیں آ رہا تھا لیکن وہ یقیناً وہی بھوت تھا۔ نہ جانے کیوں اسے دیکھتے ہی میرا غصہ ٹھنڈا پڑنے لگا۔ حالانکہ اس نے بہت غلط حرکت کی تھی۔ ایک لمحے کو مجھے وہاں سے بھاگ جانے کا خیال آیا مگر میں اس پر عمل نہیں کر سکی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''آئی ایم رئیلی سوری...''

''تم نے صبح سے مجھے دہشت زدہ کر رکھا ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر شکایت کی۔ دراصل اب مجھے شرم آ رہی تھی کہ اس نے مجھے کس حال میں دیکھا تھا اور میں اس کے منہ سے اس بارے میں کچھ سننا نہیں چاہتی تھی۔

وہ مسکرایا۔ ''ایک تو تم زندہ انسان ذرا سی بات پر دہشت زدہ ہو جاتے ہو۔''

''ظاہر ہے۔'' میں خفگی سے بولی۔ ''اگر کوئی نظر نہ آنے والا شخص آس پاس ہو اور آپ کی چیزوں کو چھیڑے تو آپ خوفزدہ ہی ہوں گے۔ ویسے تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''میں بھوت ہوں اور یہاں رہتا ہوں۔'' اس نے سادگی سے جواب دیا۔

''وہ تو ظاہر ہے، میں تمہارا نام اور یہاں رہنے کی وجہ پوچھ رہی ہوں۔''

''میرا نام ایڈم ہے نام کا دوسرا حصہ نہیں بتاؤں گا اس سے میرے خاندان کی بدنامی ہو گی جو اب بھی یہاں معزز شمار ہوتا ہے اور یہاں اس لیے رہتا ہوں کہ یہ گھر مجھے پسند ہے۔''

''شکریہ۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔ ''جان اور میں نے اسے ٹھیک کرنے میں بہت محنت کی ہے۔''

''میں اب کی نہیں اس کی پرانی حالت کی بات کر رہا ہوں۔ اس وقت یہ بھوتوں کے رہنے کی جگہ تھی لیکن اب...'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر سرد آہ بھری۔ اتنی گفتگو سے میرا خوف دور ہو گیا تھا اور اب میں اس کے بارے میں پُرتجسس تھی۔ بلکہ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں اتنے ہینڈسم سے بھوت سے ڈر رہی تھی جو دیکھنے میں ذرا بھی خوفناک نہیں لگ رہا تھا۔ اگر وہ بھوت کی حیثیت سے سامنے نہ آتا تو میں قیامت تک اس کے بھوت ہونے کا یقین نہ کرتی۔ اس کے ادھورے جملے سے ظاہر تھا کہ اسے مکان کی حالت کی تبدیلی پسند نہیں آئی تھی۔

''تم کب سے یہاں ہو؟''

اس نے انگلیوں پر حساب لگایا اور جتنی مشکل سے لگایا اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کبھی طالب علم رہا تھا تو یقیناً خاصا غبی رہا ہو گا۔ اس نے حساب سے فارغ ہو کر بتایا۔ ''میں گزشتہ بتیس سال سے یہاں ہوں۔''

''بتیس سال!'' میں حیران ہوئی۔ ''ایک جگہ رہنے کے لیے یہ مدت زیادہ نہیں ہے؟''

''زندہ انسانوں کے لیے زیادہ ہے۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''ہم بھوتوں کے لیے تو بہت کم ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ انسانوں کے حساب سے مجھے یہاں آئے ہوئے چند سال ہی گزرے ہیں۔ میں ایسے بھوتوں سے واقف ہوں جو کئی سو سال سے ایک ہی جگہ رہتے آئے ہیں۔''

میں اس سوال کی طرف آئی جسے پوچھنے کے خیال سے مجھے خوف آ رہا تھا۔ ''تم... تم بھوت کیسے بنے؟''

''مرنے کے بعد۔'' اس نے سادگی سے جواب دیا۔

''میرا مطلب ہے مرے کیسے؟ یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ آدمی مرنے کے بعد ہی بھوت بنتا ہے۔''

اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''میں نے ویت نام کی جنگ میں حصہ لیا تھا اور وہاں دو سال میں بہت خونریزی دیکھی۔ لیکن صحیح سلامت واپس آ گیا۔ امریکا آنے کے چار سال بعد گاڑی کے حادثے میں مارا گیا۔ حادثہ اسی سڑک پر ہوا تھا اور اسی مکان میں رہنے والے شخص کی گاڑی سے ہوا تھا۔ میں بہت تیز رفتاری سے جا رہا تھا کہ اس نے اچانک کار سڑک پر نکالی اور میں بریک نہ لگا سکا۔ میں نے اسی مکان کے سامنے دم توڑا تھا۔''

''اس لیے تم یہاں آ گئے۔'' میں نے بے ساختہ کہا پھر مجھے تعزیت کا خیال آیا۔ ''مجھے سن کر افسوس ہوا۔''

شاید ہی کسی زندہ آدمی نے کسی مرنے والے سے خود اس کی تعزیت کی ہو۔ یہ اعزاز میرے حصے میں آیا تھا۔

''میں نے منگنی کر لی تھی اور میرا بزنس بھی اچھا چل رہا تھا۔ اگر زندہ رہتا تو چند مہینے بعد ہم شادی کر لیتے۔''

''اوہ۔'' اس بار میں نے سچ مچ افسوس سے کہا۔ ''وہ یقیناً بہت پیاری لڑکی ہو گی۔''

ایڈم نے ایک پرس نکال کر کھولا اور اسے میری طرف بڑھا دیا۔ اس میں ایک بہت پیاری اور کم عمر لڑکی کی تصویر لگی تھی۔ میرا افسوس بڑھ گیا۔ اگر ایڈم زندہ ہوتا تو یقیناً اس لڑکی کے ساتھ خوش و خرم زندگی بسر کر رہا ہوتا۔ میں

نے پھر افسوس کیا اور اس سے بولی۔ ”اب تم جاؤ میں چینج کروں گی۔“

وہ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے غائب ہو گیا۔ مجھے ایک لمحے کو ڈر لگا تھا، وہ غائب ہوا تھا لیکن اس کا امکان تھا کہ وہ یہیں موجود ہو گا، میں نے کہا۔ ”ایڈم تم یہیں ہو؟... مجھے معلوم ہے۔“

اس بار دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔ میں نے مسکراتے ہوئے چینج کیا اور نیچے آئی۔ اتنی محنت اور نہانے کے بعد میری بھوک کھل گئی تھی۔ اپنے لیے سینڈوچز اور کافی تیار کر کے لنچ کیا۔ پھر مجھے خیال آیا اور میں نے کہا۔ ”ایڈم تم یہیں ہو؟“

وہ اچانک سامنے والی کرسی پر نمودار ہوا تو میں اچھل پڑی اور کافی چھلک گئی۔ میں نے خفگی سے کہا۔ ”یہ کیا حرکت ہے، تم اس طرح کیوں نمودار ہو جاتے ہو؟“

”میں تو اسی طرح نمودار ہو سکتا ہوں میں پہلے سے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ تم نے پکارا تو سامنے آ گیا۔“

”یعنی تم غائب رہ کر یہیں موجود تھے۔“ میں مزید خفا ہو گئی۔ ”ٹھیک ہے اب تم بھوت ہو لیکن کبھی تم زندہ انسان تھے اور اس وقت کے مینرز تمہیں یاد ہوں گے۔ کسی کے آس پاس رہ کر اسے اس طرح دیکھنا کہ اسے خبر نہ ہو اخلاق سے گری ہوئی حرکت ہے۔“

”ہم بھوتوں کا اخلاق سے تعلق نہیں ہے۔“

”تمہیں اس گھر میں رہتے ہوئے ان باتوں کا خیال رکھنا ہو گا۔“ میں نے زور دے کر کہا۔ ”دیکھو اگر تم نظروں سے غائب رہنا چاہو تو کسی ایسی جگہ چلے جانا جہاں ہم نہ جاتے ہوں ورنہ تم نظروں کے سامنے رہو گے۔“

اس نے سوچا اور سر ہلا دیا۔ ”او کے، میں تمہاری خاطر مان جاتا ہوں کیونکہ تم ایک خوب صورت اور اچھی خاتون ہو۔“

”میرا شوہر بھی بہت ہینڈسم اور اچھا ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”جب تم اس سے بات کرو گے تو تم یقیناً اسے پسند کرو گے۔“

اس پر ایڈم نے جس طرح کا منہ بنایا اس سے ظاہر تھا کہ وہ پہلے ہی جان کو ناپسند کر چکا ہے۔ البتہ اس نے بادل ناخواستہ سر ہلایا، میں نے خوش ہو کر کہا۔ ”تم ایک اچھے بھوت ہو۔ مجھے امید ہے کہ اب تم ہمارے لیے مسئلہ نہیں بنو گے۔“

”مسئلہ میں نہیں بنوں گا؟“ اس نے خفگی سے کہا۔ ”مسئلہ تم لوگ بن گئے ہو۔ تین ہفتے سے میرا اس گھر میں رہنا حرام کیا ہوا ہے۔ میں جہاں جاتا ہوں کچھ دیر بعد تمہارا شوہر وہاں پہنچ کر ٹھوکا پیٹی کرنے لگتا ہے۔“

”وہ مجبوری تھی۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”تم نے دیکھا ہو گا، اس گھر کی حالت کیا تھی اور ہمیں کتنا کام کرنا پڑتا۔“

”حالت تو پہلے والی ٹھیک تھی۔“ اس نے سرد آہ بھری۔ ”لیکن تمہاری خاطر میں نے اس تبدیلی کو برداشت کیا بلکہ یہ گھر بھی تمہاری وجہ سے بکا ورنہ اس سے پہلے جو آتا تھا میں اسے بھگا دیتا تھا۔ میں سچ کہتا ہوں اگر خریدار تم جیسی حسین عورت نہ ہوتی تو یہ گھر کبھی نہ بکتا۔“

”میں تمہاری شکر گزار ہوں۔“ میں نے شرما کر کہا۔ اپنی تعریف کس عورت کو بری لگتی ہے۔ ”تو اب سب طے ہے نا؟“

اس نے سر ہلایا اور غائب ہو گیا لیکن فوراً ہی نمودار ہو کر معذرت کی اور اٹھ کر چلتا ہوا کچن کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کچھ کام نمٹائے اور پھر رات کے کھانے کی تیاری کرنے لگی۔ جان صبح ناشتا کرتا تھا اور پھر رات کو کھانا کھاتا تھا، اس کا کہنا تھا کہ دوپہر میں کھانے سے وہ سست ہو جاتا ہے اس لیے وہ گھر آ کر کھاتا تھا۔ جان کو اچھا کھانے کا شوق تھا اور بہت کم چیزیں اس کی ناک کے نیچے آتی تھیں اس لیے میں شام کا کھانا بہت دھیان اور محنت سے بناتی تھی۔ وہ شام کو آیا تو تھکا ہوا تھا اس لیے میں نے فی الحال اسے ایڈم کے بارے میں نہیں بتایا۔ اس نے نہا دھو کر ڈنر کیا اور ہم لاؤنج میں آئے تو اسے یاد آیا۔

”صبح تم فون کر کے کچھ کہہ رہی تھیں لیکن اس وقت میرا باس سر پر تھا اور اس نے مجھے وارننگ دی ہے کہ اب کام کے دوران میری کوئی کال آئی تو مجھے فائر کر دیا جائے گا۔“

”گھٹیا شخص۔“ میں نے غصے سے کہا۔ ”گھر میں بیوی کو مسئلہ ہو تو وہ کسے کال کرے گی؟“

”شوہر کو۔“ جان نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”تم شاید کسی بھوت کا ذکر کر رہی تھیں جو نل کھول اور چیزیں ادھر ادھر کر رہا تھا۔“

میں نے جوش و خروش سے جان کو بتایا کہ ایسا سچ مچ ہوا تھا لیکن وہ یوں سنتا رہا جیسے میں اسے کوئی فیری ٹیل سنا رہی ہوں۔ میں نے اپنی بات ختم کی اور اس نے کہنا شروع کیا۔ ”دیکھو ڈیئر ہو سکتا ہے...“

”ہونے کو بہت کچھ ہو سکتا ہے لیکن کچھ دیر بعد میری ملاقات اس شخص سے ہو گئی جو ان سب باتوں کا ذمے دار تھا۔“

جان نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ ”تمہارا مطلب ہے سچ مچ کا بھوت؟“

”بالکل ڈیئر... اصلی بھوت۔“ میں نے کہا اور اسے ایڈم کے بارے میں بتایا البتہ باتھ روم والا واقعہ گول کر دیا کیونکہ جان میرے بارے میں نہایت حساس تھا۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ بھوت مجھے نہاتے ہوئے دیکھ رہا تھا تو اسے یقیناً غصہ آتا۔ سب سن کر بھی جان کے تاثرات شک والے تھے۔ مجھے غصہ آ گیا اور میں نے بلند آواز سے کہا۔ ”ایڈم تم کہاں ہو؟“

جواب میں بیرونی دروازہ کھلا اور ایڈم اندر آ گیا۔ جان نے اسے دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔ ”یہ کون ہے اور یہاں کیوں آیا؟“

”یہ ایڈم ہے۔“ میں نے تعارف کرایا۔ ”یہ بتیس سال سے یہیں رہ رہا ہے۔“

”میری، لگتا ہے آج تم عملی مذاق کے موڈ میں ہو؟“

مجھے معلوم تھا جان اتنی آسانی سے نہیں مانے گا اس لیے میں نے ایڈم سے کہا۔ ”تم اسے یقین دلا سکتے ہو؟“

”کیوں نہیں۔“ اس نے مسکرا کر کہا اور غائب ہو گیا۔

”شٹ!“ جان کے ہاتھ سے جام چھوٹ گیا وہ لڑکھڑا کر صوفے پر گرا پھر چلّا اٹھا۔ ”میری، یہ کیا تھا؟“

”وہی جس پر تم یقین نہیں کر رہے ہو۔ ایڈم آ جاؤ۔“

ایڈم دوبارہ نمودار ہوا۔ اس بار جان کو یقین آ گیا لیکن اب اس نے معاملے کا دوسرے پہلو سے جائزہ لیا۔ ”ہم نے یہ مکان خریدا ہے لیکن معاہدے میں کہیں بھی یہ نہیں لکھا تھا کہ یہاں ایک بھوت بھی رہے گا۔“

”اس قسم کی باتیں معاہدوں میں نہیں لکھی جاتیں۔“ ایڈم نے متانت سے کہا۔ ”کیونکہ بھوتوں کا معاملہ اس دنیا سے تعلق نہیں رکھتا۔“

”لیکن تم اس گھر میں ہو اور اس کا تعلق اس دنیا سے ہے۔“ جان نے دلیل دی۔ ”یہ گھر میرا ہے۔“

ایڈم نے لاجواب ہو کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ ”میں بتیس سال سے یہاں رہ رہا ہوں۔“

مجھے اس پر ترس آنے لگا اور میں نے جان سے کہا۔ ”اس میں کیا حرج ہے، دیکھو یہ اس گھر کو اس طرح استعمال نہیں کرتا ہے جیسے ہم استعمال کرتے ہیں اور نہ ہی کوئی چیز استعمال کرتا ہے۔“

”بالکل۔“ ایڈم نے خوش ہو کر کہا۔ ”پھر میں نے میری سے معاہدہ کر لیا ہے کہ میں گھر میں کہیں غیر مرئی حالت میں نہیں رہوں گا۔ اس سے تم لوگوں کی پرائیویسی متاثر نہیں ہو گی۔“

”پرائیویسی۔“ جان نے طنز کیا۔ ”ہمارے ساتھ ایک بھوت رہ رہا ہے اور اس پر بھی ہماری پرائیویسی برقرار رہے گی؟“

”ڈیئر یہ وعدہ کر رہا ہے کہ یہ گھر میں غیر مرئی حالت میں نہیں رہے گا۔“

جان کا موڈ مزید خراب ہو گیا۔ ”یعنی یہ اکثر لاؤنج، کچن، اسٹڈی اور شاید ہمارے بیڈ روم میں بھی نظر آئے گا۔“

”تم کیا چاہتے ہو میں یہاں سے چلا جاؤں۔“ ایڈم کا موڈ بھی خراب ہو گیا۔ ”یہ اصل میں میرا گھر ہے اور میں چاہتا تو کوئی اسے خرید نہیں سکتا تھا۔“

اب مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں ایڈم انکشاف نہ کر دے کہ اس نے صرف میری وجہ سے یہ مکان فروخت کرنے کی اجازت دی تھی اس لیے میں نے جلدی سے مداخلت کی۔ ”دیکھو آپس میں جھگڑنے کی ضرورت نہیں ہے ہر مسئلہ بات چیت سے حل کیا جا سکتا ہے۔“

”ضرور، اب ہم ایک بھوت سے مذاکرات کریں گے کہ اپنے ہی گھر میں کس طرح سکون سے رہیں؟“ جان کھڑا ہو گیا اور مجھ سے کہا۔ ”میرا خیال ہے تم ہی اس سے بات کرو۔“

میں نے جان کو روکنا چاہا لیکن وہ تنتناتا ہوا اوپر چلا گیا اور مجھے معاملہ گڑبڑ ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ جان سے ایڈم کی پہلی ملاقات ہی ناخوشگوار رہی تھی۔ میں نے ایڈم سے کہا۔ ”جان ابھی غصے میں ہے لیکن مجھے امید ہے جلد ہمارے درمیان تعلق خوشگوار ہو جائے گا۔“

”مجھے اس شخص کی کوئی پروا نہیں ہے۔“ ایڈم نے غصہ ور لہجے میں کہا اور چلتا ہوا کچن کی طرف چلا گیا یعنی اس کا فی الحال مکان سے باہر جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں اوپر آئی تو جان بستر پر دراز تھا اور اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اس نے مجھے دیکھتے ہی شکوہ کیا۔ ”تم میرے بجائے اس بھوت کی حمایت کر رہی تھیں جو ہمارے گھر میں گھسا ہوا ہے۔“

”ڈیئر، ہمیں اس معاملے سے سوچ سمجھ کر نمٹنا ہو گا۔“ میں نے اس کا سر سہلایا۔ ”تم ایک بات یاد رکھو، وہ ایک بھوت ہے اور ہم اس کے خلاف کسی کی مدد نہیں لے سکتے۔“

”یعنی وہ ہمیں نقصان پہنچا سکتا ہے اس لیے ہمیں اس کے سامنے سرینڈر کر دینا چاہیے۔“ جان نے طنزیہ لہجے میں کہا اور اٹھ کر باتھ روم چلا گیا۔ یہ اس کا انداز تھا، جب وہ کسی معاملے پر بات نہیں کرنا چاہتا تو باتھ روم چلا جاتا تھا۔ میں فکر مند ہو گئی۔ اگرچہ میں یہ مکان لینے کی مخالف تھی لیکن اب ہم نے اسے حاصل کر لیا تھا اور بہت اچھی حالت میں بھی لے آئے تھے بلکہ مجھے امید ہو چلی تھی کہ کچھ عرصے

بعد ہم اسے تقریباً پہلے گھر جیسی حالت میں لے آئیں گے۔ تب میں یہاں بھی آس پاس والوں سے جان پہچان کرسکوں گی اور اپنے گھر میں لوگوں کو بلاسکوں گی۔ میں یہاں سے جانا نہیں چاہتی تھی لیکن اگر جان، ایڈم سے جھگڑا کرتا تو وہ ہمیں یہاں سے نکالنے پر تل جاتا۔

صبح بھی جان بغیر ناشتا کیے کام پر چلا گیا اور یہ اس کی ناراضی کی نشانی تھی۔ میرا دل دکھنے لگا، جان میرا شوہر ہی نہیں میرا محبوب بھی تھا اور اس کی ناراضی میرے دل پر لگتی تھی۔ میرا دل ناشتے کو نہیں چاہ رہا تھا اس لیے میں کافی بنا کر وہیں کچن میں بیٹھ گئی۔ ابھی کل صبح تک سب ٹھیک تھا لیکن ایڈم کی موجودگی سامنے آتے ہی میرے گھر کا سکون رخصت ہوگیا تھا۔ اگرچہ ایڈم نے سوائے چند حرکتوں کے اور کچھ نہیں کیا تھا اور اب تو وہ دوستانہ انداز میں پیش آرہا تھا لیکن جان کے تیوروں سے لگ رہا تھا کہ وہ اسے یہاں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ مرد اپنے گھر اور بیوی کے معاملے میں حساس ہوتے ہیں۔ وہ کسی صورت ایک غیر مرد کو اپنے گھر اور اپنی بیوی کے پاس برداشت نہیں کرتے۔ سوچتے ہوئے اچانک مجھے احساس ہوا کہ ایڈم وہاں موجود تھا، میں نے کہا۔ ”یہ اچھی بات نہیں ہے، تم شروع میں وعدہ خلافی کررہے ہو۔“

وہ سامنے نمودار ہوا اور شرمندگی سے بولا۔ ”سوری... رات کو تم دونوں کا موڈ خراب ہوگیا تھا اس لیے مجھے تمہارے سامنے آتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔“

میں بے ساختہ ہنس دی۔ ”تم کو بھوت ہوکر ڈر لگ رہا تھا۔“

”ہاں مجھے ڈر تھا کہ تم مجھ سے ناراض نہ ہو۔“

”میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”بلکہ ایک طرح سے تمہاری شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے زیادہ نہیں ڈرایا اور سامنے آگئے۔ میرا خوف ختم ہوگیا ورنہ کل صبح میں اتنی ڈر گئی تھی کہ یہ گھر چھوڑ کر جانے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔“

ایڈم نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ ”شکر ہے تم نہیں گئیں اور شکر ہے تم مجھ سے ناراض نہیں ہو۔“

”میں تو ناراض نہیں ہوں لیکن ایڈم... تم سمجھتے ہو کہ مردوں کو ایسی باتوں پر غصہ آتا ہے۔“

”میں وعدہ کرچکا ہوں کہ اب یہاں غیر مرئی حالت میں نہیں رہوں گا۔“

”نہیں، اسے تمہاری موجودگی پر اعتراض ہے۔“

ایڈم کی آنکھیں ایک لمحے کو دہک اٹھی تھیں اس نے غرا کر کہا۔ ”وہ اعتراض نہیں کرسکتا، یہ میرا گھر ہے اور میرا یہاں سے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”نہیں... نہیں بات تمہارے جانے کی نہیں، اس گھر میں موجود رہنے کی ہے، وہ بھی نظروں کے سامنے... تم خود سوچو اگر تمہاری بیوی ہوتی تو کیا تم اپنے گھر میں کسی مرد کی موجودگی پسند کرتے؟“

ایڈم نے غور کیا اور نفی میں سر ہلایا۔ ”بالکل بھی نہیں۔“

”اسی طرح جان کو بھی پسند نہیں ہے۔“

”لیکن میں بھوت ہوں۔“

”ہاں، مگر ایک مردانہ بھوت ہو اور جان کا اعتراض اسی پر ہے۔“

وہ مرجھا گیا۔ ”تو تم کیا چاہتی ہو میں یہاں سے چلا جاؤں؟“

مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ وہ بتیس برس سے اکیلا تھا اور شاید اسے پہلی بار ایسے لوگ ملے تھے جن کے سامنے وہ آسکتا تھا۔ ”نہیں، تم یہاں سے نہیں جاؤ گے۔“ میں نے کہا۔ ”میرے ذہن میں ایک تجویز آرہی ہے اگر تم مانو تو؟“

”مجھے تمہاری ہر بات منظور ہوگی۔“

”دیکھو دن میں بے شک تم یہاں رہا کرو اور میرے ساتھ رہا کرو، میں تم سے گپ شپ کروں گی تو میرا وقت بھی اچھا گزرے گا لیکن جب جان آئے تو تم مکان کے باہر چلے جاؤ گے۔ جان کی موجودگی میں تم یہاں نہیں آؤ گے۔ اس طرح جان کو اعتراض بھی نہیں رہے گا اور تم یہیں رہو گے۔“

ایڈم کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ اسے یہ تجویز اچھی نہیں لگی ہے لیکن وہ میری خاطر مان گیا۔ اس نے کہا۔ ”میں بھی تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے یہاں سے جانے کو نہیں کہا۔“

”اگر میں تمہیں یہاں سے جانے کو کہتی تو...؟“

”تو میں چلا جاتا... میں تمہاری کوئی بات نہیں ٹال سکتا۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا اور کچن سے باہر چلا گیا۔ میں اس کی بات پر غور کرتی رہ گئی۔ اس دن میں نے لان کا بقیہ کام نمٹایا۔ ایڈم کو باغبانی آتی تھی، اس نے مجھے کئی مفید مشورے دیے اور جہاں تک ممکن ہوا میرا ہاتھ بھی بٹاتا رہا۔ بلکہ کئی بار تو اسے روکنا پڑا تھا۔ ایک بار بیلچہ خود بہ خود زمین کی گوڈی کررہا تھا اور سڑک سے گزرنے والی ایک بڑی بی نے یہ منظر دیکھا تو ان کی رفتار خاصی تیز ہوگئی۔ یقیناً ایڈم کا شہرہ آس پاس بھی تھا۔ جان آیا تو میں نے اسے بتایا کہ ایڈم

اب اس کی موجودگی میں گھر میں نہیں آئے گا۔ توقع کے عین مطابق اس کا ردعمل بھی ناپسندیدہ تھا۔ ”وہ یہاں رہے گا تو؟“

”ہاں مگر گھر سے باہر۔“

”اور جب میں نہیں ہوں گا تو وہ یہاں تمہارے ساتھ ہوگا۔“ جان کے لہجے میں حسد آگئی۔

مجھے غصہ آگیا۔ ”خدا کے لیے جان... وہ ایک بھوت ہے۔ وہ مجھے چھو بھی نہیں سکتا اور اگر وہ کوئی بھوت نہیں ہوتا تب بھی کیا تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے؟“

جان شرمندہ ہوگیا۔ ”یہ بات نہیں ہے جان۔“ اس نے مجھے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ ”تم جانتی ہو میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں اور تمہارے معاملے میں کتنا حساس ہوں۔“

”میں جانتی ہوں لیکن یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے جسے ہم صرف اپنی مرضی سے حل کرسکیں۔“

جان نے سرد آہ بھری۔ ”گویا ہمیں ساری عمر اس بھوت کے ساتھ رہنا ہوگا۔“

”تم اسے منفی معنوں میں مت لو۔ اسی کی وجہ سے یہ مکان اتنا سستا مل گیا۔ اگر ایڈم یہاں نہ ہوتا اس حالت میں بھی یہ سوا لاکھ ڈالرز سے کم کا نہیں تھا۔“

جان نے مجھ سے اتفاق کیا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اوہ ہاں...... لان تم نے ٹھیک کیا ہے؟“

”ہاں، میں سوچ رہی ہوں اب یہاں کے لیے گھاس اور پودے لے آؤں۔ اس اتوار کو تم درختوں کی اوپری شاخیں صاف کردینا۔ میں نے نیچے سے صفائی کردی ہے۔“

”اس ویک اینڈز پر یہ کام نمٹادیں گے۔“

میں خوش ہوگئی کہ بادل ناخواستہ ہی سہی لیکن دونوں حضرات نے میری بات مان لی تھی۔ اب ایڈم دن میں میرے ساتھ ہوتا تھا۔ البتہ وہ میرے معمولات میں حائل نہیں ہوتا تھا اور جب میں بیڈروم میں جاتی تو وہ وہاں آنے سے گریز کرتا تھا۔ ہفتہ اور اتوار کو میں نے جان کے ساتھ مل کر دونوں لان درست کیے۔ درخت کی کٹنگ کرکے ان کو شیپ میں لائے۔ پھر نزدیکی نرسری سے اچھی قسم کی گھاس اور پودے لاکر لگائے۔ ابھی سردی کا آغاز نہیں ہوا تھا اس لیے مجھے امید تھی کہ گھاس اور پودے اچھی طرح جڑ پکڑ لیں گے۔ ساؤتھ ڈکوٹا میں موسم اکتوبر کے آخر تک خاصا سرد ہو جاتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو برف بھی گرتی تھی اور ابھی ستمبر کا آخر تھا اس لیے موسم اتنا سرد نہیں ہوا تھا۔

آگے اور پیچھے کے لان کے کاموں میں ایڈم نے بھی چوری چھپے میرا ہاتھ بٹایا تھا، اسے معلوم تھا کہ اعلانیہ وہ کچھ کرے گا تو جان کو یہ بات ناپسند ہوگی۔ اس نے میرے بہت سے کام جو سخت تھے اس طرح کردیے کہ جان کو پتا بھی نہیں چلا۔ وہ چپکے سے گھاس اور پودوں کو لگانے کے لیے زمین کھود دیتا تھا۔ جان حیران تھا کہ میں نے اتنی جلدی گھاس اور پودے لگانے کا کام کرلیا تھا۔ برسوں سے زمین استعمال نہ ہونے کی وجہ سے زرخیز تھی اور گھاس پودوں نے چند دن میں جڑ پکڑلی۔ اکتوبر کے وسط تک دونوں لان گھاس سے ڈھک گئے تھے اور پودے بھی اتنے بڑے ہوگئے تھے کہ آنے والے سرما کو برداشت کرسکیں۔ جان نے پورے گھر پر نیا خوب صورت ایپل وائٹ پینٹ کردیا تھا۔ ترچھی چھتوں پر سی گرین پینٹ تھا۔ ساتھ ہی اس نے ڈرائیووے کی ٹوٹ جانے والی اینٹوں کی مرمت بھی کردی تھی۔ دو مہینے میں مکان کی حالت بالکل بدل گئی تھی اور اسے دیکھ کر خود مجھے بھی یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی گھر تھا جسے دیکھ کر مجھے وحشت ہوئی تھی اور اب یہ میرے خوابوں کے گھر میں بدل چکا تھا۔

اس دوران میں ایڈم اپنے عہد پر قائم رہا۔ وہ صرف جان کی غیر موجودگی میں گھر میں آتا تھا اور اس کے آتے ہی باہر چلا جاتا تھا۔ چھٹی والے دن وہ اندر نہیں آتا تھا لیکن جب ہم لان پر نکلتے تو وہ آس پاس غیر مرئی حالت میں موجود ہوتا تھا۔ عجیب بات تھی، میں اس کی موجودگی محسوس کرلیتی تھی جبکہ جان کو نہیں پتا چلتا تھا۔ اگر جان بے تکلف ہونے لگتا تو میں چپکے سے ایڈم کو وہاں سے جانے کا اشارہ کرتی اور وہ چلا جاتا تھا۔ اس دوران میں ہماری آس پاس کی کئی فیملیوں سے ہیلو ہائے ہوگئی تھی۔ ان میں سے کئی ہمارے گھر آچکے تھے اور تقریباً سب نے بتایا کہ گزشتہ تین دہائیوں میں سکون سے رہنے والے ہم واحد لوگ تھے۔ سامنے رہنے والے سابق آرمی میجر ہیروٹ نے کہا۔ ”یہ گھر آسیب زدہ ہے۔“

”لیکن ہمیں تو کسی آسیب سے واسطہ نہیں پڑا۔“ میں نے صفائی سے انکار کردیا اور تصدیق کے لیے جان کی طرف دیکھا اس نے جلدی سے کہا۔

”بالکل... ہمیں نہ تو کوئی چیز دکھائی دی اور نہ ہی کبھی خوف محسوس ہوا۔“

”جان کام پر جاتا ہے تو میں اکیلی ہوتی ہوں اور بہت مزے سے ہوتی ہوں۔“

سردیوں کے آغاز تک میری کئی پڑوسنوں سے اتنی اچھی دوستی ہوگئی تھی کہ روز کسی نہ کسی سے ملاقات اور گپ شپ ہوتی تھی۔ میرا وقت اچھا گزر جاتا تھا۔ قسط کی رقم اور

آنے جانے کے خرچے سے جان چھوٹی تو جان کی کم تنخواہ بھی ہمارے گزارے کے لیے کافی ہونے لگی تھی۔ نومبر کے آغاز میں ہم نے گھر کی خوشی میں دعوت کی جس میں پڑوسیوں کے ساتھ اپنے سابق پڑوسیوں کو بھی مدعو کیا اور ان سب نے متفقہ فیصلہ دیا کہ یہ گھر ہمارے سابق گھر سے بہت اچھا تھا۔ اس روز جان بہت خوش تھا کیونکہ خراب اقتصادی حالات نے اس کے کئی جاننے والوں اور دوستوں کو اتنے برے حالوں میں پہنچا دیا تھا کہ وہ اپنے گھروں اور گاڑیوں سے محروم ہو گئے تھے جبکہ ہمارے پاس ایک خوب صورت گھر تھا اور گاڑی بھی موجود تھی۔ اس کے علاوہ جان کے پاس ملازمت بھی تھی۔ کرسمس اچھا گزرا۔ میں نے ایڈم کی مدد سے پورا گھر سجایا تھا۔ جان نے کیک کاٹنے اور ڈنر کے موقع پر اس کی موجودگی گوارہ کر لی تھی۔ ایڈم اس پر خوش تھا۔ وہ بے چارہ کچھ کھا پی نہیں سکتا تھا۔ وہ انسانی ضرورتوں سے بے نیاز ہو گیا تھا لیکن ہمارے ساتھ اس نے بھی کرسمس سے لطف اٹھایا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے مشکل وقت گزر گیا تھا۔

مگر نئے سال کا آغاز اچھا نہیں تھا۔ جان جس ورکشاپ میں کام کرتا تھا وہاں اس کا باس سے کچھ جھگڑا ہوا اور اس نے جان کو ملازمت سے نکال دیا۔ ان دنوں اس کا موڈ خراب تھا، اب وہ زیادہ پینے لگا تھا۔ اکثر کام پر بھی دیر سے جاتا تھا۔ میں پینے سے روکتی تو لڑنے لگتا۔ مجھے اسی بات کا خطرہ تھا کہ اسے ملازمت سے جواب نہ مل جائے۔ میرا خدشہ درست ثابت ہوا تھا اور جان کی ملازمت ختم ہو گئی۔ اس کے بعد وہ نئی ملازمت تلاش کرنے کے بجائے گھر میں بیٹھ گیا اور اس کا بیشتر وقت پینے یا نشے میں دھت ہو کر سونے میں گزرتا تھا۔ میں اسے سمجھاتی کہ ایک ملازمت ختم ہونے کا مطلب دنیا ختم ہونا نہیں تھا۔ وہ نئے سرے سے کوشش کر سکتا تھا، اس طرح گھر بیٹھ جانے سے مسئلے حل نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ ہنرمند تھا، اسے کہیں نہ کہیں ملازمت مل جاتی مگر جان کچھ سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

دراصل اس گھر میں ایڈم کی موجودگی کے انکشاف کے بعد سے ہی جان کا موڈ ٹھیک نہیں تھا۔ وہ اکثر غصے میں ہوتا اور ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ جب تک گھر کے کاموں اور جاب کی مصروفیات تھیں وہ پھر بھی ٹھیک تھا اگر کبھی غصہ کرتا تو فوراً پیار سے بھی پیش آ جاتا تھا لیکن جاب چھوٹنے کے بعد وہ فارغ تھا اور اس کا رویہ ہر گزرتے دن خراب ہوتا جا رہا تھا۔ ظاہر ہے گھر میں، میں ہی تھی جس پر اس کا غصہ اتر سکتا تھا۔ وہ عام طور سے ناشتے کی میز پر بوتل لے کر بیٹھ جاتا اور کھانے کی جگہ بھی شراب پیتا تھا۔ آمدنی نہیں تھی اور اخراجات برقرار تھے اس لیے جو جمع پونجی تھی وہ بھی رفتہ رفتہ ختم ہونے لگی۔ میں جان کی توجہ اس طرف کراتے ہوئے ڈر رہی تھی کہ کہیں اس بات پر بھی جھگڑا نہ ہو جائے۔ مگر اسے بتانا تو تھا۔ مکان سے جو ملا تھا وہ اس مکان پر لگ گیا تھا اور اب گزارہ جان کی تنخواہ سے تھا۔ وہ بند ہوئی تو فروری کے آخر تک بینک اکاؤنٹ میں بس چند سو ڈالرز رہ گئے تھے۔ بجلی اور دوسرے بل ادا کرنے تھے۔ کھانے پینے کے اخراجات الگ تھے۔ پھر جان کی شراب کا خرچ بھی بڑھ گیا تھا۔ اس صبح بھی اس نے ناشتے کی میز پر بوتل کھولی تو میرا کئی ہفتوں سے دبا ہوا غصہ ابھر آیا اور میں نے اس سے بوتل چھین کر بند کر دی۔ جان نے مجھے گھورا۔ ”یہ کیا حرکت ہے؟“

”سنو جان... گھر میں رقم ختم ہو چکی ہے۔“

”تو میں کیا کروں۔“ اس نے بے پروائی سے کہا اور بوتل اٹھا لی۔

”تمہیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا۔“ میں نے دوبارہ بوتل چھین لی۔ ”اس طرح کب تک گزارہ ہوگا؟“

”میں نہیں جانتا۔“ اس نے بوتل لینے کی کوشش کی تو میں نے بوتل پیچھے کر لی۔ وہ بے قابو ہو کر زبردستی پر اتر آیا لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے بوتل نہیں دوں گی۔ میں نے اسے سنک میں پٹخ کر توڑ دیا۔ جان کے منہ سے ایک گندی گالی نکلی اور اس نے مجھے تھپڑ مارا۔ یہ ہماری ازدواجی زندگی کا پہلا تھپڑ تھا جو مجھے لگا۔ میرا منہ گھوم گیا اور بے ساختہ چیخ نکلی۔ جان نے دوسرا تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اوپر کیا تو اس کا ہاتھ رک گیا۔ میں سمجھی کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے لیکن جب اس نے زور لگانے کے ساتھ ایڈم کو گالی دی تب مجھے پتا چلا اس کا ہاتھ ایڈم نے روک لیا تھا۔ جان نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے چلا کر کہا۔ ”چھوڑو میرا ہاتھ...“

ایڈم نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور خود سامنے آ گیا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں میری پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔“

جان آپے سے باہر ہو گیا۔ ”تم کون ہوتے ہو میرے گھر میں مجھ پر حکم چلانے والے۔ یہ میری بیوی ہے۔“

”لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم اس پر تشدد کرو۔“ ایڈم نے غصے سے کہا تو اس کا چہرہ تانبے جیسا سرخ ہو گیا اور وہ خوفناک لگنے لگا۔ میں ڈر گئی لیکن جان ویسا ہی تن کر کھڑا ہوا تھا۔

”یہ میری بیوی ہے میں اس کے ساتھ جو چاہے...“ جان کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ وہ اڑتا ہوا لاؤنج میں جا گرا تھا۔ ایسا لگا کسی نے اسے اٹھا کر پھینک دیا ہو۔ ایڈم اپنی جگہ موجود تھا۔ لکڑی کے فرش پر جان کے گرنے سے دھماکا ہوا اور اسے یقیناً چوٹ لگی تھی۔ ایڈم اسے خوفناک نظروں سے گھور رہا تھا اور اس کا ارادہ جان کو مزید سزا دینے کا تھا کیونکہ وہ گرا اور دوبارہ ہوا میں معلق ہو گیا۔ ایڈم اسے پھر پٹخنے جا رہا تھا۔

”ایڈم!“ میں بے ساختہ چلائی۔ ”پلیز نہیں...“

ایڈم نے میری طرف دیکھا تو اس کا چہرہ نارمل ہو گیا اور جان دھپ سے اسی جگہ گر گیا، وہ کراہ رہا تھا۔ ایڈم نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اسے سمجھا دینا اب اس نے تمہیں ہاتھ لگایا تو میں اسے جان سے مار دوں گا۔“

ایڈم باہر چلا گیا تو میں نے جان کو اٹھایا۔ دو بار گرنے سے اسے خاصی چوٹ آئی تھی اور اس کے کس بل نکل گئے تھے۔ میں اسے بیڈروم میں لے آئی۔ اگرچہ مجھے غصہ آ رہا تھا مگر ابھی اسے میری مدد کی ضرورت تھی۔ کچھ دیر بعد اس کی حالت بہتر ہونے لگی اور چہرے پر ندامت کے تاثرات نمودار ہوئے۔ مجھے معلوم تھا اب وہ مجھ سے معافی طلب کرے گا لیکن میں اسے اتنی آسانی سے معاف کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ میں نے اٹھ کر بیگ نکالا اور اپنے کپڑے اس میں رکھنے لگی۔ جان جلدی سے اٹھ کر آیا اور بیگ بند کر دیا۔ ”یہ کیا کر رہی ہو؟“

”میں اس گھر سے جا رہی ہوں جو صرف تمہارا ہے اور میرا کوئی اختیار نہیں ہے۔“

”میری، آئی ایم رئیلی سوری۔“

”سوری۔“ میں نے طنز کیا۔ ”اس سوری کا کیا فائدہ جب تم کرو گے وہی جو تمہارے دل میں ہے۔“

”نہیں، میں وعدہ کرتا ہوں میں جاب تلاش کروں گا۔ اب میں وقت ضائع نہیں کروں گا لیکن اب میں اس بھوت کا کوئی علاج کر کے رہوں گا اس نے تمہارے اور میرے معاملے میں دخل کیسے دیا۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ ابھی تمہارے دل کی حسرت نکلی نہیں۔“ میں نے دوبارہ بیگ کھول لیا۔ ”تمہیں اس تھپڑ کا افسوس ہو رہا ہے جو تم میرے منہ پر رسید نہیں کر سکے تھے؟“

”ارے نہیں۔“ جان نے بوکھلا کر کہا۔ ”مجھے تو پہلے تھپڑ کا بھی افسوس ہے۔ میرا مطلب ہے اسے میرے اور تمہارے درمیان میں نہیں آنا چاہیے تھا اس نے مجھے روک کر ٹھیک کیا لیکن اسے مجھے دھمکانا نہیں چاہیے تھا۔“

”وہ ایک مرد کا بھوت ہے اور یقیناً اسے خاصا غصہ آتا ہوگا۔“ میں نے طنز کیا۔ مگر جان اب بالکل پسیج گیا تھا اور اس پر میرے طنز کا اثر نہیں ہوا۔ اس نے منت سماجت کر کے اور کچھ مردوں کے مخصوص انداز سے بالآخر مجھے منا لیا تھا۔ میں کون سا سچ مچ جا رہی تھی۔ یہاں سے نکل کر میں کہاں جاتی۔ دنیا میں صرف باپ تھا جو کیلیفورنیا میں تھا اور خود ایک اولڈ ہاؤس میں رہ رہا تھا۔ بہرحال اس ڈبل ڈوز کے بعد جان کی حالت میں خاصی بہتری آئی تھی اور اس نے اگلے دن سے نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ وہ صبح سے دوپہر تک انٹرنیٹ پر ملازمتوں کے اشتہار دیکھ کر سی ویز بھیجتا رہا تھا۔ اس دوران میں، میں نے باہر جا کر ایڈم سے بات کی۔ باہر وہ غیر مرئی حالت میں رہتا تھا کیونکہ ظاہر ہوتا تو سب کو ہی نظر آتا۔ میں نے اس سے شکوہ کیا۔

”تم نے جان کے ساتھ کچھ زیادہ ہی سخت سلوک کر دیا۔“

”مجھے افسوس ہے لیکن اس وقت مجھے غصہ آ گیا تھا اور میں زیادہ ہی ردعمل دکھا گیا۔ اگر تم کہو تو میں اس سے معافی مانگ لیتا ہوں۔“

”نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ جان بھی شرمندہ تھا اس نے مجھ سے سوری کر لی ہے اور ملازمت کی تلاش کر رہا ہے۔“

”کیا میں اس معاملے میں اس کی مدد کر سکتا ہوں؟“

”نہیں، یہ دنیا کے معاملات ہیں اور تم اب ان میں دخل نہیں دے سکتے۔“

”یہ تو ہے۔“ اس نے سرد آہ بھری۔ ”میں اس دنیا میں تو ہوں لیکن اس دنیا سے میرا تعلق ختم ہو گیا ہے مگر اس گھر کی حد تک میں خود مختار ہوں، یہاں میں سب کر سکتا ہوں۔“

پہلے میں بھوتوں پر یقین نہیں رکھتی تھی لیکن ایڈم سے تعلق کے بعد یقین نہ کرنے کا سوال ہی ختم ہو گیا تھا بلکہ مجھے بھوتوں سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔ ”کیا میں بھوتوں کے بارے میں کچھ پوچھ سکتی ہوں؟“

”کیوں نہیں تم مجھ سے ہر بات پوچھ سکتی ہو۔“

”انسان مرنے کے بعد بھوت کیسے بنتا ہے اور کیا ہر شخص بھوت بن جاتا ہے؟“

”انسان مرنے کے بعد بھوت کیسے بنتا ہے یہ تو میں بھی نہیں جانتا البتہ یہ معلوم ہے کہ ہر شخص بھوت نہیں بنتا۔ میں اب تک جتنے بھوتوں سے ملا ہوں ان سب کی موت کسی نہ کسی حادثے یا غیر فطری طریقے سے ہوئی اور اب وہ بھوت ہیں۔“ ایڈم نے وضاحت کی۔ ”میرا خیال

ہے غیر فطری موت ہی کسی انسان کے بھوت بننے کی وجہ ہوتی ہے۔"

"کیا تم لوگ ہمیشہ دنیا میں رہتے ہو۔ میرا تو خیال ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی روح کہیں اور چلی جاتی ہے۔"

"بالکل چلی جاتی ہے لیکن بعض روحیں اسی دنیا میں رہ جاتی ہیں۔ میں ان میں سے ایک ہوں۔ ممکن ہے کچھ عرصے بعد مجھے یہاں سے جانے کی اجازت مل جائے یا ممکن ہے میں ہمیشہ یہیں رہوں۔"

"ہوسکتا ہے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ یہ خیال کچھ اچھا نہیں تھا کہ ایک بھوت ساری عمر اس گھر میں رہے چاہے وہ ایڈم جیسا دوستانہ رویہ رکھنے والا بھوت ہی کیوں نہ ہو۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ جب تک ہم یہاں تھے اس کے ساتھ رہنے پر مجبور ہوتے کیونکہ اسے تو ہمارے بعد بھی اس گھر میں رہنا تھا۔ "بہرحال اب تم کوشش کرنا کہ جان سے سامنا نہ ہو اور ہمارے کسی معاملے میں دخل مت دو۔"

اس نے میری یہ بات ماننے سے انکار کر دیا۔ "اگر تمہیں کوئی نقصان ہونے لگا تو میں دخل ضرور دوں گا۔"

میں نے اسے سمجھایا۔ "تمہارے دخل دینے سے مجھے کوئی بڑا نقصان بھی ہوسکتا ہے اس لیے میری بات مان لو، آئندہ دخل اندازی مت کرنا۔"

ایڈم نے سوچ کر کہا۔ "ٹھیک ہے لیکن تم وعدہ کرو اگر تمہیں میری مدد کی ضرورت محسوس ہوئی تو تم مجھے ضرور بلاؤ گی؟"

"مجھے منظور ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ یہی غنیمت تھا کہ وہ دخل اندازی نہ کرنے کا وعدہ کر رہا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر اسے جان سے معافی مانگنے سے روکا تھا میں چاہتی تھی کہ جان پر اس کا خوف برقرار رہے اور وہ دوبارہ پٹڑی سے اترنے سے گریز کرے۔ فی الحال اس نے رویہ بدلنے کا وعدہ کیا تھا لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ اپنے وعدے پر قائم رہتا ہے یا نہیں۔ اس گھر میں آنے اور ایڈم کی موجودگی کی وجہ سے جان میں تبدیلیاں آئی تھیں۔ جاب کی وجہ سے وہ پہلے ہی پریشان تھا۔ اوپر سے دوسری نوکری سے بھی جواب مل گیا۔ میں اس کی ذہنی کیفیت سمجھ رہی تھی اس لیے میں نے اس کے درشت رویے کا دل سے برا بھی نہیں منایا تھا۔ ممکن ہے اگر یہاں ایڈم نہ ہوتا تو شاید جان کا رویہ اتنا خراب اور بے پروانہ ہوتا۔

جان نے ملازمت کے لیے دوبارہ کوشش شروع کر دی مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ ملازمت مل کر نہیں دے رہی تھی۔ اگر وہ دس جگہ درخواست بھیج رہا تھا تو صرف دو جگہوں سے انٹرویو کال آ رہی تھی اور وہاں سے بھی بعد میں کوئی جواب نہیں آتا تھا۔ فروری کے وسط تک حالت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ جان اپنی گاڑی فروخت کرنے پر مجبور ہوگیا۔ اس نے دو سال پہلے ہی یہ فورڈ وین چوبیس ہزار ڈالرز کی لی تھی اور اب بیچی تو صرف پندرہ کی گئی۔ اسے بیچ کر ہم نے گزارے کے لیے ایک پرانی لیکن چلتی کار لے لی۔ بل ادا کیے اور گھر میں راشن ڈلوایا تھا۔ سردیوں میں بلز بھی زیادہ آتے ہیں، میں نے احتیاطاً دو مہینے کا راشن ڈلوا لیا تھا کیونکہ اب تک ایسے آثار نظر نہیں آئے تھے کہ جلد جان کو جاب مل جائے گی۔

جان ہر دوسرے تیسرے دن جاتا تھا لیکن واپسی پر اس کا منہ لٹکا ہوا ہوتا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ انٹرویو اور جاب کی تلاش میں ہی جاتا تھا کیونکہ جب وہ واپس آتا تو اس کے پاس سے نت نئی اقسام کی شراب کی بو آ رہی ہوتی تھی اور یہ بو بتاتی تھی کہ وہ کسی بار میں بھی جاتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ مجھے انٹرویو کا کہہ کر جاتا ہو لیکن کسی بار میں جا کر وقت گزاری کرتا ہو۔ مارچ میں موسم بدلنے لگا تھا۔ اگرچہ تازہ برف باری بھی ہوئی تھی لیکن سردی کی شدت میں نمایاں کمی آ گئی تھی۔ مارچ کے آخر تک ہم دوبارہ فاقوں کے خطرے سے دوچار ہو چکے تھے کیونکہ میرے پاس صرف پندرہ سو ڈالرز بچے تھے۔ ان سے زیادہ سے زیادہ ایک مہینا گزارا جا سکتا تھا۔ ایک دن میں اور جان بیٹھے یہی فکر کر رہے تھے کہ اب کیا ہوگا کہ جان نے کچھ سوچ کر کہا۔

"میری مجھے لگ رہا ہے ہمیں یہ مکان بیچنا پڑے گا۔"

میں چونک اٹھی۔ "بیچنا پڑے گا... پھر ہم کہاں جائیں گے؟"

"ہم کوئی چھوٹا اپارٹمنٹ لے لیں گے، دو تین کمروں کا اور اس مکان کی فروخت سے جو رقم ملے گی اس سے میں اپنا ورک شاپ کھول لوں گا۔ میں اب نوکری نہیں کر سکتا۔"

میں ہراساں ہو گئی۔ "کیا ہمیں اس مکان کی فروخت سے اتنی رقم مل جائے گی؟"

"ہاں، میں نے اسمتھ سے بات کی ہے اس کا کہنا ہے کہ وہ اس مکان کے ہمیں دو لاکھ ڈالرز تک دلا سکتا ہے۔"

گویا جان پہلے ہی اسمتھ سے بات کر چکا تھا۔ کہاں تو میرا اس مکان کو لینے کو دل نہیں کر رہا تھا اور کہاں اب جان نے اسے بیچنے کی بات کی تو میرا دل دکھنے لگا تھا۔ اس گھر میں میرا دل لگ گیا تھا... میں نے اسے شوق سے سجایا

تھا۔ اب میں یہاں رہنا چاہتی تھی تو جان کہہ رہا تھا کہ ہم اسے فروخت کر دیں۔ مجھے ایڈم کا خیال بھی آیا کہ جب اسے پتا چلے گا کہ ہم یہاں سے جانے کا سوچ رہے ہیں تو اس پر کیا گزرے گی۔ اگلے دن جان سو رہا تھا میں نیچے آئی اور ناشتے کی تیاری کرنے لگی۔ ایڈم اچانک ہی سامنے نمودار ہوا تو میں چونک گئی گویا وہ پہلے سے یہاں موجود تھا۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے سن گن مل گئی ہے۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے اس نے سر ہلایا۔ "مجھے معلوم ہے جان یہ مکان بیچنا چاہتا ہے۔"

مجھے غصہ آیا تھا۔ "یعنی تم چھپ کر ہماری باتیں سنتے ہو۔"

وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "اگر نہ سنتا تو مجھے کیسے پتا چلتا کہ جان کیا منصوبہ بنا رہا ہے۔"

"یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے تم نے وعدہ کیا تھا کہ جان کے ہوتے ہوئے گھر میں نہیں آؤ گے اور نہ کبھی غائب ہو کر ہماری باتیں سنو گے۔"

"ٹھیک ہے، میں نے کہا تھا۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "لیکن ایک بات یاد رکھو میں تمہیں یہاں سے جانے نہیں دوں گا۔"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا، کیا تم مجھ پر مسلط ہونا چاہتے ہو اور تمہارا کیا اختیار ہے؟"

وہ سنجیدہ ہو رہا تھا۔ "میں نے تمہیں خبردار کر دیا ہے۔"

وہ جانے لگا تھا کہ میں نے اسے روکا۔ "ایک منٹ ...... یہ تم کس طرح بات کر رہے ہو۔ تمہارا مجھ پر کوئی حق نہیں ہے کہ تم مجھے روک سکو۔ دوسرے یہ کہ ہم مکان مجبوری میں فروخت کر رہے ہیں تاکہ جان اپنا کام کر سکے اور ہم کوئی چھوٹا مکان لے کر رہ سکیں۔"

"جان کو جاب مل سکتی ہے اگر وہ ٹھیک سے کوشش کرے لیکن وہ کوشش ہی نہیں کر رہا ہے۔" ایڈم نے منہ بنایا۔ "اب وہ مکان بیچنے کی بات کر رہا ہے۔ اسے بتا دینا، میری مرضی کے بغیر یہ مکان نہیں بکے گا اور نہ ہی تم دونوں یہاں سے جا سکو گے۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ "تم چاہتے ہو ہم یہاں سے نہ جائیں مگر تم بھول رہے ہو یہ ہماری مجبوری ہے۔"

اس پر وہ کچھ ٹھنڈا ہوا تھا۔ "ٹھیک ہے تم مجبور ہو، تمہیں رقم کی ضرورت ہے لیکن اس کے لیے یہاں سے جانا ضروری نہیں ہے تم کوئی اور طریقہ بھی اختیار کر سکتے ہو۔"

میں نے سوچ کر کہا۔ "کاش کہ جان کو کوئی جاب مل جائے پھر ہم مجبور نہیں ہوں گے یہاں سے جانے پر۔"

"افسوس کہ اس مکان سے باہر میں انسانوں کے معاملے میں اس طرح سے دخل نہیں دے سکتا ورنہ جان کو کہیں نہ کہیں نوکری دلا دیتا۔"

"میں سمجھتی ہوں۔" میں نے سرد آہ بھری۔ "اگر تمہارے بس میں ہوتا تو تم ضرور ہماری مدد کرتے۔"

ایڈم سوچ میں پڑ گیا، اچانک اس نے پرجوش انداز میں کہا۔ "لیکن میں ایک طرح سے تمہاری مدد ضرور کر سکتا ہوں۔"

"وہ کیسے؟"

"تم یہ مکان فروخت کر دو۔ میں دوبارہ اسے آدھی قیمت پر تمہیں واپس دلا دوں گا۔"

مجھے اس کی بات سمجھنے میں ذرا دشواری پیش آئی تھی۔

"تمہارا مطلب ہے تم خریدنے والے کو ڈراؤ گے اور اسے اتنا مجبور کر دو گے کہ وہ یہ مکان فروخت کر کے یہاں سے جانے پر مجبور ہو جائے؟"

"بالکل... میرے لیے یہ بہت آسان ہے، یوں سمجھ لو کہ یہ میری جاب ہے۔"

میں نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے، میں جان سے مشورہ کر کے تمہیں بتاتی ہوں۔"

"مجھے یقین ہے وہ مان جائے گا۔" ایڈم نے یقین سے کہا۔ "دیکھو اگر یہ مکان بک کر تمہارے پاس واپس آ جائے اور تمہیں لاکھ ڈالرز کا فائدہ ہو جائے تو یہ ایک سال کے لیے کافی ہوگا۔ ایک سال بعد دوبارہ فروخت کر دینا۔"

میں نے جان کے سامنے تجویز رکھی لیکن ایڈم کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس نے غور کیا اور پوچھا۔ "میری، کیا یہ سچ مچ تمہاری تجویز ہے؟"

میں ہچکچائی پھر بولی۔ "وہ اصل میں یہ تجویز ایڈم کی ہے، وہ نہیں چاہتا کہ..."

"کہ ہم یہاں سے جائیں۔" جان نے طنز کیا۔ "وہ بہرصورت تمہیں یہاں دیکھنا چاہتا ہے۔"

میں تنک گئی۔ "آخر اس میں حرج ہی کیا ہے، تم بھی تو یہی چاہتے ہو نا؟"

جان سوچ میں پڑ گیا۔ "ہاں یہ تو ہے۔ لیکن دوبارہ خریدنے کا نہیں سوچا تھا۔"

"دیکھو اگر ہم اسے دو لاکھ میں بیچ کر ایک لاکھ میں واپس لے لیں تو اس میں ہمارا ہی فائدہ ہے، ہمیں مکان بھی مل جائے گا اور رقم بھی۔ کچھ عرصے بعد ہم یہی کوشش دوبارہ کر سکتے ہیں۔" کہتے ہوئے مجھے ایک خیال آیا۔ "سنو اگر ہم سامان سمیت فروخت کر دیں تو ہمیں قیمت بھی زیادہ مل

جائے گی دوسرے ہمیں سامان کی بار برداری سے بھی نجات مل جائے گی۔ دوسری صورت میں ہمیں مکان سے سامان لے جانا اور پھر لانا بھی پڑے گا اور دونوں صورتوں میں سامان اور ہمارا کچومر نکل جائے گا۔"

تجویز جان کو مناسب لگی تھی۔ کچھ غور کے بعد اس نے اسے منظور کرلیا اور اسی وقت اسمتھ کو کال کردی کہ وہ مکان کے لیے کوئی مناسب گاہک تلاش کرے۔ جان نے قیمت ڈھائی لاکھ ڈالرز رکھی تھی کیونکہ اس میں سامان بھی شامل تھا۔ اگلے روز میں نے ایڈم کو بتایا تو وہ بھی خوش نظر آنے لگا۔ اس نے کہا۔ "تم دیکھنا میں آنے والوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہوں۔ وہ دو تین دن میں یہاں سے بھاگ نکلیں گے۔ ایک دو ہفتے بعد تم اپنا مکان واپس خرید سکتے ہو۔"

میں نے جلدی سے کہا۔ "نہیں، اتنی عجلت کی ضرورت نہیں ہے کچھ عرصے ان کو ضرور رہنے دینا ورنہ مکان کی شہرت خراب ہوجائے گی اور آئندہ اس کا گاہک نہیں ملے گا۔"

"چلو ٹھیک ہے لیکن میں انہیں ایک مہینے سے زیادہ نہیں رکنے دوں گا۔" ایڈم نے وارننگ دینے کے انداز میں کہا۔ صاف ظاہر تھا وہ ہم سے بلکہ مجھ سے اس سے زیادہ دوری برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ مکان کو فروخت کرنے کی پلاننگ کے ساتھ ہی ہم نے اس کے کسی قدر خراب ہوجانے والے حصوں کی صفائی اور مرمت کا کام شروع کردیا۔ اپریل کے آغاز میں برف پگھل جانے کے بعد پودوں اور درختوں نے نئے پتوں کا لباس پہن لیا تھا اور گھاس پھر سے خوش رنگ ہوگئی تھی۔ معمولی سے رنگ و روغن اور مرمت کے بعد مکان یوں جگمگانے لگا جیسے ابھی تیار ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسمتھ پہلا گاہک لے آیا۔ یہ چار آفت قسم کے بچوں والا جوڑا تھا۔ اگرچہ ان کے بچوں کو دیکھ کر مجھے اپنے مکان کی خوب صورتی خطرے میں نظر آنے لگی تھی لیکن یہ اس لحاظ سے اچھا بھی تھا کہ کسی بھوت کی موجودگی ثابت ہوتے ہی اس جوڑے کو اپنے بچوں کی سلامتی کی فکر لاحق ہوجاتی اور وہ اس مکان کو جلد از جلد چھوڑ جاتے۔ جوڑے کو مکان پسند آیا تھا کیونکہ اس میں بیسمنٹ بھی تھا اور تین بیڈ رومز تھے جبکہ نیچے ایک کمرے کو مزید بیڈ روم میں تبدیل کیا جاسکتا تھا۔ مگر ان کے خیال میں مکان کی قیمت زیادہ تھی۔ اگر اسمتھ اشارہ نہ کرتا تو جان جذباتی ہوکر قیمت میں کمی کا اقرار کرنے جارہا تھا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد اسمتھ نے کہا۔

"انہیں مکان پسند آگیا ہے تم لوگ ذرا صبر سے کام لو، یہ مکان لازمی خریدیں گے بس ذہنی طور پر تیار ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔"

عورت کے رویے سے مجھے بھی لگا تھا کہ اسے مکان پسند آگیا تھا کیونکہ اس میں استعمال ہونے والی چیزیں نئی لگی تھیں اور ہمارا فرنیچر اور سامان بھی بہترین حالت میں تھا اور اس کی مالیت کسی طرح چالیس پینتالیس ہزار ڈالرز سے کم نہیں تھی۔ ایک ہفتے بعد ہی اس جوڑے نے رضامندی ظاہر کردی تھی۔ وہ دو ہفتے بعد رقم ادا کرتے اور ہم سے مکان کی خرید کا معاہدہ کرلیتے۔ یہ طے ہوتے ہی جان گھر سے غائب رہنے لگا۔ وہ صبح جاتا اور شام کو واپس آتا تھا۔ میں پوچھتی تو یہی کہتا کہ وہ کوئی ٹھکانا تلاش کررہا ہے جہاں ہم آرام سے کچھ وقت گزار سکیں، جب تک نیا مالک تنگ آکر مکان دوبارہ فروخت پر آمادہ نہ ہوجائے۔ دو ہفتے بعد خریدار نے رقم کا ڈرافٹ ہمارے حوالے کیا اور ہم نے اس سے معاہدہ کرلیا۔ ہمیں دو دن کے اندر مکان اس کے حوالے کرنا تھا۔

اس دوران میں ایڈم اور جان میں کسی قدر دوستی ہوگئی تھی کیونکہ ہمیں مل کر کام کرنا تھا۔ فروخت کی کارروائی کے دوران ہی ایڈم دکھی نظر آنے لگا تھا۔ اس نے کئی بار اس عزم کا اعادہ کیا کہ ہم جلد از جلد اس گھر میں واپس آئیں گے۔ صاف ظاہر تھا وہ ابھی سے نئے مالکوں کو بے دخل کرنے کے خوفناک منصوبے بنا رہا تھا بلکہ اس کے انداز سے مجھے بعض اوقات یہ خطرہ محسوس ہونے لگتا تھا کہ اگر نئے مالک مکان نے مکان خالی اور فروخت کرنے میں ذرا تاخیر کی تو وہ ان کا مرڈر کرنے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ میں نے دعا کی کہ یہ معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹ جائے اور کسی کو نقصان نہ ہو۔ اس وقت میں یہ بھول گئی تھی کہ نئے خریدار کو لاکھ ڈالرز کا نقصان ہونے والا تھا اور ہم اس میں برابر کے شریک تھے۔ دو دن بعد ہم اپنا ذاتی سامان اور چیزیں سمیٹ کر گھر سے روانہ ہوئے تو ایڈم ڈرائیو وے میں موجود تھا۔ وہ اس وقت تک ہاتھ ہلاتا رہا جب تک وہ ہمیں نظر آتا رہا تھا۔ گاڑی گلی سے نکلی تو ایڈم بھی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ جان نے گہرا سانس لیا۔ "شکر ہے اس سے جان چھوٹی۔"

"کیا مطلب؟" میں نے حیرت سے کہا۔

جان نے صاف لفظوں میں جواب دیا۔ "مطلب یہ کہ میرا واپس اس مکان میں جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے جہاں ایک بھوت ہے اور بھوت بھی وہ جس کی تم پر نظر ہے۔"

"اگرچہ اس کی مجھ پر نظر ہے لیکن وہ مجھ سے کچھ مانگ تو نہیں رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ تم سے کچھ نہیں مانگ رہا ہے لیکن وہ ہماری ازدواجی زندگی میں دخیل ضرور ہوگیا ہے۔" جان کا لہجہ تلخ ہوگیا۔

"اس نے ہماری مدد بھی تو کی ہے۔" میں نے دلیل دی۔

"ہاں لیکن اپنے مفاد کے لیے۔" جان نے میری دلیل مسترد کردی۔ "وہ ہمیشہ تمہیں اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتا ہے اور یہ کسی صورت مجھے گوارہ نہیں ہے۔"

"اس نے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔" میرا لہجہ کمزور ہوگیا۔

جان نے گاڑی روک لی اور تلخ لہجے میں بولا۔ "کیا تم اس کا ایک مہینے پہلے والا رویہ بھول گئی ہو جب اس نے کچن میں تمہیں دھمکی دی تھی۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا میں نے تو بتایا نہیں کہ تم اس سے لڑنے کو تیار ہوجاتے۔"

"میں نے خود سنا تھا۔ میں کچن کی طرف آرہا تھا اسی وقت میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ ایک بار مکان بکا تو میں کسی صورت دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کروں گا۔"

"جان! ایڈم ایک شریف بھوت ہے اور پھر یہ دھوکا ہوگا۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ آئندہ بھی وہ اسی طرح شریف رہے گا۔ تم بھول رہی ہو وہ بھوت ہے اور اپنی من مانی پر اتر آیا تو ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے سوائے اس کے کہ وہ گھر چھوڑ کر چلے جائیں۔ جہاں تک دھوکے کا تعلق ہے تو اس نے خود ہمیں دھوکا دیا، تم سے وعدہ کیا اور چھپ کر ہماری باتیں سنتا رہا بلکہ ہماری تنہائی میں نہ جانے کتنا شامل ہوا ہوگا۔ اسی وجہ سے میں نے اسے ایسا کوئی تاثر نہیں دیا کہ ہم ہمیشہ کے لیے یہاں سے جارہے ہیں ورنہ امکان تھا وہ پیچھے چلا آتا۔"

"یہ خطرہ تو اب بھی ہے۔"

"نہیں، ابھی وہ مطمئن ہے کہ ہم اس کی بنائی ہوئی اسکیم پر عمل کررہے ہیں اور وہ ہمارے پیچھے نہیں آئے گا اس لیے ہم کہیں بھی جاکر چھپ سکتے ہیں۔"

"ہم کہاں جارہے ہیں؟" مجھے خیال آیا کیونکہ اب تک جان نے مجھے نہیں بتایا تھا کہ ہم کہاں جارہے ہیں۔

"ہم یہ شہر اور یہ ریاست چھوڑ کر جارہے ہیں۔" جان نے کہا۔ "میں نے ابھی فیصلہ نہیں کیا ہے کہ ہم کہاں جائیں گے، یہ فیصلہ ہم اس ریاست سے نکلنے کے بعد کریں گے۔ اگر تم راضی ہو تو ٹھیک ہے ورنہ ہم یہیں رہتے ہیں اور جب مکان کا خریدار اسے دوبارہ فروخت کرنے کا ارادہ کرے گا تب ہم خریدار بن جائیں گے۔ مگر اس کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ وہ مکان فروخت ہی کرے گا۔ ہوسکتا ہے وہ صرف خالی کرکے چلا جائے اور اگر وہ فروخت کرنے پر آمادہ ہو بھی گیا تو ممکن ہے وہ بھی ڈھائی لاکھ ڈالرز ہی مانگے۔ تب ہم کیا کریں گے؟ اس لیے اس مشکل میں پھنسنے سے بہتر ہے کہ ہم یہاں سے نکل جائیں اور کہیں اور جاکر اپنی دنیا بسائیں۔ ہمارے پاس اب ڈھائی لاکھ ڈالرز ہیں۔ اس سے میں اپنا کام کرسکتا ہوں اور زیادہ کما سکتا ہوں۔"

میں نے غور کیا اور خود کو جان سے متفق پایا۔ اس کی ہر دلیل میں وزن تھا۔ ایڈم کا رویہ میں دیکھ چکی تھی۔ وہ شریف تھا لیکن اس نے بھوت بن کر دھمکانے میں بھی زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ میں نے سر ہلایا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو ہم واپس جانے کا رسک نہیں لے سکتے لیکن بے چارہ ایڈم۔۔۔"

"تم اس کی فکر مت کرو۔" جان نے جلدی سے میری بات کاٹ کر کہا۔ "میرا خیال ہے وہ عاشق مزاج بھوت ہے اور نئے خریدار کی بیوی چار بچوں کی ماں بننے کے باوجود خاصی حسین اور اسمارٹ ہے۔ اس کا گزارا ہوجائے گا۔"

میں نے گھور کر جان کو دیکھا۔ "لگتا ہے تم اسے بڑے غور سے دیکھتے رہے تھے۔"

وہ ہنسا۔ "اب پتا چلا کہ کوئی آپ کے شریک حیات کو دیکھتا ہے اور اس میں دلچسپی لیتا ہے تو آدمی کے دل پر کیا گزرتی ہے۔"

میں جھینپ گئی پھر جان کے شانے پر سر رکھ لیا۔ "سوری ڈیئر، میں نے تمہارا بہت دل دکھایا۔ نہ جانے کیوں مجھے اس بھوت سے ہمدردی ہوگئی تھی۔"

"کیونکہ وہ خاصا خوش شکل اور اسمارٹ بھوت ہے۔" جان نے شرارت سے کہا تو میں نے کھسیا کر اس کے شانے پر مکا مارا۔ جان نے شانہ سہلایا۔ "تو اب کیا حکم ہے؟"

"ہم یہاں سے دور کہیں جارہے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "ہمیں کہاں ٹھکانا بنانا ہے؟ اس کا فیصلہ ریاست سے نکلنے کے بعد ہی کریں گے۔"

جان نے خوش ہوکر کار آگے بڑھادی تھی۔

شکستہ گڑیا

ایچ اقبال

کچھ لوگ شجر کے مانند مزاج رکھتے ہیں... زمین کے اوپر سایہ بن کر ٹھنڈک پہنچانا اور... زمین کے اندر دور تک اپنی جڑیں پھیلائے رہنا... جن پر سارے موسم اترتے ہیں مگر وہ کسی موسم کا تعاقب نہیں کرتے۔ جن کی ہریالی آنکھوں کو تازگی اور ویرانی دلوں میں درد جگاتی ہے مگر... ان کا دوسرا رخ... اپنی انا کے گنبد میں یوں قید رہنا کہ تنہائی میں اپنی ہی بازگشت سنتے رہنا، سلگتی یادوں سے اٹھتا دھواں کچھ تصویریں بناتا اور پھر مٹا دیتا... مگر آگہی کے اُس ایک لمحے نے جیسے اس کی ذات کے گرد حصار کو یوں توڑ ڈالا کہ اس کی ہر سمت رستے بکھر گئے۔ خوابوں کا تاج محل اگرچہ مسمار ہوا لیکن بنیادوں نے پھر سے تعمیر و تعبیر کی راہوں پر ڈال دیا۔ وہ جو ریت کے مانند بکھر گیا تھا، جذبات کے تلاطم نے وہ عزم عطا کیا کہ اس شمع کو محفل سے چرا کر اپنے گھر کا چراغ بنا لیا۔ یہ اور بات کہ کتنے ہی طوفان اور موسم آئے اور گزر گئے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کی بھیڑ میں اگر کسی کا دلبر کھو جائے تو روگ تمام عمر پیچھا نہیں چھوڑتے مگر... وہ نہ تو کوئی روگ پالنے کا قائل تھا اور نہ ہی کسی کو راہ میں حائل کرنے کا... پھر کیسے محبت اس کی طرف مائل نہ ہوتی۔

شکست و ریخت کی اذیتوں میں مبتلا دو حساس دلوں کی دھڑکنوں کا احوال

یاسمین اور عارف کی کاریں ایک ساتھ ہی شہر کے اس بڑے پارک تک پہنچیں جہاں لوگ تفریحاً یا جوگنگ کی غرض سے آیا کرتے تھے۔ عارف اور یاسمین کی بیشتر ملاقاتیں اسی پارک میں ہوا کرتی تھیں۔ گزشتہ دو برسوں میں وہ بہت کم کسی اور جگہ ملے تھے۔ یاسمین کی عمر اب ستائیس سال کے لگ بھگ تھی۔ عارف یقیناً تیس سال سے

زیادہ کا ہو چکا تھا۔ دو سال قبل ان کی ملاقات ایک کیفے میں ہوئی تھی۔ یاسمین نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ عارف کی شاعری بہت پسند کرتی تھی۔ دو سال قبل ہی عارف کا دوسرا مجموعۂ کلام بازار میں آیا تھا۔ یاسمین وہ خریدنے کے بعد ہی چائے پینے کی غرض سے کیفے میں گئی تھی۔ عارف کے دوسرے مجموعۂ کلام کے ٹائٹل کی بیک پر عارف کی تصویر بھی شائع ہوئی تھی جس نے یاسمین کو مسحور کر دیا تھا۔

یہ تو اپنی خوب صورت نظموں ہی کی طرح خوب صورت ہے، یاسمین نے تصویر دیکھتے ہوتے سوچا تھا۔ مگر کیفے میں اسے دیکھ کر تو وہ چند لمحے کے لیے دم بہ خود رہ گئی اور اسے خیال آیا کہ یہ تو اپنی تصویر سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔

عارف اس وقت چائے پیتے ہوئے ایک کاغذ پر کچھ لکھ رہا تھا اور اس کی کیفیت یہ تھی جیسے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو۔ شاید کچھ شعر ہی اچانک دماغ میں آ گئے ہوں اور وہ لکھنے بیٹھ گیا ہو۔

یاسمین بے اختیار اس میز کی طرف کھنچتی چلی گئی، جیسے دھات کا کوئی چھوٹا سا ٹکڑا مقناطیس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔

''آٹوگراف پلیز!'' یاسمین کی آواز نے عارف کو خاصا چونکا دیا تھا۔

ان دونوں کی وہ پہلی ملاقات ایک ایسی محبت کا عنوان بن گئی جس نے ان دونوں ہی کو بے حد آزمائشوں میں ڈالے رکھا۔

عارف نے آٹوگراف دیتے وقت اخلاقاً یاسمین سے بیٹھنے کے لیے بھی کہا اور چائے کی دعوت بھی دی جو یاسمین نے فوراً قبول کر لی تھی۔ اس وقت اس کے سان گمان میں نہیں تھا کہ وہ ایک ایسا دروازہ کھول رہی ہے جس سے ایک گرجتا ہوا طوفان اس کے وجود میں داخل ہو جائے گا۔

چائے پینے کے دوران میں یاسمین نے عارف کی کئی نظموں پر مختلف زاویوں سے اتنے بھرپور تجزیے کیے کہ عارف اس کی سخن فہمی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

خود یاسمین بھی معمولی شکل صورت کی لڑکی نہیں تھی۔ اس کا رنگ تو کچھ ایسا سرخ وسفید نہیں تھا جو دلکش نقش ونگار کو نکھار دیتا ہے تاہم اس کی ہرنوں جیسی غیر معمولی طور پر بڑی بڑی آنکھیں، تیکھے نقوش اور متناسب جسم ایسا تھا کہ وہ جدھر سے گزرتی، بہت سی نگاہیں اس پر جم کر رہ جاتی تھیں۔

اسی ملاقات میں عارف کو بھی گویا احساس ہوا کہ اس کی نظموں اور غزلوں کا تخیلاتی محبوب، انسانی جسم میں ڈھل کر اس کے سامنے آگیا ہے۔ اسی ملاقات میں دونوں نے کنٹیکٹ نمبرز کا تبادلہ بھی کرلیا، پھر اس کے بعد تو کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا جب عارف اسے فون نہ کرتا ہو۔ اس کی باتوں نے یاسمین پر ظاہر کردیا کہ وہ بہت تیزی سے عارف کے رگ وپے میں رچتی بستی چلی جارہی تھی۔

یہ احساس ایسا تھا کہ یاسمین کانپ گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ عارف کی کال ریسیو نہیں کرے گی لیکن وہ اس فیصلے پر قائم نہیں رہ سکی۔ اس نے محسوس کیا کہ خود اس کے صفحۂ دل پر بھی عارف کا نام لکھا جاچکا ہے۔

پھر موبائل فون پر باتیں کرتے ہوئے عارف کے اصرار پر ان کی دوسری ملاقات اس پارک میں ہوئی۔ اس کے بعد وقفے وقفے سے ان ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ان ملاقاتوں میں یاسمین کی کوشش ہوتی تھی کہ موضوع گفتگو عارف کی شاعری تک محدود رہے لیکن عارف کسی نہ کسی طرح اشاروں کنایوں میں اپنے دل کی حالت بیان کرنے کی کوشش بھی کرڈالتا۔ ان باتوں کی یاد... یاسمین کو تنہائی میں نہ جانے کیوں رلاتی تھی۔

عارف کے مجموعوں میں شائع شدہ دیباچوں وغیرہ سے یاسمین یہ تو جان چکی تھی کہ عارف ایک بڑی کاروباری شخصیت کنور شمشاد کا بیٹا تھا۔ یہ جاننے کے بعد وہ ایک پرشکوہ زندگی کے خواب دیکھ سکتی تھی لیکن اس نے ایسا کوئی خواب نہیں دیکھا۔

جب ان کی ملاقاتوں کو سات آٹھ ماہ گزر چکے تو ایک ملاقات میں جب یاسمین نے عارف کی ایک غزل کو موضوع گفتگو بنایا تو پہلی مرتبہ عارف پر یکایک جھنجلاہٹ طاری ہوگئی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ اب میں شاعری ہی چھوڑ دوں۔ تم گھوم پھر کر اسی کو گفتگو کا موضوع بنائے رکھتی ہو۔ میں اشاروں ہی اشاروں میں بہت کچھ کہہ چکا ہوں اب تک، اور تم نا سمجھ بھی نہیں ہو۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تمہارے دل میں بھی میرے لیے وہی جگہ بن چکی ہے جو میرے دل میں تمہارے لیے ہے۔''

یاسمین چند لمحوں کے لیے گنگ سی ہوکر رہ گئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دماغ میں سناٹا چھا گیا ہو۔ عارف کی زبان پر وہ بات واضح طور پر آگئی تھی جس سے اسے ہمیشہ ڈر لگا رہتا تھا۔

''کیا میں غلط کہہ رہا ہوں عدیلہ؟'' عارف کچھ توقف سے بولا۔

یاسمین نے پہلی ملاقات میں اسے اپنا نام عدیلہ ہی بتایا تھا۔ اس غلط بیانی کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ بس یوں ہی یاسمین کے دماغ میں یہ خیال آیا تھا کہ پہلی ہی ملاقات میں کسی نوجوان کو اپنا صحیح نام نہیں بتانا چاہیے۔ عارف نے آٹوگراف دیتے وقت اس کا نام پوچھا تھا۔ اس کے بعد وہ نشست قدرے طویل ہوگئی تھی۔ اس نشست کی طوالت ہی کے باعث بعد میں یاسمین کو خیال آیا تھا کہ اس نے غلط نام بتا کر ٹھیک نہیں کیا، لیکن جب غلطی ہوجائے تو اس کا ازالہ کرنا آسان نہیں ہوتا۔ بعد کی ملاقاتوں میں اسے کئی بار خیال آیا کہ عارف کو اپنا صحیح نام بتادے لیکن وہ اس خیال سے تذبذب کا شکار رہی کہ جو غلط بیانی وہ کرچکی تھی، اس کے بارے میں عارف نہ جانے کیا خیال کرے۔

''جواب دو عدیلہ!'' عارف پھر بولا۔

''تم غلط نہیں کہہ رہے ہو عارف!'' یاسمین نے نظریں جھکائے ہوئے جواب دیا۔ ''دراصل میں چاہتی تھی کہ...... کہ...... بس......'' وہ چپ ہوگئی۔

''بس...... کیا مطلب! بات پوری کرو عدیلہ!''

''بس یہ چاہتی تھی میں کہ یہ بات مناسب وقت پر ہی زبان پر لائی جائے۔''

''مناسب وقت سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''یعنی جب ان باتوں کا کوئی نتیجہ بھی نکل سکے۔''

''نتیجہ؟''

''تم میری زبان سے کیوں کہلوانا چاہتے ہو......؟ ابھی جو تم نے ایک واضح بات کی ہے تو کیوں کی ہے؟''

''اس لیے کہ اب میں مزید انتظار نہیں کرسکتا۔ اس سے زیادہ صاف بات یہ ہے کہ اب میں تم سے جلد از جلد شادی کرلینا چاہتا ہوں۔''

یاسمین نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اسی کو میں نے مناسب وقت کہا تھا۔ میں ابھی شادی نہیں کرسکتی عارف!''

''کیوں؟''

''میرا گھریلو معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔''

''نہ جانے کیوں، میں نے آج تک تمہارے گھر کے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں چھیڑی۔ کبھی تمہارے والدین یا بھائی بہنوں کے بارے میں نہیں پوچھا، لیکن اب بات آگئی ہے تو مجھے بتاؤ۔ کیا مسئلہ ہے تمہارے گھر کا؟...... کیا ایسا معاملہ ہے کہ تم شادی نہیں کرسکتیں!''

''میری کچھ ذمے داریاں ہیں عارف!'' یاسمین کی آواز میں لرزش تھی۔ ''جب میرے ڈیڈی کا انتقال ہوا تھا تو......'' وہ چپ ہوگئی۔ اسے جھوٹ بولنے میں دقت محسوس ہورہی تھی۔

''تو؟'' عارف بے تاب ہوا۔

''پلیز عارف!...... آج اس موضوع کو یہیں ختم کردو۔ ہم پھر کسی وقت بات کریں گے اس بارے میں!''

''ابھی میں نے کہا تھا نا کہ اب میں انتظار نہیں کرسکتا۔ اس کی ایک وجہ بھی ہے، وہ میں تم سے چھپاؤں گا نہیں۔ ابھی بتاؤں گا تمہیں، لیکن پہلے تم اپنے مسئلے کے بارے میں بتاؤ۔''

''اچھا!'' یاسمین نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے جھوٹ بولنے کی ہمت کی۔ ''ڈیڈی کے انتقال کے بعد ان کا کاروبار ممی نے سنبھال لیا تھا۔ خود ڈیڈی ہی نے ان میں یہ کاروباری سوجھ بوجھ پیدا کی تھی۔ میں اس وقت سیکنڈ ایر کی طالبہ تھی لیکن ممی نے مجھ سے کہا کہ میں اپنی پڑھائی جاری رکھتے ہوئے، کاروبار میں بھی تھوڑی بہت دلچسپی لیتی رہوں، دراصل ڈیڈی ہی کی طرح وہ بھی یہی چاہتی تھیں کہ اگر انہیں کسی وقت خدانخواستہ کچھ ہوجائے تو کاروبار کی ذمے داری میں سنبھال سکوں۔''

روش پر ٹہلتے ہوئے وہ دونوں ایک بینچ کے قریب پہنچ گئے تھے۔

''بینچ خالی ہے۔'' عارف بول پڑا۔ ''یہاں بیٹھ جاتے ہیں، مجھے محسوس ہورہا ہے کہ تم تھکن محسوس کررہی ہو۔''

لیکن حقیقت یہ تھی کہ جھوٹ بولتے ہوئے یاسمین کے اعصاب پر کچھ ایسا دباؤ پڑ رہا تھا کہ اس کی چال بھی متاثر ہوگئی تھی۔ اسی کو عارف نے اس کی تھکن سمجھا تھا۔

وہ دونوں بینچ پر بیٹھ گئے۔ یاسمین کھوئی کھوئی سی نظر آرہی تھی۔ عارف کے ٹوکنے پر اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔ ''جب میں فورتھ ایر میں تھی تو ممی کی صحت خاصی خراب رہنے لگی تھی۔ اسی لیے مجھے کاروباری معاملات پر زیادہ توجہ دینا پڑی۔ اس سے ایک نقصان تو میری پڑھائی کا ہوا۔ میں پاس تو ہوگئی لیکن کوئی اچھی ڈویژن نہیں لاسکی لیکن دوسری

الیکشن کی برکتیں

ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر لیڈر حضرات اتنے ہی پیٹ کے ہلکے تھے تو اب تک کیسے خاموش بیٹھے تھے؟ یہ جو اچانک انہیں ایک دوسرے کی برائیوں کا خیال آگیا ہے اور فطرتیوں اور تیزیوں کی طرح مخالفین کے لتے لینے لگے ہیں تو کیا اس سے قبل ان کی معلومات کا یہ خانہ خالی تھا یا محض انتخابات کا انتظار تھا؟ بہرصورت کچھ بھی ہو اتنی بات ماننا پڑے گی کہ یہ سب الیکشن کی برکتیں ہیں جو ہر شخص زباں دانی کے میدان میں خم ٹھونک کر نکل آیا ہے۔ ہر ایک اپنی جگہ انوکھی بنا ہوا ہے اور اسے یہ خیال تک نہیں آتا کہ بھائی! تیرے ایک نہیں دو کندھے ہیں اور ان میں سے ایک اتر بھی سکتا ہے۔ اصل فیصلہ تو الیکشن کے بعد ہونا ہے ابھی تو صرف ڈنڑ بیٹھکوں سے ہی ایک دوسرے کو دہلایا دبکایا جارہا ہے اور محض ''بڑھکوں'' اور چیلنجوں پر گزارا کیا جارہا ہے۔

❊❊❊❊

سرکس

گزشتہ کچھ دنوں سے کراچی میں ایک سرکس چل رہا تھا بڑے اشتہار چھپ رہے تھے اور بے شمار لوگ سرکس کے فن کاروں کے کرتب دیکھنے جاتے تھے۔ کئی بار رات کو وہاں سے گزر ہوا تو دیکھا، یار لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں۔ تماشائی ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ خوب رش لے رہا تھا لیکن وہ روز پہلے وہاں سے گزرنا ہوا تو دیکھا کہ سرکس کا تنبو وغیرہ گرایا جارہا تھا اور ساز وسامان سمیٹا جارہا تھا۔ تعجب ہوا کہ اس قدر چالو بزنس کو بند کیا جارہا ہے؟ آگے بڑھ کر ایک صاحب سے دریافت کیا ''کیوں صاحب سرکس بند کیوں کر دیا؟ یہ تو خاصا رش لے رہا تھا؟'' جواب میں انہوں نے ایک نظر دیکھا اور ڈھیلا سا منہ بنا کر بولے۔ ''صاحب! الیکشن کے دن آگئے ہیں۔ گلی گلی محلہ محلہ جلسے شروع ہوگئے ہیں۔ ان حالات میں ہمارا سرکس کون دیکھنے آئے گا؟''

شفیع عقیل کی کتاب ''سرخ سفید سیاہ'' سے اقتباس

طرف یہ بہتری آئی کہ میں نے کاروباری معاملات کو تقریباً پوری طرح سمجھ لیا۔ اس کے بعد میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ممی کو آرام کرنے دوں۔ تمام معاملات میں نے خود سنبھال لیے۔ کوئی زیادہ پیچیدگی آجاتی ہے تو گھر پر ممی سے مشورہ کرلیتی ہوں۔ ممی کے مشورے پر میں نے یہ بھی کیا ہے کہ اپنی چھوٹی بہن کو بھی کاروبار میں تھوڑا بہت انوالو کرلیا ہے۔ اب وہ بھی گریجویشن کرنے والی ہے۔ ابھی میں اس پر زیادہ دباؤ نہیں ڈال رہی ہوں۔ بنیادی معاملات میں نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھے ہیں۔"

"تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ جب تک وہ کاروبار پوری طرح نہ سنبھال لے، تم شادی نہیں کرسکتیں؟" عارف بول پڑا۔

"یہ بات نہیں۔ دراصل میرا ایک بھائی بھی ہے۔ ممی نے اسے ایک کورس کرنے کے لیے باہر بھیجا ہے۔ وہ آجائے گا تو وہی سنبھالے گا سارا کاروبار۔"

"وہ کب آئے گا؟"

"لگ بھگ ایک سال بعد۔" یاسمین نے جواب تو دے دیا لیکن اس خیال سے اس کا دل بیٹھنے لگا کہ اگر عارف مزید ایک سال انتظار کرنے پر آمادہ ہوگیا تو وہ سال بھر بعد اس کو مزید کس طرح ٹال سکے گی۔

"سال......" عارف بے چینی سے بڑبڑایا۔ "اتنا انتظار میں نہیں کرسکتا عدیلہ......! ڈیڈی اب جلد از جلد میری شادی کردینا چاہتے ہیں۔ تمہیں ڈیڈی کے انداز فکر پر تعجب ضرور ہوگا۔ میں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کروں گا۔ اس پر وہ کہنے لگے کہ اس پر انہیں کوئی اعتراض نہیں لیکن مجھے ایک شادی ان کی خواہش کے مطابق بھی کرنا پڑے گی۔"

"کیا مطلب!" یاسمین کے منہ سے نکلا۔

عارف دھیرے سے لیکن کسی قدر طنزیہ انداز میں ہنسا۔ "خود انہوں نے بھی دو شادیاں کی تھیں۔ ایک اس لڑکی سے جو انہیں پسند تھی اور دوسری اس سے جو ان کے ڈیڈی کو پسند تھی۔"

"اوہ! تمہاری سوتیلی والدہ بھی ہیں؟"

"اب تو سگی والدہ بھی نہیں۔" عارف نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "کئی سال ہوئے، دونوں کا انتقال ہوچکا ہے۔ اس کے سال بھر بعد سے ڈیڈی کی خواہش ہے کہ میری شادی کردیں، میں انہیں اس طرح ٹالتا رہا ہوں کہ ابھی مجھے کوئی لڑکی پسند نہیں آئی۔ اب کل ڈیڈی نے مجھے فیصلہ سنا دیا ہے کہ اب وہ مہینے بھر کے اندر میری شادی کردینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ جب کوئی لڑکی مجھے پسند آجائے تو میں اس سے بھی شادی کرلوں۔"

"تمہارا خیال ہے، میں یہ گوارا کرلوں گی کہ......"

"میں سمجھ گیا، تم کیا کہنا چاہتی ہو۔" عارف نے اس کی بات کاٹی۔ "نہیں عدیلہ! تمہیں کوئی سوتن برداشت نہیں کرنا پڑے گی۔ اتنے عرصے سے ہمارا ساتھ ہے، میں تمہیں بہت اچھی طرح سمجھ چکا ہوں۔ تم بہت ذہین ہو۔ تم ڈیڈی کے دل میں اس طرح گھر لوگی کہ وہ میری دوسری شادی کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیں گے۔"

"اور اگر ایسا نہ ہوا تو؟" یاسمین نے خوامخواہ کہا۔ یہ تو وہ طے کرچکی تھی کہ عارف سے شادی نہیں کرے گی۔

"تو......" عارف نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "تو میں تمہیں ساتھ لے کر گھر چھوڑ دوں گا لیکن دوسری شادی نہیں کروں گا۔ ڈیڈی ناراض ہوں گے تو ہوجائیں، مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ میں ان کی جائیداد سے محروم ہوسکتا ہوں تو ہوجاؤں! میری جائیداد تو تم ہوگی عدیلہ!"

"لیکن میرے بھائی کے آنے میں تو ابھی......"

"وہ تو تم مجھے بتا چکی ہو۔" عارف نے اس کی بات کاٹی۔ "لیکن اب تمہیں کوئی تدبیر کرنا ہوگی عدیلہ......! اگر تم سے میری شادی نہیں ہوئی تو ڈیڈی نہ جانے کس سے میری شادی کردیں۔"

"تو کرلینا۔" عدیلہ کے منہ سے نکلا۔

"کیا!" عارف حیرت سے بولا۔ "تم مجھ سے بعد میں شادی کروگی؟ ایک سوتن برداشت کرلوگی؟"

"نہیں۔" عدیلہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں تمہیں بھولنے کی کوشش کروں گی عارف......! تم بھی کسی طرح مجھے بھلا دینا۔"

"یہ ناممکن ہے۔" عارف جوشیلا ہوگیا۔ "میں تمہیں نہیں بھلا سکتا۔"

"سب کچھ ممکن ہوتا ہے عارف!" یاسمین کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

"یہ ممکن نہیں ہوگا۔ میں نے ڈیڈی کی پسند کی شادی کرلی تو گھٹ گھٹ کر مرجاؤں گا۔ تمہیں نہیں بھول سکوں گا۔ پلیز عدیلہ!...... کوئی راستہ نکالو!"

لیکن یاسمین کیا راستہ نکالتی۔ وہ تو خود چاہتی تھی کہ عارف سے اس کی شادی نہ ہو۔ اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے اسے خون کے آنسو رونا پڑتا لیکن اسے کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ تنہائی میں وہ اسی خیال سے رو پڑتی

تھی کہ وہ عارف سے شادی نہیں کرسکتی لیکن اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر وہ عارف سے ملتی بھی رہی تھی۔

اس وقت گفتگو اس لیے آگے نہیں بڑھ سکی کہ یاسمین کے موبائل پر کال آگئی تھی۔

"جی ممی!" اس نے موبائل کان سے لگایا۔

"کہاں ہو اس وقت؟...... خیر کہیں بھی ہو، فوراً گھر آؤ۔ ایک ضروری بات کرنا ہے۔" دوسری طرف سے کرخت نسوانی آواز آئی۔

"آتی ہوں ممی!"

یاسمین رابطہ منقطع کرتے ہوئے جلدی سے کھڑی ہوئی۔ "مجھے اب جانا ہوگا عارف! ممی نے فوراً بلایا ہے مجھے۔"

"یہ مسئلہ کب حل ہوگا؟" عارف نے بے تابی سے پوچھا۔ یاسمین نے پارک کے پھاٹک کی طرف بڑھنا شروع کردیا تھا۔

"ہم اس بارے میں اگلے ہفتے بات کریں گے۔"

"اگلے ہفتے کیوں؟" عارف نے تیزی سے پوچھا۔

"ایک اہم کاروباری معاملہ ہے۔ میں کل صبح کی فلائٹ سے اسلام آباد جارہی ہوں۔ واپسی ایک ہفتے بعد ہوگی۔"

"میرے لیے تو بڑی پریشانی ہوجائے گی عدیلہ!" عارف حواس باختہ سا ہوگیا۔ "میں تو آج صبح ڈیڈی سے کہہ چکا ہوں کہ میں نے لڑکی پسند کرلی ہے۔ انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن یہ معاملہ اگر ٹلے گا تو پھر وہ اصرار کریں گے کہ میں ان کی پسند کی لڑکی سے شادی کرلوں۔ ایسی صورت میں میرے لیے صرف یہی ایک راستہ رہ جائے گا کہ میں گھر چھوڑ دوں۔ خواہ ڈیڈی کتنا ہی ناراض ہوں۔"

"ہرگز نہیں عارف......! ایسا ہرگز نہ کرنا۔ تم کو میری قسم ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو عدیلہ!" عارف پریشان ہوگیا۔ "مجھے ڈیڈی کی پسند کی شادی کرنا پڑ جائے گی۔"

"تو کرلینا۔"

"عدیلہ!" عارف کے منہ سے اتنا ہی نکل سکا۔ وہ حیرت سے یاسمین کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

"ہاں۔" یاسمین نے نم ناک آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "پہلی بار ایک بات کہی ہے میں نے......! مانو گے نہیں؟"

"لیکن پھر عدیلہ، تمہیں ایک سوتن......"

"وہ سب بعد میں دیکھا جائے گا۔"

عارف یاسمین کے ساتھ اس کی کار کے قریب جارکا تھا۔ یاسمین چابی سے کار کا دروازہ کھولنے لگی۔

"عدیلہ! میرے لیے بہت پریشانی ہوجائے گی۔" عارف پاگل سا ہوا جارہا تھا۔

یاسمین نے دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ اس نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو تم اپنا گھر ہرگز نہیں چھوڑو گے۔"

کار حرکت میں آچکی تھی۔

"لیکن عدیلہ!" عارف نے پاگلوں کی طرح کار کے ساتھ دوڑنا چاہا مگر یاسمین نے اتنی تیزی سے رفتار بڑھائی کہ وہ کار کے ساتھ دوڑتے ہوئے اپنی بات مکمل نہیں کرسکا۔ اسے رکنا پڑا اور وہ حسرت سے یاسمین کی کار کی طرف دیکھتا رہ گیا جو تیزی سے دور ہوتی چلی جارہی تھی۔ وہ یہ نہیں دیکھ سکا کہ تیز ڈرائیونگ کرتے ہوئے بھی یاسمین کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

"کیا ہوگا؟" وہ سوچ رہی تھی۔ "کیا ہوگا اب؟"

اس کی شدید ترین خواہش یہ تھی کہ عارف اسی لڑکی سے شادی کرلے جسے اس کے باپ نے اس کے لیے پسند کیا تھا، لیکن وہ محسوس کررہی تھی کہ ایسا نہیں ہوسکے گا۔ عارف اس لڑکی سے شادی نہیں کرے گا۔

دوسری صورت کیا ہوسکتی ہے؟ یاسمین کا دماغ برابر کام کرتا رہا۔ یہ سوال اس کے دماغ میں گونجتا رہا کہ دوسری تدبیر کیا ہوسکتی ہے؟ یہ سوال اتنا پیچیدہ تھا کہ جواب میں کوئی بات اس کے ذہن میں نہیں ابھر رہی تھی، مگر پھر یکایک ہی اسے ایک ایسا خیال آیا کہ اس کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔

پہلے تو وہ ہمیشہ یہی سوچتی رہی تھی کہ وہ زندگی بھر شادی نہیں کرے گی اور عارف کی یادوں کے سہارے زندہ رہ لے گی لیکن اب پہلی مرتبہ اسے خیال آیا تھا کہ وہ کسی سے شادی کرلے، کسی سے بھی......! اس صورت میں عارف اسے بے وفا جیسے نہ جانے کتنے نام دے ڈالتا۔ دے ڈالے! یاسمین سوچ رہی تھی۔ کوئی اور تدبیر ممکن نہیں عارف سے شادی نہ کرنے کی۔

دل میں درد اٹھتا رہا، آنکھوں میں آنسو تیرتے رہے لیکن وہ اپنے فیصلے پر جمی رہی۔

کچھ دیر بعد جب اس کی کار ایک خوب صورت بنگلے کے احاطے میں داخل ہوئی۔ پھاٹک پر "الماس نادر" کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی، یہ یاسمین کی ماں کا نام تھا۔

کار کھڑی کرکے یاسمین نے ٹشو پیپر سے اپنی آنکھیں

خشک کیں۔ کار سے اتر کر وہ خود کو سنبھالے رکھنے کی کوشش کرتی ہوئی بنگلے میں داخل ہوئی۔ فوراً ہی الماس نادر سے سامنا ہو گیا۔ اس کے ساتھ یاسمین کی چھوٹی بہن ریشماں بھی تھی۔

"آؤ باجی!" ریشماں مسکراتی ہوئی بولی۔ "تمہارے لیے ممی کی پاس بہت اچھی خبر ہے۔"

یاسمین استفہامیہ نظروں سے الماس نادر کی طرف دیکھنے لگی۔

"تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟" الماس نادر نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ یاسمین کی بے حد کوشش کے باوجود اس کے چہرے نے اس کی کیفیت کی چغلی کر دی تھی جسے الماس نادر جیسی جہاں دیدہ عورت بہ آسانی سمجھ گئی۔

"نہیں تو۔" یاسمین نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "کالج کی ایک دوست کے ساتھ لانگ ڈرائیو پر نکل گئی تھی۔ بہت تھک گئی ہوں۔ جی چاہ رہا ہے، فوراً بستر پر جا گروں۔"

الماس نادر نے دو تین لمحے تک یاسمین کی طرف غور سے دیکھنے کے بعد کہا۔ "رانی بیگم آئی تھی آج......! میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا لیکن بہت دن ہوئے...... کوئی ایک مہینا پہلے اس سے کہا تھا میں نے کہ وہ تمہارے لیے کوئی اچھا سا رشتہ ڈھونڈے۔ آج وہ بات لے کر آئی تھی مجھے اور تمہاری بہن کو تو رشتہ بہت ہی پسند آیا ہے۔"

لفظ "رشتہ" سنتے ہی یاسمین کا دل بڑی زور سے اچھلا تھا۔

الماس نادر کہتی رہی۔ "تم اب پہلے جیسی رہی بھی نہیں ہو، ڈھلک گئی ہو۔ اب تمہاری جگہ ریشماں سنبھال لے گی۔ لاہور سے تمہیں ایک ہفتے میں واپس آنا ہے۔ یہ تمہارا آخری کام ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔" یاسمین نے آہستہ سے کہا۔ اگرچہ خود اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ کسی سے شادی کر لے گی لیکن غیر متوقع طور پر یہ بات اس کے سامنے آئی تھی تو اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے سینے میں اس کا دل بیٹھتا ہی چلا گیا ہو۔

"اب میں جاؤں ممی؟" وہ بولی۔ "میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔"

الماس نادر اور ریشماں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ان کی حیرت کا سبب یہی تھا کہ یاسمین نے اس رشتے کے بارے میں ذرا بھی استفسار نہیں کیا تھا۔

الماس نادر بولی۔ "یہ نہیں پوچھو گی کہ......"

"مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے ممی!" یاسمین نے کہا۔ "آپ جو فیصلہ کریں گی، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ پہلے بھی ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے آپ کے کسی فیصلے سے اختلاف کیا ہو...... بس اب میں جا کے آرام کرتی ہوں۔"

وہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

الماس نادر اور ریشماں حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔

یاسمین نے اپنے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کیا اور دوڑنے کے سے انداز میں بستر کے قریب جا کے اس پر گر پڑی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ پڑا تھا۔ اس سیلاب کی شدت میں دھیرے دھیرے ہی کمی آسکی۔ اس کا ہاتھ سرہانے رکھے ہوئے عارف کے مجموعے پر پڑا۔ وہ اس کے سرہانے ہی رکھا رہتا تھا۔ یاسمین نے وہ اٹھا لیا اور اس میں چھپی ہوئی عارف کی تصویر پر نظریں جما دیں۔

"ہاں عارف!" وہ قدرے توقف سے بڑبڑائی۔ اس کی بڑبڑاتی ہوئی آواز میں بھی لرزش تھی۔ "بے وفا سمجھ لینا تم مجھے! جو دل چاہے سمجھ لینا، لیکن میرا دل تو جانتا ہے نا......! میں تم سے بے وفائی نہیں کروں گی یہ شادی کر کے!...... یہ تو میری وفا ہو گی جس کی چوکھٹ پر میں خود کو قربان کروں گی۔"

اتنا کہتے کہتے یاسمین کی آواز اس کے حلق میں گھٹ گئی اور اس کی آنکھوں سے وہ سیلاب پھر امڈ پڑا جس کی شدت میں کمی آگئی تھی۔

✂✂✂

دوسری صبح ناشتے کی میز پر عارف کے ہاتھ سے سلائس چھوٹ کر فرائی انڈے کی پلیٹ میں گر پڑا۔ اس کے باپ کنور شمشاد نے بات ہی ایسی کہی تھی کہ بوکھلاہٹ میں عارف سے کچھ بھی سرزد ہو سکتا تھا۔

"ایک لڑکی کے لیے تمہارے رشتے کی بات شروع کرا دی ہے میں نے۔" کنور شمشاد نے کہا تھا۔ "دو ایک دن بعد جواب دینے کے لیے کہا ہے لڑکی کی ماں نے...... اس کی طرف سے انکار کا امکان نہیں ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کی رسم ہے کہ لڑکی والے فوراً جواب نہیں دیتے۔"

"لیکن...... ڈیڈی......"

"اب میں مزید تاخیر برداشت نہیں کروں گا۔" کنور شمشاد نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں اپنی اس بات پر اب بھی قائم ہوں کہ اگر تم کسی لڑکی کو پسند کرو گے تو میں اس سے بھی تمہاری شادی میں رکاوٹ نہیں بنوں گا۔ جب تم چاہو گے، تمہاری دوسری شادی بھی ہو جائے گی۔"

"میں نے آپ سے ایک بات اور بھی کہی تھی ڈیڈی!" عارف نظریں جھکائے ہوئے بولا۔ "آپ شاید بھول گئے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ......"

"مجھے یاد ہے۔" کنور شمشاد نے اس کی بات کاٹی۔ "تم چاہتے تھے کہ تمہاری پہلی شادی تمہاری پسند کی ہو۔"

"میں اب بھی یہی چاہتا ہوں۔"

"بہت دن سے تمہاری یہ بات سن رہا ہوں مگر تم نے اب تک کوئی لڑکی پسند نہیں کی۔" کنور شمشاد نے کہا۔ "آخر مجھے فیصلہ کرنا ہی پڑا۔ لڑکی ایسی ہے کہ تم بھی اسے ناپسند نہیں کرو گے۔ یاسمین نام ہے اس کا۔ اس کی ماں ایک بیوہ خاتون ہیں مگر مالی حالات اچھے ہیں۔ یاسمین کی ایک چھوٹی بہن بھی ہے۔ جوان وہ بھی ہو چکی ہے لیکن اس کا تمہارا کوئی جوڑ نہیں بنتا۔ وہ تم سے کافی چھوٹی ہے۔ یاسمین ہی مجھے تمہارے لیے مناسب معلوم ہوئی۔"

عارف کو اس وقت یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے جسم کی جان نکلی جا رہی ہو۔

"ناشتا تو کرو!" کنور شمشاد نے بیٹے کو گھورتے ہوئے کہا۔

عارف کا سلائس پلیٹ میں گرا ہوا تھا۔ وہ اس نے اس طرح اٹھایا جیسے کوئی وزنی چیز اٹھا رہا ہو۔ اس کا دماغ بھی جیسے ناکارہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب اس معاملے کو کس طرح ٹالے۔

"رانی بیگم کو تو جانتے ہو نا تم؟" کنور شمشاد نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

"جی...... جی نہیں۔" عارف جیسے چونک کر بولا تھا۔ "میں آپ کے زیادہ تر دوستوں یا شناساؤں کو صرف چہروں سے پہچانتا ہوں، ناموں سے واقف نہیں ہوں۔"

"نیو ایر کے فنکشن میں جو لوگ آتے ہیں، میں تعارف تو کراتا رہا ہوں ان سے تمہارا۔"

کنور شمشاد کے گھر پر نئے سال کی تقریب ہمیشہ ہوتی تھی۔

"شاید میں بھول گیا ہوں۔" عارف نے دھیمی آواز میں کہا۔

"خیر!" کنور شمشاد نے کہا۔ "وہ ایک اچھی خاتون ہیں۔ شوہر سے کسی اختلاف کے باعث انہوں نے علیحدگی تو اختیار کر لی ہے لیکن طلاق نہیں لی۔ ایک مرتبہ میں نے چند دوستوں کو چائے پر بلایا تھا، تب بھی وہ آئی تھیں۔ تم شاید اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ دراصل تمہارے رشتے کی بات انہی کے ذریعے شروع ہوئی ہے کیونکہ ان کا میل جول بہت زیادہ لوگوں سے ہے اس لیے کچھ عرصہ پہلے میں نے ان سے ذکر کر دیا تھا کہ مجھے تمہارے لیے کسی اچھی لڑکی کی تلاش ہے۔ انہوں نے ہی مجھے یاسمین کی تصویر دکھائی تھی۔ اس کی ماں الماس نادر کے بارے میں بھی بتایا تھا اور گھریلو حالات کے بارے میں بھی! آسانی سے تو میں بھی صرف تصویر دیکھ کر اس رشتے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتا تھا لہٰذا ایک دن بعد رانی بیگم نے اپنے موبائل فون سے بنائی ہوئی ان لوگوں کے گھر کی وڈیو بھی دکھائی۔ اس میں یاسمین کے علاوہ بیگم الماس اور ان کی چھوٹی بیٹی ریشماں بھی تھی۔ رانی بیگم نے مجھے بتایا کہ بیگم الماس نادر ابھی اپنی چھوٹی بیٹی کی شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ خود میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ ریشماں سے تمہارا کوئی جوڑ نہیں بنتا۔ میں نے یاسمین کو تمہارے لیے پسند کر لیا اور رانی بیگم کو اجازت بھی دے دی کہ وہ سلسلہ آگے بڑھائے چنانچہ ابھی جب میں ناشتے کے لیے اپنے کمرے سے نکلا تھا تو ان کا فون آیا تھا۔ اسی وقت انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ بیگم الماس نادر نے دو ایک دن بعد جواب دینے کے لیے کہا ہے۔"

اس وقت عارف کے کانوں میں بھی سائیں سائیں ہونے لگی تھی۔ وہ اپنے باپ کی ساری باتیں ذرا بھی توجہ سے نہیں سن سکا۔ وہ تو اس سوچ میں غلطاں رہا تھا کہ اس معاملے کو کس طرح ٹالا جا سکتا ہے، لیکن کوئی تدبیر اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اسے اپنے والد کے مزاج سے مکمل آگاہی تھی۔ جب وہ کوئی بات ایک مرتبہ کہہ دیتے تو پھر اس پر اڑ جاتے تھے۔ انہوں نے اس کے اور یاسمین کے رشتے کی بات آگے بڑھا دی تھی لہٰذا اب وہ اس سے پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ وہ عارف کی دوسری شادی کے معاملے میں بھی اپنا وعدہ فراموش نہ کرتے لیکن عارف دوسری شادی کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کے دل و دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ عدیلہ اس کے باپ کے دل میں اتنی جگہ بنا لے گی کہ پھر وہ دوسری شادی کا خیال اپنے ذہن سے نکال دیتے لیکن وہ سارا معاملہ اس وجہ سے بگڑتا نظر آرہا تھا کہ عدیلہ ابھی شادی کے لیے تیار

ہی نہیں تھی۔

ناشتے کے بعد کنور شمشاد اپنے دفتر چلے گئے۔ انہوں نے عارف کو اپنے کاروبار میں نہیں الجھایا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ شاعرانہ مزاج رکھنے والا ان کا بیٹا کاروباری معاملات میں بالکل فیل ثابت ہوگا۔

باپ کے جاتے ہی عارف نے موبائل پر عدیلہ سے رابطہ کرنا چاہا لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ عدیلہ کا موبائل بند تھا۔ عارف نے کئی مرتبہ کوشش کی لیکن اس سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ عارف نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ اس نے ایئرپورٹ انکوائری سے رابطہ کیا۔ عدیلہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ اس دن اسلام آباد چلی جائے گی۔

انکوائری سے معلوم ہوا کہ ساڑھے سات بجے ایک فلائٹ اسلام آباد جا چکی تھی۔ دوسری فلائٹ گیارہ بجے روانہ ہوتی۔

عارف نے سوچا، شاید وہ ساڑھے سات کی فلائٹ سے نہ گئی ہو اور اب گیارہ بجے کی فلائٹ سے جائے۔ ایسی صورت میں اسے ایئرپورٹ پر پکڑا جا سکتا تھا۔

کافی عرصے تک تعلقات رہنے کے باوجود وہ عدیلہ کے گھر کے پتے سے ناواقف تھا۔ یہ کسی حد تک غیر فطری سی بات تھی لیکن ہوا ایسا ہی تھا۔ اس کی طرح عدیلہ نے بھی کبھی اس کے گھر کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔

عارف دس بجے ہی ایئرپورٹ پہنچ گیا اور ایسی جگہ کھڑا ہو گیا کہ کوئی شخص بھی اس کی نظروں سے بچ کر ایئرپورٹ کی عمارت میں داخل نہ ہو سکے۔ وہ آنے والی کاروں پر بھی نظر رکھے رہا۔ اس کے خیال میں یہ امکان بھی تھا کہ عدیلہ کی چھوٹی بہن ڈرائیونگ جانتی ہو اور وہی عدیلہ کو لے کر آئے تاکہ کار واپس لے جا سکے۔

عارف نے اس دوران میں متعدد بار موبائل پر عدیلہ سے رابطہ کرنے کی بھی کوشش کی تھی مگر ناکام رہا تھا۔ یہ بات بھی اس کے ذہن کو الجھائے ہوئے تھی کہ عدیلہ نے اپنا موبائل بند کیوں کر رکھا تھا۔ اس الجھن کے ساتھ اس کے دماغ میں یہ سوال بھی تھا کہ عدیلہ مل گئی تو وہ اس سے کیا بات کرے گا۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا کہ عدیلہ کو صورت حال سے آگاہ کر دیتا۔ وہ یہ اندازہ لگانے سے قاصر تھا کہ عدیلہ پر اس کا کیا ردعمل ہوگا مگر اس کے باوجود خوش گمانیوں میں مبتلا تھا۔ ان حالات کی وجہ سے عدیلہ شاید فوری طور پر اس سے شادی کے لیے آمادہ ہو جائے!...... ایسی صورت میں وہ اپنے باپ سے یہ منوانے کی کوشش کر سکتا تھا کہ یاسمین نامی لڑکی سے اس کی شادی کچھ عرصے کے لیے ملتوی کر کے پہلے اس کی اور عدیلہ کی شادی کروا دی جائے۔

انہی خیالات میں وقت گزرتا رہا۔ پونے گیارہ بجنے والے تھے جب اس کی مایوسی کا غلبہ شدید ہو گیا۔ اس کے اندازے کے مطابق اسلام آباد جانے والی فلائٹ کے مسافروں کو اس وقت ڈیپارچر لاؤنج میں تو ہونا ہی چاہیے تھا۔

پھر گیارہ بھی بج گئے۔ اسلام آباد کی فلائٹ چلی گئی۔

حد درجہ مایوسی کے عالم میں عارف نے سوچا کہ ابھی کوئی اور فلائٹ بھی ہوگی جس سے عدیلہ نے اسلام آباد جانے کا فیصلہ کیا ہو۔ اس خیال کے باعث اس نے انکوائری سے رابطہ کیا معلوم ہوا کہ ساڑھے چار بجے بھی ایک فلائٹ اسلام آباد جائے گی۔

عارف دل برداشتگی کے عالم میں گھر روانہ ہوا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ ساڑھے تین بجے پھر ایئرپورٹ آئے گا۔ اس نے اپنے اس فیصلے پر عمل بھی کیا لیکن نتیجہ وقت کے زیاں کے علاوہ کچھ نہ نکلا۔ عدیلہ اسے نہیں مل سکی۔

اس نے موبائل پر بھی عدیلہ سے رابطہ کرنے کی کوششیں جاری رکھی تھیں لیکن عدیلہ کا موبائل بند ہونے کی وجہ سے رابطہ ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔

پھر دو دن گزر گئے۔ عارف ان دو دنوں میں ایک بار بھی گھر سے باہر نہیں نکلا۔ اس کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ اسے عدیلہ کے علاوہ کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ بھوک بھی جیسے مر گئی تھی۔ دوپہر کا کھانا اس نے کسی دن بھی نہیں کھایا۔ صبح کا ناشتا اور رات کا کھانا بھی اسے اس لیے کھانا پڑا کہ اس وقت کنور شمشاد عموماً گھر پر ہی ہوتے تھے۔

"کیا بات ہے!" تیسری صبح ناشتے کی میز پر کنور شمشاد نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے اپنی......؟ اس دن کے بعد غالباً شیو تک نہیں بنایا ہے تم نے......! یہ میں نے کل ہی محسوس کر لیا تھا لیکن نظر انداز کر گیا۔ آخر بات کیا ہے؟"

"جانے کیا بات ہے ڈیڈی!" عارف نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ "ان دنوں دل نہ جانے کیوں بہت اداس ہے۔"

"اداسی کی وجہ؟"

"وہ میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہی ہے۔" عارف اس کے علاوہ کوئی جواب نہیں دے سکا۔

"یہ تو میں جانتا ہوں کہ تم شاعر ہو، لیکن شاعر مجنوں تو نہیں بن جاتا...... سچ سچ بتاؤ، کیا معاملہ ہے؟"

"سچ بات!" عارف کو کچھ خیال آیا تو وہ باپ کا چہرہ تکنے لگا۔

"ہاں، بالکل سچ۔"

"سچ بات یہ ہے ڈیڈی کہ میں ایک لڑکی کو پسند کر چکا ہوں۔"

کنور شمشاد نے چونک کر کہا۔ "پہلے کیوں نہیں بتایا تم نے؟ میں اس لڑکی سے تمہاری شادی میں رکاوٹ تو نہیں بنتا۔"

"بات کچھ اور ہے ڈیڈی......! وہ لڑکی فی الحال شادی کے لیے تیار نہیں ہے۔"

"کیوں؟"

"اس کی کچھ گھریلو مجبوریاں ہیں۔"

"ایسی کیا مجبوریاں ہیں کہ وہ شادی ہی نہ کر سکے!...... کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ تم سے شادی کرنا ہی نہ چاہتی ہو۔"

"ایسا نہیں ہے ڈیڈی...... وہ مجھے اتنا ہی چاہتی ہے جتنا میں اسے چاہتا ہوں۔"

"پھر مجبوریاں کیسی...... کہیں ملازمت کرتی ہے وہ...... اپنے گھر کی کفیل ہے؟"

"کفیل تو وہ ہے لیکن ملازمت نہیں کرتی۔ اس کے والد اچھا خاصا کاروبار چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوئے ہیں۔"

عارف نے وہ سب کچھ بیان کر دیا جو اسے عدیلہ نے بتایا تھا۔ یہ بھی بتا دیا کہ کسی کاروباری معاملے ہی میں وہ ان دنوں اسلام آباد گئی ہوئی ہے۔

کنور شمشاد نے کہا۔ "اس کا پتا بتاؤ۔ میں خود جا کر اس کی ماں سے مل لیتا ہوں۔ جب تک اس لڑکی کا بھائی پڑھ کر واپس آنے کے بعد کاروبار نہیں سنبھالتا، وہ کاروبار سنبھالے رہے۔ شادی سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑے گی۔ مجھے اس کی اس مصروفیت پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ صرف ایک سال کی بات ہے، یہ کوئی طویل مدت نہیں...... اگر وہ فوری طور پر تم سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے اور اس کی ماں کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا تو میں یاسمین سے تمہاری شادی چند ماہ کے لیے موخر کر دوں گا۔"

"عدیلہ کی واپسی کا انتظار کرنا پڑے گا ڈیڈی!"

"کیوں؟ یہ کیوں ضروری ہے......؟ اس کی ماں سے ملنے کے لیے میں آج ہی جانے کے لیے تیار ہوں۔ رانی بیگم کو فون کر دوں گا۔ وہ بھی میرے ساتھ چلی جائیں گی۔ میں ان پر اس معاملے میں بھی اعتماد کر سکتا ہوں۔"

"مجھے عدیلہ کا گھر نہیں معلوم ڈیڈی!" عارف نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"کیا!" کنور شمشاد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، پھر جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم اسے اتنا چاہتے ہو اور تمہیں اس کے گھر کا علم نہیں...... کیا شاعر ہونے کے بعد آدمی پاگل بھی ہو جاتا ہے۔"

عارف چپ رہا۔ وہ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

کنور شمشاد ذرا دیر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑاتے رہے، پھر عارف کی طرف دیکھ کر بولے۔ "ایک بات میں تمہیں بتا دوں۔ یاسمین کی ماں نے شادی کے لیے آمادگی کا اظہار کر دیا ہے۔ شادی کی تاریخ دس دن بعد طے کی جائے گی۔ اگر عدیلہ تین چار دن بعد واپس آ جاتی ہے اور تم اسے شادی پر آمادہ کر لیتے ہو تو میں یاسمین سے تمہاری شادی چند ماہ کے لیے موخر کر دوں گا۔ اگر تم ضروری سمجھو تو میں بھی جا کر عدیلہ کی ماں سے مل لوں گا، لیکن اگر وہ دونوں فوری شادی پر رضامند نہیں ہوتیں تو پھر میں یاسمین سے تمہاری شادی کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گا۔"

عارف کی کچھ امید بندھی تو وہ کسی قدر جوش سے بولا۔ "میں پوری کوشش کروں گا ڈیڈی! آپ کو اس کی کاروباری مصروفیت پر اعتراض نہیں ہے تو وہ ضرور شادی کے لیے تیار ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے، لیکن تمہاری اس بات نے میرا موڈ بہت خراب کر دیا ہے کہ تم اس کے پتے سے بھی ناواقف ہو۔ کیا شاعری آدمی کو احمق بھی بنا دیتی ہے۔"

عارف کچھ نہیں بول سکا۔ اس کے بعد کنور شمشاد نے کوئی بات نہیں کی۔ ان کا موڈ واقعی بہت خراب ہو گیا تھا۔ ناشتا کرنے کے بعد بھی وہ کچھ کہے بغیر میز سے اٹھ گئے۔

یاسمین پورے ایک ہفتے بعد اسلام آباد سے لوٹی۔ اس کی بہن ریشماں اسے لینے کے لیے ایئرپورٹ پر موجود تھی۔ یاسمین کے ساتھ ایک چھوٹے سے اٹیچی کیس کے علاوہ کسی قسم کا سامان نہیں تھا۔ وہ کار کی ڈکی میں رکھوا دیا گیا، پھر کار ایئرپورٹ سے روانہ ہوئی۔ ڈرائیونگ سیٹ ریشماں ہی نے سنبھال رکھی تھی۔

"یہ عارف کیا بہت اچھا شاعر ہے باجی؟" ریشماں

نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

''کیوں؟'' یاسمین چونکی۔ ''یہ اچانک تجھے عارف کا خیال کیوں آ گیا؟''

''تمہیں اس کی شاعری بہت پسند ہے نا......! تمہارے کمرے میں بھی اس کی کتاب رہتی ہے۔ کار میں بھی ہے۔'' ریشماں نے ڈیش بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں۔'' یاسمین نے اپنا وینٹی بیگ کھولتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس کی شاعری بہت پسند ہے۔''

''مجھے تو شاعری سے کوئی دلچسپی ہے نہیں......! کار میں تھی اس کی کتاب تو میں نے تھوڑی سی پڑھی تھی۔''

یاسمین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے وینٹی بیگ سے دو موبائل فون نکالے تھے۔ اس نے ان میں سے ایک کو ''پاور آف'' کیا اور دوسرا جو بند پڑا تھا، اسے کھولا۔

''اس مرتبہ تم دوسرے نمبر کا موبائل کیوں لے گئی تھیں!'' ریشماں بولی۔ ''پہلے تو کبھی ایسا نہیں کیا تم نے!''

اس سے پہلے کہ یاسمین کوئی جواب دیتی، اس موبائل کی گھنٹی بجنے لگی جو اس نے ابھی کھولا تھا۔ یاسمین نے وہ اٹھایا اور اسکرین پر نظر ڈالی۔ کال کرنے والا اس کی توقع کے مطابق عارف ہی تھا۔ یاسمین نے موبائل کان سے لگایا۔ ''ہیلو!'' وہ بہت سنجیدہ تھی۔

''شکر ہے کہ تم نے کال ریسیو کی۔'' دوسری طرف سے عارف نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ''اس ایک ہفتے میں کم از کم سو مرتبہ تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کر چکا ہوں۔ کیا تم اپنا موبائل بند کر دیتی ہو جب شہر سے کہیں باہر جاتی ہو؟''

''ہاں، کہیں جاتی ہوں تو دوسرا نمبر استعمال کرتی ہوں۔'' یاسمین نے جھوٹ بولا۔

''کیوں؟...... اچھا خیر، مجھے دوسرا نمبر بتا کے تو جاتیں۔ بہت پریشان رہا ہوں اس ہفتے میں۔ اب فوراً مجھ سے ملو۔ کہاں ہو اس وقت؟''

''ابھی پہنچی ہوں کراچی!...... ایرپورٹ سے گھر کی طرف جا رہی ہوں۔''

''ٹیکسی میں؟''

''نہیں۔'' یاسمین نے جواب دیا۔ ''ریشماں آئی تھی مجھے لینے۔''

''ریشماں؟'' چونک کر کہا گیا۔ ''یہ کون ہے؟''

یاسمین کو یاد نہیں تھا کہ اس نے پہلے کبھی عارف کو اپنی بہن کا نام بتایا تھا یا نہیں لیکن عارف کے چونکنے سے اس نے یہی سمجھا کہ اس نے عارف کو اپنی بہن کا نام نہیں بتایا ہوگا۔

''میری چھوٹی بہن ہے یہ۔'' یاسمین نے جواب دیا۔

''عجیب بات ہے، اس کی چھوٹی بہن کا نام بھی...... اچھا خیر چھوڑو۔ یہ باتیں ملاقات پر ہی ہوں گی۔ تم فوراً مجھ سے ملنے آؤ، ابھی دوپہر ہے۔ پارک میں ملنا تو اچھا نہیں رہے گا۔ اسی کیفے میں آؤ جہاں ہم پہلی مرتبہ ملے تھے۔''

''فوراً کیسے آجاؤں!'' یاسمین بولی۔ ''ابھی تو ریشماں کے ساتھ گھر جا رہی ہوں۔ پھر کچھ دیر تو گھر پر رکوں گی۔''

''تم سے رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے میرے اعصاب ٹوٹنے لگے ہیں۔ میں تم سے جلد از جلد ملنا چاہتا ہوں عدیلہ!''

''آخر بات کیا ہے؟ اتنی بےتابی؟''

''بات کچھ ایسی ہی ہے کہ تمہیں بتانا بہت ضروری ہے لیکن اتنی مختصر بات نہیں ہے کہ فون پر بتا دوں۔ تمہارے ساتھ تمہاری بہن بھی تو ہے نا......! فون پر بات نہیں ہو سکے گی۔''

''مجھے اب پندرہ منٹ تو لگیں گے گھر پہنچنے میں!'' یاسمین نے کہا۔ ''کچھ دیر تو رکنا ہوگا نا! اس کے بعد مجھے پہنچنے میں بیس منٹ تو لگیں گے۔''

''ٹھیک ٹھیک وقت بتاؤ پلیز...... میں بہت بےچین ہوں۔''

یاسمین نے گھڑی دیکھی۔ ''اتنی بےچینی ہے تو میں گھر پر دس منٹ سے زیادہ نہیں رکوں گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' عارف نے کہا۔ ''پینتالیس منٹ بعد میں کیفے میں تمہارا منتظر ہوں گا۔''

''اچھا۔'' یاسمین نے رابطہ منقطع کیا۔

اس دوران میں ریشماں چپ رہی تھی۔ بس کبھی کبھی یاسمین پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال لیتی تھی۔ وہ اس وقت بولی جب یاسمین نے موبائل بند کیا تھا۔

''کون تھا باجی؟''

''میری ایک دوست ہے۔'' یاسمین نے جواب دیا۔ ''کسی وجہ سے پریشان ہے، مجھ سے مشورہ کرنا چاہتی ہے۔ جانا تو پڑے گا مجھے!''

''اگر وہ تمہاری کوئی بہت اچھی دوست ہے تو تمہیں فوراً اس سے ملنے جانا چاہیے نا باجی!...... تم کار لے جاؤ، میں ٹیکسی کر کے چلی جاؤں گی۔''

''نہیں نہیں۔ یہ ٹھیک نہیں رہے گا۔ ممی کی ڈانٹ پڑ جائے گی مجھ پر!''

''ممی گھر پر نہیں ہیں۔ کہہ کر گئی تھیں کہ دو تین گھنٹے بعد واپسی ہوگی ان کی۔ ابھی انہیں گئے ہوئے مشکل سے ایک گھنٹا گزرا ہے۔ وہ اسی وقت گئی تھیں جب میں تمہیں لینے کے لیے گھر سے نکلی تھی۔''

''پھر بھی یہ ٹھیک نہیں ہے کہ تم ٹیکسی کرو۔ گھر پہنچ کر تم گاڑی سے اتر جانا۔ میں فوراً چلی جاؤں گی۔''

ریشماں نے اس معاملے میں تکرار غیر ضروری سمجھی۔

یاسمین کا ذہن عارف میں الجھا رہا۔ یہ اس نے بھی عارف کے لہجے سے محسوس کر لیا تھا کہ بات کچھ زیادہ ہی غیر معمولی تھی۔

ریشماں کو گھر پر اتار کے یاسمین نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور روانہ ہو گئی۔ اس نے موبائل پر عارف سے رابطہ کر کے اسے بتایا کہ وہ گھر پر ایک منٹ بھی رکے بغیر کیفے کی طرف روانہ ہو چکی ہے۔

''میں خود راستے میں ہوں۔ اگر تم گھر پر رکتیں تو مجھے دس بارہ منٹ انتظار کرنا پڑتا تمہارا۔''

''اب تو بتا دو کیا بات ہے!...... ریشماں اب میرے ساتھ نہیں ہے۔''

''اب تم آ ہی رہی ہو تو آمنے سامنے بیٹھ کر ہی بات ہوگی۔''

''خاصی الجھن میں ڈال دیا ہے تم نے......! اچھا خیر! میں آ رہی ہوں۔''

یاسمین نے رابطہ منقطع کر کے کار کی رفتار میں اضافہ کیا۔ وہ واقعی بہت زیادہ الجھ گئی تھی۔ معاملہ جو کچھ بھی ہو، اس کے بارے میں کوئی قیاس کرنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

جب وہ کیفے میں داخل ہوئی تو سامنے ہی کی میز پر عارف دکھائی دیا۔ غالباً وہ جان بوجھ کر ایسی میز پر بیٹھا تھا کہ یاسمین کیفے میں قدم رکھتے ہی اسے دیکھ لے۔

یاسمین قریب جا کر اس کے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ یہ اس نے فوراً محسوس کر لیا تھا کہ عارف کے چہرے پر پریشانی کے اثرات خاصے گہرے تھے۔

''میں تم سے پانچ منٹ پہلے پہنچ گیا تھا۔'' عارف بولا۔

''اصل بات کی طرف آؤ۔ تم نے میرے دماغ پر بہت دباؤ ڈال دیا ہے۔ میں کوئی اندازہ لگانے سے قاصر ہوں کہ بات کیا ہو سکتی ہے۔''

''یقیناً وہ ایسی ہی بات ہے۔'' عارف نے کہا۔ ''میں نے یہ ہفتہ شدید اذیت میں گزارا ہے۔ اگر فون پر بات ہو جاتی تو میں اتنی اذیت میں نہیں رہتا۔''

''اب بات تو بتاؤ!''

''ڈیڈی کہیں میری شادی کر رہے ہیں۔ بات چھیڑ دی ہے انہوں نے!''

اگرچہ یاسمین خود چاہتی تھی کہ عارف کسی لڑکی سے شادی کر لے مگر عارف کے منہ سے یہ بات سن کر اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا، تاہم اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے افسردہ سی اور ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''مبارک ہو عارف!''

عارف اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنا نچلا ہونٹ کاٹنے لگا۔

یاسمین سنجیدہ ہو گئی۔ ''کیا مجھے مبارک باد نہیں دینا چاہیے تھی؟''

''میں تم سے یہ توقع نہیں کر رہا تھا کہ تم میرے زخموں پر نمک چھڑکو گی۔'' عارف کی آواز بھرا گئی۔

''تمہیں اپنے والد کی بات تو ماننا ہی ہوگی نا عارف!''

''ضروری نہیں ہے، اگر تم مجھ سے فوری طور پر شادی کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

''یہ تم کس بنیاد پر کہہ رہے ہو؟''

''ڈیڈی سے بہت تفصیلی بات ہو چکی ہے۔ وہ اس کے لیے تیار ہیں کہ اگر میں اپنی پسند کی لڑکی سے فوری طور پر شادی کر لوں تو وہ دوسری شادی موخر کر دیں گے اور مجھے یقین ہے کہ تم ان کے دل میں اپنے لیے اتنی جگہ بنا لوگی تو پھر وہ میری دوسری شادی کا ارادہ ترک ہی کر دیں گے۔''

یاسمین چند پل خاموش رہی، پھر بولی۔ ''میں تم کو کیسے سمجھاؤں کہ میں ابھی شادی نہیں کر سکتی۔''

''اپنی کاروباری مصروفیت کی وجہ سے؟''

''ہاں۔''

''شادی کے بعد ڈیڈی کو تمہاری کاروباری مصروفیت پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''کیا مطلب!'' یاسمین حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''ہاں عدیلہ!'' عارف نے کہا۔ ''میں نے ڈیڈی کو تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔''

''اوہ!''

''اب بتاؤ!'' عارف بےتابی سے بولا۔ ''اب تو کوئی رکاوٹ نہیں ہونا چاہیے تمہارے سامنے۔''

یاسمین نہ صرف خاموش رہی، بلکہ اس نے نظریں بھی

جھکالیں۔

”جواب دو عدیلہ!“ عارف اس کے بولنے کا انتظار نہیں کر سکا۔

”کیا بولوں!“ یاسمین نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

عارف بولا۔ ”اب تو کوئی رکاوٹ نہیں ہے نا؟“

”رکاوٹ تو ہے۔“

”اب کیا ہے؟“

فوری طور پر یاسمین کے دماغ میں آیا کہ وہ عارف کو بتا دے کہ اس کی ممی نے بھی اس کی شادی کہیں طے کر دی ہے لیکن وہ یہ بات زبان پر نہیں لا سکی۔ پہلے بھی اس نے سوچا تھا کہ عارف کو یہ بات وہ فون پر ہی بتا سکے گی۔

عارف نے پہلو بدلا۔ ”تم پھر خاموش ہو گئیں، بتاؤ اب کیا رکاوٹ ہے؟“

”وہ...... یاسمین...... بات کچھ ایسی ہے عارف کہ......“ اسے خاموش ہو جانا پڑا کیونکہ ویٹر آئس کریم لے آیا تھا اور ان کی میز پر رکھ رہا تھا۔

”میں نے پہلے ہی آرڈر دے دیا تھا۔“ عارف بولا۔ ”تمہیں یہاں کی آئس کریم پسند ہے نا!...... میں نے ویٹر سے کہہ دیا تھا کہ جب تم آجاؤ تو وہ آئس کریم لے آئے۔“

یاسمین چپ رہی۔ ویٹر آئس کریم رکھ کر چلا گیا۔

”ہاں۔“ عارف بولا۔ ”تم کچھ کہتے کہتے رک گئی تھیں!“

یاسمین نے اثبات میں سر ہلایا، پھر بولی۔ ”وہ بات کچھ ایسی ہے کہ میں تمہارے سامنے بیٹھ کر اپنی زبان پر نہیں لا سکتی۔ میں تمہیں فون پر بتا دوں گی۔“ یہ جواب دیتے ہوئے بھی یاسمین کا دماغ الجھا ہی رہا تھا کہ کیا وہ فون پر بھی عارف سے سچ بول سکے گی؟

”کب بتاؤ گی فون پر؟“ عارف نے پوچھا۔

”رات کو کسی وقت فون کروں گی تمہیں!“

”اچھا!“ عارف نے طویل سانس لی۔ ”میں چند گھنٹے اور انتظار کر لیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اب اپنی جو مشکل بھی بیان کرو گی، اس کا بھی کوئی حل نکال لیا جائے گا۔“

”تم وہیں شادی کیوں نہیں کر لیتے!“

”کہاں؟“ عارف چونکا۔

”جہاں تمہارے ڈیڈی چاہتے ہیں۔“

”یہ کہنے سے تو بہتر تھا کہ تم مجھے ذبح کر ڈالتیں۔“ یہ کہتے ہوئے عارف کے ہونٹ شدت سے لرز گئے تھے۔

یاسمین کے لیے یہ بہت دشوار ہوتا جا رہا تھا کہ خود کو قابو میں رکھے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتی تھی۔

”رات کو فون کروں گی میں تمہیں۔“ وہ بہ مشکل کہہ سکی اور یک لخت کرسی سے اٹھ کر تیزی سے دروازے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈگمگا رہے تھے۔ اسے یقین تھا کہ اب وہ عارف کے سامنے چند سیکنڈ بھی رکتی تو اس کے سامنے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔

عارف ہکا بکا بیٹھا رہ گیا لیکن یاسمین نے مڑ کر دیکھا ہی نہیں۔ جب وہ کیفے سے نکل رہی تھی تو چند آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک ہی گئے تھے جو اس نے ہاتھ سے پونچھ ڈالے۔

جب وہ اپنی کار میں بیٹھی تو انجن اسٹارٹ کرتے وقت اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اسے ہوش نہیں رہا تھا کہ اس نے کس طرح ڈرائیونگ کی اور کس طرح گھر تک پہنچی۔ کار سے اتر کر وہ اس طرح دروازے کی طرف لپکی جیسے اس پر دیوانگی طاری ہو گئی ہو۔ گھر میں داخل ہونے کے بعد وہ تقریباً دوڑنے کے انداز میں اپنی خواب گاہ کی طرف بڑھی تھی۔ دروازہ بھی اس نے طوفانی انداز میں کھولا اور سیدھی اپنے بستر کی طرف گئی تھی۔ اسے سینڈل اتارنے کا بھی خیال نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے بستر پر اوندھی گری۔ اس کی آنکھوں سے وہ سیلاب امنڈ پڑا جسے اتنی دیر تک روک کے رکھنے کی کوشش میں اس پر قیامت گزرتی رہی تھی۔

آنسو بھی وہ خاموشی سے نہیں بہا رہی تھی۔ اس کی سسکیوں سے اس کا سارا جسم ہل رہا تھا۔

سسکیوں اور آنسوؤں کا طوفان بتدریج کم ہوتے ہوتے تھم گیا لیکن اسے احساس نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر تک روتی رہی تھی۔ جب اس کے آنسو تھمے تو ان آنسوؤں سے اس کا سارا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔ اس کا ہاتھ بڑی آہستگی سے تکیے کے نیچے گیا اور اس نے عارف کا وہ مجموعہ نکالا جو عموماً اس کے سرہانے ہی رکھا رہتا تھا۔ اس کا پہلا مجموعہ وہ اپنی کار میں رکھتی تھی جو ریشماں نے بھی دیکھ لیا تھا۔

وہ اوندھی ہی لیٹی رہی۔ اس کی آنکھیں عارف کی تصویر پر جمی ہوئی تھیں۔

”کاش تم مجھے نہ ملے ہوتے۔“ وہ دھیمی اور گلوگیر آواز میں بولی تو اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ اسے کیفے کا وہ منظر یاد آ رہا تھا جب اس نے پہلی مرتبہ عارف کو ایک میز پر کچھ لکھتے ہوئے دیکھا تھا اور جیسے کسی مقناطیسی کشش نے اسے عارف کے قریب پہنچا دیا تھا۔ اس وقت وہ تصور بھی

نہیں کر سکی تھی کہ یہ معاملہ کس حد تک آگے بڑھ جائے گا۔

”باجی!“ آواز دھیمی تھی لیکن یاسمین اس طرح ہڑبڑا کر اٹھی جیسے اس نے کسی دھماکے کی آواز سنی ہو۔

وہ آواز ریشماں کی تھی۔ یاسمین نے دیکھا کہ وہ اس کے بستر پر ہی پائنتی کی طرف بیٹھی ہوئی تھی۔ یاسمین نے جلدی سے عارف کا مجموعہ تکیے کے نیچے سرکا دیا۔

”کب آئیں تم؟“ یاسمین نے پوچھا۔ وہ اچانک ریشماں کو دیکھ کر گھبرا سی گئی تھی۔

”میں تمہارے پیچھے پیچھے ہی آ گئی تھی، جبھی سے بیٹھی ہوں۔“ ریشماں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”میری نظر پڑ گئی تھی تم پر!...... تمہاری حالت دیکھ کر میں بہت پریشان ہو گئی تھی۔ تمہارے پیچھے کمرے میں آئی تو تم بے تحاشا رو رہی تھیں۔ تمہاری حالت یہ تھی کہ تم نے میری آہٹ بھی نہیں سنی۔ جب میں بستر پر بیٹھی تب بھی تم نے محسوس نہیں کیا کہ کوئی آ کر بیٹھا ہے، میں پریشانی سے تمہیں روتا دیکھتی رہی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تمہیں کیا صدمہ پہنچا ہے لیکن میں چپ چاپ اس لیے بیٹھی رہی کہ تم اچھی طرح اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لو۔ اس کے بعد ہی تم سے پوچھوں گی کہ...... لیکن اب تو پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ تم نے ابھی جس تصویر سے بات کی تھی، وہ میں دیکھ چکی ہوں اور تمہارا جملہ بھی سن لیا ہے۔ تم نے یہی کہا تھا نا باجی کہ کاش تم مجھے نہ ملے ہوتے۔“

یاسمین کی نظریں جھک گئیں۔ ریشماں پر اس کے دل کا راز فاش ہو چکا تھا لیکن یہ یاسمین کے لیے کوئی پریشان کن بات نہیں تھی۔

”تم عارف صاحب سے محبت کرتی ہو؟“ ریشماں نے سوال کیا۔

یاسمین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کی نظریں جھکی رہی تھیں۔

”اور......“ ریشماں پھر بولی۔ ”اب اس لیے رو رہی ہو گی کہ ممی نے تمہاری شادی طے کر دی ہے لیکن اس روز تو تمہیں کچھ نہیں ہوا تھا جب ممی نے میرے سامنے ہی تمہیں بتایا تھا۔“

یاسمین خاموش رہی۔

”خیر!“ ریشماں مسکراتی رہی۔ ”اگر تم اسی دن ممی سے پوچھ لیتیں کہ تمہاری شادی وہ کہاں طے کر رہی ہیں تو تمہیں اس وقت رونا نہیں پڑتا۔“ ریشماں نے بستر پر آگے ہو کر تکیے کے نیچے سے عارف کا مجموعہ نکالا اور تصویر کو دو انگلیوں سے تھپتھپاتے ہوئے بولی۔ ”انہی سے تو طے ہو رہی ہے تمہاری شادی!“

یاسمین شدت سے چونکی اور ریشماں کا منہ تکنے لگی۔

”تم ملو تو جا کر ان سے!“ ریشماں نے شوخی سے کہا۔ ”یہ بتائیں گے تمہیں۔“ اس کا اشارہ تصویر کی طرف تھا۔ ”چونکانا چاہتے ہوں گے یہ تمہیں...... جبھی تم کو ابھی تک اس سے بے خبر رکھا ہے۔“

”ریشماں!“ یاسمین نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”اگر یہ مذاق ہے تو بہت گھٹیا مذاق ہے جو تجھے کم از کم اپنی بڑی بہن سے نہیں کرنا چاہیے۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو باجی!“ ریشماں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”کیا میں تمہارے سر کی قسم کھاؤں کہ میں سچ کہہ رہی ہوں۔“

اب یاسمین کے لیے شک و شبے کی گنجائش نہ رہی اور وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ اب اس کا ایک اور امتحان شروع ہو گیا۔

”ابھی خوش ہونے کا وقت نہیں آیا ریشماں!“ یاسمین نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اب تو پہاڑ جیسا دوسرا امتحان شروع ہوا ہے میرا۔“

”کیوں؟“ ریشماں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

یاسمین نظریں جھکا کر سوچ میں ڈوب گئی۔

”پتا نہیں تم کیسی باتیں کرنے لگیں۔“ ریشماں پھر بولی۔ ”میں پوچھوں گی ضرور تم سے کہ یہ تمہارے لیے امتحان کیوں ہے...... ابھی تو تم ممی کے پاس چلی جاؤ۔ وہ تمہارے آنے سے پانچ منٹ پہلے آ گئی تھیں۔ ہاں کچھ جلدی آ گئیں۔ مجھ سے کہا تھا انہوں نے کہ تم آؤ تو تمہیں ان کے پاس بھیج دوں۔“

”اچھا!“ یاسمین نے آہستگی کے ساتھ بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”لیکن پہلے اپنا حلیہ تو درست کر لو...... آئینہ دیکھو گی تو پتا چلے گا۔ چہرے سے بیمار لگنے لگی ہو، آنسوؤں سے چہرہ ابھی تک بھیگا ہوا ہے۔“

یاسمین نے اپنے گال پر ہاتھ پھیرا اور آنسوؤں کی نمی محسوس کی۔

”میں منہ دھو کے کپڑے بدل لیتی ہوں۔“ یاسمین نے باتھ روم کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”تم آؤ، میں ممی کے پاس جا رہی ہوں، کہہ دوں گی

کر ابھی آئی ہو۔ کپڑے بدل کر آؤ گی۔ یہ تو میں نے کہہ دیا تھا ان سے کہ ایرپورٹ سے آنے کے بعد تم اپنی کسی دوست سے ملنے چلی گئی تھیں۔''

یاسمین کچھ کہے بغیر باتھ روم میں داخل ہوگئی۔ اس نے واش بیسن کے اوپر لگے ہوئے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ ریشماں نے جو کچھ کہا تھا، غلط نہیں تھا۔ یاسمین نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور واش بیسن میں منہ دھونے لگی۔

کپڑے تبدیل کرنے کے بعد اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کیا، پھر الماس نادر کے کمرے کی طرف چل پڑی۔

ریشماں وہیں تھی اور ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی، الماس نادر بستر پر نیم دراز تھی اور کسی سوچ میں ڈوبی نظر آرہی تھی۔

یاسمین کو دیکھتے ہی اس نے کہا۔ ''میں نے ٹھیک ہی فیصلہ کیا کہ تمہاری شادی کر دینا ضروری سمجھا۔ لاہور سے تمہاری شکایت آئی ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ تمہاری جگہ ریشماں لے لے۔ تم اب...... اچھا خیر!...... ابھی ریشماں نے بتایا کہ تم پہلے ہی سے عارف کو پسند کرتی ہو۔''

یاسمین نے نظریں جھکالیں۔

''اس نے بتایا نہیں تمہیں!'' الماس نادر نے پوچھا۔

''دوسرے ہی دن صبح ساڑھے سات کی فلائٹ سے میں اسلام آباد چلی گئی تھی۔''

''فون پر بھی رابطہ نہیں ہوا؟''

''میں ایسے موقعوں پر آپ کے اور ریشماں کے علاوہ کسی سے رابطہ نہیں کرتی۔ ڈسٹربنس ہوتی ہے۔ اسی لیے میں نے اپنا فون بدل لیا تھا۔ عارف ضرور فون کرتا۔ اسے نہیں بتایا تھا میں نے اپنا نیا نمبر!''

''عجیب سی بات کہہ رہی ہو تم!...... ریشماں بتا چکی ہے مجھے کہ تمہاری کیا حالت تھی، جب تم اسے اتنا چاہتی ہو تو نیا نمبر بھی بتانا چاہیے تھا۔''

''عارف کو میرے گھر کا پتا معلوم نہیں تھا۔ بات یہاں تک پہنچی کیسے!''

''میں نے تمہیں بتایا تھا شاید کہ رانی بیگم پڑی ہیں بیچ میں!''

''مجھے یاد نہیں رہا شاید۔''

''تین دن بعد تمہاری شادی کی تاریخ طے کرنا ہے، میں کوشش کروں گی کہ زیادہ دیر نہ لگے۔ دس بارہ دن کی تاریخ طے ہوجائے۔''

''جی۔''

یاسمین میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ الماس نادر کے سامنے اس رشتے سے انکار کرتی۔ اگر ہمت ہوتی بھی تو اس کے انکار کے بعد یہ بحث چھڑ جاتی کہ جب وہ عارف کو اتنا پسند کرتی ہے تو انکار کا سبب؟

اس کا انکار الماس نادر اور ریشماں، دونوں ہی کو حیران کرتا۔

ذرا دیر بعد جب وہ اپنے کمرے میں لوٹی تو اس نے بڑی تیزی سے اپنا موبائل اٹھایا۔ الماس نادر کے کمرے میں جاتے وقت وہ دونوں ہی موبائل ساتھ لے جانا بھول گئی تھی۔

رابطہ قائم ہوتے ہی دوسری طرف سے عارف کی آواز آئی۔ ''شکر ہے کہ تم نے ابھی فون کرلیا، رات تک کا انتظار بھی میرے لیے کچھ کم اذیت ناک نہیں ہوتا۔''

''تمہارے والد نے تمہاری شادی کہاں طے کی ہے یا کر رہے ہیں؟'' یاسمین نے کسی تمہید کے بغیر وہ سوال کر ڈالا جو اس کے دماغ میں گردش کر رہا تھا۔

عارف حیرت سے بولا۔ ''یہ پوچھنے کے لیے فون کیا تھا؟''

''ہاں۔''

''کیوں؟''

''بس جاننا چاہتی ہوں۔''

''کیا جاننا چاہتی ہو؟''

''ان لوگوں کے نام وغیرہ۔'' یاسمین نے کہا۔

''جس سے میری شادی کی بات چلائی ہے ڈیڈی نے اس کا نام یاسمین ہے۔ اسے اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے کہ اس کی چھوٹی بہن کا نام وہی ہے جو تمہاری بہن کا ہے۔ ماں کا نام الماس نادر ہے۔''

''کون لوگ ہیں یہ؟''

''مجھے اس بارے میں کچھ نہیں معلوم! میں نے ڈیڈی سے کوئی سوال نہیں کیا۔''

''اچھا! ابھی تو مجھے یہی معلوم کرنا تھا۔ اب رات ہی کو فون کروں گی۔'' یاسمین نے کہا اور رابطہ ختم کرنے کے ساتھ ہی موبائل ''پاور آف'' بھی کر دیا۔ اسے یقین تھا کہ عارف بے تاب ہوکر اسے فون کرے گا اور اس سے معلوم کرنا چاہے گا کہ اس نے وہ پوچھ گچھ کیوں کی تھی اور یاسمین اسے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکتی تھی۔

موبائل فون ایک طرف ڈال کر وہ بستر پر نیم دراز حالت میں سر پکڑے سوچتی رہی کہ اب کیا کرے......! وہ

اب پہلے سے زیادہ کڑے امتحان میں پڑ گئی تھی، اچانک اس کے دماغ میں ایک بات آئی اور اس نے اس بارے میں کچھ سوچے سمجھے بغیر اپنا وہ موبائل اٹھایا جس کا نمبر عارف کے پاس نہیں تھا۔ وہ اس پر میسج ٹائپ کرنے لگی۔ ٹائپ کرنے کے بعد اس نے ایک بار اسے پڑھا۔ اس نے ٹائپ کیا تھا۔

''عارف صاحب!...... آپ کو حیرت ہوگی کہ میں ''یاسمین'' آپ سے مخاطب ہو رہی ہوں۔ وہی یاسمین جس سے آپ کی شادی طے ہو رہی ہے۔ میں آپ سے ایک التجا کرنا چاہتی ہوں جو آپ کو بہت عجیب لگے گی۔ آپ اس شادی سے انکار کر دیجیے۔ آپ مرد ہیں، ایسا کر سکتے ہیں لیکن میں لڑکی ہوں، میں ہمت نہیں کر سکتی۔ کوئی وجہ ہے کہ ہماری شادی نہ ہونا ہی بہتر ہوگا۔ آپ ایک اچھے شاعر ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ایک اچھے انسان بھی ہوں گے اس لیے میری التجا نظر انداز نہیں کریں گے۔''

یاسمین نے دو مرتبہ عبارت پڑھی اور پھر وہ پیغام عارف کے موبائل نمبر پر بھیج دیا۔ عبارت کے آخر میں اس نے اپنا نام لکھنا غیر ضروری سمجھا تھا۔ وہ پیغام کی ابتدا ہی میں لکھ چکی تھی کہ وہ کون ہے......

پیغام تو اس نے بھیج دیا لیکن متفکر رہی۔ اس نے سوچے سمجھے بغیر یہ قدم اٹھا ڈالا تھا لیکن اب سوچ رہی تھی کہ کیا اس کا یہ اقدام درست ثابت ہوگا؟

یہ یقین اسے بہرحال تھا کہ عارف یہ پیغام پڑھ کر خوش ہوجائے گا اور اسے فون کر کے بتائے گا بھی لیکن پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ عارف کی کال نہیں آئی۔ تب اچانک یاسمین کو خیال آیا کہ اس نے اپنا موبائل فون تو عارف سے بات کرنے کے بعد ''پاور آف'' کر دیا تھا۔ اعصابی تناؤ اور ذہنی خلفشار ہی اتنا تھا کہ وہ کوئی بات بھی بھول سکتی تھی۔ اس نے موبائل اٹھا کر اسے ''آن'' کیا۔ اسے یقین تھا کہ عارف کو اس کا نمبر بند ملا ہوگا تو وہ صبر نہیں کرے گا، بار بار اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے گا۔

یہ خیال درست ثابت ہوا۔ پانچ منٹ بعد عارف کی کال آگئی۔

''یہ کیا کرتی ہو تم!'' اس کے لہجے میں قدرے جھنجلاہٹ تھی۔ ''تم نے بتایا تھا کہ تم شہر سے باہر جاتی ہو تو اپنا یہ موبائل بند کر دیتی ہو لیکن اب تو تم کراچی ہی میں ہونا؟''

''سوری۔'' یاسمین نے آہستہ سے کہا۔ ''تم سے بات کرنے کے بعد میں بے خیالی میں فون بند کر بیٹھی تھی۔ دو

تین منٹ پہلے اسے کھولا ہے۔ کیا تم نے فون کیا تھا؟“

”تیسری مرتبہ کر رہا ہوں۔ دو مرتبہ تو فوراً کوشش کی تھی۔“

”فوراً کیا مطلب؟“

”یاسمین نے مجھے ایس ایم ایس کیا ہے۔ وہ پڑھتے ہی میں نے تم سے رابطے کی کوشش کی تھی۔ فی الحال تو میرا دماغ ہلکا ہو گیا ہے۔ یاسمین مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔“

”کیا مطلب!“ یاسمین انجان بن گئی۔

”بعد میں بات کریں گے۔ پہلے تم اس کا ایس ایم ایس پڑھ لو۔ میں تمہیں بھیج رہا ہوں۔“ دوسری طرف عارف بہت بے تاب تھا۔ اس نے فوراً ہی رابطہ منقطع کر دیا تاکہ ایس ایم ایس بھیج سکے۔

ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ اس کا ایس ایم ایس آ گیا۔ وہی ایس ایم ایس جو یاسمین نے اسے بھیجا تھا...... یاسمین کے ہونٹوں پر ہلکی سی افسردہ مسکراہٹ ابھری اور معدوم ہو گئی۔

پھر دو منٹ اور گزرے تھے کہ عارف کی کال بھی آ گئی۔

”مل گیا ایس ایم ایس؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔ پڑھ لیا میں نے......! ہو سکتا ہے یہ یاسمین کسی اور کو پسند کرتی ہو، اس سے شادی کرنا چاہتی ہو۔“

”کچھ بھی ہو، میری بلا سے......! فی الحال میری جان تو چھوٹ جائے گی۔ میں نے ڈیڈی کو فون پر بتا دیا ہے۔“

”کیا!“ یاسمین چونکی۔

”بلکہ وہ ایس ایم ایس بھی انہیں بھیج دیا ہے۔“

یاسمین قدرے بوکھلا گئی۔ اس نے کہا۔ ”تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا عارف!...... اس بے چاری نے تم پر اعتماد کیا تھا۔ تم نے اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔“

”میرے لیے اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا عدیلہ!...... میں ڈیڈی کو یہ ایس ایم ایس دکھائے بغیر اپنی جان نہیں چھڑا سکتا تھا۔“

”اچھا اب تم اس کا ایس ایم ایس ڈیلیٹ تو کر دو!“ یاسمین نے تیزی سے کہا۔

”کیوں؟“ عارف نے تعجب سے پوچھا۔

”اس کا موبائل نمبر ہو گا نا ایس ایم ایس کے ساتھ......! تم نے اس کا ایس ایم ایس اپنے ڈیڈی کو بھیجا ہو گا تو اس کے ساتھ اس کا نمبر تو نہیں گیا ہو گا۔ بعد میں تم اپنے ڈیڈی سے کہہ دینا کہ تم غلطی سے وہ ایس ایم ایس ڈیلیٹ کر چکے ہو۔ اس طرح اس بے چاری کی جان بچ سکتی ہے۔ وہ اپنے گھر والوں سے کہہ سکتی ہے کہ وہ ایس ایم ایس اس نے نہیں کیا۔“

دوسری طرف خاموشی رہی۔

”ہیلو!“ یاسمین قدرے بلند آواز میں بولی۔ ”تم چپ کیوں ہو گئے؟“

”میں ڈیڈی کو وہ نمبر بھی بھیج چکا ہوں۔“

یہ جواب سنتے ہی یاسمین کو اپنا دماغ چکراتا ہوا محسوس ہوا۔

عارف کہہ رہا تھا۔ ”ایس ایم ایس ملنے کے بعد ہی ڈیڈی نے فون پر مجھ سے کہا تھا کہ میں وہ نمبر بھی انہیں بھیجوں چنانچہ میں نے بھیج دیا۔ میں نے تو تمہیں فوراً فون کرنا چاہا تھا۔ اگر اس وقت تم سے بات ہو جاتی تو شاید میں تمہاری یہ بات مان لیتا۔ شاید کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ نمبر نہ ہونے کی وجہ سے ڈیڈی شبے میں پڑ جاتے کہ اس شادی سے بچنے کے لیے ایس ایم ایس کی چالاکی خود میں نے کی ہے۔ ڈیڈی اس ایس ایم ایس سے بہت الجھ گئے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ وہ ابھی دفتر سے واپس گھر پہنچ رہے ہیں حالانکہ عموماً وہ اتنی جلدی نہیں آتے۔“

عارف کی آواز یاسمین کو کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ ایس ایم ایس کر کے اس نے کتنی بڑی غلطی کی تھی۔ اب یہ معاملہ یہیں ختم نہیں ہو سکتا تھا۔

”عدیلہ!“ عارف کے لہجے میں اس مرتبہ کچھ افسردگی تھی۔ ”کیا تمہیں اس بات سے ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی کہ میں اس شادی سے بچ گیا۔“

یاسمین نے طویل سانس لی۔ ”اب دیکھنا ہو گا کہ تم اس شادی سے بچ سکو گے یا نہیں۔“

”اب کیوں نہیں بچ سکوں گا...... اب تو جواز ہے میرے پاس...... میں ڈیڈی سے کہہ سکتا ہوں کہ جب وہ لڑکی خود ہی مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی تو میں زبردستی اس سے شادی کیوں کروں۔“

یاسمین جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ ریشماں تیزی سے دروازہ کھولتی ہوئی اندر آئی، پھر یاسمین کو موبائل پر کسی سے بات کرتے دیکھ کر ٹھٹک جانے والے انداز میں دروازے کے قریب ہی رک گئی۔

”کوئی آ گیا ہے۔ میں تم سے بعد میں بات کروں گی۔“ یاسمین نے دھیمی آواز میں کہہ کر رابطہ منقطع کیا اور

سوالیہ نظروں سے ریشماں کی طرف دیکھا۔

”ممی بلا رہی ہیں تمہیں!“ ریشماں نے فکرمند لہجے میں کہا۔

”تو اتنی پریشان کیوں نظر آ رہی ہو!“ یاسمین کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔

”باجی!“ ریشماں غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تم نے کوئی ایسی حرکت کی ہے کیا باجی کہ ممی کو غصہ آئے۔“

یاسمین کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسے خیال آیا تھا کہیں ایسا تو نہیں کہ عارف کے والد نے اس کی ممی سے بات کی ہو اور انہیں وہ ایس ایم ایس بھیج دیا ہو جو اس نے عارف کو بھیجا تھا؟

”نہیں تو......“ یاسمین بہ مشکل بول سکی۔ ”مجھے کچھ نہیں معلوم کہ ممی کو میری کیا بات بری لگی ہو گی۔“

”جانے کیا بات ہے پھر!“ ریشماں الجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”وہ بھی غصے میں ہیں اور ماما بھی......“

”ماما؟“ یاسمین چونکی۔

”ہاں......“ ریشماں نے جواب دیا۔ ”ابھی چند منٹ پہلے تو آئے ہیں اسلام آباد سے......! میں اس وقت برآمدے میں تھی۔ بالکل ٹھیک موڈ تھا اس وقت ان کا۔ مجھ سے دو ایک باتیں کر کے وہ ممی کے کمرے کی طرف چلے گئے۔“ ریشماں نے اپنی بات دہرائی، پھر بولی۔ ”میں اس وقت مالی کو لان کے پودوں کے بارے میں کچھ سمجھا رہی تھی۔ اس سے باتیں کر کے میں ممی کے کمرے کی طرف گئی کہ ماما سے باتیں کروں۔ میں نے وہاں قدم رکھا ہی تھا کہ ممی نے مجھ سے کہا۔ ”اچھا ہوا تم آ گئیں، ذرا بلا کے تو لاؤ اسے، اپنی باجی کو......!“ ان کے چہرے سے غصہ صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ یہی حالت ماما کی تھی، وہ تو غصے میں ٹہل رہے تھے۔ جانے کیا بات ہوئی ہے کہ وہ انہوں نے شاید ماما کو بھی بتائی اور انہیں بھی غصہ آ گیا۔ میں ابھی کہہ چکی ہوں باجی کہ وہ جب آئے تھے تو بالکل ٹھیک تھے۔ مجھ سے ہنس کر بات کی تھی۔ ممی کے کمرے میں جانے کے بعد پتا نہیں کیا ہوا۔“

”چلو۔“ یاسمین نے آہستہ سے کہا اور دروازے کی طرف قدم بھی اٹھائے۔

”سوچ لو باجی!“ ریشماں بولی۔

”کیا سوچ لوں؟“

”اگر تم نے کوئی ایسی بات کی ہے جو ممی کو بری لگی ہے تو تم پہلے ہی سے سوچ لو کوئی بہانہ......“

”چل تو سہی! دیکھتی ہوں کیا بات ہے۔“

ریشماں ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑا کر اس کے ساتھ کمرے سے نکل آئی۔ یاسمین محسوس کر رہی تھی کہ اس کے قدم بوجھل ہو رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگر وہی بات ہوئی جس کا اسے خیال آیا تھا تو اب وہ کیا کہہ سکے گی۔

جب وہ دونوں الماس نادر کے کمرے میں داخل ہوئیں تو یاسمین کی نظر فوری طور پر ماما پر ہی پڑی۔

ماما نجیب خان الماس نادر سے دو چار سال چھوٹا تھا۔ اس کا قد خاصا نکلتا ہوا تھا۔ چوڑے پائنچوں کا پاجامہ، شیروانی، سلیم شاہی جوتی اور سر پر قراقلی ٹوپی میں وہ ٹھیٹ مشرقی شخص نظر آتا تھا۔ اسلام آباد میں لوگ اسے نواب زادہ نجیب خان کے نام سے جانتے تھے اور مشہور تھا کہ وہ رام پور کے نواب کی فیملی سے تعلق رکھتا تھا۔

وہ اس وقت بھی ٹہل رہا تھا۔ الماس نادر بیٹھی ہوئی اس طرح اپنی پیشانی سہلا رہی تھی جیسے سر میں درد ہو لیکن یاسمین کو دیکھتے ہی وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور یاسمین کو گھورنے لگی۔ نجیب خان بھی ٹہلتے ٹہلتے رک کر یاسمین کی طرف دیکھنے لگا۔

ریشماں کچھ گھبرائے ہوئے سے انداز میں بولی۔ ”کیا میں جاؤں ممی؟“

”ضروری نہیں! تمہاری موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ الماس نادر نے کہا، پھر یاسمین کو گھورتی ہوئی بولی۔ ”کیا میں تمہیں پاگل سمجھ لوں؟“

یاسمین خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

”یہ دیکھو!“ الماس نادر نے اپنا موبائل فون اس کی طرف بڑھایا۔

یاسمین کو چند قدم آگے بڑھ کر موبائل لینا پڑا۔

”کیا ہے ممی؟“ اس نے موبائل لیتے ہوئے پوچھا تھا۔

”خود دیکھ لو، کیا ہے اسکرین پر!“

الماس نادر کے بولنے سے پہلے ہی یاسمین کی نظر موبائل اسکرین پر پڑی اور اسے اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی۔ اسکرین پر اسی ایس ایم ایس کی ابتدائی سطریں دکھائی دے رہی تھیں جو اس نے عارف کو بھیجا تھا۔

”رانی بیگم کو عارف کے والد نے فون کیا تھا اور یہ ایس ایم ایس بھی بھیجا تھا۔“ الماس نادر ترش لہجے میں بولی۔ ”رانی بیگم نے مجھے فون کیا اور یہ ایس ایم ایس بھی بھیج دیا۔

عارف کو یہ ایس ایم ایس اسی نمبر سے بھیجا گیا ہے جو تم اسلام آباد سے مجھے فون کرتے ہوئے استعمال کیا کرتی تھیں۔"

یاسمین خاموش کھڑی رہ گئی۔

"تمہارا وہ موبائل کہاں ہے؟" الماس نادر نے پوچھا۔

یاسمین کو اپنا حلق خشک ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بہ مشکل بول سکی۔ "میرے کمرے میں۔"

"جاؤ!" الماس نادر نے ریشماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس کے کمرے سے وہ موبائل لے کر آؤ۔"

ریشماں دروازے کی طرف مڑنے ہی والی تھی کہ یاسمین بول پڑی۔ "کیا کریں گی وہ منگوا کے ممی!"

"اگر تم نے یہ ایس ایم ایس اپنے موبائل سے اڑایا نہیں ہے تو وہ اب بھی موجود ہوگا اس میں!"

"جی ہاں۔" یاسمین نظریں جھکائے ہوئے بولی۔ "وہ ہے اس میں۔"

"کیوں؟" الماس نادر نے کڑے تیوروں کے ساتھ کہا۔ "تم تو اس سے محبت کرتی ہو...... جب تمہیں یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ تمہاری شادی اسی سے کی جا رہی ہے تو تم اس کے لیے تڑپ رہی تھیں۔ ریشماں نے مجھے بتایا تھا کہ تمہاری کیا حالت تھی۔"

یاسمین چپ رہی۔

"جواب کیوں نہیں دیتیں!" نجیب خان یکا یک گرجا۔

یاسمین سہم گئی۔ وہ نجیب خان سے بہت ڈرتی تھی۔

"میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی ماما!" یاسمین کی آواز میں لرزش تھی۔

"کیوں؟" نجیب خان اس مرتبہ حیرت سے بولا۔ "اس سے محبت کرتی ہو لیکن اس سے شادی نہیں کرنا چاہتیں۔"

"جی ماما!" یاسمین کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"کیا عارف اس بات سے پریشان نہیں کہ تم اس سے محبت کرنے کے باوجود اس سے شادی نہیں کرنا چاہتیں...... کیا تمہاری محبت یک طرفہ ہے؟...... میرا مطلب ہے، کیا عارف تمہیں نہیں چاہتا؟ تمہارا جو یہ ایس ایم ایس ہے، یعنی جو تم نے عارف کو بھیجا، اس سے بھی شبہ ہوتا ہے جیسے عارف تم سے واقف نہیں۔"

"جی ہاں۔ مجھ سے واقف نہیں ہے وہ۔" یاسمین کا یہ جواب ایک اعتبار سے سچ ہی تھا۔ عارف اسے عدیلہ کے نام سے جانتا تھا۔

نجیب خان کی ان باتوں کے دوران میں الماس نادر جو خاموش رہی تھی، یکا یک بول اٹھی۔ "ریشماں نے مجھے بتایا تھا کہ تم اس کی تصویر دیکھ کر رو رہی تھیں اور تم نے یہ بھی کہا تھا کہ کاش تم اس سے نہ ملی ہوتیں۔ کیوں ریشماں!"

"جی۔" ریشماں نے آہستہ سے کہا۔ وہ پریشان سی ایک طرف کھڑی ہوئی تھی۔

الماس نادر پھر یاسمین کو گھورنے لگی۔ نجیب خان کی نظریں بھی یاسمین پر جمی ہوئی تھیں۔

یاسمین بولی۔ "اس سے میری ملاقات ایک کیفے میں ہوئی تھی۔ میں نے اس سے آٹوگراف لیا تھا۔ اس سے ایک مداح کی حیثیت سے ملی تھی۔"

"اس کے بعد کبھی نہیں ملیں؟"

"ملی ہوں۔"

"ابھی تم نے کہا تھا کہ۔" نجیب خان بول پڑا۔ "عارف تم سے واقف نہیں۔"

"وہ مجھے یاسمین کے نام سے نہیں جانتا۔"

"کیا مطلب؟"

"میں نے اسے اپنا نام عدیلہ بتایا تھا۔ وہ مجھے عدیلہ کے نام سے جانتا ہے۔"

"کیوں؟" الماس نادر چونک کر بولی۔

"پہلی بار ملی تھی اس سے......! مناسب نہیں سمجھا تھا کہ اسے اپنا اصلی نام بتاؤں۔ پھر بعد کی ملاقاتوں میں مجھے ہمت نہیں ہوئی کہ اسے اپنی غلط بیانی کے بارے میں بتاؤں۔"

"کیا تم سے...... یعنی عدیلہ سے بھی محبت نہیں کرتا؟"

اب جانے کیوں یاسمین کے لیے جھوٹ بولنا مشکل ہو گیا تھا۔ "کرتا ہے۔" وہ بہ مشکل بول سکی۔

"لیکن یاسمین نامی لڑکی سے بھی شادی کے لیے تیار ہو گیا...... ظاہر ہے کہ اگر وہ تیار نہ ہوا ہوتا تو اس کے باپ کو یہ بات چھیڑنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی......"

"وہ اس شادی کو ٹال سکتا ہے اگر میں...... یعنی عدیلہ اس سے شادی کے لیے آمادہ ہو جائے۔"

"تو تم آمادہ کیوں نہیں ہو؟"

"میں اس سے محبت کرتی ہوں۔" یاسمین لرزیدہ آواز میں بولی۔ "میں اسے دھوکا نہیں دینا چاہتی۔"

"کیسا دھوکا؟"

"میں نے اسے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

"آئندہ بھی نہ بتانا......"

"وہ جان لے گا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ شادی کے بعد

کوئی مرد......"

"اس کی پروا مت کرو تم!" الماس نادر بول پڑی۔ "اس کا بندوبست ہو جائے گا۔"

"میرے ضمیر میں تو کھٹک رہے گی۔" یاسمین دبی زبان سے بولی۔

"بکواس مت کرو۔" نجیب خان پھر گرجا۔ "تمہاری شادی اسی سے ہوگی۔ فضول قسم کی دلیلیں مت دو۔" پھر وہ الماس نادر کی طرف متوجہ ہوا۔ "تم رانی بیگم کو فون کر کے اسے کہہ دو کہ وہ ایس ایم ایس یاسمین نے نہیں بھیجا تھا۔ یہ اس کی ایک دوست کی شرارت ہے۔ یاسمین کو اس شادی سے انکار نہیں۔" اس کے بعد وہ پھر یاسمین سے مخاطب ہوا۔ "اب تم جاؤ، یہ خیال اپنے ذہن سے نکال دو کہ تم اس سے شادی نہیں کرو گی۔ اگر تم چاہو تو اس سے ملاقات کر کے اسے بتا دو کہ تم عدیلہ نہیں، یاسمین ہی ہو اور اگر نہ بتانا چاہو تو بھی کوئی حرج نہیں۔ شادی کے بعد جب وہ یاسمین کے بجائے عدیلہ کو دیکھے گا تو حیران رہ جائے گا۔ اسے خوشی بھی ہوگی اور...... اچھا خیر! اب تم جاؤ اور تم رانی بیگم کو فون کرو الماس!" وہ عمر میں چھوٹا ہونے کے باوجود الماس نادر کو اس کے نام ہی سے مخاطب کرتا تھا۔

یاسمین روہانسی ہو گئی تھی۔ اسی کیفیت میں وہ اپنے کمرے سے نکلی۔ اس کے پیچھے ریشماں بھی نکل آئی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے آستین سے اپنی آنکھیں خشک کیں۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ ریشماں اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

"تم جاؤ ریشماں!" اس نے پلٹ کر ریشماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اس وقت تنہائی چاہتی ہوں۔ پلیز!"

"لیکن باجی، میں تم سے اسی معاملے میں تو باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ آخر تم......"

"پلیز!" یاسمین نے اس کی بات کاٹی۔ "وہ پھر کسی وقت کر لینا۔ اس وقت مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ میرا دماغ چکرا رہا ہے۔"

"اچھا باجی!" ریشماں نے ٹھنڈی سانس لی۔

یاسمین نے اس کے واپس جاتے ہوئے قدموں کی چاپ سنی تو مڑ کر دروازہ بند کیا وہ کھوئی کھوئی سی اپنے بستر کی طرف بڑھی۔ بستر پر لیٹ کر وہ چھت کو تکنے لگی۔ وہ چند لمحوں میں بالکل بدل گئی تھی۔ کہاں تو کمرے میں داخل ہوتے وقت اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں لیکن پھر اسے جانے کیا خیال آیا تھا کہ یکا یک اس کا چہرہ بالکل سپاٹ ہو گیا تھا۔ ہر قسم کے تاثرات سے عاری، جیسے وہ پتھرا گئی ہو۔

ایک ڈیڑھ گھنٹا اس طرح گزر گیا کہ وہ بستر پر لیٹی چھت کو تکتی رہی۔ اس عرصے میں اس کی پلکیں بھی معمول سے کم جھپکیں۔ بہت سے خیالات اس کے دماغ میں چکراتے رہے تھے۔ آخر اس کے جسم نے حرکت کی۔ اس نے اپنا دوسرا موبائل فون اٹھایا جس سے وہ عارف کو ایک مرتبہ ایس ایم ایس کر چکی تھی۔

اب وہ ایک اور ایس ایم ایس کرنا چاہتی تھی۔ اس نے ٹائپ کرنا شروع کیا۔

"عارف صاحب!...... میں، یاسمین آپ سے ایک بار پھر مخاطب ہو رہی ہوں۔ مجھے بالکل خیال نہیں تھا کہ میں نے آپ کو جو ایس ایم ایس بھیجا تھا، وہ آپ کی ذات تک محدود نہیں رہے گا۔ وہ سب کچھ میری والدہ تک پہنچ گیا۔ میں بڑی مشکل میں پھنس گئی۔ میں نے کہا تھا نا کہ میں ایک لڑکی ہوں، شادی سے انکار کی ہمت نہیں کر سکتی۔ مجبوراً مجھے یہ بہانہ بنانا پڑا کہ میرا موبائل کچھ دیر کے لیے میری ایک دوست کے پاس رہا تھا۔ وہ ایس ایم ایس بھیجنا اس کی شرارت ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ بات آپ تک پہنچ گئی ہو۔ اگر نہیں پہنچی تو جلد ہی پہنچ جائے گی۔ میں چاہتی ہوں کہ انکار آپ ہی کی طرف سے ہو۔ اب میں مجبور ہو گئی ہوں کہ آپ سے مل کر آپ کو بتا دوں کہ میں شادی کیوں نہیں کرنا چاہتی۔ کل آپ مجھ سے مل لیجیے۔ میری درخواست ہے کہ یہ ایس ایم ایس آپ اپنی ذات تک محدود رکھیے گا۔ مجھ سے ملنے کے بعد آپ کو اختیار ہوگا کہ آپ کو کیا قدم اٹھانا چاہیے۔"

یہ تحریر ٹائپ کرنے کے بعد یاسمین نے اسے دو مرتبہ پڑھا۔ پھر اس میں اضافہ کیا کہ دوسرے دن کس وقت اور کس جگہ ملاقات ہوگی۔

عارف کو یہ ایس ایم ایس کرنے کے بعد اسے یہ پریشانی لاحق نہیں تھی کہ عارف اس کے بارے میں بھی اپنے والد کو بتا دے گا۔ اس کی جو وجہ اس کے ذہن میں تھی وہ سامنے بھی آ گئی۔ اس کے اس موبائل کی گھنٹی بجنے لگی جس کا نمبر عارف کے علم میں تھا۔ یاسمین نے وہ فون اٹھایا۔ کال واقعی عارف کی تھی۔ یاسمین کو یہی یقین تھا کہ وہ ایس ایم ایس ملنے کے بعد عارف فوری طور پر اسی کو فون کرے گا۔

"ہاں عارف!" یاسمین نے موبائل کان سے لگا کر کہا۔

''عجیب صورت حال بن رہی ہے۔'' دوسری طرف سے عارف نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''اب کیا ہوا؟'' یاسمین نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''میں تمہیں تفصیل بتانے کے بجائے وہ دوسرا ایس ایم ایس تمہیں بھیج دیتا ہوں جو یاسمین نے مجھے ابھی ابھی بھیجا ہے۔ اس سے تم خود ساری بات سمجھ لوگی۔''

''پھر آیا ہے ایس ایم ایس؟'' یاسمین نے سادگی سے پوچھا۔

''ہاں، وہ میں بھیج رہا ہوں تمہیں۔ وہ پڑھنے کے بعد تم مجھے فون کرنا۔ میں تم سے اس بارے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔''

یاسمین کے کچھ بولنے سے پہلے ہی دوسری طرف سے رابطہ منقطع کیا جاچکا تھا۔ یاسمین نے بھی اپنا موبائل بند کیا اور انتظار کرنے لگی۔ اس کا چہرہ اب بھی سپاٹ تھا۔

جلد ہی اس کے موبائل پر وہ ایس ایم ایس آگیا جو اس نے عارف کو بھیجا تھا۔

ایک منٹ بعد اس نے عارف کے موبائل.... رابطہ کیا۔

''پڑھ لیا؟'' عارف نے بے تابی سے پوچھا تھا۔

''ہاں۔'' یاسمین نے کہا۔ ''جانے کیوں نہیں چاہتی یہ لڑکی تم سے شادی کرنا...... بات میری سمجھ میں بھی نہیں آرہی ہے۔''

''وہ تو میری سمجھ میں بھی نہیں آرہی ہے لیکن اب کام بن جائے گا۔''

''کیا مطلب!''

''میں تم سے کہہ چکا ہوں ناکہ میں خود اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ اب مجھے ڈیڈی سے بات کرنے کا موقع مل جائے گا۔ میں ان سے کہہ سکتا ہوں کہ جو لڑکی شادی سے پہلے ہی مجھ سے اس قسم کا لچر مذاق کر رہی ہو، اس سے میں ہرگز شادی نہیں کروں گا۔''

''یعنی تم یہ ایس ایم ایس بھی اپنے ڈیڈی کو......''

''ہاں۔'' عارف نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''یہ مجھے بہت اچھا موقع مل گیا ہے۔''

''مجھے افسوس ہوگا اگر تم نے ایسا کیا۔''

''کیوں؟'' عارف کے لہجے میں حیرت تھی۔

''وہ بے چاری نہ جانے کس بپتا میں گرفتار ہے۔ تمہیں اس سے ہمدردی ہونا چاہیے۔ وہ تم سے ایک مرتبہ ملنا چاہتی ہے۔ مل لوگے تو کیا فرق پڑے گا......؟ ملنے کے بعد بھی تم جو چاہو، کر سکتے ہو۔ اپنی مرضی کے مالک ہو تم! لیکن اچھی بات یہی ہوگی کہ پہلے تم اس سے مل لو۔ جان تو لو کہ وہ بے چاری آخر کس مصیبت میں گرفتار ہے۔''

''تمہارے اس مشورے سے میں ایک ہی مطلب اخذ کر سکتا ہوں۔''

''مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ تم کیا مطلب اخذ کر سکتے ہو۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ مجھے جس عارف سے محبت ہے، وہ ایک اچھا انسان ہونے کا ثبوت دے۔ اس لڑکی نے تم سے درخواست کی ہے، التجا کی ہے، اسے نظر انداز کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہوگی عارف!''

عارف نے جواب میں فوراً کچھ نہیں کہا۔ یاسمین نے ایسی آواز سنی جیسے عارف نے ایک طویل سانس لی ہو۔

''کیا میں کچھ غلط کہہ رہی ہوں عارف؟'' یاسمین بولی۔

''چھوڑو اس بحث کو...... میں کل مل لیتا ہوں اس سے...... اس کے بعد ہی فیصلہ کروں گا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے بلکہ میں ابھی اسے فون کرتا ہوں۔ کل تک الجھن میں پڑا رہوں گا۔ اگر وہ مجھ سے آج ہی مل لے تو بہتر ہوگا۔ کل تک کی الجھن سے تو بچ جاؤں گا۔''

''اگر تم آج ہی ملنا چاہتے ہو تو بھی اسے ایس ایم ایس ہی کرو۔ وہ تم سے بات کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہی ہوگی، ورنہ ایس ایم ایس کیوں بھیجتی، فون کر لیتی تمہیں!''

''کوشش کر کے دیکھ لیتا ہوں۔ اگر اس نے کال ریسیو نہیں کی تو پھر ایس ایم ایس ہی کر دوں گا۔''

''ایسا کرو۔''

''اس سے بات کر کے میں تمہیں پھر فون کروں گا۔''

''اچھا۔''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

یاسمین انتظار کرنے لگی۔ جلد ہی اس کے دوسرے موبائل کی گھنٹی بجی۔ یاسمین کو یقین تھا کہ کال عارف ہی کی ہوگی، تاہم اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا۔ اسکرین پر عارف ہی کا نمبر تھا۔ یاسمین نے کئی گھنٹیاں بجنے کے باوجود کال ریسیو نہیں کی۔

آخر گھنٹیاں بجنا بند ہوئیں۔ پھر کچھ وقفے سے ایس ایم ایس آیا۔

عارف نے لکھا تھا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آسکا کہ تم مجھ سے بات کرتے ہوئے کیوں ہچکچا رہی ہو۔ خیر!...... میں تمہاری یہ بات مان رہا ہوں کہ تم سے ملاقات کرنے تک یہ ایس ایم ایس اپنی ذات تک محدود رکھوں لیکن کل تک الجھن میں پڑے رہنا میرے لیے مشکل ہوگا۔ تم مجھ سے

ابھی، ایک گھنٹے کے اندر اندر مل لو، اسی جگہ جو تم نے تجویز کی ہے، میں تمہارا انتظار کروں گا۔ اگر تم نہیں آئیں تو میرے لیے مشکل ہوگا کہ یہ ایس ایم ایس اپنی ذات تک محدود رکھوں۔''

یاسمین نے پیغام پڑھنے کے بعد عارف کو یہ ایس ایم ایس بھیجا۔

''اچھا! میں ایک گھنٹے میں پہنچ جاؤں گی۔ میں آپ کو پہچانتی ہوں اس لیے آپ کی میز تک پہنچنا میرے لیے مشکل نہیں ہوگا۔''

یاسمین نے ملاقات کے لیے ایک ایسے ریسٹورنٹ کا نام تجویز کیا تھا جہاں بہت کم لوگ جاتے تھے حالانکہ وہ ریسٹورنٹ برا نہیں تھا۔

وہاں پہنچنے میں یاسمین کو آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگتا اس لیے وہ فوراً بستر سے نہیں اٹھی۔ اس کے چہرے سے اب قدرے پریشانی ظاہر ہونے لگی تھی۔ اس نے دوسرے دن تک کی مہلت اس لیے چاہی تھی کہ عارف کو سب کچھ بتانے کے لیے خود کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کر سکے۔ جو کچھ اسے بتانا تھا، وہ زبان پر لانا اس کے لیے آسان نہیں تھا لیکن وہ اس خیال سے فوراً ملنے پر آمادہ ہوئی تھی کہ عارف واقعی دوسرے دن تک ضبط نہیں کر پاتا اور ایس ایم ایس کی بات اس کے ڈیڈی سے ہوتی ہوئی الماس نادر تک پہنچ جاتی۔

باتھ روم میں جا کر یاسمین نے منہ پر پانی کے چھپکے مارے۔ اس طرح وہ خود کو تازہ دم کرنا چاہتی تھی۔ ڈریسنگ ٹیبل کی کرسی پر بیٹھ کر اس نے اپنا میک اپ بھی درست کیا، پھر اپنے کمرے سے نکلی۔

ریشماں اپنے کمرے میں تھی۔ یاسمین نے وہاں جا کر اس سے کہا۔ ''میری دوست کی طبیعت پھر کچھ زیادہ خراب ہوگئی ہے۔ اس کی بہن کا فون آیا تھا ابھی!...... میں اسی کے گھر جا رہی ہوں، ممی کو بتا دینا۔''

''اچھا۔'' ریشماں نے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

یاسمین مڑی اور تیزی سے چلتی ہوئی بنگلے سے نکل آئی۔ وہ اس وقت الماس نادر یا نجیب خان کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

کار ڈرائیو کرتے ہوئے وہ عارف سے بات کرنے کے لیے اپنی ہمت مجتمع کرنے میں کوشاں رہی۔

طے شدہ وقت سے پانچ منٹ پہلے ہی اس کی کار ریسٹورنٹ کے سامنے پارک ہو چکی تھی لیکن اس نے کار سے اترنے میں تین منٹ لگا دیے۔ پھر کار سے اتر کر ریسٹورنٹ کی طرف بڑھی جو اوپری منزل پر تھا۔ وہ عارف کے مزاج کو جانتی تھی اس لیے اسے یقین تھا کہ عارف وقت سے پہلے ہی ریسٹورنٹ پہنچ چکا ہوگا۔

اس کا یقین درست ثابت ہوا۔

''تم!'' عارف اسے دیکھ کر چونک پڑا۔

''ہاں۔'' یاسمین اپنا وینٹی بیگ گود میں رکھتے ہوئے عارف کے سامنے کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''تمہیں نہیں آنا چاہیے تھا عدیلہ!'' عارف پہلو بدل کر بولا۔ ''ممکن ہے کہ وہ تمہارے سامنے مجھ سے بات نہ کرنا چاہے اور تمہیں دیکھ کر واپس لوٹ جائے۔''

''ایسی صورت میں وہ تمہیں ایس ایم ایس ضرور کرے گی۔ اگر ایسا ہوا تو میں چلی جاؤں گی۔'' یاسمین نے اپنی گود میں رکھا ہوا وینٹی بیگ کھولتے ہوئے کہا۔

''لیکن۔'' عارف بولا۔ ''تم نے اس وقت آنا کیوں ضروری سمجھا؟''

''ابھی بتاتی ہوں۔'' یاسمین نے جواب دیتے ہوئے وینٹی بیگ سے اپنا وہ موبائل نکالا جس سے وہ عارف کو ایس ایم ایس کرتی رہی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ گود میں ہی رکھے تاکہ عارف وہ موبائل نہ دیکھ سکے۔

عارف الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

یاسمین نے ایس ایم ایس ٹائپ کیا۔ ''عارف!...... میں یعنی یاسمین تمہارے سامنے بیٹھی ہوئی ہوں۔''

یہ ایس ایم ایس اس نے عارف کے موبائل پر بھیجنے کے بعد اپنا موبائل وینٹی بیگ میں رکھا اور سیدھی ہو کر عارف کی طرف دیکھنے لگی جو اس وقت اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھ رہا تھا۔

''تین منٹ زیادہ ہوگئے۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''وہ ضرور تمہیں دیکھ کر واپس چلی گئی ہوگی۔''

اسی وقت عارف کی جیب میں پڑے ہوئے موبائل کی ''میسج ٹون'' سنائی دی۔ عارف نے جلدی سے موبائل نکالا اور اس کی اسکرین پر نظر ڈال کر یاسمین کی طرف دیکھتے ہوئے تیزی سے بولا۔ ''اسی کا ایس ایم ایس ہے، میں نے کہا تھا ناکہ وہ تمہیں دیکھ کر واپس چلی گئی ہوگی۔''

''کوئی لڑکی یہاں آتی ہوئی دکھائی تو نہیں دی۔ تم دیکھو تو، اس نے کیا میسج کیا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے یاسمین کی

آواز میں لرزش آگئی تھی۔
عارف نے ایس ایم ایس پڑھا۔ عبارت مختصر تھی۔ عارف نے چونک کر یاسمین کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کا تاثر بھی تھا۔
"کیا مطلب!" اس کے منہ سے نکلا۔ "یاسمین کا ایس ایم ایس یہ ہے کہ وہ میرے سامنے بیٹھی ہوئی ہے۔"
"ہاں۔" یاسمین نے افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ "ایس ایم ایس میں کچھ غلط نہیں ہے۔"
"لیکن...... لیکن......" عارف ہکلاتے سا لگا۔ "میرے سامنے تو تم بیٹھی ہو۔"
"میں ہی یاسمین ہوں۔" اس مرتبہ یاسمین نے سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے معاف کر دینا عارف!...... میں نے تمہیں غلط نام بتایا تھا اپنا...... میرا نام عدیلہ نہیں، یاسمین ہے۔"
عارف ہونقوں کی طرح اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔
"کیفے میں ہماری وہ پہلی ملاقات...... یاد ہے نا!" یاسمین نے نظریں جھکالیں۔ "جب تم نے آٹوگراف دینے کے لیے میرا نام پوچھا تھا تو یکایک میرے دماغ میں خیال آیا کہ مجھے پہلی ہی ملاقات میں کسی مرد کو اپنا نام نہیں بتانا چاہیے۔ آٹوگراف لینے کا مقصد تو یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے نام پر لیا جائے مگر جب میرے دماغ میں یہ خیال آیا تو میں بے اختیار تمہیں ایک غلط نام بتا بیٹھی۔ فوری طور پر وہی نام میرے ذہن میں ابھرا تھا۔"
عارف اب بھی کچھ نہیں بول سکا۔ وہ اب بھی یاسمین کو اس طرح تکے جا رہا تھا جیسے اس کے سامنے کوئی عجوبہ ہو۔
یاسمین نے ایک بار نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا دیا۔ "لیکن جب تم سے باتیں شروع ہوئیں تو ملاقات ختم ہونے تک مجھے احساس ہو چکا تھا کہ غلط نام بتا کر میں نے غلطی کی ہے۔ اس احساس ہی کی وجہ سے میں نے تمہیں اپنا موبائل نمبر غلط نہیں بتایا۔ اس وقت میں نے سوچا تھا کہ بعد میں تمہیں کبھی کسی وقت اپنی غلطی کے بارے میں بتا دوں گی لیکن بعد میں یہ ہوا کہ میں تذبذب کا شکار ہو گئی۔ بار بار یہ خیال ذہن میں آجاتا تھا کہ جب میں تمہیں یہ بات بتاؤں گی تو میرے بارے میں تم نہ جانے کیا سوچو۔ اس تذبذب میں زیادہ دن گزر گئے اور پھر میں نے فیصلہ کیا کہ تم سے اپنے تعلق کو عدیلہ ہی کے نام سے چلنے دیا جائے۔"
عارف اب بھی خاموش رہا۔ ان باتوں نے یقیناً اس کو دماغی طور پر اتنا چکرا دیا تھا کہ اسی کی طرح شاید اس کی زبان بھی پتھرا سی گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہوگا کہ وہ ان باتوں پر اپنا ردعمل کن الفاظ میں ظاہر کرے۔
"تم کچھ نہیں بولو گے عارف!" یاسمین نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اس مرتبہ اس کی آواز کچھ بھرا گئی تھی۔
عارف کے ہونٹ پہلے تو لرزے، پھر وہ بہ دقت بول سکا۔ "میں...... میں کیا بولوں۔" اس کا لہجہ سوالیہ نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے جو کچھ کہا تھا، خود سے کہا تھا۔
یاسمین افسردگی سے مسکرائی۔ "مجھے برا بھلا ہی کہو۔"
عارف کے ہونٹ پھر لرزے اور اس مرتبہ لرز کر ہی رہ گئے۔ وہ کچھ بول نہیں سکا۔ یاسمین نے پھر نظریں جھکالیں۔ اب اس کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔
اس وقت ویٹر ان کے قریب آگیا۔ پہلے تو اس بے چارے نے انتظار ہی کیا ہوگا کہ اسے قریب آنے کا اشارہ کیا جائے۔
عارف نے اس سے چائے لانے کے لیے کہا لیکن اس طرح جیسے اسے خود بھی معلوم نہ ہو کہ اس نے ویٹر سے کیا کہا تھا۔
یاسمین سر جھکائے ہوئے بولی۔ "میں تنہائیوں میں رویا کرتی تھی عارف کہ مجھے تم سے محبت تو ہو گئی ہے لیکن میں تم سے شادی نہیں کر سکوں گی۔ پھر اچانک مجھے معلوم ہوا کہ ممی کسی سے میری شادی طے کر رہی ہیں۔ میں نے ان سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ میری شادی کہاں کر رہی ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ اچھا ہے، میری شادی کہیں ہو جائے۔ تم مجھے بے وفا اور نہ جانے کیا کیا سمجھتے لیکن مجھے وہ سب کچھ قبول تھا۔"
"عدیلہ!" عارف کے منہ سے بے اختیار وہی نام نکلا جو اسے پہلی مرتبہ بتایا گیا تھا۔ "یعنی۔" وہ قدرے رک کر بولا۔ "میرے علاوہ کسی سے شادی کرنے پر تمہیں کوئی اعتراض......"
"ہاں۔" یاسمین نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کسی اور سے شادی ہونے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ تم سے تو میں اس لیے شادی نہیں کرنا چاہتی کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ کوئی بھی اس شخص کو دھوکا نہیں دے سکتا جس سے وہ محبت کرتا ہو۔"
"دھوکے سے کیا مراد ہے تمہاری!" دھیرے دھیرے عارف بولنے کے قابل ہو گیا تھا۔
"وہ...... وہ......" یاسمین نے اپنی بات مکمل کیے بغیر پھر نظریں جھکالیں۔ "میں...... میں کیا بتاؤں عارف!...... تمہیں کیا بتاؤں کہ مجھ پر اس وقت کیسی قیامت گزر گئی تھی

جب مجھے معلوم ہوا تھا کہ میری شادی تمہارے ساتھ طے کی جارہی ہے۔ میرا دماغ جیسے شل ہوگیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کروں۔ ممی سے یہ کہنا میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ میں یہ شادی نہیں کروں گی۔ اسی لیے میں نے تم کو ایس ایم ایس بھیجا۔ میرا خیال تھا کہ تم میری بات مان لو گے اور شاید یہی سوچو کہ یاسمین نامی یہ لڑکی کسی اور سے محبت کرتی ہے اس لیے تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے یہ بھی خیال تھا کہ تم خود بھی میرے علاوہ...... یعنی عدیلہ کے علاوہ کسی سے شادی کے لیے تیار نہیں ہو۔ ایس ایم ایس بھیجنے کا خیال میرے دماغ میں اچانک آیا تھا اور میں کچھ غور کیے بغیر یہ قدم اٹھا بیٹھی تھی۔ اگر میں سوچ لیتی تو یقیناً میری سمجھ میں آجاتا کہ تم اس شادی سے بچنے کے لیے میرے ایس ایم ایس ہی کا سہارا لوگے، اپنے والد کو دکھا دو گے...... اور اس طرح بات بڑھے گی، میری ممی تک پہنچے گی اور وہی ہوا۔'' یاسمین نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اس کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ میں تم سے ملوں، تمہیں بتادوں کہ میں...... یعنی عدیلہ ہی دراصل یاسمین ہوں اور یہ بھی بتادوں کہ میں تم سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتی جبکہ میں تمہیں اپنی زندگی سے بھی زیادہ چاہتی ہوں۔ تمہاری خاطر اپنی جان بھی دے سکتی ہوں۔''

عارف نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر رکھتے ہوئے مٹھیاں بھینچ لیں اور بولا۔ ''مگر کیوں؟ کیوں عد...... ہاں! میں اب بھی تمہیں عدیلہ ہی کہوں گا۔ مجھے کچھ وقت لگے گا اپنی یہ عادت چھوڑنے میں!...... مجھے بتاؤ!...... تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتیں؟''

''اس لیے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔'' یاسمین کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ ''میں تمہیں دھوکا نہیں دے سکتی۔''

''کیسا دھوکا؟'' عارف نے تیزی سے پوچھا۔

''وہ...... وہ...... دراصل......'' یاسمین پھر چپ ہوگئی۔

''بتاؤ! پلیز!'' عارف شدید سے شدید تر جذباتی ہوتا چلا جارہا تھا۔ ''ابھی ذرا دیر پہلے بھی تم وہ وہ کرکے بات ٹال گئی تھیں۔ مجھے صاف صاف بتاؤ۔ پلیز!''

''کیسے بتاؤں!'' یاسمین کی آواز اس کے گلے میں پھنسنے لگی۔ ''راستے بھر ہمت مجتمع کرتی رہی کہ تمہیں بتادوں گی لیکن میں کامیاب نہیں ہوسکی۔ اسی لیے میں نے ایس ایم ایس میں لکھا تھا کہ میں تم سے کل ملوں گی۔ میرا خیال تھا کہ میں کل تک خود کو اتنا مضبوط کرلوں گی کہ تمہیں بتا سکوں کہ...... کہ...... لیکن تم نے آج ہی ملنے کی بات کی۔ تمہاری وجہ سے میں یہ سوچ کر گھر سے چل پڑی تھی کہ ہمت کرلوں گی لیکن...... لیکن...... میں کیسے بتاؤں عارف! مجھے ہمت نہیں ہورہی ہے۔''

''کیا پہلے کسی سے تمہاری شادی ہوچکی ہے؟'' عارف بول پڑا۔

یاسمین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ خیال تمہیں کیوں آیا؟''

''سوچتا جو رہا ہوں۔ مسلسل سوچتا رہا ہوں کہ تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کرنا چاہتیں۔ اب اس وقت یہی بات ذہن میں آئی۔ تمہیں یہ خیال ہوگا کہ شادی کے بعد مجھے اس کا علم ہوجائے گا کہ تمہاری شادی ہوچکی ہے اور......''

عارف یکایک خاموش ہوگیا۔ اس نے ویٹر کو دیکھ لیا تھا جو چائے کی ٹرے سنبھالے ان کی میز کے قریب آچکا تھا۔

یاسمین کی پلکیں بھی اب بھیگی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ اس نے جلدی سے اپنا رخ دوسری طرف کیا تاکہ ویٹر اس کی بھیگی ہوئی آنکھیں نہ دیکھ سکے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جلدی سے ٹشو پیپر نکال لیا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں خشک کرلیں۔

ویٹر ٹرے رکھ کر چلا گیا۔

''بتاؤ...... عدیلہ...... یاسمین!...... پلیز!...... بتاؤ!...... میرا خیال صحیح ہے؟ تمہاری کبھی کسی سے شادی ہوچکی ہے؟''

یاسمین نے اس کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکالیں۔

''پلیز یاسمین!'' عارف بولا۔ ''بتاؤ...... پلیز بتاؤ!...... کیا یہی بات ہے؟ پہلے کبھی تمہاری شادی ہوچکی ہے؟...... بتاؤ!''

''کیا بتاؤں عارف...... مجھے ہمت نہیں ہورہی ہے۔ اگر میں تمہاری بات کے جواب میں نہیں کہوں گی تو تم پوچھو گے کہ پھر کیا بات ہے اور اگر ہاں کہوں گی تو بھی تم سوالات کرو گے کہ وہ شادی ختم کیوں ہوگئی۔ پلیز عارف! یہاں ہوٹل میں مجھے اتنا جذباتی نہ کرو کہ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگوں۔ میں ہمت نہیں کر پارہی ہوں کہ تمہیں کچھ بتاؤں...... پلیز!...... پلیز عارف! میں رو پڑوں گی اگر......''

اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں پھر ڈبڈبانے لگیں۔

''اچھا!'' عارف نے طویل سانس لی اور پہلی مرتبہ یاسمین کے چہرے سے نظریں ہٹا کر میز کی طرف دیکھنے لگا۔

چائے میز پر موجود تھی لیکن اس کا خیال نہ یاسمین کو آیا تھا، نہ عارف کو!

یاسمین نے ایک بار پھر ٹشو پیپر سے اپنی آنکھیں خشک کیں۔ عارف کی طرح اس نے بھی نظریں جھکالی تھیں۔ وہ اس وقت چونکی جب اس نے برتنوں کی کھنک سنی۔ اس نے دیکھا کہ عارف چائے بنانے کے لیے پیالیاں سیدھی کررہا تھا۔

''میں بناتی ہوں۔'' یاسمین جلدی سے بولی اور ٹرے اپنی طرف کھسکانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھائے۔

عارف نے اپنے ہاتھ ہٹالیے۔

یاسمین نے دونوں پیالیوں میں چائے بنانے کے بعد ایک پیالی عارف کی طرف بڑھائی جو اب بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا اور کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

''چائے پیو۔'' یاسمین دھیمی آواز میں بولی اور خود بھی اپنی پیالی اٹھائی۔

ان دونوں نے چائے اس طرح پی جیسے کوئی فرض ادا کررہے ہوں۔ اس دوران میں دونوں ہی خاموش رہے۔ چائے ختم کرنے کے بعد ویٹر کو اشارہ کیا۔ ویٹر بل لے آیا۔ عارف نے بل کی ادائیگی کی، پھر ویٹر کے جانے کے بعد یاسمین کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے جان لیا کہ تم عدیلہ نہیں، یاسمین ہو، لیکن...... کیا اس ملاقات کا مقصد اتنا ہی تھا؟''

یاسمین کوئی جواب نہیں دے سکی۔

کچھ خاموشی کے بعد عارف پھر بولا۔ ''ایک بات کہی تھی تم نے...... کل تک کی مہلت چاہتی تھیں تم!...... کل تک تم ہمت کرلو گی کہ مجھے شادی نہ کرنے کی صحیح وجہ بتاسکو۔''

''کوشش کروں گی مگر ابھی یہ خیال تو تم اپنے دماغ سے نکال ہی دو کہ پہلے کسی سے میری شادی ہوچکی ہے۔''

عارف نے طویل سانس لی۔ ''چلو ٹھیک ہے، نکال دیتا ہوں یہ خیال اپنے ذہن سے...... میں کل تک تمہارے جواب کا انتظار کروں گا۔ ہاں ایک خدشہ مجھے ضرور ہے۔ کل تک تم نے ہمت کر بھی لی تو میرے سامنے آکر تمہاری ہمت شاید پھر جواب دے جائے لہٰذا......''

''لہٰذا؟'' یاسمین نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''کل ہم ملیں گے نہیں۔'' عارف نے کہا۔ ''تم مجھے فون پر بتادینا۔ میرا خیال ہے کہ فون پر تمہاری ہمت جواب نہیں دے گی۔''

یاسمین خاموش رہی۔

''چلو اب اٹھتے ہیں یہاں سے۔'' عارف پھر بولا۔

یاسمین کچھ کہے بغیر کھڑی ہوگئی۔ ریسٹورنٹ سے باہر نکل کر یاسمین اپنی کار کی طرف بڑھی۔ عارف اس کے ساتھ چلتا ہوا بولا۔

''تمہیں کار تک تو چھوڑ دوں۔''

یاسمین اب بھی خاموش رہی۔ کار کے قریب پہنچ کر اس نے دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کیا۔ عارف کار کی کھڑکی کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ یاسمین نے اس پر ایک نظر ڈالی۔ اس وقت اس کی پلکیں پھر بھیگنے لگی تھیں مگر اس سے پہلے کہ اس کے آنسو ڈھلک جاتے، وہ کار حرکت میں لائی اور تیزی سے اس کی رفتار بڑھاتی چلی گئی۔ اس نے عقب نما آئینے میں دیکھا کہ عارف جہاں کھڑا تھا، وہیں کھڑا اس کی کار کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔ یاسمین کی ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے دو آنسو اس کے گالوں پر ڈھلک گئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنے گھر پر تھی۔ اس دوران میں اس نے اپنے جذبات پر قابو پالیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ گھر کا کوئی فرد اس کی بھیگی ہوئی آنکھیں دیکھے۔

وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی کہ ٹی وی لاؤنج سے ریشماں نکلی۔ ''دیکھ آئیں اپنی دوست کو باجی...... کیسی ہے اب؟''

''ٹھیک ہوجائے گی۔ زیادہ تشویش کی بات نہیں ہے۔''

''اسی لیے اتنی جلدی واپس آگئیں۔'' ریشماں اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی تھی۔

''ہوں۔''

''تم اس وقت بھی پریشان نظر آرہی ہو۔ کیا اپنی دوست کی وجہ سے یا اپنی شادی کی وجہ سے۔''

یاسمین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے کمرے میں داخل ہوگئی۔ ریشماں اب بھی اس کے ساتھ تھی۔

''کیا بات کرنا چاہتی ہے تو مجھ سے!'' یاسمین بولی۔

''تم اس شادی کی وجہ سے کیوں پریشان ہو باجی جبکہ تم ان سے محبت بھی کرتی ہو۔''

''اسی لیے پریشان ہوں کہ محبت کرتی ہوں۔ میں عارف کو دھوکا نہیں دینا چاہتی۔ شادی کے بعد اسے پتا چل جائے گا۔''

''نہیں پتا چلے گا باجی......! ممی نے کہا تو تھا تم سے...... انہوں نے ڈاکٹر فیروزہ سے بات کرلی ہے۔''

''ڈاکٹر فیروزہ کون؟''

''گائناکولوجسٹ ہیں۔ وہ سب ٹھیک کردیں گی۔''

یاسمین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں باجی!...... ممی بتارہی تھیں کہ وہ بہت ماہر ہیں۔''

''یہ بھی تو دھوکا دینا ہی ہوگا عارف کو!''

''جب تم ان سے محبت کرتی ہو تو انہیں پانے کے لیے تمہیں اتنا تو کرنا ہی پڑے گا باجی!''

''میں نہیں کرسکوں گی۔ میں تو چاہتی ہوں کہ عارف کو پہلے ہی سے سب کچھ بتادوں۔'' یاسمین نے اپنے دل کی بات ریشماں پر اس لیے ظاہر کردی کہ وہ اس پر بھروسا کرسکتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ یہ بات ریشماں کی زبان سے الماس نادر تک نہیں پہنچے گی۔

ریشماں چونکی۔ ''انہیں بتانا چاہتی ہو؟''

''ہاں۔''

''پھر تو...... شاید وہ...... شادی نہ کریں تم سے!''

''عارف کو دھوکا دینے سے اچھا ہے کہ میں زندگی بھر اس کے لیے تڑپتی رہوں۔'' یاسمین نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

ریشماں اس کا منہ تکتی رہ گئی۔

یاسمین اس موضوع پر زیادہ بات نہیں کرنا چاہتی تھی، اس لیے بولی۔ ''ماما کہاں ہیں؟''

''اپنے کمرے ہی میں ہوں گے، جب سے آئے ہیں کہیں گئے تو نہیں۔''

گھر میں نجیب خان کے لیے ایک کمرا مخصوص تھا۔ وہ جب بھی اسلام آباد سے دو چار دن کے لیے آتا تھا، اسی کمرے میں رہتا تھا۔

''اچھی طرح سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا باجی!'' ریشماں نے کہا اور یاسمین کے جواب کا انتظار کیے بغیر جانے کے لیے اٹھ گئی۔

یاسمین نے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کرلیں۔ وہ اس وقت بھی محسوس کررہی تھی کہ عارف کو حقیقت سے آگاہ کرنا اس کے لیے ایک کٹھن امتحان ہے۔

لیکن دوسرے دن دوپہر تک وہ ہمت مجتمع کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ اس نے اپنے موبائل پر عارف سے رابطہ کرنا چاہا لیکن اسے عارف کا موبائل بند ملا۔ اسے تعجب ہوا۔ اسے یقین تھا کہ عارف اس کا جواب سننے کے لیے بے چین ہوگا اور اس کے کان اپنے موبائل کی گھنٹی سننے کے لیے بے چین رہیں گے۔

اتفاقی طور پر بند ہوگیا ہوگا اس کا موبائل، یاسمین نے سوچا۔

پندرہ منٹ بعد اس نے دوسری مرتبہ رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوسکی۔ موبائل بہ دستور بند تھا۔

شام ہوتے ہوتے یاسمین نے متعدد کوششیں کر ڈالیں مگر عارف سے بات کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔ یہ ایسی صورت حال تھی جس نے یاسمین کو بے حد پریشان کردیا تھا۔ اب جبکہ وہ عارف کو حقیقت بتانے کے لیے ذہنی طور پر پوری طرح تیار ہوگئی تھی تو اس سے رابطہ ہی نہیں ہورہا تھا۔

اس سے اگلا دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ پھر اس سے اگلا دن بھی اور یاسمین کی پریشانی مسلسل بڑھتی رہی۔ اب دوسری صورت یہ ہوسکتی تھی کہ وہ عارف سے ملاقات کرے لیکن اسے عارف کے گھر کا پتا معلوم نہیں تھا۔ وہ ریشماں سے اس بارے میں معلوم کرسکتی تھی لیکن اسے خیال تھا کہ عارف کے سامنے بیٹھ کر اپنی زبان کھولنے میں کامیاب نہیں ہوسکے گی۔

ایک دن اور گزر گیا۔ عارف کا موبائل بہ دستور بند مل رہا تھا۔ پھر اس دن اس وقت یاسمین کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی جب اسے ریشماں سے معلوم ہوا کہ شادی کی تاریخ طے پاچکی تھی۔

پانچ دن بعد شادی ہونا تھی۔

اس دن وہ اتنی روئی جتنا وہ ساری زندگی میں کبھی نہیں روئی تھی۔

✂✂✂

عارف نے اپنا موبائل اس لیے بند کیا تھا کہ وہ شادی نہ کرنے کے سلسلے میں یاسمین کی کوئی وجہ سننے کے لیے اب تیار ہی نہیں تھا۔ وہ کہہ چکی تھی کہ پہلے اس کی کسی سے شادی نہیں ہوئی، لیکن اگر ہو بھی چکی ہوتی تو عارف اسے خاطر میں نہیں لاتا۔ یاسمین سے اس کی محبت اتنی ہی شدید ہوچکی تھی۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اس سے شادی نہ کرنے کے سلسلے میں یاسمین کا کوئی بھی مسئلہ ہو، وہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کچھ بھی کر گزرے گا لیکن شادی یاسمین ہی سے کرے گا۔

اپنا نیا نمبر اس نے صرف اپنے والد کنور شمشاد کو بتایا تھا۔ اس کے باپ نے نمبر بدلنے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہہ دیا تھا کہ اس کا پہلا نمبر بہت زیادہ لوگوں کو معلوم ہوچکا ہے اور موبائل کی وقت بے وقت کی گھنٹی اسے بور کردیتی ہے لہٰذا

اب وہ اپنا نیا نمبر اپنے بہت چنیدہ دوستوں یا واقف کاروں کو بتارہا ہے۔

جواز کیونکہ معقول تھا اس لیے کنور شمشاد نے دوبارہ اس بارے میں کوئی بات ہی نہیں کی تھی۔

گزرتے ہوئے دنوں میں اسے دو ایک بار یہ خیال بھی آیا کہ یاسمین شاید فون پر بھی اس سے کوئی بات کرنے کی ہمت نہ کرسکی ہو اور اس نے اسے فون ہی نہ کیا ہو۔

لیکن اگر کیا ہو تو؟ عارف کے دماغ میں یہ سوال بھی ابھرا تھا۔

تو موبائل بند ملنے پر وہ بہت پریشان ہوئی ہوگی، جھنجلائی بھی ہوگی۔ عارف نے سوچ لیا تھا کہ اگر وہ خفا بھی ہوگی تو شادی کے بعد وہ اپنی روٹھی ہوئی محبوبہ کو منالے گا۔ یہ تو وہ خوب سمجھتا تھا کہ یاسمین بھی اسے دل وجان سے چاہنے لگی تھی۔ وہ اتنی زیادہ خفا ہرگز نہ ہوتی کہ اسے منانا بہت مشکل ہوجاتا۔

ایک اندیشہ عارف کو یہ ضرور ہوا تھا کہ یاسمین تنگ آکر اپنی ماں کے سامنے ہی اس شادی سے انکار نہ کردے لیکن جب شادی کی تاریخ طے ہوگئی اور اس کے تین چار روز بعد بھی تاریخ منسوخ ہونے جیسی کوئی بات اس کے سامنے نہیں آئی تو وہ مطمئن ہوگیا۔ اس کا زیادہ تر وقت اس خمار میں گزرنے لگا کہ شادی کی پہلی رات کو وہ اپنی محبوب بیوی کو کس کس طرح منائے گا۔

کبھی کبھی وہ تھوڑا سا فکرمند ہوتا کہ یاسمین کے سامنے کوئی بہت ہی بڑا مسئلہ ہوگا جس کے باعث وہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی، لیکن عارف کی یہ فکرمندی وقتی ثابت ہوئی تھی۔ وہ یہ سوچ کر اس فکر سے نجات حاصل کرلیتا کہ پیسا ہو تو دنیا کا ہر مسئلہ حل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے باپ کے پاس بہت دولت تھی اور اکلوتا بیٹا ہونے کے باعث عارف فطری طور پر یہی سوچتا تھا کہ وہ ساری دولت اس کی تھی۔ اس کا ذاتی اکاؤنٹ بھی چھوٹا موٹا نہیں تھا۔ کنور شمشاد نے اس کا اکاؤنٹ لاکھوں روپے سے کھلوایا تھا تاکہ عارف کو اپنی بڑی سے بڑی خواہش پوری کرنے کے لیے باپ سے کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

اسی اکاؤنٹ سے عارف نے یاسمین کے لیے ایک بے حد قیمتی ہار خریدا تھا جو وہ اسے منہ دکھائی میں دینا چاہتا تھا۔

شادی میں صرف ایک دن باقی رہ گیا تھا جب رات کو دس بجے کے قریب ایک ملازم نے آکر اس سے کہا کہ اسے اس کے والد نے اپنے کمرے میں بلایا ہے۔

اس وقت اپنی اچانک طلبی پر عارف کو تعجب ہوا، تاہم وہ کنور شمشاد کے کمرے میں پہنچا اور یہ دیکھ کر چونک گیا کہ وہاں ایک عورت بھی موجود تھی۔ پختہ عمر کی اس عورت نے خود کو اس حد تک ''مین ٹین'' کیا تھا کہ وہ اس عمر میں بھی خاصی دلکش اور پروقار نظر آرہی تھی۔ عارف کو یہ خیال آیا کہ وہ اس عورت کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی عارف کو یہ بہت عجیب معلوم ہوا تھا کہ وہ عورت اس کے باپ کی خواب گاہ میں تھی اور وہ بھی رات کے وقت!

''یہ رانی بیگم ہیں۔'' کنور شمشاد نے فوراً تعارف کرایا۔

اب عارف کو خیال آیا کہ اس نے رانی بیگم کو اپنے ہی گھر میں دیکھا ہوگا۔ کنور شمشاد نے اسے بتایا تھا کہ وہ نیو ایر کے فنکشنز میں ان کے گھر آیا کرتی تھی اور اسی نے یاسمین سے اس کی شادی بھی طے کرائی تھی۔ گویا وہ کنور شمشاد کی خواتین دوستوں میں سے ایک تھی۔

عارف کو یہ بھی اچھا نہ لگا کہ ایک خاتون دوست کو اس کے باپ نے رات کے وقت اپنی خواب گاہ میں بٹھا رکھا تھا۔

''حیران ہوگئے تم کہ میں نے تمہیں اس وقت کیوں بلایا ہے۔'' کنور شمشاد نے تعارف کرانے کے ساتھ اپنی بات جاری رکھی۔ ''بیٹھ جاؤ، دراصل رانی بیگم ہی کا اصرار تھا کہ میں جو فرض تمہاری شادی کے بعد ادا کرنا چاہتا تھا، وہ شادی سے پہلے ہی ادا کردوں۔''

عارف بیٹھ گیا اور الجھی ہوئی نظروں سے اپنے باپ کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اندازہ لگانے سے بھی قاصر تھا کہ اس کا باپ اپنا کیا فرض ادا کرنا چاہتا تھا۔ نیز یہ کہ رانی بیگم کی ایسی کیا حیثیت تھی کہ وہ کسی فرض کی ادائیگی کے سلسلے میں اس کے باپ سے اصرار کرے۔

رانی بیگم سے تعارف کے وقت عارف نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی تھی اور جواباً رانی بیگم نے بھی نہ صرف سر ہلایا تھا بلکہ مسکرائی بھی تھی۔

''میں کوئی تمہید نہیں باندھنا چاہتا عارف!'' کنور شمشاد نے عارف کے بیٹھتے ہی کہا تھا۔ ''ابھی چند منٹ کے اندر اندر میرے کاروبار کے لیگل ایڈوائزر ایڈووکیٹ ظفر علی یہاں آنے والے ہیں۔ میں نے انہیں کل شام ہدایت کردی تھی اور ایک گھنٹے قبل انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے کاغذات تیار کرلیے ہیں، تمہیں آج ہی...... بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ابھی ان کاغذات پر دستخط کرنا ہیں۔''

”کیسے کاغذات ڈیڈی!“ عارف حیرت سے بولا۔

”میں نے اپنا کاروبار، بلکہ سبھی کچھ تمہارے نام کردیا ہے۔ میرا جو ذاتی اکاؤنٹ ہے، وہ بہرحال...... ظاہر ہے کہ میرے ہی نام رہے گا لیکن باقی سب کچھ آج سے قانونی طور پر تمہارا ہو جائے گا۔“

”اس کی کیا ضرورت تھی ڈیڈی......! آپ کا جو کچھ ہے، وہ میرے علاوہ کس کا ہوسکتا ہے۔“ عارف باپ کی بات سے متعجب ہوا تھا۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں قانونی طور پر تمہارے نام سب کچھ اس لیے کرنا چاہتا ہوں کہ اب تمام کاروباری معاملات میں تمہارے ہی دستخط ہوں گے۔ صرف دستخط ہی نہیں ہوں گے بلکہ اب سارا کاروبار سنبھالنا بھی تمہاری ذمے داری ہوگی۔“

عارف نے فوراً کچھ بولنا چاہا لیکن کنور شمشاد نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا اور اپنی بات جاری رکھی۔ ”اپنے شاعرانہ مزاج کی وجہ سے تمہیں کبھی کاروباری معاملات سے دلچسپی نہیں رہی اور میں نے بھی تم پر زور نہیں ڈالا کہ تم میرا ہاتھ بٹاؤ لیکن اس طرح ہمیشہ تو نہیں چل سکتا نا عارف! میرے بعد تمہی کو سب کچھ دیکھنا ہوگا لہٰذا......“

”اب ایسی بات کبھی اپنی زبان پر نہ لائیں۔“ رانی بیگم بول اٹھی۔ ”یہ کہنا کوئی ضروری تو نہیں کہ آپ کے بعد۔“

”جی ڈیڈی!“ عارف بھی بول پڑا۔ ”آپ کو یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی!“

”انسان کو حقیقت سے نظریں نہیں چرانا چاہئیں۔“ کنور شمشاد نے کہا۔ ”ہم تینوں ہی میں سے کسی نہ کسی کو کسی وقت اس دنیا سے رخصت تو ہونا ہے، خیر......! میں یہ کہنے جا رہا تھا کہ شادی کے بعد تم ہنی مون کے لیے جہاں چاہو چلے جاؤ لیکن واپس آنے کے بعد سارا کاروبار تمہی کو سنبھالنا ہے۔ میں اب بہت تھک چکا ہوں۔“

”لیکن میں تو کاروبار کی الف ب سے بھی واقف نہیں ڈیڈی!“

”تمہیں الف ب سے واقف کرانا میری ذمے داری ہے۔ میں فوری طور پر خود کو الگ تھلگ نہیں کرلوں گا، تمہاری رہنمائی کے لیے میں چند ماہ تمہارے ساتھ دفتر جاتا رہوں گا۔ بے شک تمہارا مزاج شاعرانہ ہے لیکن تم پڑھے لکھے ہو۔ یہ ممکن نہیں کہ تم کاروبار کے طریق جلد ہی نہ سمجھ لو، اور پھر یہ کہ...... وہی بات زبان پر آرہی ہے میرے...... کسی نہ کسی دن یہ سب کچھ سنبھالنا تو تمہیں ہی پڑیگا۔ اب اس معاملے میں تمہیں کوئی بحث چھیڑنے کی ضرورت نہیں۔ میں جو فیصلہ کرچکا ہوں، اس میں اب کسی بھی قسم کی تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔“

عارف کو چپ ہو جانا پڑا۔

”ظفر صاحب! ابھی تک نہیں آئے۔“ کنور شمشاد نے گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے بڑبڑانے والے انداز میں کہا، پھر وہ عارف کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ”ابھی وہ نہیں آئے ہیں تو میں ایک بات سے اور آگاہ کردوں، یہ رانی بیگم تمہاری نئی ممی ہیں۔“

”جی!“ عارف اچھل ہی پڑا۔

”ہاں۔“ کنور شمشاد سنجیدہ رہے۔ ”رانی بیگم سے میری شادی کو دو سال گزر چکے ہیں۔ اب تک میں نے یہ بات مصلحتاً چھپائے رکھی۔ لوگ باتیں بناتے کہ بیٹے کی اب تک شادی نہیں کی اور خود شادی کرکے بیٹھ گیا۔ تمہاری شادی کے سلسلے میں عجلت مجھے اس لیے بھی تھی۔ آخر کب تک یہ بات چھپائے رکھوں...... ویسے اب بھی کچھ دن تو یہ بات پوشیدہ ہی رکھوں گا۔ یہ سب لوگوں پر افشا میں اس وقت کروں گا جب کاروبار تم پوری طرح سنبھال لوگے۔“

عارف نے رانی بیگم کی طرف دیکھا جو خاموش بیٹھی بس مسکرا رہی تھی۔

”اور ہاں!“ کنور شمشاد پھر بولا۔ ”میں نے تمہیں غالباً یہ بتایا تھا کہ رانی بیگم کی اپنے سابق شوہر سے ذہنی ہم آہنگی نہیں ہوسکی تھی اس لیے دونوں ایک دوسرے سے الگ رہنے لگے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی علیحدگی قانونی طور پر ہوچکی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں ان سے شادی کیسے کرسکتا تھا۔ اب تمہیں ایک بات اور بتادوں۔“

لیکن اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتے، ملازم نے آکر اطلاع دی کہ ان کا لیگل ایڈوائزر آگیا ہے جسے ڈرائنگ روم میں بٹھادیا گیا ہے۔

”چلو، ہم دونوں وہیں چلتے ہیں۔“ کنور شمشاد نے کھڑے ہوتے ہوئے عارف سے کہا۔ پھر رانی بیگم کی طرف دیکھا۔ ”تم یہیں رکو......“

رانی بیگم نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

عارف اور کنور شمشاد ڈرائنگ روم میں پہنچے۔ ایڈووکیٹ ظفر کو عارف جانتا بھی تھا۔

کاغذات پر دستخط ہونے کے بعد ایڈووکیٹ نے عارف سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ”مبارک ہو کہ آج سے

آپ قانونی طور پر بھی اپنے سارے کاروبار وغیرہ کے مالک بن گئے ہیں۔“

عارف مسکرایا لیکن اس کی مسکراہٹ جبری تھی۔ غیر متوقع طور پر جو کچھ ہوا تھا، اس نے عارف کو خاصا الجھا دیا تھا۔ خاص طور پر ذہنی جھٹکا اسے اس بات سے لگا تھا کہ رانی بیگم اس کی سوتیلی ماں تھی۔

البتہ اس انکشاف سے یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ اس کے باپ کو اس کی دوسری شادی پر اعتراض کیوں نہیں تھا۔ کنور شمشاد کی یہ تیسری شادی تھی۔ پہلے جو ان کی دو شادیاں ہوچکی تھیں اور دوسری شادی ان کی پسند کی شادی تھی اور وہ سب کچھ عارف کے علم میں تھا لہٰذا کنور شمشاد اس کی دوسری شادی پر معترض ہونے کا کوئی جواز ہی نہیں رکھتے تھے۔

ایڈووکیٹ ظفر کو رخصت کرنے کے بعد وہ عارف سے بولے۔ ”جاؤ! اب تم آرام کرو۔“

غالباً وہ بھول ہی گئے تھے کہ عارف کو انہیں کوئی دوسری بات بھی بتانا تھی۔ ایڈووکیٹ کی آمد کی اطلاع کے باعث ان کی وہ بات ادھوری ہی رہ گئی۔

خود عارف کا ذہن بھی اتنا الجھ گیا تھا کہ اسے بھی کسی ”دوسری بات“ کا خیال نہیں آیا۔ وہ اپنے کمرے میں پہنچ کر بستر پر لیٹ گیا۔ رانی بیگم کی وجہ سے تو اس کا ذہن الجھا ہوا تھا ہی لیکن اس خیال سے اس پر گھبراہٹ بھی طاری تھی کہ اب اسے کاروباری ذمے داریاں بھی سنبھالنا ہوں گی۔

دوسری صبح ناشتے کی میز پر اس کے ساتھ صرف کنور شمشاد تھا۔ عارف کو اس پر کوئی تعجب نہیں ہوا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ رانی بیگم کو کنور شمشاد نے رات ہی کو کسی وقت رخصت کردیا ہوگا۔ خود کنور شمشاد ہی نے کہا تھا کہ ابھی وہ کچھ عرصے تک اپنی اس شادی کو منظر عام پر نہیں لانا چاہتا۔

رانی بیگم کے رہنے کے لیے کنور شمشاد نے اسے دوسرا گھر دلا دیا ہوگا۔

کنور شمشاد ناشتا کرنے کے بعد دفتر چلا گیا۔ عارف اپنے کمرے میں آگیا۔ یاسمین سے ملاقات کے بعد وہ کسی دن بھی گھر سے نہیں نکلا تھا۔ اپنے کمرے ہی میں پڑا یاسمین کے بارے میں سوچتا رہتا یا اس کی شاعری جاری رہتی۔ اس نے یاسمین اور اپنی محبت پر اچھی خاصی لمبی نظم کہہ ڈالی تھی جو وہ شادی کی پہلی رات یاسمین کو سنانا چاہتا تھا۔

اس نے اپنا موبائل بند ہی رکھا۔ یہاں تک کہ شادی کا دن آگیا۔ پھر شادی بھی ہوگئی۔ رات گئے وہ یاسمین کو بیاہ کر گھر لے آیا۔ مہمان رخصت ہوتے رہے۔ اسی دوران میں رانی بیگم نے اسے الگ تھلگ لے جاکر شفقت آمیز مسکراہٹ اور لہجے میں کہا۔ ”اب تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ دلہن کو زیادہ انتظار نہ کراؤ۔“

عارف خود بھی اپنے کمرے میں جانے کے لیے بے چین تھا۔ اس دن اس کے کمرے کی خاص آرائش رانی بیگم اور دو تین خواتین نے کی تھی جو کنور شمشاد کی دوست تھیں۔

عارف نے دھڑکتے دل کے ساتھ اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا موبائل بند ہونے کی وجہ سے یاسمین خفا تو ضرور ہوگی لیکن اسے یہ اطمینان بھی تھا کہ وہ اسے منالے گا۔

بستر پر یاسمین اپنی ٹھوڑی گھٹنوں پر رکھے بیٹھی تھی۔ اس کا رخ دروازے کی طرف نہیں تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز اسے یقیناً سنائی دی ہوگی لیکن اس نے اس وقت بھی دروازے کی طرف نہیں دیکھا۔ اس کے خفا ہونے کی یہ دلیل عارف کے لیے کافی تھی لیکن وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بستر کے قریب پہنچ گیا۔

”زیورات ابھی سے اتار ڈالے تم نے!“ عارف اس طرح بولا جیسے اسے یاسمین کی خفگی کا کوئی خیال نہ ہو۔

”ہوں۔“ یاسمین نے نہ تو منہ کھولا، نہ اس کی طرف دیکھا۔

”یہ سب کچھ تو مجھے کرنا تھا یاسمین!“ عارف شوخ لہجے میں کہتے ہوئے بستر پر بیٹھ گیا، پھر بستر کی دونوں سائڈ ٹیبلز پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ”کسی دراز میں رکھ دیے؟“

اس مرتبہ یاسمین نے سر کی جنبش سے واڈروب کی طرف اشارہ کیا۔

”اوہو!“ عارف ہنسا۔ ”اتنی احتیاط؟“

یاسمین خاموش رہی۔

”بہت ناراض ہو؟“ عارف نے بڑی محبت سے یاسمین کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔ یاسمین نے نظریں چار نہیں کیں اور اپنی آنکھیں جھکالیں۔

”واقعی بہت ناراض ہو اور ناراضی اسی لیے ہوسکتی ہے کہ میں نے اپنا موبائل بند رکھا تھا۔ ہے نا؟“

یاسمین نہ کچھ بولی، نہ اس نے نظریں اٹھائیں۔

”میں ابھی تمہارا غصہ ختم کردوں گا۔“ عارف نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تمہارے لیے بڑی خوب صورت نظم لکھی ہے۔“

عارف نے اس کی ٹھوڑی چھوڑ دی اور نظم سنانا شروع

کی۔ یاسمین نے اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپالیا۔

نظم مکمل ہوگئی تو بھی یاسمین کا چہرہ گھٹنوں میں چھپا رہا۔

عارف نے ایک طویل سانس لی۔ ''اتنی اچھی نظم سن کر بھی تمہارا غصہ دور نہیں ہوا؟ کتنے اچھوتے استعارے استعمال کیے ہیں میں نے تمہارے حسن کے لیے!'' یہ کہتے ہوئے عارف نے ہاتھ آگے بڑھا کر اس کا چہرہ بھی اوپر اٹھایا اور چونک پڑا۔ یاسمین کا چہرہ آنسوؤں میں ڈوبا ہوا تھا۔

''یہ کیا!'' عارف کے منہ سے نکلا۔ ''آج کی رات تم رو رہی ہو۔''

یاسمین نے ایک سسکی لی اور پہلی مرتبہ بولی۔ ''اس خیال سے رو پڑی ہوں کہ تم نے اس نظم میں جو کچھ لکھا ہے، اس کے برعکس کبھی نظم لکھو گے۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' عارف کہتے ہوئے ایک رومال سے اس کا چہرہ خشک کرنے لگا جو آنسوؤں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ''اب اگر ایک بھی آنسو بہایا تو میری ناراضگی شروع ہو جائے گی۔ دیکھو تو...... تمہاری موجودگی کے باعث اس کمرے کا منظر کتنا حسین ہو گیا ہے۔ اس منظر کو اپنے آنسوؤں سے دھندلا نہ کرو۔''

''یہ منظر۔'' یاسمین یاس انگیز لہجے میں بولی۔ ''کچھ ہی وقت جاتا ہے کہ یہ منظر یکسر بدل جائے گا۔''

''تمہاری موجودگی میں تو یہ ممکن نہیں میری جان!''

''میری ہی وجہ سے تو بدلے گا۔''

✂

یاسمین نے جو کچھ کہا تھا، وہ درست ثابت ہوا۔ کچھ دیر بعد اس کمرے کا منظر اس حد تک یقیناً تبدیل ہو گیا تھا کہ یاسمین اور عارف ایک دوسرے سے بالکل لاتعلق نظر آرہے تھے۔ اگرچہ دونوں ہی بستر پر لیٹے ہوئے تھے مگر ان کے درمیان کچھ فاصلہ تھا۔ چہروں کے تاثرات بھی بدلے ہوئے تھے۔ یاسمین گم صم اور چت لیٹی چھت کو تک رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اداسی پھیلی ہوئی تھی۔ عارف اس طرح لیٹا ہوا تھا کہ اس کا رخ یاسمین کی مخالف سمت میں تھا۔ چہرے پر کسی بھی قسم کے تاثرات نہیں تھے، جیسے وہ پتھرا گیا ہو۔ اس کی پلکیں بھی کم کم جھپک رہی تھیں۔

یہ بوجھل سکوت عارف ہی کی آواز سے ٹوٹا۔ اس نے یاسمین کی طرف کروٹ لیے بغیر بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ ''مجھے یہ دھوکا تم نے کیوں دیا یاسمین؟''

''میں نے تمہیں کوئی دھوکا نہیں دیا۔'' یاسمین کی نظریں چھت پر جمی رہیں۔

''تم پھر جھوٹ بول رہی ہو۔'' عارف بولا۔ ''شوہر سے یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی کہ اس کی بیوی کی شادی پہلے بھی ہو چکی ہے۔ اگر تم مجھے بتا دیتیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے جذبات کو جھٹکا تو اب لگا ہے۔ میرے پوچھنے پر بھی تم نے کہہ دیا تھا کہ تمہاری شادی نہیں ہوئی۔''

''میں اب بھی قسم کھا کر کہوں گی کہ میری شادی نہیں ہوئی۔''

اب عارف کے پتھرائے ہوئے چہرے پر تغیر آیا۔ اس نے کروٹ لی اور یاسمین کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ حیرت سے بولا۔ ''تم اب بھی یہی کہہ رہی ہو...... میں تو اب بھی یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ تمہاری وہ شادی کئی سال برقرار بھی رہی ہو گی۔''

''ہرگز نہیں۔ میں قسم کھا چکی ہوں عارف!'' یاسمین نے جواب دیتے ہوئے اس کی طرف نہیں دیکھا، چھت ہی کو تکتی رہی۔

عارف اس مرتبہ کچھ تلخ لہجے میں بولا۔ ''تمہاری قسمیں مجھے یقین نہیں دلا سکتیں کہ میں تمہاری زندگی میں آنے والا پہلا مرد ہوں۔''

''یہ جھوٹ تو میں بولنا بھی نہیں چاہتی۔''

''کیا!'' عارف نہ صرف چونکا بلکہ اس کی حیرت میں بھی اضافہ ہوا۔ ''تم جانتی ہو؟ تمہاری اس بات کا کیا مطلب ہوا؟''

''جانتی ہوں۔'' اس مرتبہ یاسمین کی آواز کانپ گئی۔ ''تم سے پہلے میری زندگی میں بہت سے مرد آچکے ہیں۔''

اس مرتبہ عارف کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ اب یاسمین کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کسی دوسری دنیا کی مخلوق کو دیکھ رہا ہو۔

''تم مجھے طوائف بھی کہہ سکتے ہو عارف!'' یاسمین کی آواز رندھ گئی اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ ''اسی لیے میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن تمہیں یہ سب کچھ بتانا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ آخر میں نے تمہیں موبائل فون پر سب کچھ بتانے کا فیصلہ کرلیا تھا لیکن تم نے اپنا موبائل مستقل بند رکھا۔ میں تم سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں عارف کہ تمہیں دھوکا نہیں دینا چاہتی تھی، دے ہی نہیں سکتی تھی۔ آج بھی تمہیں کچھ معلوم نہ ہو پاتا اگر میں تمہیں دھوکا دینا چاہتی۔ اس شہر کی بعض گائناکولوجسٹ یہ گھناؤنا کام بھی کرتی ہیں۔ ان گائناکولوجسٹ کی وجہ سے نہ جانے کتنی لڑکیاں اپنے شوہروں کو دھوکا دیتی ہوں گی۔ وہ لڑکیوں کو

بالکل دوشیزہ بنا دیتی ہیں۔ میں چاہتی تھی کہ تم اس تلخ حقیقت سے آگاہ ہو جاؤ۔ اس کے بعد تم مجھے قبول کرسکو تو کرو یا مجھے ٹھوکر مار دو۔''

''مائی گاڈ!'' عارف کے منہ سے نکلا اور وہ اپنی پیشانی مسلنے لگا۔

''میں تو ممی کے لیے سونے کی چڑیا تھی عارف!'' یاسمین نے اپنی رندھی ہوئی آواز سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اب نہیں رہی تھی۔ ڈھلک چکی ہوں نا اب...... گاہکوں کو شکایت رہنے لگی تھی۔ اسی لیے ممی نے میری شادی ہی کردی۔ اب میرے بجائے میری چھوٹی بہن ان کے لیے سونے کی چڑیا بنے گی۔''

یہ ایسے انکشافات تھے کہ عارف کا سر چکرانے لگا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ وہی سب کچھ سن رہا ہے جو یاسمین اسے بتا رہی تھی۔ اس کے خیال میں شاید یہ ناممکن تھا کہ کوئی ماں اپنی بیٹیوں سے اس طرح پیسا کمائے۔

عارف نہیں جانتا تھا کہ یاسمین کی ماں الماس نادر خود ایک طوائف تھی، لیکن اس نے جسم فروشی کا یہ کام نجیب خان کی مدد سے اس طرح کیا تھا کہ کبھی کسی کو اس کے بارے میں ایسا کوئی شک بھی نہ ہو۔ نجیب خان اس کے لیے ایسے گاہک تلاش کرتا تھا جن کا تعلق عرب ریاستوں سے ہو۔ وہ کسی ریاست کے شہزادے نہ ہوتے ہوئے بھی شہزادوں ہی کی طرح مال دار ہوتے تھے اور جب الماس نادر اس قابل نہ رہی تو اس نے اپنی بیٹی یاسمین سے یہ کام کروانا شروع کیا۔

یاسمین اور ریشماں کی بچپن ہی سے ایسی تربیت کی گئی تھی کہ وہ سمجھ لیں کہ انہیں جوان ہونے کے بعد کیا کرنا ہے۔

دونوں بہنوں کو اچھی تعلیم اسی لیے دلائی گئی تھی کہ انہیں بڑے بڑے لوگوں کی آغوش کی زینت بننا تھا اور انہیں یہ بات بھی بتا دی گئی تھی کہ ان کی ماں نے بھی اپنی جوانی میں یہی سب کچھ کیا تھا۔

یاسمین نے عارف کو یہ سب کچھ بتا دیا اور عارف کی اس دوران میں یہ حالت رہی جیسے وہ کوئی گڑھی ہوئی کہانی سن رہا ہو۔

''نجیب خان میرا ماما ہے یا نہیں، میں نہیں جانتی۔'' یاسمین مشینی انداز میں بولے جا رہی تھی۔ ''یہ تو مجھے اور ریشماں کو ممی نے بتایا ہے۔ وہ بہت عیار شخص ہے عارف......! مستقل طور پر وہ اسلام آباد میں رہتا ہے۔ اسے عرب ریاستوں کے ایسے لوگ وہیں ملتے ہیں جنہیں عیاشی کے لیے کسی لڑکی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان لوگوں سے نجیب خان کا میل جول برسوں پرانا ہے، جب وہ ممی کے لیے گاہک تلاش کیا کرتا تھا۔ بات صرف اس حد تک نہیں ہے عارف......! ایک لڑکی کے ذریعے اتنی دولت نہیں کمائی جاسکتی جو ممی کے پاس ہے اور خود نجیب خان بھی ایک شوگر مل کا مالک بن گیا ہے۔ اتنی دولت بلیک میلنگ سے جمع کی گئی ہے۔''

ایک مرتبہ پھر عارف کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ اب یاسمین نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اداسی اب بھی چھائی ہوئی تھی۔ بولی۔ ''ہاں عارف! بلیک میلنگ......! جب نجیب خان اسلام آباد میں کوئی گاہک تلاش کرلیتا اور میں اسلام آباد بلائی جاتی تھی تو ممی ایک لاکٹ مجھے ضرور پہنایا کرتی تھیں۔ ان کی نہایت سخت تاکید تھی کہ مجھے جس وقت وہ لاکٹ اپنے گلے سے اتارنا پڑے تو وہ میں قریب ہی کسی جگہ رکھ دیا کروں۔ مجھ پر اس لاکٹ کا راز بہت دن بعد کھلا۔ اتفاق تھا کہ میں نے ممی اور نجیب خان کی باتیں سن لی تھیں۔ اس لاکٹ میں کوئی چیز لگی ہوئی ہے جو آوازیں ٹرانسمٹ کردیتی ہے۔ میں گاہک کے ساتھ عموماً کسی ہوٹل میں ہوتی تھی۔ ہوٹل کے باہر کسی جگہ نجیب خان موجود رہتا تھا۔ میری اور گاہک کی آوازیں لاکٹ میں لگے ہوئے آلے سے ٹرانسمٹ ہوتی تھیں جو نجیب خان کے پاس موجود ایک ریسیور کے ذریعے ریکارڈ کرلی جاتی تھیں۔ بعد میں اسی ریکارڈنگ کے ذریعے اس شخص کو بلیک میل کیا جاتا تھا۔ شاید وہ لوگ مسلسل بلیک میل ہوتے رہتے ہیں۔ میں نہیں جانتی کہ ممی تمہیں کس طرح بلیک میل کرتیں۔''

''کیا مطلب!''

''میں نے جو زیورات الماری میں رکھے ہیں، ان میں وہ لاکٹ بھی ہے۔ وہ میں نے خود سے دور الماری میں اسی لیے بند کردیا تھا کہ ہم دونوں کی اس وقت کی باتیں نجیب خان نہ سن سکے، نہ ریکارڈ کرسکے۔ کل مجھے وہ لاکٹ ممی کو واپس کرنا ہے۔ غالباً اب وہ ریشماں کو پہنایا جایا کرے گا لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی ہے کہ نجیب خان ہماری آج کی باتیں ریکارڈ کرلیتا تو وہ یا ممی تمہیں کس طرح بلیک میل کرتے۔''

عارف تیزی سے بستر سے اٹھا۔ اس کی نظر الماری کی طرف تھی۔ اس کے انداز سے یہ بات صاف ظاہر ہوگئی کہ وہ الماری سے لاکٹ نکال کر دیکھنا چاہتا تھا۔

''پلیز عارف!'' یاسمین جلدی سے بول پڑی۔ ''ابھی وہ لاکٹ نہ نکالو۔ پہلے میرے بارے میں کوئی فیصلہ کرلو۔''

"کیسا فیصلہ؟"

"تم مجھے اپنے گھر سے کب نکالو گے۔" یاسمین کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

عارف چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر لیٹ گیا۔

کچھ توقف سے یاسمین بولی۔ "میرے دماغ پر بہت بوجھ ہے عارف! اپنا فیصلہ جلدی سنادو۔"

"میرا دماغ تو پتھر ہوکر رہ گیا ہے یاسمین!" عارف کا لہجہ بھی اس مرتبہ پتھرایا ہوا سا تھا۔ "جو کچھ میں نے ابھی جانا ہے، اس کے بعد میں کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہ گیا ہوں۔ میں ابھی تمہیں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے دماغ پر بوجھ ہوگا لیکن اسے برداشت کردو تاکہ میں کوئی درست فیصلہ کرسکوں۔"

یاسمین چپ رہی۔ عارف بھی پھر کچھ نہیں بولا اور یہ خاموشی طویل سے طویل تر ہوتی چلی گئی۔

***

یاسمین کے دماغ میں ماضی چکراتا رہا، بچپن سے جوانی تک کے واقعات، پھر عارف سے ملاقات، ملاقات کے بعد جذباتیت اور بے بسی کی کیفیت! عارف کے وہ اشعار بھی اسے یاد آتے رہے جو اسے بہت پسند تھے۔ مختلف النوع خیالات کی وجہ سے اس کے چہرے کے تاثرات بھی بدلتے رہے۔ کبھی اس کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں، کبھی چہرہ بالکل سپاٹ ہوجاتا۔ اسی عالم میں اس پر غنودگی طاری ہوئی لیکن اسے غنودگی کا احساس بھی نہیں ہوا اور کسی وقت اس کی آنکھ لگ گئی۔

پھر وہ اس وقت کلبلائی جب اس نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ پر بوندیں گر رہی تھیں۔ نیند ہی کے عالم میں اس نے اپنا ہاتھ ہٹانا چاہا تو فوراً ہی اپنی کلائی پر گرفت محسوس کی۔ فوراً اس کی آنکھ کھل گئی۔ جو کچھ اس نے دیکھا، وہ فوری طور پر تو اس کی سمجھ میں ہی نہیں آسکا اور جب سمجھ میں آیا تو اس کے منہ سے سسکی کی صورت میں عارف کا نام نکلا۔

عارف بستر سے لگا ہوا فرش پر بیٹھا تھا، اس نے یاسمین کی کلائی پکڑ لی تھی اور اس کی آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسو یاسمین کے ہاتھ پر گر رہے تھے۔ جذبات کی شدت سے یاسمین کے ہونٹ کانپنے لگے۔

"عارف!" دوبارہ اس کے منہ سے آواز اٹکتی ہوئی نکلی تھی اور آنسو اس کی آنکھوں میں بھی آگئے تھے۔

"یاسمین!" عارف کی آواز گھٹی ہوئی سی تھی۔ "کیسی ظالم ہے تمہاری ماں، تمہارا ماموں!...... کیسا ظلم توڑا ہے انہوں نے مجھ پر...... میری پیاری گڑیا کو انہوں نے پہلے ہی توڑ پھوڑ ڈالا۔ کیسی قیامت توڑی ہے انہوں نے مجھ پر...... ٹوٹی ہوئی گڑیا دے دی ہے انہوں نے مجھے...... لیکن میں اس ٹوٹی ہوئی گڑیا کو بھی اپنے کلیجے سے لگا کر رکھوں گا۔"

عارف کے آخری فقرے کا مطلب بالکل واضح تھا۔ اس نے اپنا فیصلہ سنادیا تھا۔

یاسمین پاگلوں کی طرح بستر سے اتر کر عارف سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آنسو عارف کے بھی بہتے رہے اور ہونٹوں میں شدید لرزش رہی۔ وہ یاسمین کو اپنے سینے سے لگائے رہا۔

نہ جانے کتنا وقت اسی طرح گزر گیا۔ پھر انہیں یہ بھی احساس نہیں ہوسکا کہ وہ فرش سے کب اٹھ کر بستر پر اس طرح لیٹ گئے جیسے یک جان، دو قالب ہوں۔ اتنی دیر تک انہوں نے ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہا تھا۔ بستر پر لیٹنے کے بعد بھی دونوں خاموش ہی رہے۔ ان دونوں کے چہرے اتنے قریب تھے کہ وہ ایک دوسرے کی سانسیں اپنے چہروں پر محسوس کر رہے تھے، ان کے چہروں پر غمناک تاثر جیسے منجمد ہوکر رہ گیا تھا۔

پھر یکایک عارف کے تاثرات میں تبدیلی آئی۔ وہ غضب ناک سا نظر آنے لگا۔

"یاسمین۔" وہ بولا۔ "جس عورت کو تم ممی کہتی ہو، میں اب اس کے لیے یہ مقدس لفظ اپنی زبان پر نہیں لانا چاہتا۔ میں اسے اب الماس نادر ہی کہوں گا۔ تمہیں اس سے اور نجیب خان سے کتنا لگاؤ ہے؟ مجھے بالکل سچ سچ بتانا یاسمین!"

"میں تم سے کوئی جھوٹ بول ہی نہیں سکتی عارف......! اگر یہ میرے لیے ممکن ہوتا تو تمہیں میرے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا اور نہ ہی میں تمہیں وہ سب کچھ بتاتی جو بتا چکی ہوں۔ تمہیں دھوکا دینا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اسی لیے تم سے شدید محبت کے باوجود میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں اپنے محبوب کو دھوکا نہیں دے سکتی۔ اس سے کوئی جھوٹ نہیں بول سکتی۔"

"تو میرے سوال کا جواب دو۔ تمہیں ان دونوں سے کتنا لگاؤ ہے؟"

"ذرا بھی نہیں عارف...... ذرا بھی نہیں۔"

"پھر تم نے ان کے ساتھ...... خاص طور سے الماس نادر کے ساتھ اتنی زندگی کیسے گزار دی؟"

"میں اور کیا کرتی عارف؟ کہاں جاتی؟ دنیا میں میرا

کوئی نہیں تھا۔ اب تم تو میرے ہو۔ تم سے پہلے تو میرا سہارا کوئی نہیں تھا۔ میں نے...... اور میں نے ہی کیا، ریشماں بھی اپنی آنے والی زندگی سے دکھی ہے۔ میں بھی اسے اپنی قسمت کا جبر سمجھ کر برداشت کرتی رہی ہوں اور ریشماں بھی برداشت کرتی رہے گی۔ ہوش سنبھالتے ہی ہمیں معلوم ہوگیا تھا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ عام طور پر ایسی لڑکیاں اس انداز کی سوچ نہیں رکھتیں جو میری اور ریشماں کی ہے۔ وہ اس زندگی کو خوشی خوشی قبول کرلیتی ہیں لیکن میں ساری زندگی بس کڑواہٹ نگلتی رہی ہوں۔ قدرتی طور پر مجھے شاعری سے لگاؤ تھا۔ میں کچھ سوچنے کے بجائے خود کو اسی میں الجھائے رکھتی تھی۔ شاید ہی کوئی شاعر ہو جسے میں نے نہ پڑھا ہو، لیکن تم سے ملنے کے بعد میں نے کسی اور شاعر کو نہیں پڑھا۔ صرف تم کو پڑھتی رہی ہوں۔"

"تو یہ طے ہے کہ تمہیں ان دونوں سے کوئی لگاؤ نہیں!"

"ہرگز نہیں عارف!"

"تو پھر ان دونوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ میں انہیں معاف نہیں کرسکتا جنہوں نے میری گڑیا کو پہلے ہی توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔"

"تم کیا کرو گے عارف؟" یاسمین سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"ابھی میرے دماغ میں صرف اتنا ہی آیا ہے کہ میں ان سے انتقام لوں گا۔"

"پلیز عارف!" یاسمین پریشان نظر آئی۔ "کوئی ایسا قدم نہ اٹھانا جس سے تمہیں بھی کوئی زک پہنچے۔ میں نے اپنی زندگی صرف برداشت کرنے میں گزاری ہے لیکن یہ میں برداشت نہیں کرسکوں گی کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچ جائے۔"

عارف کچھ سوچتا ہوا بولا۔ "ریشماں بھی اپنی آنے والی زندگی سے خوش نہیں ہے؟"

"بالکل خوش نہیں ہے۔"

"اور ابھی اس نے اس زندگی میں قدم نہیں رکھا؟"

"نہیں۔" یاسمین نے جواب دیا۔ "وہ تو جب نجیب خان اسلام آباد واپس جائے گا تو کوئی گاہک تلاش کرنے کے بعد ریشماں کو وہاں بلایا جائے گا۔"

"تو پھر میں اسے بھی اس خارزار سے بچاؤں گا۔"

"مگر کیسے عارف؟" یاسمین بے چین ہوئی۔

"میں نے ابھی کہا تھا تم سے...... میں نے ابھی کوئی تدبیر نہیں سوچی۔ بس اتنا ہی آیا ہے میرے دماغ میں کہ مجھے ان لوگوں سے انتقام لینا ہے۔"

"تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچے عارف!" یاسمین جذباتی انداز میں زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

"کل تم کیا کرو گی؟" عارف نے پوچھا۔ "اپنے گھر...... میرا مطلب ہے، الماس نادر کے پاس تو جاؤ گی نا؟"

"یہ تو ایک رسم ہے۔ دنیا دکھاوے کے لیے مجھے جانا ہی ہوگا لیکن کل کے بعد میں وہاں کبھی نہیں جاؤں گی۔ فون پر ہی کہہ دوں گی کہ اب وہ لوگ مجھ سے کوئی واسطہ نہ رکھیں۔"

"تم نے لاکٹ الماری میں رکھ دیا ہے۔ نجیب خان ہماری اس وقت کی باتیں ریکارڈ نہیں کرسکا ہوگا۔ الماس

نادر تم سے اس بارے میں پوچھے گی تو!"

"میرے دماغ میں صرف ایک ہی بات ہے۔ میں کہہ دوں گی کہ تم نے کمرے میں آکر مجھ سے کوئی بات کیے بغیر میرے زیور اتار کر کہیں رکھے تھے، پھر...... پھر......"

یاسمین کی زبان لڑکھڑائی۔ "میں کہہ دوں گی کہ اس کے بعد ہی عارف نے بولنا شروع کیا تھا۔"

"کیا الماس نادر یقین کر لے گی؟"

"نہ کرے۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔"

"سوچنا پڑے گا اس بارے میں۔" اس مرتبہ عارف کا انداز بڑبڑانے کا سا تھا اور اس نے گھڑی پر بھی نظر ڈالی۔ "چھ بجنے والے ہیں۔ سوچنے کے لیے وقت بہت کم ہے۔"

یاسمین کچھ نہیں بولی۔ وہ بھی سوچ میں پڑ گئی تھی۔

"ایک بات نہیں کی تم نے عارف!" وہ کچھ توقف سے بولی۔

"کیا؟"

"تم نے یہ نہیں پوچھا کہ میرا یا ریشماں کا باپ کون ہوسکتا ہے۔ تم ہم بہنوں کی پیدائش کو ناجائز سمجھ رہے ہو گے جبکہ ایسا نہیں ہے۔ تمہاری وجہ سے میں بھی اب اس عورت کو الماس نادر ہی کہوں گی۔ یہ بات ہم دونوں کے علم میں ہے کہ الماس نادر نے ایک غریب شخص سے شادی کی تھی۔ شاید اس کے ماں باپ بھی غریب ہی ہوں گے اس لیے اس کی شادی کسی غریب شخص سے ہی ہوسکتی تھی۔ ہم دونوں اس غریب شخص ہی کی بیٹیاں ہیں۔ الماس نادر کی دوسری زندگی ہمارے باپ کی وفات کے بعد کی ہے۔"

"تب تو ایک معما حل ہوگیا۔" عارف نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"کیسا معما؟"

"تمہارا غریب باپ یقیناً کوئی بہت شریف انسان ہوگا۔ تم دونوں بہنوں کی رگوں میں اسی شریف باپ کا خون دوڑ رہا ہے۔ اسی لیے تم نے اس زندگی کو خوشی سے قبول نہیں کیا اور ریشماں بھی اسی لیے اپنی آنے والی زندگی کو خوشی سے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔"

یاسمین کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "ہاں عارف......! یہی بات ہے۔ میں خود تم سے یہ بات کہتے ہوئے ہچکچا رہی تھی کہ ہم بہنیں کسی کی ناجائز اولاد نہیں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے جھوٹا نہیں سمجھتے۔ اب یہ مشکل خود کو آمادہ کر سکی کہ تمہیں یہ بات بتا ہی دوں۔"

"تمہارے بتانے سے ایک بات صاف ہوگئی لیکن اگر تم دونوں الماس نادر کی ناجائز اولاد ہوتیں تو بھی میرے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لوگ ناجائز اولاد کے لیے اچھے خیالات نہیں رکھتے لیکن میری سوچ ان سے مختلف ہے۔ اگر کوئی کسی کی ناجائز اولاد ہو تو اس میں اس کا نہیں، اس کی ماں کا قصور ہوتا ہے۔"

"عارف! میرے اچھے عارف!" یاسمین جذباتی انداز میں اس سے لپٹ گئی۔ "میرے بہت ہی اچھے عارف...... تمہارے ان خیالات کا اندازہ مجھے پہلے سے تھا۔ تمہاری دو نظموں کا موضوع یہی ہے۔ تم اپنے ان خیالات کا اظہار ان نظموں میں کر چکے ہو۔"

"اور ان نظموں کو ادبی حلقوں میں سراہا بھی جا چکا ہے لیکن اب یہ باتیں چھوڑو۔ بہت کچھ سوچنا ہے مجھے، لیکن اس سے پہلے میں ایک مرتبہ پھر۔" عارف نے بات ادھوری چھوڑ کر اپنی دو انگلیوں سے یاسمین کے ہونٹوں کو چھیڑا۔

یاسمین نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ نظریں جھکا لیں۔

دوسری صبح اس کی آنکھ کچھ دیر سے ہی کھلتی اگر عارف اسے جگا نہ دیتا۔ وہ غسل کر کے ہشاش بشاش نظر آرہا تھا۔

"بس اب جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" عارف نے کہا۔ "آج ڈیڈی دفتر نہیں جائیں گے۔ انہوں نے کل ہی بتا دیا تھا۔ اس وقت عموماً ناشتے کی میز لگ جاتی ہے لیکن خاص طور سے آج کے لیے ڈیڈی نے ناشتے کا پروگرام ایک گھنٹے بعد کا رکھا ہے۔"

یاسمین اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ جب وہ غسل کر کے نکلی تو عارف موبائل فون پر دھیمی آواز میں بات کرتے ہوئے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ بات اختتام پر تھی۔ یاسمین نے عارف کو کہتے سنا۔ "ٹھیک ہے، تم آدھے گھنٹے میں پہنچ جاؤ۔ میں بے چینی سے انتظار کروں گا۔"

اس نے رابطہ منقطع کر کے یاسمین کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "گلاب کی طرح نکھر آئی ہو۔"

"موبائل پر کس سے بات کر رہے تھے؟" یاسمین نے پوچھا۔ "اس وقت کسے بلایا ہے؟"

"ایک دوست ہے میرا۔ چلو تم جلدی سے تیار ہو جاؤ اور ہاں! زیورات ابھی نہ پہننا۔ تمہاری بہن اپنی کچھ دوستوں کے ساتھ تمہیں جب لینے آئے گی، اسی وقت پہن لینا۔"

"اس لاکٹ کی وجہ سے کہہ رہے ہو؟"

"ہاں۔ میں نہیں چاہتا کہ اگر اس وقت بھی آس پاس کہیں نجیب خان موجود ہو تو ہماری باتیں سن سکے، نہ ریکارڈ

کر سکے۔ تم تیار ہو۔ میں ذرا باہر کا...... میرا مطلب ہے گھر ہی میں...... ایک چکر لگا کر آتا ہوں۔"

وہ یاسمین کے کچھ بولنے سے پہلے ہی تیزی سے چلتا ہوا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

یہ بات یاسمین کی سمجھ میں نہیں آسکی تھی کہ فوری طور پر عارف نے اپنے کسی دوست کو کیوں بلایا تھا......؟ اس کا ذہن الجھا رہا لیکن اسی دوران میں وہ تیار ہوگئی۔ تیار ہونے کے بعد اسے عارف کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔

"میرا اندازہ تھا کہ تم تیار ہو چکی ہو گی۔" عارف نے اندر داخل ہوتے ہوئے خوشگوار موڈ میں کہا۔ اس کے چہرے سے یہ بات قطعی ظاہر نہیں ہو رہی تھی کہ گزشتہ رات اسے ایک شدید ذہنی جھٹکا لگ چکا تھا یا شاید وہ یاسمین کو یہ تاثر دینا چاہتا ہو کہ جو کچھ اس کے سامنے آیا ہے، وہ سب اس نے سچے دل کے ساتھ قبول کر لیا ہے۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ ڈائننگ روم میں پہنچے۔ ڈائننگ ٹیبل پر اس وقت کنور شمشاد کے ساتھ رانی بیگم بھی موجود تھی۔ عارف کو تعجب ہوا۔ وہ پہلی مرتبہ رانی بیگم کو اتنی صبح اپنے گھر پر دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر میں یہ بات نہیں آسکی کہ یاسمین رانی بیگم کو دیکھ کر چونک گئی تھی۔

"آؤ دلہن!" رانی بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ تم نے زیورات کیوں نہیں پہنے؟"

"اچھا خاصا بوجھ ہوتا ہے، زیورات کا۔" یاسمین سے پہلے عارف بول پڑا۔ "میں نے ہی کہا تھا کہ جب ریشماں لینے آئے تو پہن لینا زیورات۔"

پھر وہ دونوں سلام کر کے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

ابھی ناشتا پوری طرح نہیں کیا گیا تھا کہ ایک ملازم نے آکر عارف کو اطلاع دی کہ اس کا دوست شکیب فاروقی آیا ہے اور اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا ہے۔

عارف جلدی سے اٹھا۔ "سوری ڈیڈی...... میں نے ہی اسے بلایا تھا۔ ایک بہت ضروری کام ہے۔"

"آج تو تمہیں بالکل فارغ ہونا چاہیے تھا۔" کنور شمشاد نے منہ بنایا۔

"آئی ایم ویری سوری ڈیڈی......! دراصل کام بہت ضروری تھا۔ میں ناشتا بعد میں کر لوں گا۔"

عارف تیزی سے چلتا ہوا ڈائننگ روم سے نکل جانا چاہتا تھا کہ کنور شمشاد بول پڑے۔ "سنو!" عارف ٹھٹکا۔ کنور شمشاد نے اپنی بات مکمل کی۔ "ابھی میں یاسمین بیٹے کو اپنے کمرے میں لے جاؤں گا۔ کچھ باتیں کروں گا، تم اپنے دوست سے مل کر ادھر ہی آجانا۔"

"جی بہتر۔" عارف نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

یاسمین نظریں جھکائے ناشتا کرتی رہی۔ اس کے ذہن میں یہ سوال نہیں اٹھا کہ کنور شمشاد اس سے کیا باتیں کرے گا۔ یہ سوال اس کے دماغ میں اٹھنا فطری بات ہوتی لیکن اس کا دماغ پہلے ہی اتنا الجھا ہوا تھا کہ اس نے کنور شمشاد کی بات بھی ٹھیک سے نہیں سنی۔ اس پر شدید دباؤ تو اس بات کا تھا کہ رانی بیگم کی وہاں موجودگی کیا معنی رکھتی ہے۔

رانی بیگم نجیب خان کی بیوی تھی۔ اپنے کسی منصوبے کے تحت انہوں نے عام طور پر تو یہ ظاہر کر رکھا تھا کہ ان دونوں میں علیحدگی ہوگئی ہے لیکن حقیقت یہ نہیں تھی۔ ویسے تو رانی بیگم کا قیام ایک بنگلے میں تھا لیکن یاسمین کے علم کے مطابق نجیب خان اس کے بنگلے پر کبھی نہیں جاتا تھا۔ ان کی خفیہ ملاقاتیں خود یاسمین کے گھر میں ہوتی تھیں جب نجیب خان اسلام آباد سے آتا تھا۔

ایسی صورت میں رانی بیگم کی وہاں موجودگی یاسمین کے لیے حیرت کا سبب بننا ہی چاہیے تھی۔

ڈائننگ ٹیبل پر زیادہ تر گفتگو کنور شمشاد اور رانی بیگم میں ہوتی رہی۔ ان باتوں سے یاسمین کو یہ اندازہ بھی ہوا کہ رانی بیگم رات کو شادی میں بھی شریک رہی تھی۔ یاسمین نے رات کو اسے اس لیے نہیں دیکھا تھا کہ وہ مستقل نظریں جھکائے رہی تھی۔

ان باتوں سے یہ بھی ظاہر ہو رہا تھا کہ رانی بیگم کنور شمشاد کے نہ صرف تجارتی بلکہ گھریلو معاملات میں بھی خاصی دخیل تھی۔

یاسمین کا ذہن الجھا رہا اور ناشتا کر لیا گیا۔ اس کے بعد کنور شمشاد اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ رانی بیگم اس وقت بھی ساتھ رہی۔ بیٹھنے کے بعد کنور شمشاد نے یاسمین کو عارف کے مزاج کے بارے میں سمجھاتے ہوئے کہا۔ "یہ

ایک لڑکا برقعے والی کو چھیڑتے ہوئے۔

"جہاں سبزی وہاں ڈالڈا کیسی ہو میری خالدہ؟"

برقعے والی نے کہا۔ "غور سے دیکھ نہ میں خالدہ نہ ڈالڈا۔ میں ہوں تیری والدہ۔"

لڑکے نے کہا۔ "اوہ امی جان! جہاں ماسنا وہاں ڈالڈا۔"

☆☆☆

سب کچھ میں تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ یہ باتیں آئندہ زندگی میں تمہارے کام آئیں گی۔"

"جی۔" یاسمین نظریں جھکائے رہی۔

ایک ملازم آکر چائے دے گیا۔ یاسمین کو علم نہیں تھا کہ ناشتے کے بعد کنور شمشاد اپنے کمرے میں آکر بھی چائے پینے کا عادی تھا یا صرف اسی وقت ایسا ہوا تھا۔

چائے پینے کے دوران میں کنور شمشاد کی باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اس نے یہ بھی بتا دیا کہ اس نے اپنا کاروبار بلکہ اپنا سب کچھ عارف کے نام کر دیا ہے اور اب عارف کو اپنی شاعری کے ساتھ ساتھ کاروبار میں بھی دلچسپی لینا ہوگی۔

آدھا گھنٹا گزرا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ آنے والا عارف ہی تھا۔

"بس مجھے یہی باتیں کرنا تھیں۔" کنور شمشاد نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ یاسمین سے کہا۔ "اب تم جا کے تیاری کرو۔ کچھ دیر میں تمہاری بہن اپنی دوستوں کے ساتھ آتی ہی ہوگی۔"

یاسمین اٹھ کر عارف کے ساتھ کمرے سے نکل آئی۔

"کیا کہہ رہے تھے ڈیڈی؟" عارف نے پوچھا۔

یاسمین نے سب کچھ مختصراً بتا دیا۔ وہ عارف کے ساتھ اس کے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی مگر اس کا دماغ رانی بیگم ہی میں الجھا ہوا تھا۔ وہ عارف سے اس کے بارے میں سوال کر بیٹھی۔

جواب میں عارف نے کہا۔ "فی الحال یہ بات راز میں رکھنا ہے یاسمین! اپنے گھر میں بھی کسی کو نہیں بتانا۔ میرا خیال ہے کہ اب بس دو چار دن کی بات ہے، پھر ڈیڈی ظاہر کر ہی دیں گے۔ وہ رانی بیگم سے شادی کر چکے ہیں۔"

"کیا!" یاسمین ٹھٹک کر رک گئی۔

"کیوں؟" عارف بھی رک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ "ڈیڈی کی تیسری شادی تمہارے لیے تعجب کی بات ہے؟"

"یہ بات نہیں۔" یاسمین نے عارف کا بازو پکڑ کر تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔ "دراصل یہ شادی ممکن ہی نہیں۔ رانی بیگم نجیب خان کی بیوی ہے۔"

اس مرتبہ عارف ٹھٹک کر رکنا چاہتا تھا لیکن یاسمین نے اسے رکنے نہیں دیا اور اسے لیے کمرے میں داخل ہوگئی۔ پھر اس نے عارف کو سب کچھ بتا دیا۔ عارف دم بہ خود بیٹھا رہ گیا۔

"اور اس کا مطلب ہے۔" یاسمین پرجوش انداز میں بولی۔ "یہ لوگ اب غالباً تمہارے گرد بھی کوئی جال بننا چاہتے ہیں اور آلۂ کار مجھے بنانا چاہیں گے۔"

"میرے گرد کیا جال بنا جا سکتا ہے؟" عارف الجھ گیا تھا۔

"ابھی میں اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ سب کچھ سامنے تو آئے گا اگر ان لوگوں نے مجھے آلۂ کار بنایا لیکن یہاں...... تمہارے معاملے میں تو میں ان کی ایک نہیں چلنے دوں گی۔"

"یہ سب کچھ تو میرے لیے خاصا پریشان کن ہے یاسمین! اور پھر یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے کہ ڈیڈی سے اس کا یہ تعلق ناجائز ہے۔"

"لیکن اس میں تمہارے ڈیڈی کا کوئی قصور نہیں۔ ان کو تو رانی بیگم نے اندھیرے ہی میں رکھا ہوگا۔"

"ہاں، یہ تو خیر ظاہر ہے۔" عارف نے کہا اور سوچ میں ڈوب گیا۔

"اچھا اب میں تیار ہو جاؤں۔ سوچنا تو بہرحال پڑے گا اس بارے میں۔" عارف نے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

یاسمین نے الماری سے اپنے زیورات نکالے اور تیار ہونے لگی۔

تھوڑی دیر بعد ریشماں اور اس کی دو دوست آگئیں۔ رانی بیگم نے ان کا استقبال ڈرائنگ روم میں کیا تھا۔ جب یاسمین اور عارف وہاں پہنچے تو کنور شمشاد بھی وہاں آچکے تھے۔

مہمانوں کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی۔ اس کے بعد یاسمین ان کے ساتھ روانہ ہوئی۔ ریشماں اسی کی کار میں آئی تھی۔ اب آئندہ بھی وہ اسی کے استعمال میں رہتی۔

ریشماں نے اپنی دوستوں کو ان کے گھروں پر ڈراپ کیا، پھر اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے ریشماں متفکر لہجے میں بولی۔ "جانے کیا بات ہے باجی!...... آج بھی وہ دونوں بہت غصے میں ہیں۔" اس کا اشارہ نجیب خان اور الماس نادر ہی کی طرف تھا۔

یاسمین ان دونوں کے غصے کی وجہ سمجھ گئی۔ بالکل سامنے کی بات تھی۔ نجیب خان اس کی اور عارف کی باتیں ریکارڈ نہیں کر سکا ہوگا۔

البتہ یہ بات یاسمین کی سمجھ میں بھی نہیں آسکی کہ ان دونوں کی باتیں ریکارڈ کر کے یہ لوگ کیا فائدہ اٹھا سکتے تھے۔

گھر پر الماس نادر بے چینی سے منتظر نظر آئی۔ اس کے ساتھ نجیب خان بھی تھا۔

فطری طور پر تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ ایک ماں کی حیثیت سے الماس نادر بڑی محبت سے یاسمین کو اپنے سینے سے لگا لیتی لیکن سامنا ہوتے ہی اس نے ایک سوال داغ دیا۔

"یہ لاکٹ رات کو کہاں تھا؟" اس نے یاسمین کے گلے میں پڑے ہوئے لاکٹ کی طرف اشارہ بھی کیا تھا۔

جواب میں یاسمین نے وہی کچھ کہا جو وہ عارف کو بتا چکی تھی۔

"بے تکی بات ہے یہ!" نجیب خان بول پڑا۔ "ایسا کوئی نہیں کرتا۔"

"عارف کہہ رہے تھے کہ میں انہیں زیورات کے بغیر زیادہ اچھی لگتی ہوں۔" یاسمین نے جواب دیا۔

"مجھے شبہ ہے کہ تم سچ نہیں بول رہی ہو۔" الماس نادر نے یاسمین کو گھورتے ہوئے کہا۔ "اور پھر اسے سب زیورات الماری میں رکھنے کی کیا ضرورت تھی...... ایسے موقعوں پر زیورات قریب ہی کہیں رکھ دیے جاتے ہیں۔"

"جو بات تھی، وہ میں نے بتا دی۔ آخر اس سے فرق بھی کیا پڑا کہ ماما ہماری باتیں ریکارڈ نہیں کر سکے۔"

نجیب خان اور الماس نادر نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر دونوں ہی یاسمین کو گھورنے لگے۔

"ریکارڈنگ کی کیا بات کی تم نے؟" الماس نادر نے کھردرے لہجے میں پوچھا۔

یاسمین نے بے خوفی سے جواب دیا۔ "اس لاکٹ میں کوئی سم یا ڈیوائس...... یا جو کچھ بھی کہتے ہیں، وہ لگی ہوئی ہے۔ اتفاق سے میں نے آپ کی اور ماما کی باتیں سن لی تھیں۔ تب ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اس لاکٹ میں جو آلہ لگا ہے، وہ آوازیں نشر کرتا ہے۔ ماما اپنے کسی آلے پر وہ آوازیں ریسیو کرتے اور ریکارڈ کر لیتے۔ آخر اس کی ضرورت کیا تھی ممی؟ میری اور عارف کی باتوں کو ریکارڈ کرنے سے آپ کو کیا حاصل ہوتا؟"

"بے وقوف لڑکی۔" نجیب خان غصے سے بڑبڑایا۔ پھر اس نے کہا۔ "تمہاری ان باتوں سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ تم نے خود یہ لاکٹ الماری میں رکھا تھا۔ تم نہیں چاہتی تھیں کہ تم دونوں کی باتیں ریکارڈ ہوں۔"

"آپ جو چاہیں، سمجھیں لیکن میرا سوال اپنی جگہ ہے۔ ان باتوں کو ریکارڈ کر کے آپ کو کیا حاصل ہوتا؟"

"ہمیں اندازہ ہو جاتا اس کی باتوں سے کہ وہ تمہیں

لاجواب

ایک ہندو استاد کلاس روم میں۔ "بچوں...... کیا میں آپ کو نظر آرہا ہوں؟"

بچے۔ "جی ہاں۔"

استاد۔ "میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں اس لیے نظر آرہا ہوں کیا آپ کو اللہ نظر آرہا ہے؟"

بچے۔ "نہیں۔"

استاد۔ "ہوتا تو نظر آتا ناں۔"

ایک مسلمان بچے نے کھڑے ہو کر کہا۔ "بچوں! آپ کو استاد کی عقل نظر آرہی ہے؟"

بچے۔ "نہیں۔"

مسلم بچہ۔ "ہوتی تو نظر آتی ناں۔"

مرسلہ: محمد جاوید بلوچ، علی پور

کتنا چاہتا ہے اور تم اسے کس حد تک اپنی انگلیوں پر نچا سکتی ہو۔" الماس نادر نے کہا پھر اس نے یاسمین کے قریب ہو کر بڑی محبت کا اظہار کیا۔ "دیکھو میری جان...... یہ ٹھیک ہے کہ تم عارف سے محبت کرتی ہو لیکن ہمارا ابھی تو کوئی حق ہے تم پر......! چلو ہم مان لیتے ہیں کہ عارف ہی نے تمہارے سب زیورات اتارے تھے لیکن اب تم دو دن تک ایسا نہیں ہونے دینا۔ تم اس سے کیا اتنی بات بھی نہیں منوا سکتیں کہ وہ زیورات الماری میں بند کرنے کے بجائے قریب ہی کہیں رکھ دے۔ سائڈ ٹیبل پر رکھ دے۔"

"منوا سکتی ہوں میں یہ بات۔" یاسمین نے سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اگر میں عارف کو اپنی انگلیوں پر نچا سکی تو اس سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟"

"دیکھو!" الماس نادر کا لہجہ نرم ہی رہا۔ "اب تک اس لاکٹ کی وجہ سے تمہارے بہت سے گاہک ہماری گرفت میں آچکے ہیں۔ ان کی اس آوارگی کو چھپانے کے لیے ہم ان سے رقومات لیتے رہے ہیں۔ ان لوگوں کو یہ حق آخر کس نے دیا کہ وہ دولت پر سانپ بن کر بیٹھے رہیں۔ ہم کیوں محروم رہیں اس دولت سے......؟ اور اب تم ڈھل چکی ہو۔ تمہارے لیے اب اچھے گاہک نہیں مل سکتے۔ اسی لیے اب تمہاری جگہ ریشماں لے لے گی لیکن دولت تو عارف کے پاس بھی بہت ہے۔ اس کے والد نے اپنا سب کچھ اس کے نام کر دیا ہے۔ اگر عارف تمہیں بے پناہ چاہتا

ہے تو تم بہ آسانی اسے اپنی انگلیوں پر نچا سکتی ہو۔ تم اس سے لاکھوں کی فرمائش کروگی تو بھی وہ تمہیں نہیں ٹالے گا۔ بس یہی اندازہ لگانا ہے ہمیں کہ تم اس سے ہمارے لیے کتنی رقم اینٹھ سکتی ہو۔"

اب یاسمین کی سمجھ میں آیا کہ عارف کے گرد گھیرا ڈالنے سے ان لوگوں کا مقصد کیا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بھی آیا کہ رانی بیگم نے شادی کے نام پر کنور شمشاد سے تعلقات کس لیے قائم کیے ہوں گے۔ اسی نے کنور شمشاد کو اس کے لیے تیار کیا ہوگا کہ وہ عارف کی شادی یاسمین سے کروادے اور کیا عجب کہ اسی کے کہنے سے کنور شمشاد نے اپنا سب کچھ ابھی سے عارف کے نام کر دیا ہوتا کہ یاسمین اپنی فرمائش آسانی سے پوری کرواسکے۔

یاسمین نے یہ سب کچھ سمجھنے اور اندازے لگانے کے بعد اپنے رویے میں تبدیلی لانا ضروری سمجھا۔ اسی طرح وہ الماس نادر سے کچھ اور باتیں بھی اگلوا سکتی تھی۔ اس نے آہستگی سے سر ہلایا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"اچھا......! اگر آپ عارف سے بھی دولت گھسیٹنا چاہتی ہیں تو عارف سے محبت کی خاطر میں اسے گوارا کرلوں گی۔ بہت دولت ہے عارف کے پاس...... اگر آپ میرے ذریعے ایک آدھ کروڑ بھی حاصل کرلیں گی تو اس سے عارف کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، معاف کیجیے گا، اب جو آپ اتنے میٹھے انداز میں باتیں کرنے لگی ہیں، یہ مصنوعی ہے۔ آپ جانتی ہیں کہ جس طرح عارف مجھے چاہتے ہیں، اسی طرح میں بھی ان کے لیے کچھ بھی کرسکتی ہوں۔"

الماس نادر چونکی۔ کچھ ایسی ہی کیفیت نجیب خان کی بھی ہوئی تھی۔ ریشماں اس دوران میں نظریں جھکائے ایک طرف خاموشی سے بیٹھی رہی تھی۔ لیکن یاسمین کی اس بات پر اس نے بھی تیزی سے سر اٹھا کر یاسمین کی طرف دیکھا تھا۔

یاسمین نے اپنی بات جاری رکھی۔ "آپ جانتی ہیں کہ جس طرح عارف مجھے چاہتے ہیں، اسی طرح میں بھی عارف کو شدت سے چاہتی ہوں۔ اگر میں آپ لوگوں کی بات نہیں مانوں گی تو جس طرح رانی بیگم نے عارف کی مجھ سے شادی کرنے کے لیے ان کے والد کو آمادہ کیا ہے، اسی طرح آپ ان کے ذریعے عارف پر ان کے والد کا یہ دباؤ بھی ڈلوا سکتی ہیں کہ وہ مجھے طلاق دیدے۔"

"ارے نہیں۔" الماس نادر نے پھر اداکاری کی اور یاسمین کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "اب ایسا بھی نہیں ہے کہ میری بیٹی میری بات نہ مانے تو میں اس سے اس طرح انتقام لوں۔ ہاں البتہ تمہاری عارف سے شادی کے لیے رانی بیگم ہی نے کوشش کی تھی۔"

یاسمین نے نجیب خان کی طرف دیکھا۔ "آپ کو اس بات پر شرم بھی نہیں آئی ہوگی ماما کہ آپ نے اپنی بیوی کو کنور شمشاد کو سونپ دیا ہے۔ شاید انہیں آپ نے اور لوگوں کے پاس بھی بھیجا ہوگا جب وہ جوان ہوں گی۔"

"ہمارا پیشہ ہی یہ ہے۔" نجیب خان نے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ تم بھی جانتی ہو۔ خود تم بھی ایک طوائف کی اولاد ہو۔"

"مجھے بڑی حد تک یقین ہے کہ میں ان کی ناجائز اولاد نہیں ہوں۔" یاسمین نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میرا باپ وہی ہوگا جس سے ممی نے شادی کی تھی۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹی!" الماس نادر نے اپنے لب و لہجے کی نرمی برقرار رکھی۔ "تم اور ریشماں، دونوں ہی میرے اس شوہر کی اولاد ہو لیکن وہ بہت غریب آدمی تھا۔ میرے لیے تو بہت اچھا ہوا کہ وہ جلد مر گیا۔ تم دونوں بہنوں نے اس وقت ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا۔ اس کے بعد ہی میں نے یہ پیشہ اختیار کیا جس کی بہ دولت میں نے ہی نہیں، تم دونوں بہنوں نے بھی عیش و عشرت کی زندگی گزاری ہے، لیکن اب تلخ باتیں ختم کرو۔ یہ خیال اپنے ذہن سے نکال دو کہ میں تمہیں عارف سے طلاق دلوانے کے بارے میں سوچوں گی۔ اب میں یہ تمہاری مرضی پر چھوڑتی ہوں کہ تم عارف سے ہمیں کچھ دلوانا چاہوگی یا نہیں۔"

"کیسے چھوڑ رہی ہو تم یہ بات اس پر۔" نجیب خان بگڑ کر بولا۔ "اسے وہ سب کچھ کرنا ہی پڑے گا جو ہم چاہتے ہیں۔ تم اسے طلاق نہیں دلوانا چاہوگی تو نہ چاہنا۔ میں رانی بیگم کے ذریعے اسے طلاق دلوا کر رہوں گا اگر یہ ہماری بات نہیں مانے گی تو۔"

"تم بہت ضدی ہو نجیب!" الماس نادر نے سنجیدگی سے کہا، پھر نجیب خان کو آنکھوں سے کچھ اشارہ بھی کیا۔

"ہاں ضدی ہوں میں......! آخر اس لڑکی نے اتنی عیش و عشرت کی زندگی گزاری ہے تو ہماری ہی وجہ سے گزاری ہے۔ اب اسے ہمارے کام بھی آنا پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" یاسمین نے تلخ لہجے میں کہا۔ "میں تم لوگوں کی ڈیمانڈ پوری کرتی رہوں گی۔"

یہ جواب دیتے وقت وہ دل ہی دل میں فیصلہ کرچکی تھی کہ عارف کو ان تمام باتوں سے آگاہ کردے گی۔ عارف چاہتا بھی تھا کہ ان لوگوں کے خلاف کوئی ایکشن لیا جائے لہٰذا یہ سب کچھ جاننے کے بعد اسے کوئی معقول تدبیر

سوجھ سکتی تھی۔

نجیب خان بولا۔ "دو دن تک یہ لاکٹ تم سے دور نہیں ہونا چاہیے۔ میں اچھی طرح اندازہ لگا لینا چاہتا ہوں کہ تم دونوں کے تعلقات میں کتنی گہرائی ہے۔ گہرائی جاننے کے بعد ہی میں یہ فیصلہ کرسکوں گا کہ تم اس کو کس حد تک نچا سکتی ہو۔"

یاسمین بولی۔ "میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ ایک آدھ کروڑ سے بھی عارف کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔"

"بس تو پھر وہی کرنا جو میں ابھی کہہ چکا ہوں۔ دو دن تک یہ لاکٹ تم سے دور نہیں ہونا چاہیے۔"

اس وقت الماس نادر بول پڑی۔ اس نے یاسمین سے پوچھا۔ "تمہیں واپس کب جانا ہے؟"

"رات کو ولیمہ ہے۔" یاسمین نے جواب دیا۔ "پانچ بجے تک عارف خود آئیں گے مجھے لینے۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ عارف کو تمہارے ماضی کے بارے میں کوئی شبہ تو نہیں ہوا؟"

"نہیں۔" یاسمین نے جواب میں صرف اتنا ہی کہنا مناسب سمجھا۔

"ٹھیک ہے، مجھے اطمینان بھی تھا۔ جس لیڈی ڈاکٹر سے میں نے سب کچھ کروایا تھا وہ اس کام کی ماہر بھی ہے۔ اچھا خیر! جاؤ، اب آرام کرو تم جا کر۔"

یاسمین نے فوراً ہی قدم بڑھا دیا۔ اس نے اپنے کمرے کا رخ کیا تھا۔ سینڈل اتار کر اس نے زیورات بھی اتار کر ایک طرف رکھے اور بستر پر لیٹ کر سوچ بچار کرنے لگی۔ ایک خیال اسے یہ بھی آیا کہ ابھی اپنے موبائل پر عارف سے رابطہ کرے اور اسے سب کچھ بتادے لیکن پھر اس نے یہ خیال اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ مناسب یہی تھا کہ اتنی تفصیلی باتیں فون پر نہ کی جائیں۔

یہ خیال ذہن سے جھٹکنے کے بعد بھی وہ سوچ بچار میں ڈوبی رہی۔ اب اس کا مرکزِ فکر یہ تھا کہ ان سب باتوں سے واقف ہوجانے کے بعد عارف ان لوگوں کے خلاف کوئی ایکشن لے بھی سکتا ہے یا نہیں؟

اس سوچ بچار میں آدھا گھنٹا گزرا تھا کہ ریشماں دستک دے کر اس کے کمرے میں آئی۔ وہ بہت سنجیدہ نظر آرہی تھی۔ یاسمین نے اسے محبت سے اپنے قریب بٹھایا۔

"اتنی فکرمند کیوں نظر آرہی ہے میری گڑیا!" وہ بولی۔

"ماما کے گرگے بھی تو ہیں اسلام آباد میں!" ریشماں نے کہا۔ "ان میں سے کسی نے ماما کو اطلاع دی ہے کہ دو دن بعد کسی خلیجی ریاست سے کوئی آنے والا ہے جسے بڑی آسانی سے پھانسا جاسکتا ہے۔"

"تو؟"

"ماما نے پرسوں رات اسلام آباد جانے کا پروگرام بنالیا ہے۔"

"میں اب بھی نہیں سمجھی کہ تم فکرمند کیوں ہو؟"

"فکرمند نہیں ہوں باجی......! بس سوچ رہی ہوں تمہارے بعد اب مجھے مردوں کا کھلونا بننا پڑے گا۔"

یاسمین نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم نہیں بننا چاہتیں؟"

"میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔" ریشماں اب کچھ اداس نظر آنے لگی۔ "تمہاری طرح میرا بھی کوئی سہارا نہیں ہے۔ ماما کے اشاروں پر ناچنا تو پڑے گا۔ یہ جاننے کے بعد مجھے ان دونوں سے نفرت ہوگئی ہے کہ میں ایک شریف باپ کی بیٹی ہوں اور آپ بھی۔"

"اسی بارے میں مجھ سے مشورہ کرنے آئی ہو؟"

"آپ بھی کیا مشورہ دے سکتی ہیں باجی!" ریشماں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "میں تو بس اس لیے آگئی کہ آپ سے باتیں کرکے شاید کچھ دھیان بٹے۔"

"لیکن تم چاہتی ہو کہ جو زندگی میں نے گزاری، وہ تمہیں نہ گزارنا پڑے؟"

"میں نے ابھی کہا نا باجی کہ میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

اس وقت یاسمین کے دماغ میں یہ سوال ابھرا کہ عارف اگر ان لوگوں کے خلاف کوئی ایکشن لے سکا تو کیا یہ بھی ممکن ہوگا کہ ریشماں کو بھی ان لوگوں کی گرفت سے نکالا جاسکے؟

یاسمین کے دماغ میں عارف کا جملہ گونجا۔ "تو پھر میں اسے بھی اس خارزار سے بچاؤں گا۔"

عارف نے یہ بات ریشماں ہی کے لیے کہی تھی لیکن یاسمین کے لیے اندازہ لگانا بھی مشکل تھا کہ عارف یہ سب کچھ کس طرح کرسکے گا۔

✂✂✂

شام کے پانچ بجے تھے جب یاسمین نے اپنے موبائل پر عارف کی کال ریسیو کی۔ "میں آرہا ہوں یاسمین! آدھا گھنٹا لگے گا، تیار ملنا؟"

"تیاری کیا کرنا ہے مجھے! جیسی آئی تھی، ابھی تک اسی حالت میں ہوں۔ تم آؤ گے تو اٹھ کر چل پڑوں گی۔"

''میک اپ تو خراب ہو ہی گیا ہوگا۔ خیر، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ویسے میں جانے سے پہلے تمہیں بیوٹی پارلر تو جانا ہی ہوگا۔ بس الماس نادر کو بتا دو کہ میں تمہیں لینے آرہا ہوں۔''

''تم خود فون کر دو۔ میں تو اس وقت سے اب تک کمرے سے نہیں نکلی۔ کھانا بھی یہیں کھایا تھا ریشماں کے ساتھ۔ باہر نکلنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا ہے۔ ان لوگوں کی شکلوں سے نفرت ہوگئی ہے مجھے...... سب کچھ جان بھی چکی ہوں کہ یہ لوگ مجھ سے اور کیا کروانا چاہتے ہیں۔''

''اچھا!''

''ہاں۔'' یاسمین نے کہا۔ ''جب میں یہاں سے تمہارے ساتھ چلوں گی تو تمہیں وہ سب کچھ بتا دوں گی۔''

''بتا دینا۔ اچھا میں الماس نادر کو فون کیے دیتا ہوں۔ بس آدھے گھنٹے میں پہنچ جاؤں گا۔''

دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

یاسمین کو عارف کے اس انداز پر تعجب ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ جب وہ یہ بتائے گی کہ اس نے سب کچھ جان لیا ہے تو عارف متجسس ہو کر کچھ سوال ضرور کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ ''کیوں؟''

اس سوال نے یاسمین کو الجھن میں ڈالا، مگر اس کی یہ الجھن عارف سے باتیں کر کے ہی ختم ہو سکتی تھی۔ اس کے باوجود الجھن کی وجہ سے وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی۔

ٹہلتے ہوئے آدھا گھنٹا گزر گیا لیکن اسے وقت کا کچھ احساس ہی نہیں تھا۔ وہ اس وقت چونکی جب ریشماں کمرے میں آئی۔

''چلیے باجی!''

''عارف آگئے؟'' یاسمین نے جلدی سے پوچھا۔

''آتے ہی ہوں گے۔ ممی کو فون کیا تھا انہوں نے۔ ممی اور ماما ڈرائنگ روم میں ہیں، تمہیں بلایا ہے۔''

یاسمین سر ہلا کے ریشماں کے ساتھ کمرے سے نکلی۔ جب وہ دونوں ڈرائنگ روم میں پہنچیں تو وہاں عارف بھی تھا اور غالباً اسی وقت پہنچا تھا۔ نجیب خان اسے بڑی شفقت کے ساتھ سینے سے لگا رہا تھا۔

شریف زادہ بن رہا ہے، یاسمین نے جلے بھنے انداز میں نجیب خان کے بارے میں سوچا۔

''آؤ!'' الماس نادر نے یاسمین کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ''تمہارے دلہا میاں آگئے تمہیں لینے!'' پھر وہ ریشماں سے بولی۔ ''جمن سے کہہ دیا تھا؟''

''جی ہاں، وہ دیکھیے!''

ریشماں کے اشارے پر الماس نادر نے اندرونی دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے ملازم جمن ایک بڑی سی ٹرالی کو دھکیلتا ہوا اندر آرہا تھا۔

نجیب خان نے بڑی محبت سے عارف کو اپنے قریب بٹھایا اور کہا۔ ''تم نے فون پر کہا تھا نا کہ تم بہت جلدی میں ہو گے اس لیے تمہاری خاطر تواضع کے لیے تیاری پہلے ہی کر لی گئی تھی۔''

''ارے اس کی کیا ضرورت تھی۔'' عارف نے کہا۔

''ارے واہ!'' الماس نادر بول پڑی۔ ''پہلی مرتبہ سسرال آئے ہو، کچھ کھائے پیے بغیر کیسے چلے جاؤ گے۔''

''ہمیں جلدی ہے ماما!'' یاسمین بول پڑی۔ ''عارف نے مجھے فون پر بتایا تھا کہ ابھی مجھے بیوٹی پارلر بھی جانا ہے، وہاں خاصا وقت لگتا ہے۔''

''اب ایسی بھی جلدی نہیں ہے یاسمین!'' عارف نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اور پھر بڑوں کی بات ماننا ضروری ہے۔ اسی بہانے مجھے ماما سے کچھ باتیں کرنے کا موقع مل جائے گا۔''

یاسمین نے تعجب سے عارف کی طرف دیکھا لیکن پھر کچھ بولی نہیں اور ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

ملازم جمن ٹرالی قریب کھڑی کر کے چلا گیا۔ اسے جانے کا اشارہ خود ریشماں نے کیا تھا۔ وہ ٹرالی سے پلیٹیں اٹھا کر درمیانی تپائی پر رکھنے لگی تھی۔

''مجھ سے تمہیں کیا باتیں کرنا ہیں برخوردار!'' نجیب خان ہنس کر بولا۔

''یاسمین نے بتایا تھا کہ آپ زیادہ تر اسلام آباد میں رہتے ہیں۔''

''ہاں، میرا کاروبار وہیں ہے۔''

''عورتوں کا کاروبار!''

عارف کی اس بات پر الماس نادر اور نجیب خان ہی نہیں، یاسمین اور ریشماں بھی چونک پڑی تھیں۔

''عجیب سی بات کی ہے تم نے!'' نجیب خان نے عارف کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''کیا مطلب ہے اس سے تمہارا؟''

''مطلب تو وہی ہے جو آپ نے سمجھا ہے۔'' عارف نے سنجیدگی سے کہا، پھر یاسمین کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''ذرا یہاں آؤ!''

یاسمین شدید ذہنی الجھن کے عالم میں صوفے سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ عارف نے کس قسم کی منصوبہ بندی کر ڈالی ہے کہ اسی وقت

ایسی باتیں شروع کر دیں جن کے لیے خاصی تیاری کی ضرورت تھی۔

عارف اور نجیب خان بڑے صوفے پر بیٹھے تھے۔ عارف نے یاسمین کو اپنے اور نجیب خان کے بیچ میں بٹھالیا۔

نجیب خان اب بھی تیکھی نظروں سے عارف کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

عارف نے اس کی طرف توجہ دیے بغیر یاسمین کے گلے سے لاکٹ اتارا۔ اس وقت نجیب خان اور الماس نادر پھر چونکے تھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا بھی تھا۔

ریشماں ٹرالی سے پلیٹیں اٹھا کر تپائی پر رکھنا بھول گئی تھی اور کھڑے کھڑے سب کچھ دیکھے جا رہی تھی۔

''ماما صاحب!'' عارف بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ''آپ نے اس لاکٹ میں جو سم لگا رکھی تھی نا، وہ اس وقت اس میں نہیں ہے، بالکل اسی جیسی دوسری سم ہے۔'' عارف نے لاکٹ میں پوشیدہ سم نکال کر نجیب خان کو دکھائی۔ ''تم نے جو سم لگائی تھی، وہ میری الماری میں پڑی ہوئی ہے۔ رات کو لاکٹ بھی اسی الماری میں تھا۔ اسی لیے تم میری اور یاسمین کی باتیں ریکارڈ نہیں کر سکے۔''

نجیب خان اور الماس نادر کے چہرے کی رنگت بدل گئی۔

''اس میں یہ دوسری سم میں نے لگائی ہے۔'' عارف کہتا رہا۔ ''اس سم سے نشر کی جانے والی آوازیں جس ریسیور پر سنی جا سکتی تھیں، وہ ریسیور میری کار میں ہے۔ یاسمین جب سے یہاں آئی تھی تو میں اپنی کار میں تمہارے گھر کے قریب ہی تھا۔ یہاں یاسمین سے جو باتیں تم لوگوں نے کی تھیں، وہ میں نے ریکارڈ کر لی ہیں، سنواتا ہوں تمہیں!''

عارف نے کوٹ کی جیب سے ایک چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر نکال کر اپنے گھٹنے پر رکھا۔

یاسمین کی حالت اس وقت ایسی تھی جیسے دم بخود رہ گئی ہو۔ اس کے دماغ نے جیسے کام کرنا ہی چھوڑ دیا تھا ورنہ وہ سمجھ جاتی کہ جب اس نے فون پر کہا تھا کہ وہ سارا کھیل سمجھ چکی ہے تو عارف نے اس سے کوئی استفسار اس لیے نہیں کیا تھا کہ وہ پہلے ہی ان سب باتوں سے واقف ہو چکا تھا۔

عارف ٹیپ ریکارڈر آن کر چکا تھا اور اس میں سے آوازیں ابھرنے لگی تھیں۔ وہ وہی باتیں تھیں جو یاسمین کے آتے ہی الماس نادر اور نجیب خان نے اس سے کی تھیں۔

ریشماں کھڑے کھڑے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔

نجیب خان اور الماس نادر کے چہرے بار بار رنگ بدل رہے تھے۔

دو منٹ بعد عارف نے ٹیپ ریکارڈر بند کیا اور بولا۔ ''ساری باتیں سنانے کی، میرا خیال ہے کہ ضرورت نہیں ہے نجیب خان!...... تم سمجھ ہی گئے ہو گے کہ اس میں ساری باتیں موجود ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' نجیب خان نے سنبھالا لیا اور بولا۔ ''تم یہ سب کچھ جان ہی گئے ہو تو اب چاہتے کیا ہو......؟'' پھر اس نے جواب کا انتظار کیے بغیر یاسمین کو گھورتے ہوئے زہریلے انداز میں کہا۔ ''لاکٹ کے بارے میں تو ہی نے بتایا ہوگا۔''

یاسمین میں کچھ بولنے کی سکت ہی نہیں تھی۔ جواب عارف نے دیا۔ ''ہاں یاسمین نے ہی مجھے بتایا تھا کیونکہ یہ مجھے بہت چاہتی ہے۔ اس کے زیورات میں نے نہیں رکھے تھے الماری میں، خود اسی نے رکھے تھے۔ اسے اندازہ تو نہیں تھا کہ تم ہم دونوں کی باتیں کیوں سننا چاہتے ہو لیکن اسے غالباً شبہ ہو گیا ہوگا کہ تم مجھے بھی کسی قسم کے جال میں پھانسنا چاہتے ہو۔ اب میں نے جو باتیں ریکارڈ کی ہیں، اس سے ظاہر ہو گیا ہے کہ تم مجھے پھانسنا نہیں بلکہ صرف کچھ اندازہ لگانا چاہتے تھے کہ تم یاسمین کو آلۂ کار بنا کر مجھے لوٹنا چاہتے تھے۔ مجھے اس ریکارڈنگ سے اہم بات صرف یہی معلوم ہو سکی ہے کہ پہلے تم نے میری محبوب بیوی کو لوگوں تک پہنچایا تھا اور اب وہی کام تم معصوم ریشماں سے بھی لینا چاہتے تھے لیکن اب ایسا نہیں ہو سکے گا۔ یاسمین نے خود ہی مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس کے باوجود میرے دل سے اس کی محبت ختم نہیں ہو سکی۔ یہ میری ہے اور میری رہے گی۔'' پھر وہ ریشماں کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تم نے آج اپنی باجی سے جو باتیں کی تھیں نا ریشماں، وہ بھی اب اس ٹیپ میں موجود ہیں۔ تمہاری خواہش ضرور پوری ہوگی۔ جو کچھ تم چاہتی ہو، وہی ہوگا۔ تم اب ان سوداگروں کے ساتھ نہیں، میرے گھر میں اپنی بہن کے ساتھ رہو گی۔''

''تمہارا مطلب کیا ہے ان باتوں سے!'' نجیب خان تیز لہجے میں بولا۔

''مطلب بالکل صاف ہے نجیب خان......! اگرچہ ٹیپ کی ہوئی آوازیں عدالت کے لیے ٹھوس ثبوت نہیں ہوتیں لیکن اگر اس ٹیپ کی بنیاد پر میں تم لوگوں کو عدالت میں گھسیٹوں تو پولیس مزید تفتیش کر کے تم لوگوں کے خلاف خاصے ثبوت اکٹھا کر لے گی۔ میں اس کے لیے بے تحاشا اخراجات کے لیے بھی تیار ہوں لیکن میں ایسا نہیں کرنا

چاہتا۔ اس صورت میں میری محبوب بیوی کو بھی عدالت میں جانا پڑے گا۔ اس کی بھی بدنامی ہوگی جو میں گوارا نہیں کر سکتا اس لیے میں بس یہ چاہتا ہوں کہ تم دونوں جہنم میں جاؤ۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تم آئندہ کس قسم کی زندگی گزارو گے۔ خواہش تو یہی تھی کہ تم دونوں سے بھیانک انتقام لیا جائے لیکن اپنی بیوی سے میری محبت آڑے آ رہی ہے۔ میں تم لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرنا چاہتا۔ بس آج کے بعد تم ہم لوگوں سے کوئی تعلق نہیں رکھنا۔ ریشماں کو بھی میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ تم لوگ اسے اس جہنم میں نہیں جھونک سکتے...... اور ہاں نجیب خان! کوئی اوندھا سیدھا خیال اپنے دل میں نہ لانا۔ میرا مطلب ہے کہ تمہاری ایسی کوئی کوشش بار آور نہیں ہو سکتی کہ تم مجھ سے یہ ٹیپ چھین لو، اپنے ملازمین سے مدد لے لو۔ کوئی فائدہ نہیں ہوگا اس سے۔ اس ٹیپ کی ایک کاپی اور بھی ہے جو میں نے اپنے ایک دوست شکیب فاروقی کو دے دی ہے۔''

شکیب فاروقی کے نام نے یاسمین کو چونکایا۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ اسی روز عارف نے صبح ہی صبح اپنے جس دوست کو بلایا تھا، اس کا نام شکیب فاروقی ہی تھا۔

''وہ یہاں کی ایک لا انفورسمنٹ ایجنسی میں کام کرتا ہے۔'' عارف نے اپنی بات جاری رکھی۔ اگرچہ یہ سم اور اس قسم کے آلات اب کھلی مارکیٹ میں دستیاب ہیں لیکن میں نے اس سلسلے میں اپنے دوست کی مدد لی تھی۔ اسے فون کر کے اپنے گھر بلایا تھا۔ وہ کئی سمیں ساتھ لایا تھا تا کہ تمہاری لگائی ہوئی سم کی جگہ ان میں سے کوئی نہ کوئی سم فٹ ہو جائے۔ لاکٹ میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کرنا پڑے۔ میں نے اپنے دوست کو یہ ساری باتیں بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اگر بتا دیتا تو یاسمین ہمیشہ اس کے سامنے شرمسار رہتی۔ اسی لیے میں نے ریکارڈنگ بھی خود کی تھی۔ بس اس سے طریقۂ کار سیکھ لیا تھا اس کام کا۔ جو دوسرا ٹیپ اس کے پاس ہے، وہ اسے سنے گا ہرگز نہیں۔ یہ وعدہ لے چکا ہوں میں اس سے...... ! مجھے یقین بھی ہے کہ وہ اپنے وعدے کا پاس کرے گا۔ ہاں ایک بات ضرور ہے۔ یہ خدشہ تو مجھے تھا اور ہے کہ تم شاید مجھے یہاں سے زندہ واپس نہ جانے دو۔ ایسی صورت میں شکیب حرکت میں آ جائے گا۔ اس وقت بھی اس کی کار تمہارے گھر سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اگر تم نے کوئی ایسی ویسی حرکت کرنا چاہی میرے ساتھ تو پھر شکیب حرکت میں آ جائے گا۔ اسے صرف ایک گھنٹے انتظار کرنا ہے میرے باہر نکلنے کا اور ابھی ایک گھنٹا ہونے میں کافی دیر ہے۔ ہم اس سے پہلے یہاں سے چلے جائیں گے۔''

اب نجیب خان اور الماس کے چہرے سفید پڑ چکے تھے۔ اس دوران میں الماس نادر تو کچھ بول ہی نہیں سکی تھی۔

''ریشماں!'' عارف نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''چلو گی نا میرے ساتھ؟''

ریشماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ تیزی سے قریب آئی۔ انداز کچھ ایسا تھا جیسے عارف کے قدموں میں گر پڑے گی لیکن عارف نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اپنے قریب صوفے کے ہتھے پر بٹھا لیا۔ ''میری چھوٹی سی پیاری سی بہن! اب تمہیں رونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب تمہاری زندگی میں صرف خوشیاں بکھریں گی۔ بڑی دھوم دھام سے شادی کروں گا میں اپنی بہن کی۔''

اس وقت یاسمین کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

عارف نے لاکٹ پھر اسے پہنا دیا۔ ٹیپ ریکارڈر اٹھا کر اپنی جیب میں رکھا اور نجیب خان کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجہ میں بولا۔ ''اب ہمیں اجازت ہے ماما صاحب!''

نجیب خان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل سکا۔

عارف پھر بولا۔ ''یہ تم دونوں کی خوش قسمتی ہے کہ میں اپنی بیوی کی بدنامی نہیں چاہتا، ورنہ تم دونوں کو جیل میں سڑنا پڑتا۔''

پھر وہ یاسمین کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

''ریشماں کو تم سنبھالو۔'' عارف نے اس سے کہا۔

ریشماں ابھی تک روئے جا رہی تھی۔

''اور ہاں!'' عارف پھر نجیب خان کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ہمارے جاتے ہی تم اپنی بیوی رانی بیگم کو تو فون کر ہی دو گے کہ کھیل ختم ہو چکا ہے۔ اس کے بعد وہ بھی فرار ہی کا راستہ تلاش کرے گی۔ اس کے غائب ہو جانے سے میرے والد پریشان ہو سکتے ہیں لیکن میں انہیں بتا دوں گا کہ اس سے ان کی شادی ہوئی ہی نہیں تھی کیونکہ وہ تمہاری بیوی ہے۔ ساری تفصیلات میں ان کو بہر حال نہیں بتاؤں گا۔ میں اپنی محبوب بیوی کو ان کے سامنے ایکسپوز نہیں کر سکتا۔''

اس کے بعد بھی نجیب خان کے منہ سے کچھ نہ نکلا۔ الماس نادر پہلے ہی خاموش تھی۔

عارف، یاسمین اور ریشماں کے ساتھ بیرونی دروازے سے باہر نکل گیا۔ نجیب خان اور الماس نادر بے بسی سے انہیں جاتے دیکھتے رہے۔ اس سے زیادہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے دماغ میں اس وقت یہ خیال ضرور ہوگا کہ ان کی جان تو بچی!